جلد نمبر ۱۲۵

جنوری ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتاب

غالبؔ مدح و قدح کی روشنی میں

غالبؔ کی زندگی سے لے کر ۱۹۶۹ء تک غالب کی مدح و قدح میں جو
اس کا پوری دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے

حصہ اول

اس میں مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۸ء تک ان کی حمایت و مخالفت جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے قیمت ۱۵ روپے

حصہ دوم

اس میں مرزا غالب مخالفت میں ۱۹۲۹ء سے جو کچھ لکھا گیا ہے، ا کیا گیا ہے، قیمت

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۲۵ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کو چودہ سو سال ہوئے، مگر آپ کی نبوت کا آغاز اس سے تیرہ سال پہلے ہوا، اس وقت سے اب تک مسلمانوں کی جو تاریخ رہی وہ آج کل زیر بحث ہے، مگر ہم کو اپنے عروج سے زیادہ اپنے زوال کے اسباب پر غور کرنا بھی ضروری ہے،

مسلمان اسلام میں داخل ہوئے تو جب تک انکے دلوں میں ایمان داخل رہا، یا جب تک انھوں نے قرآن حکیم کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا، یا جب تک کعبہ کو اپنی جبینوں سے بسایا تو وہ دنیا کیلئے خیر و برکت بنے رہے، وہ حق و صداقت کی خاطر کبھی خشکیوں اور کبھی دریاؤں میں لڑے، جنگ میں اڑے تو کبھی نہیں ٹلے، کبھی یورپ کے کلیساؤں اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اذانیں دیں، دلوں پر نقش توحید بٹھانے کی خاطر درۂ خیبر لکھاڑا، شہر قیصر کو مسخر کیا، آتشکدۂ ایران کو ٹھنڈا کیا، دشت تو دشت کوہ اور سمندر بھی نہ چھوڑا، ان کے عروج کی داستان اگر شاندار ہے تو ان کی تاریخ ان کے زوال کے اسباب سے بھی داغدار ہے، ان کی مذہبی فرقہ بندی کی کہانی ان کے سیاسی انتشار سے زیادہ المناک ہے،

قرآن حکیم کی یہ تعلیم تھی کہ مسلمان عصبیت کے شکار نہ ہوں، (مائدہ - ۲، نساء - ۱۴) وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، (حجرات - ۱) لیکن ان کی فرقہ بندی شروع ہوئی تو اب تک ختم نہیں ہو سکی ہے سب سے پہلے شیعان علی کا فرقہ وجود میں آیا، وہ حضرت علیؓ کے وصی ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے، اس لئے اسلام کے پہلے تین خلفاء کے منکر ہو گئے، حضرت فاطمہؓ کی اولاد کو اوصیا سمجھ کر اپنا امام تسلیم کرتے رہے، مگر یہ بھی مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے، کچھ معتدل اور کچھ غالی ہو گئے۔

غالی شیعوں میں فرقہ سبیہ عبد اللہ بن سبا کا متبع ہوا، یہ اس کی ترویج کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجسم ہو کر حضرت علیؓ کی شکل میں نازل ہوا، وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں، ایک اور غالی فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نبی کریمؐ سے اس طرح مشابہ تھے جیسے ایک کوا دوسرے سے ہوتا ہے، حضرت جبرئیل نے غلطی سے محمدؐ کو وحی لاکر دیدی، ایک تیسرا فرقہ کیسانیہ ہوا جو مختار بن عبید ثقفی کا پیرو رہا، یہ حضرت علیؓ

اولاد کونبی سے کم نہیں سمجھتا، اور امام حسینؓ کے خون کا بدلہ لینے کا دعویدار ہوا، فرقہ زیدیہ غالی نہ تھا، یہ امام زید بن علی بن حسینؓ کا معتقد ہوا، یہ صحابۂ کرام کی تکفیر نہیں کرتا، لیکن اپنے ائمہ کو رسول کے بعد سب سے افضل سمجھتا۔

شیعون مین اثنا عشریہ کا فرقہ زیادہ پھیلا، یہ حضرت علیؓ سے لے کر ان کی بارہ پشت تک کی اولاد کو اپنا امام مانتے ہیں، اُن ہی کو کتاب وسنت کا شارح سمجھتے ہیں، ان ہی میں سے فرقہ اسماعیلیہ نکلا، اثنا عشریہ امام جعفر کے بعد ان کے بیٹے موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں، اسماعیلی امام جعفر صادق کے دوسرے بیٹے اسماعیل کو اپنا امام قرار دیتے ہیں، اسماعیلیون ہی میں سے ایک فرقہ باطنیہ ہوا، جس کا عقیدہ ہے کہ شریعت کے باطن کا علم صرف اسکے امام کو ہوتا ہے، قرامطہ، بوہرے، خوجے اور نزاری بھی اسماعیلیون ہی میں سے ہیں، نزاریوں کا اہم داعی حسن بن صباح تھا، جس نے فدائیوں کے نام سے ایک انتہا پسند فوجی دستہ بھی قائم کیا، اور ایک ارضی جنت بھی بنا رکھی تھی شیعوں ہی میں سے ایک فرقہ حاکمیہ بھی ہوا، جو چھٹے فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ کا پیرو تھا، اس کا خیال تھا کہ ذات خداوندی اس کے پیشوا میں حلول کر آئی ہے، ایک فرقہ ایک ایرانی حمزہ الدرزی کی قیادت مین درزکے نام سے ابھرا، دروزاس کو قائم الزمان اور مظہر عقل کل تسلیم کرتے، شام کا ایک فرقہ نصیریہ بھی حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل تھا

باطنیون میں سے بابی اور بہائی فرقے نکلے، ایک مشہور لیکن ضعیف حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس شہر کے باب ہیں شیخ احمد زین الدین احسائی نے دعویٰ کیا کہ وہ علم کا شہر باب یعنی تمام باطنی اسرار سے واقف ہے، یہ فرقہ شیخیہ کہلانے لگا، شیخ احمد کے جانشین سید علی محمد شیرازی نے مامور الٰہی اور باب ہونے کی حیثیت سے حامل نبوت اور پھر مظہر الوہیت ہونے کا اعلان کیا، ان کی وفات کے بعد ان کے دو مریدون میں جانشینی کا جھگڑا ہوا، ایک کا لقب صبح ازل اور دوسرے کا بہاء اللہ تھا، ان دونوں کے پیرو ازلیہ اور بہائی کہلائے، مگر جو باب کے کسی جانشین کے قائل نہ تھے، بابیہ کے نام سے مشہور ہوئے، بہاء اللہ نے من یظہرہ اللہ ہونے کا اعلان کیا، اور ایسے دین کی تبلیغ کی جس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ تمام ادیان کا ناسخ اور سب کی نمایندگی کرتا ہے بابیوں کو اس سے اختلاف رہا، مگر وہ اس کے قائل رہے کہ ہر ہزار سال کے بعد شریعت بدل جاتی ہے،

شیعون کے ساتھ خوارج کا بھی فرقہ پیدا ہوا، یہ ایک سیاسی فرقہ تھا، جو شیخین کے علاوہ حضرت عثمانؓ

حضرت علیؓ دونوں کو نعوذ باللہ گمراہ سمجھتے اور ان کے ماننے والوں کو کافر اور مباح الدم سمجھتے، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا حکم قابل قبول نہیں سمجھتے، وہ اس کے بھی قائل تھے کہ کوئی بھی مسلمان انتخاب کے ذریعہ خلیفہ ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے غلو میں اس خیال کو دینی رنگ دیدیا، اور عبداللہ بن وہب الراسبی کو اپنا امیر المومنین بنایا مگر ان کے بھی کئی فرقے ہو گئے، نافع بن ازرق کے پیرو ازارقہ کہلانے لگے، وہ اپنے مخالفین کو مشرک اور جہنمی سمجھ کر قتل کر دینے میں تامل نہ کرتے، عبداللہ ابن اباض کو اس انتہا پسندی سے اختلاف ہوا تو وہ علحدہ ہو کر فرقہ اباضیہ کا بانی ہوا، پھر نجدہ بن عامر کے مقلدین فرقہ نجدات سے موسوم ہوئے جو اشاعت اسلام کے لیے امام کے تقرر کو شرعی حیثیت نہیں دیتے مگر ان سے بھی الگ ہو کر ایک فرقہ نے ابو فدیک کی رہنمائی اختیار کی، فرقہ صفریہ زیاد بن الاصفر کا معتقد ہوا جو اپنے مخالفین کو مشرک نہیں سمجھتا، عبدالکریم بن عجرد کے ماننے والے عجاردہ کہلائے، یہ اسکے قائل تھے کہ بچے جب تک جوان ہو کر باضابطہ ایمان نہ لائیں خارج از اسلام ہیں، ان کی بھی علحدہ علحدہ شاخیں، میمونیہ، حلفیہ، حمزیہ، اشعوبیہ، خازمیہ وغیرہ کے نام سے ہو گئیں، یہ بچوں کے ایمان کے بارہ میں متشدد نہیں، ایک فرقہ یزیدیہ نے اس کی ترویج کی کہ عجمیوں میں بھی ایک رسول پیدا ہوگا۔

اہل السنت والجماعت میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے اہل فقہا ہوئے، جن کے مقلدین حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی کہلائے، ان سے الگ اہل حدیث ہیں، جو کسی امام کے مقلد نہیں ہیں، مگر وہ سنی ہی سمجھے جاتے ہیں، سنیوں میں متکلمانہ اور فلسفیانہ موشگافیاں ہونے لگیں تو اعتقادی طور پر ان کے علحدہ علحدہ فرقے ہو گئے،

ایک فرقہ جبریہ ہوا جو اس کا قائل تھا کہ انسان سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے، وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس کی اشاعت خراسانی الاصل جہم بن صفوان نے کی، اس کے مقابلہ میں قدریہ اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے غیلان دمشقی کی اہم قیادت میں فرقہ جبریہ کی تردید یہ کہہ کر کی کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ کا کوئی تعلق نہیں پھر ایک فرقہ مرجیہ ہوا جس میں ایک مرجیۃ السنت اور ایک مرجیۃ البدعت کہلایا، مرجیۃ السنت کا خیال تھا کہ گناہ گار کو اس کے گناہ کے مطابق سزا دی جائیگی، مگر وہ دائمی جہنمی نہیں ہوگا، مرجیۃ البدعت کہتے ہیں کہ ایمان کی موجودگی میں معصیت سے ضرر نہیں پہونچتا۔

واصل بن عطا کی سرکردگی میں معتزلہ کا گروہ پیدا ہوا، جو مسائل کو عقل پر پرکھتا، اور جو بات عقل کے مطابق نہ ہوتی اس کو رد کر دیتا، اسکی عقلی تعبیرات سے خلق قرآن، باری تعالیٰ کی ذات، صفات اور رویت پر طرح طرح کی بحثیں، اٹھ کھڑی ہوئیں جن سے فقہا اور محدثین کو سخت اختلاف ہوا، اگر معتزلہ کے بھی بہت سے فرقے ہو گئے، ہذیلیہ، حائطیہ، بشریہ، معمریہ، مرداریہ، ثمامیہ، ہشامیہ، جاحظیہ، خیاطیہ اور جبائیہ وغیرہ اپنے اپنے داعیوں کے نام سے منسوب تھے،

معتزلہ کے مقابلہ میں ابوالحسن علی اشعری کی رہنمائی میں اشاعرہ صف آرا ہو گئے، معتزلہ رویت باری تعالیٰ سے انکار کرتے، اشاعرہ کہتے کہ آخرت میں اسکی زیارت ہوگی، مگر اسکی صورت اور ہیئت بتائی نہیں جا سکتی، معتزلہ کہتے کہ ید اللہ سے مراد غلبہ ہے، اشاعرہ اس کا یہ جواب دیتے کہ ید سے مراد ہاتھ ہی ہے، جو انسانی ہاتھ کے برخلاف ذات خداوندی کی شان کے مطابق ہے، معتزلہ کا خیال تھا کہ قرآن مجید مخلوق اور حادث ہے، اشاعرہ یہ کہہ کر اس کو رد کرتے کہ کلام اللہ کی صفت ازلی ہے، اس لئے یہ غیر مخلوق ہے، دونوں میں اسی قسم کے اور مباحث ہوتے رہے،

امام ابو حنیفہ کے متبعین میں ابو منصور ماتریدی نے ان جھگڑوں کو یہ کہہ کر مٹانے کی کوشش کی کہ تفکر و تامل ضروری ہے مگر عقل پر اسی وقت اعتماد کیا جا سکتا ہے جب یہ مشعل شرع سے منور ہو، انکے ماننے والے ماتریدیہ اشاعرہ اور معتزلہ کے بین بین تھے۔

ایک گروہ سلفیہ بھی پیدا ہوا، اس کے خیال میں وہی عقائد معتبر ہیں جو کتاب وسنت کے عین مطابق ہیں عقل سے شرعی احکام کی تائید و توثیق تو ہو سکتی ہے، مگر عقل کی خاطر شرعی احکام ترک نہیں کئے جا سکتے، عقل کو نقل کے پیچھے چلنا چاہئے، اس کے پرجوش داعی امام ابن تیمیہ تھے، ان کا مسلک یہ تھا کہ تم میں سے جو کوئی خلاف شرع امر دیکھے وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، جو ایسا نہ کر سکے، وہ اپنی زبان سے اسکی مخالفت اور اصلاح کرے، جو یہ نہ کر سکے وہ اپنے دل سے اس کی مخالفت کرے۔

امام ابن تیمیہ کے مسلک کو نجد کے محمد بن عبد الوہاب سے زیادہ تقویت پہونچی جب وہ مسلمانوں میں جتنی بدعتیں رائج ہو گئی تھیں ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے، ان کے مقلدین وہابی کہلائے۔

مصر میں حسن البنا کی قیادت میں اخوان المسلمین کی جماعت دین اور سیاست کو ایک چیز قرار دے کر اسلام کے دینی اور سیاسی احیاء کی دعویدار ہوئی، اور اس کی تلقین کی کہ اسلام بیک وقت ایمان و عبادت، وطن و قوم، مذہب و حکومت، روحانیت و عمل اور قرآن و شمشیر سب کچھ ہے،

جس ملک میں مسلمان گئے اور پہلے وہاں کوئی نہ کوئی مذہبی فرقہ ضرور پیدا ہو گیا، مثلاً ہندوستان
میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اباحتیوں کا ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو گناہ کو گناہ نہیں سمجھتا، اسی عہد میں دہلی کے ایک باشندہ
رکن الدین نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر نویں صدی ہجری میں سید محمد جونپوری کے معتقدین اپنے کو مہدوی کہنے لگے،
عہد اکبری میں بایزید روشن جالندھری نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ان کے ماننے والے روشنیہ کہلانے لگے، اکبر نے خود
دین الٰہی قائم کر کے مذہب کا ایک معجون مرکب تیار کیا، فرخ سیر کے زمانہ میں میر محمد حسین رضوی مشہدی نے بھی
اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا، اس کے معتقدین فرقوی کہلانے لگے، انگریزوں کے زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی
نے اپنے کو نہ صرف مہدی ظاہر کیا بلکہ یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت مسیحؑ کی قوت ان میں لوٹ آئی ہے
ان کے معتقدین ان کو نبی ماننے لگے، اور وہ احمدی یا قادیانی کہلائے ۔

بریلی کے مولانا احمد رضا خاں کے پیرو بریلوی کہلاتے ہیں جن کو انکے معترضین بدعتی کہتے ہیں، مگر بریلوی اپنے معترضین کے عقائد کے
طرح طرح کے فتاوے صادر کرتے رہتے ہیں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی کے نام سے ایک سیاسی اور
دینی جماعت اخوان المسلمین ہی کی طرح ابھری، یہ بھی اسکی قائل ہے کہ اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمہ داری قانون شریعت کا نفاذ ہو
جو قرآن و سنت پر مبنی ہو، مگر اسکے بھی بعض عقائد زیر بحث رہتے ہیں، مولانا محمد الیاس کی مساعی جمیلہ سے ایک تبلیغی جماعت بنی
جو مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے کی کوشش کرتی ہے، مگر اسکے بھی معترضین پیدا ہو گئے ہیں،

علمائے ظاہر اور صوفیائے کرام کے اختلافات کی المیہ داستان الگ ہے، صوفیہ نے طریقت کے ذریعہ سے تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن
کی تعلیم دینی شروع کی تو کچھ علماء نے اسکو شریعت کی روح کے منافی قرار دیا، گو صوفیہ شریعت کے بغیر طریقت کو زندقہ سمجھتے ہیں اور جب
ابن عربی نے وحدت الوجود کا فلسفیانہ نظریہ پیش کیا تو ان پر گمراہی اور ضلالت کا الزام رکھا گیا، حضرت احمد سرہندیؒ نے
وحدت الوجود کا ابطال وحدت الشہود سے کیا، شاہ ولی اللہؒ نے دونوں کی تطبیق دینے کی کوشش کی، مگر مرزا مظہر جانجاناںؒ جیسا
بزرگان دین اس سے مطمئن نہیں ہوئے، اور اس مسئلہ پر اختلاف جاری ہے،

پھر صوفیائے کرام کے بھی مختلف فرقے نظری اور فکری حیثیت سے ہو گئے، محاسبیہ، قصاریہ، طیفوریہ، نوریہ، سہیلیہ
حکیمیہ، خرازیہ اور خفیفیہ وغیرہ اپنے اپنے پیشواؤں کے نام سے منسوب ہوئے، انکے سلسلے بھی علٰحدہ علٰحدہ ہو گئے، صرف ہندوستان
میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، شطاریہ، فردوسیہ اور مجددیہ وغیرہ اپنے سلسلے ہیں ۔

ان فرقہ بندیوں سے مسلمانوں میں جو انتشار پھیلا وہ انکے سیاسی انتشار سے کم مہلک ثابت نہیں ہوا، انھیں

سنیوں کے خون ریز تصادم سے بربادی اور ملکی نقصانات ہوتے رہے، حسن بن صباح نے نظام الملک طوسی کا قتل کرایا، پھر اس کے مقلدوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی حملہ آوروں کا ساتھ دیا، فرقہ نصیریہ نے شام میں تاتاریوں کی حمایت کی، مصر کے فاطمی مدلس کی عرب حکومت کے مخالف رہے، اسی اختلاف کی وجہ سے ہلاکو خاں نے عروس البلاد بغداد کو مستعصم باللہ کے زمانہ میں خون اور لاشوں کا شہر بنا دیا، بنگال میں پلاسی اور دکن میں سرنگاپٹم کی لڑائیوں میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان شہید ہوئے، پھر بہائیوں نے ایرانی حکومت کے خلاف روسیوں سے مل کر سازش کی کہ وہاں کی حکومت ختم ہو تو ان کو بہائیت کی اشاعت کا موقع ملے، اب تو وہ خارج از اسلام قرار دیدیے گئے ہیں۔

ایک خارجی ابن ملجم نے حضرت علی رضؓ کو شہید کیا، ان ہی میں سے فرقہ ازارقہ امویوں اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے انیس سال تک جنگ کرتا رہا، انھوں نے شمالی افریقہ میں طنجہ کے مقام پر امویوں کی مخالفت میں عربوں کا قتل عام کیا، ان کے خلاف جنگ اشراف ہوئی تو عرب کے بڑے بڑے شرفاء و عمائد کام آئے، عبدالملک بن مروان نے خارجیوں سے عاجز آکر ازارقہ اور فدیک کے مقلدوں کا خاتمہ کرا دیا۔

معاصر حکمراں بھی اپنے سیاسی مصالح یا ذاتی دینی رجحانات کی وجہ سے بعض مذہبی فرقوں کے حریف اور فریق بن جاتے، عبدالملک بن مروان خارجیوں کا سخت مخالف رہا، ہشام بن عبدالملک اموی نے امام زید بن علی بن حسین کو قتل کرا دیا، امام ابو حنیفہ عباسیوں کے بجائے سادات کی خلافت کے حق میں تھے، منصور نے عہدۂ قضا نہ قبول کرنے کے بہانے سے انکو قید خانہ بھجوا کر وہاں زہر دلوا دیا، اسی کے عہد میں مدینہ کے حاکم نے جبری طلاق کے مسئلہ پر امام مالک کو ستر کوڑے لگوائے، خلق قرآن کے مسئلہ پر معتصم باللہ بن ہارون نے امام احمد بن حنبل کو اٹھائیس مہینے تک جیل خانہ میں رکھا، اور برابر کوڑے لگواتا رہا، بہائی حکومت ایران سے برسرپیکار ہوئے، تو ان کیلئے ہر قسم کی سزا اور تعذیب روا رکھی گئی، وہ ترکی سے بھی جلاوطن کیے گئے، مصری حکومت نے حسن البنا کی تحریک کو اپنے لئے خطرہ سمجھی تو ان کو قتل کرا دیا، پھر ان کی تحریک بھی ہر طرح دبا دی گئی۔

ہندوستان میں فیروز شاہ نے رکن الدین کو قتل کرا دیا، جس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اسی عہد میں اباحیتوں کا بالکل قلع قمع کر دیا گیا، سید محمد جونپوری کے مخالفین نے ان کو کہیں چین لینے نہیں دیا، اکبر نے روشنیہ فرقہ کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کر دیا، اکبر کے دین الٰہی کے برے اثرات کو دور کرنے کیلئے حضرت احمد سرہندیؒ نے مجددانہ کارنامے انجام دیئے، مغلوں کے آخری عہد میں فریدی بھی ختم کر دیئے گئے، فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو پھانسی

کی سزادی بھی معاف کر دی، قادیانیوں کو اب پاکستان میں غیر مسلم قرار دیدیا گیا ہے۔

فرقوں میں باہمی کشمکش بھی رہی، دروزی عقائد کا بانی حمزہ بن علی بن احمد آپس کے اختلاف سے قتل ہوا، جعد بن درہم کو ابو فدیک کے حامیوں نے ہلاک کیا، فرقہ جبریہ اور قدریہ کے داعیوں میں سے جہم بن صفوان اور غیلان دمشقی دونوں قتل ہوا، حنابلہ ہمیشہ اشاعرہ کے مخالف رہے، دونوں میں کشت وخون تک کی نوبت پہنچ جاتی، امام غزالی نے امام ابو حنیفہ پر نہایت سخت نکتہ چینی کی تو انکے مخالفین ان کو زندیق اور ملحد قرار دینے سے باز نہیں آئے، ابن تیمیہ کے حاسدوں نے بار بار قید خانہ بھجوایا، آخر بار قید ہوئے تو وفات پاکر چھوٹے، آج بھی جہاں کہیں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں تو چھوٹے بڑے مذہبی اختلاف پر خونریز تصادم بھی ہو جاتا ہے۔

یہ درد بھری روداد اس ملت کی ہے جو خیر الامت کہلائی جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ سب مل کر مضبوطی سے اللہ کے دین کی رسی کو پکڑے رہیں (آل عمران - ۱۱) پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ انکے دلوں میں ایسی محبت والفت پیدا کر دی ہے جو بڑے سے بڑا خزانہ صرف کر کے وہ حاصل نہیں کر سکتے تھے (انفال - ۶ آیت ۶۳) پھر یہ بھی حکم دیا تھا کہ وہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں ورنہ وہ بزدل ہو جائیں گے اور انکی ہوا خیزی ہو جائیگی، (انفال - آیت، ۴ - ۵ ۴) پھر رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اسطرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اسکے ایک حصہ سے اسکا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، یہ کہہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، (صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲)

اسلام کے مفکر شاعر علامہ محمد اقبال کو یہ احساس رہا کہ مسلمانوں نے اپنی ہوا خیزی کے باوجود اللہ کے فرمان اور رسول کی ہدایت پر عمل نہیں کیا، اسی لیے انھوں نے اپنے خون دل کی بوند سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مسلمانوں کیلئے قلمبند کیا ہے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

چودہ سو سال کے بعد مسلمان اپنی فرقہ بندی کے المیہ پر خون کے آنسو بہائیں، اور سوچیں کہ زمانے میں پنپنے کی باتیں کون سی ہیں۔

مقالات

مولانا شبلیؒ اور اُن کی فارسی خدمات

از

ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ مقالہ ملک کے مشہور اہل قلم جناب ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے علامہ شبلی توسیعی لکچرز کے سلسلہ میں ۱۰ دسمبر ۱۹۸۴ء کو جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں پڑھا، امید کہ ناظرین اس کا مطالعہ شوق سے کریں گے (ص ع)

علامہ شبلی ایک جامع حیثیات بزرگ اور ایک عہد آفریں شخصیت تھے، وہ محقق، مورخ، ادیب، انشا پرداز، متکلم، مفکر، ماہر تعلیم سبھی کچھ تھے، سید سلیمان ندوی مرحوم نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ وہ عہد جدید کے معلم اول تھے، ان کی شخصیت میں بڑی پُر تاثیر بوقلمونی ہے، انھوں نے اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و کلام کی بے نظیر خدمت انجام دی، ان کی تحریروں کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے شاندار واقعات اور کارہائے نمایاں لوگوں کے سامنے آئے، ان کا مقصد زندگی یہ تھا کہ اسلام کی تاریخی و تمدنی عظمت اس طرح پیش کی جائے کہ مسلمانوں کے دلوں میں از سر نو تازگی و امنگ پیدا ہو۔

مولانا بحیثیت مصنف ایک مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ تنقید و تحقیق کی موشگافیوں سے واقف تھے، استدلال کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتے تھے، ان کی ہر تصنیف اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، سفرنامہ، الفاروق، الغزالی، علم الکلام، الکلام، موازنۂ انیس و دبیر،

شعر العجم، اورنگ زیب عالمگیر، سیرۃ النبی، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر لاجواب تصنیف ہے، اتنے متنوع موضوعات پر مولانا نے جس طرح قلم اٹھایا ہے کم لوگوں نے اٹھایا ہوگا، اور پھر ان میں جس طرح داد تحقیق دی وہ ان ہی کا حصہ ہے، ان کی تصانیف علم و فضل کے ایسے روشن منارے ہیں جن سے صدیوں تک رہنمائی ہوتی رہے گی، ان کی تحریروں سے اردو ادب کا دامن مالا مال ہوگیا ہے اور ان ہی کی خدمات کی وجہ سے اردو زبان با عتبار علوم اسلامی عربی اور فارسی کے ہم پلہ ہوگئی ہے۔

مولانا شبلی ایک بڑے درجہ کے ادیب، انشا پرداز اور نقاد تھے، اور اسی اعتبار سے ان کی اکثر کتابیں اعلیٰ درجے کے نصاب میں شامل ہیں، وہ اردو ادب کے نامور معماروں میں ہیں، اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب کی انھوں نے ایسی شاندار خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے معاصرین میں ہندوستان میں ان کا کوئی ثانی نہیں، اور بعض لحاظ سے ایران میں بھی ان کے مرتبے کے شاید ہی ایک آدھ عالم نظر آئیں، آج کی صحبت میں ان کی فارسی خدمات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنا ہے۔

علامہ کو فارسی شعر و ادب سے کم عمری ہی میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اور عمر کے ساتھ یہ شغف بھی بڑھتا گیا، دراصل مولانا فاروق چریاکوٹی کے فیض تربیت سے یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ استاد کے لئے مایۂ ناز بن گیا، مولانا کی طبیعت میں فارسی کا ذوق ایسا رچ بس گیا تھا کہ کوئی مجلس جو فارسی کی گفتگو سے خالی نہ ہوتی، فارسی شعر اور مصرعے ان کی زبان پر ہوتے، شعر کے برمحل استعمال سے گفتگو میں لطف پیدا کرتے، کسی کو خط لکھتے تو فارسی لطائف سے پُر لطف بناتے تھے۔

کم عمری ہی میں شعر کا ذوق پیدا ہوگیا تھا، علی گڑھ آئے تو اس ذوق کو جلا ملی اور اب وہ بڑے خود اعتمادی سے شعر کہتے تھے، ان کا قصیدۂ عیدیہ اسی ابتدائی دور کا ہے جب ان کی عمر ۲۶ - ۲۷ سال کی تھی، اس نوجوانی میں بھی ان کی کہنہ مشقی دیکھئے، چند شعر پیش کرتا ہوں!

روز عید است و دگر کار جہاں گشت بساز   باز شد بر رخ گیتی در امید فراز

دست بید او فلک آن ہمہ کوتاہ شدہ است | کہ گرفتہ شب او دل کند پاسے دراز
خلق را تا زلب از غنچہ صبا ہم آمد | چون گل تازہ کہ غنچہ اش نتواں کرد باز
عیش کیں شود و طرب یک دو نفس بیش نماند | چہ کند عید بدردے کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدفِ تیرِ بلا | خود چو کج باخت بایشاں فلکِ عربدہ ساز

فارسی کے شوق کا نتیجہ تھا کہ دیوانِ حافظ سے گہری دلچسپی پیدا ہوئی، یہاں تک کہ اس سے فال لینا شروع کر دیا، ایک بار دیوان سے فال دیکھی کہ کالج کی قید سے کب رہائی ہوتی ہے، حافظ کے یہاں سے جواب ملا: وقت آنست کہ پدرود کنی زنداں را۔

فارسی سے ان کو جو تعلق تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے بخوبی ہوگا، ۱۹۰۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد فارسی کو یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کرنا چاہتے تھے، اس کی وجہ سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں اس اقدام کے خلاف ایک تجویز پیش ہوئی، تجویز کی تائید میں علامہ شبلیؒ نے ایک مدلل تقریر کی، اس میں انھوں نے معترضین کے ان اعتراضات کا کہ فارسی کلاسیکی زبان نہیں، اس میں تخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں اور نہ اس کے ادب میں علوم و فنون اور حقیقی شاعری ہے، ایسی خوبی سے رد کیا کہ لوگ حیران رہ گئے، مولانا نے بتایا کہ علوم و فنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں فارسی میں بھی موجود ہیں، فلسفہ، منطق اور علم طب کی مکمل تصانیف اس میں پائی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار ہے۔ پھر انھوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خود نوشت سوانح عمریوں کا ذکر کیا جن کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں، اس کے بعد مولانا نے فارسی کی فلسفیانہ شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا، ساتھ ہی مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے، اس سلسلہ میں مولانا نے ہفت بند کاشی کے اشعار جب اپنے مخصوص انداز میں پڑھے تو کانفرنس مجلسِ ماتم بن گئی۔

مولانا ہر موقع پر فارسی ہی میں شعر کہنا پسند کرتے تھے ان کے دیوان پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے علی گڑھ، حیدرآباد، قسطنطنیہ یہاں تک کہ جہاز مقدس میں بھی فارسی میں بے دریغ شعر کہے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ علی گڑھ کے ابتدائی قیام ہی کے زمانے میں دیوان کی ترتیب اور طباعت کا پختہ عزم کر چکے تھے۔

فارسی کے نادر مخطوطات سے مولانا شبلی کی گہری دلچسپی کا حال مکاتیب شبلی سے معلوم ہوتا ہے نادر مخطوطات کے علاوہ مصور نسخے، تصویریں، شبیہیں اور خوش نویسوں کے قطعے وغیرہ انھیں بہت عزیز تھے، اس سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صاحب سے اکثر خط و کتابت رہتی، چنانچہ ذخیرۂ حبیب گنج کی بعض نادر کتابیں مولانا شبلی ہی کی نشاندادہ ہیں، یہ مخطوطات اکثر و بیشتر فارسی ہی کے ہیں نادر کتابوں میں انھوں نے امیر خسرو کے اعجاز خسروی کے ایک ایسے نسخے کا پتہ دیا تھا جو حضرت امیر خسرو کی وفات کے دس سال کے بعد کا مکتوبہ تھا، نہایت صحیح اور سراپا محشی ہونے کے علاوہ اس میں لفظی رعایت کا نہایت درجہ اہتمام ہوا تھا۔

مولانا شبلی کی فارسی خدمات کے سلسلہ میں جو کتابیں قابل ذکر ہیں ان میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور شعر العجم ہے، یہ کتاب مولانا کی ناقدانہ بصیرت، شعر فہمی، دقیقہ سنجی، نکتہ رسی، جودت طبع، جمالیاتی حس اور کمال انشاپردازی کی مظہر ہے، یہ کتاب عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے مشرق و مغرب میں جہاں کہیں فارسی پڑھائی جاتی ہے وہاں شعر العجم کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی، فارسی میں ایران اور افغانستان دونوں ملکوں میں اس کے پانچوں حصے کے ترجمے ہوئے اور کم از کم دو بار چھپے، مدتوں سے ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کے نصاب میں شامل رہی ہے، مغرب میں اس کی مقبولیت کا اندازہ پروفیسر براؤن کی تحریروں سے ہو سکتا ہے، براؤن کی تاریخ ادبیات فارسی میں تقی شاعری

تبصرہ اسی کتاب سے من و عن لیا گیا ہے۔

اس کتاب کو جس قدر مقبولیت ہوئی اور مولانا شبلی کو جو شہرت حاصل ہوئی اس کا اندازہ شاید مولانا کو بھی نہ رہا ہوگا، اس کے پہلے دو تین حصوں کی تصنیف کو تقریباً ستر سال ہوئے، اس درمیان ستندی کا وافر مواد جمع ہوا جو مولانا کے دسترس میں نہ تھا لیکن اس کے باوجود اب تک کوئی کتاب ان موضوعات پر جن کا احاطہ شعرالعجم نے کیا ہے، شعرالعجم جیسی وجود میں نہیں آسکی ہے۔ مولانا شبلی کی یہ تصنیف ہنوز نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے اور باوجود وسائل کی کمی کے ایسی کتاب مرتب ہوئی جو ستر برس سے تاریخ شعر و ادب فارسی کے خطے کی تنہا حکمراں ہے، اور ابھی مستقبل قریب میں اس کے جواب کی کوئی توقع نظر نہیں آتی۔

شعرالعجم پانچ حصوں میں ہے، پہلے تین حصے باعتبار ادوار مرتب ہیں، ان میں ہر دور کے شعر کے خصائص اور منتخب اور نمایندہ شعراء کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرہ ہے، چوتھے اور پانچویں حصے شاعری کے اقسام اور تحول شعر کے مباحث کو حاوی ہیں،

پہلا حصہ دور متقدمین سے متعلق ہے جو فارسی شاعری کی ابتداء سے ساتویں صدی کے اواخر تک ہے اس کے مندرجات یہ ہیں؛

ا۔ شعر کی حقیقت، فارسی شاعری کی ابتداء۔

ب۔ شعرائے دور سامانیہ: رابعہ، رودکی، دقیقی، شہید بلخی وغیرہ۔

ج۔ شعرائے دور غزنویہ: عنصری، فرخی، فردوسی، اسدی، منوچہری۔

د۔ پانچویں اور چھٹی صدی کے شعراء، حکیم سنائی، عمر خیام، انوری، نظامی گنجوی۔

شاہنامہ کے بارے میں مولانا کے موضوعات سے ان کے انداز بحث کا قیاس ہوسکتا ہے:

شاہنامہ، زمانہ تصنیف، تاریخی آخذ، شاہنامہ کی تاریخی حیثیت، شاہنامہ کی خصوصیات شاعری

پہلی خصوصیت ، کمال قدرت زبان ۔

دوسری خصوصیت ، ایرانی تہذیب و تمدن کا مرقع ہے ۔

تیسری خصوصیت ، عشقیہ شاعری میں حد اعتدال کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔

چوتھی خصوصیت ، رزمیہ شاعری کے ساتھ بزمیہ کے اچھے نمونوں کا حامل ہے ۔

پانچویں خصوصیت ، واقعہ نگاری کے ایسے ایسے نمونے جن سے فارسی شاعری کا دامن خالی ہے ،

چھٹی خصوصیت ، جذبات انسانی کی مصوری کے اعلیٰ نمونے ۔

ساتویں خصوصیت ، اختصار اور زور کلام ۔

آٹھویں خصوصیت ، صنایع و بدایع ۔

نویں خصوصیت ، شاہنامہ کی زبان ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے شاہنامہ کا نہایت گہرا اور دقیق مطالعہ کیا ہے ۔ اسی طرح نظامی کی شاعری کے بارے میں مولانا کا تجزیہ نہایت دقیق، مفصل اور مدلل ہے ۔ انھوں نے اس کی شاعری پر حسبِ ذیل موضوعات کے تحت بحث کی ہے :

(۱) تمام انواعِ شاعری پر قدرت (۲) نظامی کی اولیات (۳) زورِ کلام (۴) قوت تخیل کا مصرف (۵) استعارات و تشبیہات بدیع (۶) فلسفیانہ شاعری (۷) جذباتِ انسانی کا بیان (۸) مناظر قدرت ، (۹) عشقیہ شاعری (۱۰) رزمیہ شاعری (۱۱) نظامی اور فردوسی کا موازنہ ۔

اگرچہ ان میں سے ہر ایک موضوع پر نہایت دقیق انداز میں بحث کی گئی ہے ، لیکن نظامی اور فردوسی کی شاعری پر بڑے فاضلانہ انداز میں محاکمہ کیا گیا ہے ، اور اس بحث میں جس طرح کی دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے اور جو طریقہ استدلال اختیار کیا ہے اس سے دو شاعروں کے درمیان موازنہ و محاکمہ کے اصول مستنبط ہو سکتے ہیں ۔

شعرالعجم کا دوسرا حصہ ساتویں صدی سے نویں صدی کے شعراء پر مشتمل ہے، اس حصہ میں اس دور کے نمائندہ شاعروں میں عطار، کمال اسماعیل، سعدی، خسرو، سلمان ساوجی، حافظ اور ابن یمین کی شاعری کا تجزیہ ہوا ہے، اسی دور کے ممتاز شاعر مولانا روم پر الگ رسالہ لکھنے کی وجہ سے یہاں ان کا تبصرہ شامل نہیں ہے، مندرجہ بالا شاعروں میں سعدی، خسرو اور حافظ کا تبصرہ خصوصیت سے قابل توجہ ہے، سعدی کی شاعری پر حسب ذیل موضوعات کے تحت بحث ہوئی ہے: آزادی، اظہار جذبات، مرثیے کی اصلاح، اخلاقی شاعری، باریک نکتے، قوت تخیل، طرز ادا، آخر میں ان کی غزل گوئی پر سیر حاصل بحث ملتی ہے، اگرچہ مولانا حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور ان کے کلام پر بڑی جامع بحث کی ہے اور اسی بنا پر مولانا شبلی کو سعدی پر تبصرہ کرنے میں تامل تھا، لیکن دوستوں کے اصرار پر لکھا تو ایسا لکھا کہ قارئین کو حیات سعدی سے بے نیاز کر دیا۔

امیر خسرو کی شاعری پر آج تک ایسی مفصل تنقید نہیں ہوسکی ہے، یہاں تک کہ ادھر امیر خسرو پر جو متعدد سیمینار ہوئے ان کی ساری بحثیں شعرالعجم سے بے نیاز نہیں کر سکتیں، اسی طرح امیر خسرو کے حالات و کلام پر وحید مرزا کی کتاب حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے، متعدد سیمینار کے مجموعی نتائج اس کتاب پر خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکے، امیر خسرو شاعری کی تینوں صنف یعنی قصیدہ، غزل اور مثنوی میں کمال پیدا کر کے وہ جامعیت حاصل کر چکے کہ فارسی میں اس کی مثال کم ملتی ہے، پھر خاص خاص موضوعات پر نظمیں لکھ کر شاعری پر جو اعتراض تھا اس کو رفع کر دیا، ان کی تشبیہات تقلید پرستی کی قید سے آزاد ہیں، ان کی تاریخی مثنویاں بہت اہم ہیں، لیکن خمسہ باوجود اپنی مقبولیت اور شہرت کے ان کی دوسری نظموں سے کچھ پست ہے، البتہ اس میں لیلیٰ مجنوں بہت زوردار مثنوی ہے اور یہ مثنوی یقیناً نظامی کی مثنوی سے کہیں بڑھ کر ہے، امیر خسرو غزل گوئی کے لحاظ سے بہت ممتاز درجے کے مالک ہیں ان کی غزل خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچ کر تیز ہوگئی ہے، تبصرہ کے ضمن میں جو اشعار منتخب ہوئے ہیں

ں سے بہتر انتخاب کا تصور نہیں ہو سکتا۔

خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری پر علامہ نے جس طرح تنقید کی ہے اور اس میں جو لطیف نکات
پیدا کئے ہیں، ان سے نقد و تبصرہ کے اصول مرتب ہو سکتے ہیں، مولانا کے خیال میں حافظ کی شاعری
کے مہات مضامین ان کا ذاتی سرمایہ نہیں بلکہ خیام کے ابر قلم کے رشحات ہیں، خواجہ کی شاعری کا
خصوصیات جن کی وجہ سے انھوں نے دنیا میں غلغلہ برپا کر رکھا ہے، ذوقی و وجدانی ہیں جن کا
دراک مذاق سلیم کر سکتا ہے، وجدانی کیفیات کی مولانا نے جس طرح تفسیر و توضیح کی ہے وہ دیکھنے
در پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، روانی و برجستگی اور صفائی کے لحاظ سے حافظ کی شاعری سعدی اور
خسرو سے بڑھ کر ہے، حافظ کی شاعری کا دوسرا وصف جوش بیان ہے، سعدی اور نظامی کے یہاں
جوش بیان کا پورا پورا زور ہے، لیکن وہ اوروں کے خیالات اور واردات ہیں، بخلاف اس کے
حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں وہ خود ان کے وارادات ہیں، اس لئے وہ ان کو ایسے جوش کے
ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے، خواجہ کے کلام کا تیسرا وصف رندی اور مستی کے
جذبہ کا غلبہ ہے، ان کے کلام میں یہ جذبہ جس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے، فارسی شاعری کی
ہزار سالہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، چوتھا وصف بدیع الاسلوبی ہے، اس کی توضیح کے لئے
مثالیں دی گئی ہیں ان سے صحیح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ جدت ادا کس کو کہتے ہیں، مثلاً معشوق کی
آنکھ کو سب مخمور، مست و سرشار کہتے ہیں، حافظ نے اسی خیال کو اس انداز سے بیان کیا ہے:

ہر کس کہ بدید چشم او گفت — کو محتسبے کہ مست گیرد

اس عنوان کے ذیل کے مزید اشعار کی تشریح کرتے وقت نئے نئے نکتے پیدا کئے ہیں،
بعد ازاں حافظ کی شاعری کی چند اور خصوصیات یعنی واردات عشق کا بیان، فلسفہ، فلسفۂ اخلاق،
روزمرہ محاورہ، خوش نوائی، تسلسل مضامین کی توضیح و تشریح کی ہے، اور ایسے نکات نکالے ہیں، جو

پڑھنے اور دیکھنے کے لائق ہیں، حافظ کے اشعار جو شعر العجم میں منتخب ہوئے ہیں، دراصل ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔

شعر العجم کا تیسرا حصہ فارسی شاعری کے دور آخر سے بحث کرتا ہے، اس دور میں مرکز ہندوستان تھا، اس اعتبار سے شعر العجم کا یہ حصہ سبک ہندی کے خصوصیات کی شرح ہے، اس سبک کے نمایندہ شاعر فغانی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب اور کلیم ہیں۔ اس دور کی حسب ذیل خصوصیات قابل ذکر ہیں:

(۱) غزل کی ترقی (۲) وقوع گوئی یا معاملہ بندی کی طرف عام رجحان (۳) فلسفہ کی آمیزش (۴) شان تغزل (۵) مثالیہ شاعری (۶) خیال بندی و مضمون آفرینی (۷) جدت اسلوب (۸) لفظی صنعت گری (۹) استعارات و تشبیہات میں جدت و نزاکت (۱۰) نئی تراکیب۔

اس دور کے جن شعراء کے بارے میں مولانا نے خصوصیت سے بحث کی ہے وہ عرفی اور نظیری ہیں، عرفی کے کلام کے یہ خصائص بیان ہوئے ہیں: زور کلام، نئی نئی تراکیب، جدت استعارات، مسلسل مضامین میں زور طبع و شور فصاحت و بلاغت، خودستائی و خودداری، مضمون آفرینی و نازک خیالی، جدت طرز ادا، ان اوصاف کی توضیح و تشریح کے بعد عرفی کی عشقیہ، فلسفیانہ اور اخلاقی شاعری پر بحث کی ہے۔

نظیری کے کلام کے حسب ذیل خصوصیات بتائے گئے ہیں:

نئے الفاظ و تراکیب، وجدانی امور کی تجسیم، واردات و کیفیات کی تشبیہ محسوسات سے، صحیح اور سچی واردات و کیفیات کا بیان، فلسفہ خیال، طرز ادا کی جدت، تسلسل مضامین، روزمرہ و محاورہ، ان اوصاف کے ضمن میں نظیری کے سیکڑوں اشعار کی ایسی تشریح ملتی ہے کہ اس سے شاعری کے لطیف نکات سامنے آتے ہیں۔

شعرالعجم کا چوتھا حصہ حسب ذیل تین باب پر مشتمل ہے :
(۱) شاعری کی حقیقت و ماہیت (۲) فارسی شاعری کی عام تاریخ اور تمدن اور دیگر اسباب کا شاعری پر اثر (۳) تقریظ و تنقید۔

باب اول کے موضوعات یہ ہیں : شاعری کی حقیقت ، شاعری کے اصل عناصر ، محاکات یعنی تخییل ، محاکات کی تکمیل کن چیزوں سے ہوتی ہے ، تخییل کی تفصیلی بحث ، تخییل کا مواد تخییل کی بے اعتدالی ، تشبیہ و استعارہ ، جدت اور لطف ادا ، حسن الفاظ ، الفاظ کی مفصل بحث ، جملوں کے اجزاء کی ترکیب ، واقعیت اور اصلیت ، شعر کیوں اثر کرتا ہے ، شاعری کا استعمال ، شعر و شاعری کی عظمت ، ان امور پر جس بالغ نظری سے گفتگو کی گئی ہے اس کی مثال فارسی اور اردو میں نہیں نظر آتی ۔

باب دوم میں فارسی شاعری کی تاریخ ۔ تدریجی رفتار ترقی ، فارسی شاعری کی خصوصیات ، فارسی شاعری پر جن جن امور کا اثر ہے اُن میں سے قابل ذکر یہ ہیں : عربی شاعری ، نظام حکومت ، شخصی و خود مختارانہ طرز حکومت ، فوجی زندگی ، اختلاف معاشرت ، آب و ہوا و مناظر قدرت ۔

ان متنوع موضوعات پر جس طرح بحث کی گئی ہے اس سے مولانا کے مطالعہ کی وسعت اور غیر معمولی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے ، ہر موضوع کی گفتگو ایسی مختصر مگر جامع ہے کہ اسے پھیلا کر ہر ایک پر ایک رسالہ تیار ہو سکتا ہے ، گویا یہ حصہ کئی مجلدات کے مواد کا حامل ہے ۔

باب سوم میں فارسی شاعری پر تفصیلی ریویو اس طرح کیا گیا ہے کہ پہلے شاعری کے انواع کا بیان ہے ، پھر مثنوی کا ذکر ہوا ہے ، اور اس کے بعد شاہنامہ پر مفصل و مدلل گفتگو کی ہے ، پہلی جلد میں شاہنامہ کے خصوصیات بیان ہوئے تھے ، یہاں ان پر مزید تفصیل کے ساتھ ان موضوعات کے تحت تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے ، شاہنامہ کی تاریخی حیثیت ، ایران کی انسائیکلوپیڈیا ،

شاہنامہ اور نظام حکومت، تہذیب و تمدن، فن جنگ، ضمنی اور مفید معلومات، شاہنامہ اور کیرکٹر، حکمت و اخلاق، موعظت، سیاست، آزادیٔ رائے، عورتوں کا درجہ، شاہنامہ اور مذہب، شاہنامہ اور فن بلاغت، جذبات انسانی۔

شاہنامہ پر ایسی مفصل اور مدلل گفتگو اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔ اگرچہ ایران میں بنیاد شاہنامہ کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم ہے جو ہر سال شاہنامے پر سیمینار کراتا ہے، اور شاہنامے سے متعلق مواد بھی فراہم کرتا ہے، لیکن اس ادارے کی جانب سے شاہنامہ پر اب تک کوئی ایسا تبصرہ شایع نہیں ہوا ہے جو شعرالعجم سے بے نیاز کردے۔ اور اگر اس طویل مدت کو ذہن میں رکھا جائے جو شعرالعجم کی تصنیف اور ہمارے زمانے میں ہے تو اس کتاب کی عظمت کئی چند ہو جاتی ہے، تقریباً پون صدی کے بعد بھی متعدد دانشوروں کی مجموعی کوشش کا قدم تنقید شاہنامہ کے اعتبار سے شعرالعجم سے آگے نہیں بڑھ سکا، جس طرح مولانا شبلی کا انتقاد شاعری بے نظیر ہے، اسی طرح ہندوستان کے عظیم محقق پروفیسر محمود شیرانی کے "فردوسی پر چار مقالے" فردوسی اور شاہنامہ پر تحقیق کی نسبت سے اپنا جواب نہیں رکھتے، یہ مقالے بھی افغانستان میں فارسی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

شعرالعجم کا پانچواں حصہ دراصل چوتھے کا تتمہ ہے، اس میں قصیدہ، عشقیہ شاعری اور غزل، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، فلسفیانہ شاعری پر تفصیلی تبصرہ و تنقید ہے، ان موضوعات پر جس تبحر علمی سے بحث کی گئی ہے اس کا کسی قدر اندازہ موضوعات کی تفصیل سے ہو سکتا ہے۔

قصیدہ: قصیدہ گوئی کے دور، دور قدما کی خصوصیت، انوری کا اضافہ و تبدیلی، ظہیر فاریابی، دقت آفرینی و مضمون بندی، اس کے اضافات، خاقانی کی خصوصیات، ایجاد طرز خاص، کمال اسمٰعیل پر قدما کا خاتمہ، حملۂ تاتار کے بعد قصیدہ گوئی کا زوال، صفویہ اور قصیدہ گوئی میں نئی زندگی، حسین ثنائی، محتشم کاشی، سنجر کاشی، عرفی اور قدسی مشہدی، تکلف اور عیش پرستی کے اثر سے قصیدہ غزل سے نزدیک

مشتاق اصفہانی، قاآنی کی خصوصیات، ہندوستان اور ایران، مرزا غالب، اجتہاد اور بدعت۔

قصائد سے کیا کام لیا گیا، قصیدہ کا موضوع اور شرائط، فارسی اور عربی قصائد کا موازنہ، شعرائے فارس کا فخریہ، قصیدہ شاعرانہ مضامین کا سب سے بڑا میدان، فارسی قصیدہ گوئی نے خوشامد پرستی اور ذلت پرستی نہیں پیدا کی، قصیدہ گوئی بیکار نہیں گئی۔

عشقیہ شاعری: غزل کا آغاز، رودکی، دقیقی، تغزل، غزل اور تصوف، حکیم سنائی، اوحدی، عطار، مولانا روم، عراقی، سعدی اور غزل، سلمان اور خواجو، حافظ کی شاعری اس کے متعدد نکات، اس کے تغزل کی ہمہ گیری، غزل کا دور جدید، بابا فغانی اور اس کے پیرو، عرفی و نظیری، محتشم کاشی و شفائی، شرف جہاں، علی قلی میلی، ولی دشت بیاضی، وحشی، طرز فغانی میں تبدیلی، ظہوری، جلال اسیر، طالب آملی، کلیم، ناصر علی، بیدل۔

غزل: ایران میں غزل گوئی کے اسباب، ترکوں کا اثر، حملۂ تاتار اور تصوف، ایران اور عرب کا تغزل، فارسی غزل کے معائب و محاسن، تصوف اور غزل، فارسی تغزل اور واردات حسن و عشق، معشوق و محبوب اور دوسرے موضوعات غزل وغیرہ وغیرہ۔

صوفیانہ شاعری: تصوف نے فارسی شاعری میں روح پھونک دی، سلطان ابوسعید، حکیم سنائی کی صوفیانہ شاعری، حدیقہ و سیر العباد، اوحدی اصفہانی و جام جم، عطار اور ان کی صوفیانہ شاعری، مسئلۂ وحدت الوجود، صوفیانہ شاعری کی ترقی کے اسباب، اخلاق، فلسفہ اور تصوف، عراقی، محمود شبستری، شاہ نعمت اللہ ولی، مغربی، جامی، صوفیانہ شاعری کا زوال، فارسی شاعری میں تصوف کا سرمایہ، شریعت اور تصوف وغیرہ۔

اخلاقی شاعری: اخلاقی شاعری کا آغاز اور اس کی ترقی کے اسباب، اخلاقی مثنویاں، اخلاقی تعلیم، بادشاہوں کے مقابلہ میں طریقہ اصلاح، ان کے مواجہہ میں حق گوئی، شیخ سعدی اور بوستاں،

میر صیفی، نظامی، ابن یمین، عمر خیام، قناعت و توکل، دولت و امارت کی بے ثباتی، عزت نفس اور ترک احسان پذیری۔

فلسفیانہ شاعری: فلسفیانہ شاعری کیا ہے، ناصر خسرو نے اس شاعری کی ابتدا کی، نظامی نے ترقی دی بعد ازاں زوال، دور صفویہ میں پھر ترقی، فلسفیانہ شاعری کے موضوعات، حکیم کو دین و دنیا سے غرض نہیں خود غرضی نامقبولیت کا سبب، فقر، دولتمندی کی تحقیر، اخلاق رذیلہ سے اجتناب، مسئلہ جبر، عالم میں شر نہیں تقلید سے نجات، جوہر و عرض، حقیقت رسی اور اس کے مدارج، ترک خودی اور اپنی بے حقیقتی، اتحاد مذہب وغیرہ وغیرہ۔

شعر العجم کا پانچواں حصہ خود مولانا شبلی کے مسودات میں بے ترتیب پڑا تھا، بعد میں اس کو جوں کا توں شایع کر دیا گیا، یہ مسودہ نظر ثانی کا محتاج تھا، اس لئے کہ بعض مواد بے ترتیب ہے، کہیں مضامین میں تکرار ہے، بعض مقامات تفصیل طلب ہیں۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس جلد کے دیباچہ میں لکھا ہے: شعر العجم کے پانچوں حصوں کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اس سے اس علمی شاہکار کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ ہوا ہوگا، اور اسی کی بنا پر مولانا کی شخصیت بین الاقوامی اہمیت و شہرت کی مالک ہے، اسی وجہ سے ہندوستان کا کوئی نقاد یا مورخ ان کا مدمقابل نہیں ہو سکتا، ایران میں بھی ان کے مرتبے کے چند ہی دانشور ہوں گے۔

شعر العجم کے قابل توجہ خصایص حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ کتاب فارسی شاعری کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کی اہم دستاویز ہے،

(۲) یہ فارسی اصناف سخن کی جامع تفسیر و تنقید ہے۔

(۳) یہ نقد الشعر کی اہم تصنیف ہے، اس کے مطالعے سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(. اچھے اور برے شعر میں شناخت کے اصول.

ب . شاعری کے محرکات کا علم .

ج . بڑے شاعروں کے امتیازات

د . دو شاعروں کے درمیان محاکمہ کے اصول .

ہ . خیال ، جذبات و واردات کی لفظی تصویر .

و . شعری اصطلاحات کا ٹھیک ٹھیک تعین .

ز . شعر کی ایسی تفسیر و توضیح جس سے اندازہ ہو جائے کہ شاعر کے دل میں خیالات کس طرح پیدا ہوئے .

اس کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس سے نقد الشعر کا ملکہ پیدا ہو سکتا ہے .

۴ . اس کتاب کا طرز عالمانہ اور دلنشین ہے ، اردو کے اعلیٰ نصاب کے شمول میں اس کے طرز کو دخل ہے ، امیر خسرو نے فارسی طرز کی توضیح و تشریح کے ضمن میں ایک طرز طرز علماء بتایا ہے ، اور اس کی دو نمائندہ کتابیں قرار دی ہیں :

(۱) امام غزالی کی کیمیائے سعادت (۲) امام غزالی کی احیاے علوم الدین کا وہ ترجمہ جو بدر جاجرمی نے التمش کے وزیر نظام الملک جنیدی کی فرمائش پر کیا تھا ، میرے خیال میں اردو میں شعر العجم کے طرز کو طرز علماء قرار دینا چاہئے .

(۵) **مجموعہ انتخاب اشعار** ، شعر العجم میں فارسی کے ہزاروں اشعار کا انتخاب ہوا ہے ، یہ انتخاب ایسا عمدہ ہے کہ اس لحاظ سے بڑے بڑے انتخاب اس کے مرتبے کے نہیں ، دراصل شعر کے انتخاب میں ذوق سخن اور مذاق شاعری کا بڑا دخل ہے ، اچھے انتخاب کے مجموعوں میں دو باتیں قابل توجہ ہوتی ہیں :

اول یہ کہ اس سے مرتب کے اعلیٰ مذاق سخن کا پتہ چلتا ہے ، دوم اچھے انتخابات مذاق شاعری کے بدلنے میں بہت مفید ہوتے ہیں ، انتخاب اشعار کے سلسلہ میں خود مولانا شبلی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اپنے ایک مضمون میں جو علامہ غلام علی آزاد بلگرامی پر تھا ' اس طرح کرتے ہیں :

"خزانۂ عامرہ" میں بعض جگہ دقیق علمی مباحث بیان کئے ہیں جس سے ان کی علمی وقت نظر کا ثبوت فراہم ہوتا ہے یہ سب ہے لیکن افسوس صد افسوس ہے کہ جو چیز تذکرے کی جان ہے وہی نہیں، ایران میں تذکرے سے مقصود عمدہ اشعار کا انتخاب ہوتا تھا، چنانچہ ابتدائی تذکرے صرف انتخابات ہیں، میرزا صائب کا انتخاب آج بھی موجود ہے جس میں کسی شاعر کا حال بجائے نام بھی نہیں، صرف اشعار ہی اشعار ہیں، لیکن انتخاب اس درجہ کا ہے کہ ہزاروں تذکرے اس پر نثار کر دئے جائیں، والہ داغستانی اور آتشکدۂ آذر میں گو حالات بھی ہیں لیکن اصل خصوصیت موجود ہے، بخلاف ان کے خزانۂ عامرہ بلکہ آزاد کے تینوں تذکرے گویا لغو اشعار کا مجموعہ ہیں، تمام کتاب میں مشکل سے ایک آدھ شعر اچھا نکل آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں تمام ہندوستان کا مذاق شاعری سخت خراب ہو چکا تھا، مضمون آفرینی اور جھوٹی خیال بندی پر لوگ جان دیتے تھے، زبان کی دل آویزی، لطف بندش، لطافت و نزاکت سے کسی کو غرض نہیں رہی تھی، چنانچہ اس عہد کے جتنے تذکرے ہیں سب اسی مرض میں مبتلا ہیں، خان آرزو کا مجمع النفائس اس عہد کا عمدہ ترین تذکرہ خیال کیا جاتا ہے اس کی بھی یہی حالت ہے، یہ بدمذاقی آخر تک قایم رہی، یہاں تک کہ مرزا مظہر جان جاناں نے ریزۂ جواہر انتخاب کیا، میں نے ثقات دہلی سے سنا ہے کہ مرزا غالب وغیرہ کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق صحیح جو دوبارہ قائم ہوا وہ اسی انتخاب نے قائم کیا ؛

آپ علامہ کی اس رائے سے ممکن ہے پوری طرح متفق نہ ہوں کہ تذکروں کا مقصد صرف مذاق سخن کی

---

[1] آج کل تذکروں کی مدد سے تاریخ ادب مرتب ہوتی ہے اس لئے کہ انہی کے ذریعہ شعراء کے حالات معلوم ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کچھ تذکرے ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اشعار سے یکسر خالی ہیں، بلکہ اول اول ان میں اشعار شامل تھے، اور اس سے ان کا حجم کافی بڑھ گیا، اس لئے بعض مرتبین نے ان سے اشعار نکال ڈالے، نیز کہ ان کا اولین مقصد حالات شعراء کا محفوظ کرنا تھا، اس سلسلہ میں اردو تذکرے (باقی صفحہ ۲۴ پر)

ورش ہے، لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اچھے انتخاب مذاق شاعری کے قائم کرنے میں سودمند
رتے ہیں، شعرالعجم کے منتخب اشعار فارسی کے صحیح مذاق شعری کے پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

اس سے قبل شعرالعجم کی عظمت اور غیر معمولی مقبولیت و شہرت کا ذکر آچکا ہے، لیکن اگر آپ
ہند امور کو پیش نظر رکھیں تو اس سے مولانا شبلی کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے، مولانا نے آج سے پہلے
مدی پہلے شعرالعجم کی بنیاد ڈالی، اس وقت مواد کی بے حد کمی تھی، سوائے ہندوستان کے اور کسی جگہ کی
ہپی ہوئی کتابیں بہت ہی کم دستیاب تھیں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایران، افغانستان اور ماوراءالنہر
غیرہ میں چھاپے کے وسائل کی بڑی کمی تھی، کتابیں کہاں سے ملتیں، لیکن آج فارسی کی ہزاروں کتابیں
یران و افغانستان میں چھپ کر عام ہو چکی ہیں، سیکڑوں شعراء کے دیوان کے انتقادی متن چھپ چکے
یں، فارسی کے تذکرے اور تاریخیں تعلیقات و حواشی کے ساتھ منظر عام پر آچکی ہیں، فارسی کی اہم کتابیں
چھپ چکی ہیں، بہت کم صوفیانہ اور عارفانہ ادب بھی چھپنے سے باقی نہیں رہ گیا ہے، خاص لغات
بھی چھپ چکے ہیں، ان کے علاوہ ایران، افغانستان، تاجیکستان سے علمی و ادبی رابطے قائم ہو چکے
ہیں، فارسی ادب کی اہم شخصیات پر سیمینار کے الگ الگ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان اہم شخصیات کے
نام سے الگ الگ ادارے قائم ہیں جو ان کی کتابیں چھاپتے ہیں اور ان پر ضروری مواد فراہم کرتے
ہیں، سیکڑوں مصنفین و شعراء پر الگ الگ مقالے لکھے جا رہے ہیں، غرض یہ سارا مواد جس پر
تاریخ شعر و ادب کا انحصار ہوتا ہے شعرالعجم کی تصنیف کے زمانے میں ناپید تھا، لیکن باوجود وسائل کی

(بقیہ صفحہ ۲۳) قابل ذکر ہیں، ایک دسویں صدی ہجری کا عام تذکرہ خلاصۃ الاشعار ہے جس کی پہلی روایت میں کئی
لاکھ شعر شامل ہوں گے، لیکن ایک روایت ایسی بھی ملتی ہے جو اشعار سے یکسر خالی ہے، دوسرا تذکرہ خوان خلیل
تالیف ابراہیم خلیل عظیم آبادی ہے، یہ چند مثنوی گو شعراء کا تذکرہ ہے، لیکن اس کا ایک ایسا نسخہ بھی بانکی پور پٹنہ
لائبریری میں موجود ہے، جس میں اشعار کا کوئی انتخاب نہیں ہے۔

ہے کہ مولانا شبلی کی شعر العجم کا جواب نہ مشرق سے بن پڑا اور نہ مغرب سے۔

اب میں دو بیرونی دانشوروں کی شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے شعر العجم سے استفادہ کیا تھا، ان میں ایک ایرانی استاذ پروفیسر سعید نفیسی ہیں اور دوسرے انگلستان کے مشہور و معروف مورخ پروفیسر براؤن، پروفیسر نفیسی لکھتے ہیں:

"اس سودمند اور پُر مغز کتاب (شعر العجم) کا امتیاز یہ ہے کہ یہ پہلا مجموعہ ہے کہ جس کے ذریعہ ایک دانا اور روشن بین شخص نے فارسی ادب کے خزانۂ جاودانی کے گراں قدر جواہر پاروں کے تجزیہ و تحلیل کی کوشش کی ہے ... اور یہ کتاب شبلی کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی، اہل ایران کی نظر میں جس چیز سے اس کتاب کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے یہ ہے کہ اس جاودانی کتاب کے محترم مؤلف نے اپنے ہر بیان میں نہایت واضح طور پر فارسی زبان اور اس کے شاعروں سے نہ صرف اپنی محبت، بلکہ اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔

جو حضرات ادب فارسی کی تحقیق و تدقیق سے سروکار رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کے دشوار گذار مرحلوں میں اسی کتاب سے صحیح رہنمائی ملے گی، شبلی نے اس کتاب میں نقادی اور موشگافی میں استادانہ مہارت دکھائی اور در حقیقت یہ نہایت حیرت انگیز امر ہے کہ ایران سے دور ایک ایسا شخص جس نے سرزمین ایران پر کبھی قدم نہ رکھا ہو اور جو اہل ایران سے کسی طرح کا اختلاط نہ رکھتا ہو، وہ اس زبان کے اسرار سے ایسا آشنا ہو اور اس زبان و ادب کے رموز و دقائق کے بارے میں اس کی رائے ایسی صائب ہو۔"

پروفیسر براؤن شعر العجم سے بہت متاثر تھے، چنانچہ امیر خسرو، سلمان ساوجی اور حافظ کے سلسلے کا مواد شعر العجم سے حاصل کیا ہے، انھوں نے مولانا شبلی کی اس کتاب کی تعریف کا حق ادا کر دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"جو لوگ اردو جانتے ہیں ... [illegible]

شبلی نعمانی مرحوم کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب علی گڑھ میں [illegible]
میں چھپی ہے اور اس میں فردوسی سے لے کر حافظ تک کے تقریباً بیس[20] فارسی شاعروں کے کلام پر
ناقدانہ تبصرہ ہے۔"

"دو ہندوستانی دانشوروں کی دو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی طرف توجہ منعطف کرانا ہے۔ ان میں سے
ایک انگریزی میں اور دوسری اردو میں ہے۔ دوسری تقریباً بیس[20] ممتاز فارسی شعراء کے کلام کا ایک
قابل قدر تنقیدی مجموعہ ہے، جس کا عنوان شعر العجم اور جس کے مصنف شبلی نعمانی ہیں۔ یہ ۱۰-۱۳۲۴ھ
۷-۱۹۰۶ میں مرتب اور علی گڑھ میں طبع ہوئی۔"

"بحیثیت مجموعی عمدہ ترین اور مکمل ترین تنقیدی مطالعہ جس سے میں روشناس ہوں، وہ
شبلی نعمانی کی فارسی شاعری پر اردو تصنیف شعر العجم ہے، مجھے احساس ہے کہ میرے لئے اس سے بہتر
اور کوئی صورت نہیں کہ بہر حال میں اس کتاب کے اس حصہ کا خلاصہ اپنی کتاب میں شامل کر لوں جو شاعر
(حافظ شیرازی) کی زندگی، اس کے ذاتی حالات سے متعلق چند واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے تعلقات
اپنے معاصرین سے جو اس کے اشعار سے حاصل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ان مآخذ کی نشاندہی بھی کر دوں جن کی
طرف فاضل مؤلف نے اشارہ کیا ہے، ان مآخذ میں وہ خاص طور پر حبیب السیر مؤلفہ خواند میر اور میخانہ
تالیف عبد النبی فخر الزمانی (مرتبہ ۱۰۳۶/ ۲۷-۱۶۲۶ بہ عہد جہانگیری) کا ذکر کرتے ہیں، مگر اس
آخری کتاب کا کوئی نسخہ میرے پیش نظر نہیں۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی ایک ہی زمانے میں اپنی اپنی کتابیں مرتب
کر رہے تھے، مگر براؤن کا مقصد ایران کی ادبی و علمی تاریخ نگاری ہے اس میں شعر کے علاوہ علم و ادب کے
تمام شعبوں کے دانشوروں کا تذکرہ شامل ہے، اس کے برخلاف شعر العجم کا موضوع فارسی شاعری ہے
اس بنا پر یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کے تتمہ کا کام کر سکتی ہیں۔ (باقی)

سیرتِ نبویؐ کی ایک اہم کتاب

الشفا پر ایک نظر

از ضیاء الدین اصلاحی

الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ مشہور مالکی عالم قاضی عیاض بن موسیٰ (م ۵۴۴ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، قاضی عیاض کا وطن اندلس کا مشہور شہر سبتہ تھا، وہ دینی علوم تفسیر، حدیث اور فقہ و خلاف کی طرح نحو و لغت، کلامِ عرب، انساب اور ایام و وقائع میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، اپنے وطن سبتہ کے علاوہ غرناطہ کے بھی مدتوں قاضی رہے،

مالکیہ میں علامہ ابن عبد البر (م ۴۶۳ھ) سب سے ممتاز شارحِ حدیث سمجھے گئے ہیں[1] لیکن قاضی عیاض کا پایہ بھی اس حیثیت سے کم نہ تھا، ان کی تصنیف اکمال المعلم صحیح مسلم کی مشہور و معتبر شرح ہے، اس سے متاخرین نے بڑا استفادہ کیا ہے، امام نووی (م ۶۷۶ھ) کی بےنظیر شرح مسلم میں بھی اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قاضی عیاض کی دوسری تصنیفات بھی مفید اور مقبول ہیں، مگر الشفا ان کی سب سے اہم بالشان کتاب ہے، عربی میں سیرتِ نبویؐ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ اور زاد المعاد ابن قیم (م ۷۵۱ھ) اپنے مضامین کی نوعیت، ندرت، اثر انگیزی اور دلنشینی وغیرہ کے اعتبار سے خاص طور پر بڑی اہم ہیں، ان دونوں کی اہمیت اور بلند پایگی میں کلام نہیں مگر

[illegible]

کتاب الشفا کو زمانی تقدم کا شرف حاصل ہے ابن فرحون مالکی (م ۷۹۹ھ) لکھتے ہیں

"مصنف کی انفرادیت، جدت اور سبقت و تقدم مسلم ہے، لوگوں نے اس کتاب کی نقل و روایت کر کے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے، اور شرق و غرب ہر جگہ اس کا غلغلہ بلند ہے"[1]

حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) کا بیان ہے:-

"یہ نہایت بیش قیمت اور مفید کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی"[2]

کتاب الشفا کی اہمیت اور خصوصیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ مسلمانوں کے ہر طبقہ و مسلک میں مقبول اور پسندیدہ رہی ہے، میرزا محمد باقر موسوی (المولود ۱۲۲۶ھ) لکھتے ہیں:-

"ہمارے اصحاب یعنی فرقہ امامیہ کے لوگوں نے بھی اس کے بکثرت اقتباسات نقل کئے ہیں اور حقیقت اس میں بیشمار فوائد، بلند تحقیقات اور رسول اللہ کی ولادت سے وفات تک کے حالات و واقعات کے متعلق حدیثیں شامل ہیں، مصنف نے اس میں اکابر شیوخ سے روایتیں نقل کی ہیں"[3]

اس کتاب کی اہمیت و عظمت اور خصوصیات کی بنا پر اس مضمون میں اس کے محاسن ذکر کئے جاتے ہیں۔

کتاب الشفا کئی بار چھپ چکی ہے، علیحدہ بھی اور اپنی بعض شرحوں کے ساتھ بھی، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں اس کے دو قلمی نسخے اور احمد شہاب الدین خفاجی مصری (م ۸۶۶ھ) کی شرح نسیم

---

[1] الدیباج المذہب ص ۱۰۱ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۵۲ [3] روضات الجنات [illegible]

ساتھ چھپا ہوا اڈیشن بھی موجود ہے، یہ شفا کی اہم اور مشہور شرح ہے، جو چار جلدوں میں آستانہ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ شرح عام طور پر لوگوں کی دسترس میں ہے، اس لئے اس مضمون میں اسی کے حوالے دئے گئے ہیں، کتاب الشفا کسی کی فرمائش پر تحریر کی گئی ہے، قاضی عیاض تمہید میں لکھتے ہیں :-

"تم نے ایک ایسا مجموعہ مرتب کرنے کے لئے بار بار اصرار کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت پر مشتمل ہو اور اس میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ لوگوں پر آپ کا کیا ادب و احترام لازمی اور ضروری ہے، اور جو لوگ آپ کی عظمت و توقیر میں کمی اور کوتاہی کریں ان کے بارے میں کیا حکم ہے، ایسے لوگوں کے متعلق امت کے اسلاف اور ہمارے ائمہ و اکابر کا کیا طرز عمل رہا ہے، یہ بڑا دقت طلب اور مشکل کام ہے، اگر فکر صحیح اور عقل سلیم کی رہبری اور توفیق الٰہی شامل حال نہ ہو تو لغزش اور خطا کا بڑا امکان و اندیشہ ہے، لیکن چونکہ اس سے برکت، ثواب اور انعام کی امید ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں جو اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ خصائل جمع ہو گئے تھے وہ کسی بھی مخلوق کے اندر نہیں پائے جاتے اس لئے ان کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بلاشبہ ان سے واقفیت کے بغیر اللہ کی اطاعت و بندگی کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا جو تمام حقوق کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور مقدم ہے، علاوہ ازیں اللہ نے اہل علم اور اصحاب کتاب سے عہد لیا ہے کہ وہ اس کی کتاب کی باتوں کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں گے، حدیثوں میں بھی کتمان علم پر شدید وعیدیں بیان کی گئی ہیں، اس لئے میں نے کچھ واضح نکات تحریر کئے ہیں"[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ الشفا بڑے نیک جذبہ اور حصول ثواب کی خاطر لکھی گئی ہے،

---

[1] [illegible] ص ۴۲، ۴۳

مصنف کتاب کے آخر میں رقمطراز ہیں :

"اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کوشش کو قبول فرمائے، اگر اس میں ریا و تصنع کا کچھ بھی شائبہ ہو تو اس کو معاف کرے اور اپنے لطف سے ہم کو بخش دے، ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت بیان کرنے کے لیے اپنا خواب و خور حرام کر دیا تھا، آپ کے فضائل و محاسن کا تتبع کرنے اور آپ کے خصائص و امتیازات کو ظاہر کرنے کیلئے اپنے جسم و جان کے آرام کا کوئی خیال نہ رکھا تھا، خداوندا تو ہم کو جہنم سے بچا اور ان لوگوں میں شامل کر جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر سے ہٹائے نہ جائیں گے۔ تو اس کتاب کو ہمارے اور ان لوگوں کے لیے جو اس کی تحریر کی تحریک کرتے رہے ہیں اس دن کے لیے وسیلہ و ذخیرہ بنا جس دن ہر نفس کے سامنے اس کا عمل خیر موجود ہوگا، اس کو اپنی خوشنودی اور اجر و ثواب کا ذریعہ بنا، اس کی بدولت ہم کو اپنے پیغمبر اور اس کی جماعت کے اس زمرۂ سابقین و اولین میں داخل فرما جن کو قیامت کے روز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حاصل ہوگی، ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہم کو اس کی جمع و تالیف کی توفیق دی اور ایسی دعا سے اس کی پناہ مانگتے ہیں جو مسموع نہ ہو، ایسے علم و عمل سے بھی پناہ مانگتے ہیں، جو مفید اور مقبول نہ ہو، اے اللہ تو ہمارے کافی اور بہترین کارساز ہے تیرا بے پایاں درود و سلام ہو۔ ہمارے آقا خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تمام اصحاب پر۔" (ج ۲ ص ۲۱۰ تا ۲۲۲)

کتاب الشفا سیرت کی عام کتابوں سے مختلف انداز میں لکھی گئی ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت، آپ کی معجزانہ سیرت و شخصیت، بلند اوصاف و محامد، پاکیزہ اخلاق و عادات کو پیش کر کے دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام محاسن و کمالات کا

مستثنیٰ اور ہر قسم کے نقائص و عیوب سے پاک تھے، اس لیے آپ ہی کی ذاتِ گرامی تمام انسانوں
کے لیے قابلِ اتباع اور لائقِ تقلید ہے، اور آپ کے لوگوں پر گوناگوں حقوق عائد ہوتے ہیں،
جو لوگ ان حقوق کی ادائیگی میں کمی اور کوتاہی کرتے ہیں وہ ہر طرح کی دنیوی اور اخروی
سزا کے مستحق ہیں، ان مباحث کو قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے،
اور آیات و احادیث کی تشریح و توضیح کے لیے سلف کے اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں، یہاں
کتاب کے مضامین کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ ناظرین خود اندازہ کر لیں کہ اس کی
نوعیت سیرت کی عام کتابوں سے مختلف ہے۔

کتاب کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعریف و توصیف
کی تفصیل درج ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے، اس حصہ میں چار ابواب ہیں اور ہر ہر باب میں
کئی کئی فصلیں ہیں، پہلے باب میں آپ کی شان میں خدا کی ثنا و تعریف نقل کی گئی ہے اور
اس کے نزدیک آپ کا درجہ و مرتبہ واضح کیا گیا ہے، دوسرے باب میں اس کا ذکر ہے کہ اللہ نے
آپ کو تمام محاسن میں کامل بنایا تھا، اور آپ کی ذات میں دینی و دنیوی تمام فضائل و کمالات
جمع کر دیئے تھے، تیسرے باب میں وہ صحیح اور مشہور حدیثیں جمع کی گئی ہیں، جن میں آپؐ کی
جلالتِ قدر و منزلت اور دونوں جہان میں آپ کی مخصوص فضیلت و کرامت کا ذکر ہے،
چوتھا باب معجزات پر مشتمل ہے، ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوناگوں خصوصیات
و کمالات کا پتہ چلتا ہے،

دوسرے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حقوق کا ذکر ہے، جو مخلوق پر عائد
ہوتے ہیں، اس کے اندر بھی چار باب ہیں، اور ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں،
پہلے باب میں آپ پر ایمان لانے کو فرض اور آپ کی اطاعت و اتباع کو واجب بتایا گیا ہے،

دوسرے باب میں آپ کی محبت وخیر خواہی کے لازم اور ضروری ہونے کا بیان ہے، تیسرے باب میں آپ کی تعظیم وتوقیر کو ضروری قرار دیا گیا ہے، چوتھے باب میں آپ پر صلوٰۃ وسلام کا حکم اس کی فرضیت اور فضیلت کا ذکر ہے،

تیسرے حصہ میں ان امور کا ذکر ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ناروا اور نامناسب ہیں، اس میں اُن تمام بشری اوصاف وعوارض کا ذکر بھی ہے جن کی نسبت آپ کی جانب صحیح ہے، اور جن کی نسبت غیر صحیح بلکہ ممتنع ومحال ہے، مصنف کے خیال میں یہ حصہ بڑا اہم اور معرکۃ الآراء ہے، اس کو انھوں نے دو ابواب میں تحریر کیا ہے، پہلے باب میں آپ کے دینی امتیازات عصمت وغیرہ پر بحث ہے، اور دوسرے میں ان دنیوی احوال اور بشری عوارض کا ذکر ہے جو آپ کو پیش آئے۔

چوتھے حصہ میں آپ پر سب وشتم کے احکام بیان ہوئے ہیں، یہ بھی دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے میں اس کا ذکر ہے کہ کون سی باتیں آپ کے سب وشتم میں داخل ہیں اور کن باتوں سے آپ کی تنقیص ہوتی ہے، دوسرے باب میں آپ سے عداوت رکھنے والے، آپ کو اذیت دینے والے اور آپ کی مذمت کرنے والے کا حکم اس کی سزا، اس کی توبہ، اس کی نماز جنازہ، اور اس کی وراثت وغیرہ کے مسائل کا ذکر ہے، اسی باب کے آخر میں خدا، ملائکہ آسمانی کتابوں، نبیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آل واولاد اور صحابۂ کرام کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں،

کتاب کی قدر وقیمت اور مصنف کی محنت اور دقت نظر کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے بعض مباحث ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

رسول اللہ کی کاملیت وجامعیت | انسان کے اندر جلال وکمال کے اوصاف دو طرح کے ہوتے ہیں

ایک کو ہم ضروری محض سے تعبیر کرتے ہیں، یہ دنیوی اعتبار سے ضروری اور ناگزیر ہوتے ہیں، اور ان کی انسانی جبلت اور دنیاوی ضرورت متقاضی ہوتی ہے، دوسری قسم دینی ہے یہ عمل وکسب سے حاصل ہوتی ہے اس کو کرنے والا محمود اور قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے، اور اللہ کے یہاں بھی مقرب ہوتا ہے،

پہلی قسم یعنی ضروری محض میں آدمی کے ارادہ واختیار اور کسب وعمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا جیسے کوئی خلقۃً کامل اور پیدائشی طور پر صاحبِ کمال ہو، اس کی شکل وصورت حسین وجمیل ہو، وہ عقل وفہم میں فائق وبرتر ہو، اس کے حواس واعضا قوی اور توانا ہوں، اس کی حرکات میں اعتدال ہو اور اس کو نسبی شرافت اور اپنی قوم میں اعزاز حاصل ہو، اسی قسم کے اندر بعض ایسی چیزیں بھی شامل ہیں جن کی عام دنیوی ضرورتیں متقاضی ہوتی ہیں جیسے غذا، نیند، لباس، رہائش گاہ، شادی بیاہ، مال ودولت، جاہ ومنزلت، اگر ان آخری اوصاف وفضائل سے مقصود تقویٰ اور حصولِ آخرت ہو، اور یہ حدودِ ضرورت کے اندر اور قوانین شریعت کے مطابق ہوں تو ان کا تعلق بھی دینی اور اخروی قسم سے ہوجاتا ہے،

جو خصائل وعادات اُخروی اور دینی نوعیت کے ہیں اور عموماً کسب سے حاصل کئے جاتے ہیں، ان کے اندر تمام اخلاق فاضلہ اور آداب شرعیہ داخل ہیں جیسے تدین، خدا کی عبادت واطاعت، علم، حلم، صبر، شکر، عدل، زہد، تواضع، عفو، عفت، سخاوت، شجاعت، حیاء، مروت، خاموشی، اطمینان، وقار، رحمت، حسنِ ادب ومعاشرت وغیرہ،

ان سب فضائل کا جامع صرف ایک لفظ حسن خلق ہے، جو بعض لوگوں کے اندر فطری اور طبعی طور پر موجود ہوتا ہے، اور بعض لوگوں کے اندر طبعاً نہیں ہوتا، بلکہ وہ ان کو کسب سے حاصل کرتے ہیں، تاہم ایسے لوگوں کی جبلت میں بھی اس کی اصل اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ

موجود ہوتا ہے۔

یہ اخلاق عالیہ بھی ایسی صورت میں دنیوی ہو جاتے ہیں، جب ان سے خدا کی رضا اور آخرت کا ثواب مقصود نہ ہو تاہم ان کے فضائل و محاسن ہونے پر عقل سلیم رکھنے والوں کا اتفاق ہے مگر ان کے نزدیک ان کے حسن و فضیلت کے سبب میں اختلاف ہے،

اوپر جلال و کمال کے جن اوصاف کا ذکر ہوا ہے، اُن میں سے اگر ایک یا دو وصف سے بھی کوئی شخص کسی وقت اور زمانہ میں متصف ہوتا ہے، تو اس کی وجہ سے اس کو شریف اور معزز سمجھا جاتا ہے، چنانچہ حسب و نسب کی برتری یا حسن و جمال یا اعضا و جوارح کی قوت یا علم یا حلم یا شجاعت یا سخاوت سے اگر کوئی متصف ہوتا ہے تو اس کا درجہ و مرتبہ اتنا عظیم اور بلند ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں اور مرنے کے بعد بھی اس کا نام اس وصف کے لئے ضرب المثل بن جاتا ہے[1] اور لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت اور بزرگی کا سکہ برابر بیٹھا رہتا ہے خواہ کتنا ہی زمانہ کیوں نہ گزر چکا ہو۔

ایسی صورت میں ذرا اُس شخص کے فضل و کمال اور عظمتِ شان کا خیال کیجئے جس کے اندر یہ تمام اوصاف و کمالات بدرجۂ کمال اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ نہ ان کو شمار اور بیان کیا جا سکتا ہے، اور نہ بجز فضل الٰہی و تائید ایزدی کے انھیں محض کسب و تدبیر سے حاصل کیا جا سکتا ہے یعنی نبوت و رسالت کی فضیلت، خدا کا آنحضرتؐ کو اپنی دوستی اور محبت سے نوازنا، ان کا اپنے لیے انتخاب کر لینا (اصطفا) رات میں ان کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لیجانا، (اسراء) اپنی عظیم نشانیاں دکھانا (رؤیت[2])، آپ کو اپنی قربت خاص میں کر دینا، (دنی) شفاعت

---

[1] جیسے حاتم کا نام سخاوت کیلئے اور سحبان کا نام خطابت کیلئے آج تک ضرب المثل بنا ہوا ہے [2] اس سے معراج کی طرف اشارہ ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ معراج میں آپ دیدار الٰہی سے مشرف ہوئے تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ رویت سے آپ کا حضرت جبرئیل کو دیکھنا مراد ہے، مگر قرآن مجید میں جہاں اس کا ذکر ہے وہاں لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ کے الفاظ آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے معراج میں خدا کی عجیب و غریب نشانیاں دیکھی تھیں

وسیلہ، فضیلت، درجہ رفیعہ اور مقام محمود عطا کرنا، براق و معراج سے مشرف فرمانا، کالے گورے اسود و احمر یعنی تمام لوگوں کی طرف مبعوث کرنا، آپ کا انبیا علیہم السلام کی امامت کرنا، انبیا اور قوموں کے درمیان شہادت دینا، آپ کا اولاد آدم کا سردار ہونا، لوائے حمد عطا کیا جانا، آپ کا بشیر و نذیر ہونا، عرش والے کے نزدیک آپ کا مکین، مطاع اور امین ہونا، دنیا والوں کا ہادی اور ان کے لیے رحمت ہونا، خدا کا آپ کو کوثر عطا کرنا، آپ کی بات کا بارگاہ الٰہی میں مسموع ہونا، آپ پر نعمت تمام کرنا، آپ کی اگلی اور پچھلی خطاؤں کو معاف کر دینا، آپ کا شرح صدر، وضع وزر، رفع ذکر، آپ کو نصرت عطا کرنا، آپ پر سکینہ اتارنا، اور آپ کی ملائکہ کے ذریعہ تائید کرنا، کتاب و حکمت عطا کرنا، سبع مثانی و قرآن عظیم سے سرفراز کرنا، امت کے تزکیہ پر مامور کرنا، لوگوں کو اللہ کی جانب بلانا، اللہ اور ملائکہ کا آپ پر درود بھیجنا، آپ کا لوگوں کے درمیان اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق فیصلہ کرنا، لوگوں سے اصر و اغلال اتارنا، اللہ کا آپ کے نام کی قسم کھانا، آپ کی دعا کا قبول کرنا، جمادات اور حیوانات کا آپ سے بات چیت کرنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴) ۳ اس سے قرآن مجید کی سورۂ نجم کی ان آیتوں کی طرف اشارہ ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ معراج میں آپ خدا کے قرب و دنو سے سرفراز کئے گئے تھے۔ ۴ یعنی اسراء میں آپ نے تمام انبیا سے ملاقات کی اور نماز پڑھائی۔ ۵ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز میرے ہاتھ میں لوائے حمد یعنی حمد کا پرچم ہوگا، یہ امتیاز اس لیے آپ کو بخشا جائے گا کہ لوگ آپ کو پہچان سکیں۔

۶ یہ قرآن مجید کی سورۂ تکویر کی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ ۷ اس میں سورۂ مائدہ کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت یعنی دین آپ پر مکمل کر دیا گیا۔ ۸ سورۂ انشراح کی آیتوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اللہ نے اپنے نبی کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ کیا ہم نے تیرے لیے سینہ کو کھول نہیں دیا، اور تجھ سے تیرے اس بوجھ کو ہٹا نہیں دیا جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا تھا، اور تیرے لیے تیرا ذکر اونچا نہیں کر دیا۔ ۹ سورۂ انفال کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں غزوہ بدر میں سکینہ (دلجمعی) اتارنے اور ملائکہ کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کرنے کا ذکر ہے۔ ۱۰ سورۂ حجر میں اللہ نے فرمایا ہے کہ اے پیغمبر ہم نے تم کو سبع مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا، سبع مثانی کی تعیین میں مفسرین کا بڑا اختلاف ہے یہاں تفصیل کا محل نہیں ہے۔ ۱۱ سورۂ اعراف میں آپ کی اس خصوصیت کا ذکر ہو کہ آپ کی بعثت سے پہلے [illegible] [illegible] شرعی قیود کا بوجھ ڈال رکھا تھا

خدا کی قدرت سے آپ کے ذریعہ مردوں کا جی جانا، بہروں کا سن لینا، آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی جاری ہونا، تھوڑے کھانے کا زیادہ ہوجانا، چاند کا دو ٹکڑے ہوجانا، سورج کا ڈوب کر پھر نکل آنا، اشیاء کا اپنی اصل حالت سے تبدیل ہوجانا، رعب کے ذریعہ غلبہ، غیب سے واقفیت بادلوں کا آپ پر سایہ فگن ہونا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، بیماریوں اور آلام کا رفع ہوجانا، آپ کا لوگوں کے شر سے محفوظ رہنا،

غرض تنہا آپ کی ذات میں جس قدر فضائل جمع ہوگئے تھے، ان کا احاطہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون کرسکتا ہے، اور یہاں جن کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر کا تعلق آپ کے دنیوی خصائص سے تھا، آخرت میں آپ کو جس کرامت، شرافت، سعادت اور حسنیٰ سے نوازا جائے گا، اسکو کون سوچ سکتا ہے۔ (الشفاء ج ا ص ۳۰۳ تا ۳۹۹)

دنیوی ضرورت جن چیزوں کی مقتضی ہوتی ہے، ان کی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم اُن چیزوں کی ہے، جن کی کمی اچھی اور بہتر ہوتی ہے، دوسری قسم میں وہ چیزیں آتی ہیں، جن کی زیادتی عمدہ ہے اور تیسری قسم میں حالات مختلف ہوتے ہیں،

پہلی قسم کی مثال غذا اور نیند ہے، سب کا اتفاق ہے کہ غذا اور نیند کی قلت پسندیدہ اور کثرت مذموم ہے کیونکہ زیادہ کھانا پینا عدم آسودگی، حرص اور شہوت کی زیادتی کی علامت اور دنیوی و اخروی نقصان کا باعث ہے، اس سے گوناگوں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، نشاط ختم ہوجاتا ہے، اور دماغ میں امتلا پیدا ہوتا ہے، اس کے برعکس کھانے پینے میں کمی قناعت کی دلیل ہے، اس کی وجہ سے نفس قابو میں رہتا ہے، شہوت کا قلع قمع ہوجاتا ہے، جسم صحت مند اور دماغ تر و تازہ رہتا ہے، اور ذہن کی حدت میں کمی نہیں آتی، اسی طرح نیند کی زیادتی سے پست ہمتی، سستی، ضعف، عجز اور کسل پیدا ہوتا ہے، ذہن بلید ہوجاتا ہے، اور عمر غیر نفع بخش

ان سب میں آپ کے معجزات کی طرف اشارہ ہوا، ان کی تشریح و تفصیل کے لیے سیرۃ النبی جلد سوم ملاحظہ ہو۔

کام میں گذارنے کی عادت پڑجاتی ہے، نیز یہ غفلت، قساوت قلب اور موت کا پیش خیمہ ہوتی ہے، یہ سب ایسی مشہور باتیں ہیں جن کو ہر شخص جانتا ہے، اور عام طور پر ان کا مشاہدہ بھی ہوتا رہتا ہے، گذشتہ زمانہ کے حکما سے مسلسل ان کی نقل ہوتی چلی آئی ہے، عربوں کی شاعری اور واقعات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے، احادیث و آثار میں بھی ان کی صراحت موجود ہے، اس لئے ان کے دلائل و شواہد بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھانے اور پینے کے معاملہ میں اقل پر کاربند تھے، آپ کی سیرت مبارکہ کے اس پہلو پر کوئی اختلاف نہیں ہے، آپ نے دوسروں کو بھی اسی کی تلقین فرمائی ہے، یہ بھی متواتر ہے کہ کھانے پینے کی کثرت نیند کی زیادتی کا باعث بھی ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ "رات میں جگنے کی قدرت کم کھانے سے حاصل ہوتی ہے"، اور بعض سلف سے روایت ہے کہ "زیادہ مت کھاؤ کیونکہ زیادہ کھانے سے پیاس زیادہ لگتی ہے، اور نیند بھی زیادہ آتی ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ اس کھانے کو زیادہ پسند کرتے تھے جس میں زیادہ لوگ شریک ہوتے تھے، اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں تناول فرمایا، آپ کا معمول تھا کہ ازواج مطہرات سے کھانے کی فرمایش نہ کرتے، اگر وہ کھلا دیتیں تو کھا لیتے اور جو کھانا بھی پیش کرتیں اس کو قبول فرما لیتے، اسی طرح جو مشروب پیش کرتیں اس کو پی لیتے۔

حضرت لقمانؑ کے مواعظ میں ہے کہ آدمی جب شکم سیر ہوتا ہے تو اس کی فکری قوت بیدار نہیں رہتی، اس سے حکمت سلب ہوجاتی ہے، اس کے اعضا کی چستی و توانائی باقی نہیں رہتی اور وہ خدا کی عبادت کرنے میں سستی کرتا ہے، اسی طرح متعدد صحیح حدیثوں میں آپ کے کم سونے کا ذکر ہے، بلکہ آپ نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ،

ان عینی تنامان ولا ینام قلبی   میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل بیدار رہتا ہے،

آپ کا معمول تھا کہ داہنی کروٹ سوتے تھے، یہ بھی کم سونے کی دلیل ہے، کیونکہ داہنی کروٹ سونے پر آدمی جلد بیدار ہو جاتا ہے، اور اس کو زیادہ گہری نیند نہیں آتی،

دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن میں باتفاق زیادتی ممدوح اور قابل فخر ہے، اس کی مثال جاہ ہے، جو دانشمندوں کے نزدیک عموماً محمود ہے، صاحب جاہ کی عظمت لوگوں کے دلوں میں برابر رہتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

وجیھا فی الدنیا والآخرۃ   وہ دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت ہیں

لیکن یہ آفات سے خالی نہیں، چنانچہ بعض لوگوں کے لیے آخروی نقطۂ نظر سے یہ مضر ہے، اسی لیے اس کی مذمت بھی کی گئی ہے، اور عدم جاہ و عدم شہرت کو پسند کیا گیا ہے، لیکن اصل شریعت میں گھمنڈ اور علو فی الارض کو ناپسند کیا گیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے ہی، رعب و دبدبہ عظمت وحشمت اور بلند درجہ و مرتبہ سے نوازا گیا تھا، نبوت کے بعد گو لوگ آپ کی تکذیب کرتے تھے، آپ کے ساتھیوں کو ایذا دیتے تھے، اور خود آپ کے بھی خفیہ طور پر درپے آزار رہتے تھے، لیکن آپ کے سامنے اس کی ان کو جرأت نہ ہوتی تھی، بلکہ وہ آپ کی عظمت شان کا خیال کرتے تھے، آپ کو جن لوگوں نے دیکھا نہیں تھا وہ آپ کو دیکھتے ہی مبہوت اور خائف ہو جاتے تھے، چنانچہ قیلہ بنت مخرمہ کے بارہ میں بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے جب آپ کو دیکھا تو خوف سے کانپنے لگیں، آپ نے فرمایا تم کو سکون و اطمینان سے رہنا چاہئے، ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص[1] آپ کے سامنے کھڑا ہوا تو کانپنے لگا، آپ نے فرمایا ڈرتے کیوں ہو، میں کوئی جابر بادشاہ نہیں ہوں۔

---

[1] ان کا نام عتبہ بن عمرو بن ثعلبہ خزرجی تھا (شرح خفاجی)

یہ نبوت سے قبل کے واقعات تھے، نبوت و رسالت سے سرفراز کئے جانے کے بعد آپ کو جو غیر معمولی جاہ و مرتبہ حاصل ہوا اور اللہ نے آپ کو منتخب فرما کر جو کرامت و عزت بخشی اس سے بڑھکر کسی درجہ و مرتبہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا، پھر عالم آخرت میں بھی آپ اولاد آدم کے سردار ہونگے،

تیسری قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جن میں فخر و فضیلت اور پسندیدگی حالات کے اعتبار سے ہوتی ہے، جیسے مال کی کثرت، عام طور پر مالدار کو معزز اور باعظمت خیال کیا جاتا ہے کیونکہ مال کے ذریعہ آدمی کی ضرورتیں اور آرزوئیں پوری ہوتی ہیں، ورنہ فی نفسہ مال کوئی فضیلت اور خوبی کی چیز نہیں ہے، پس جب مالدار آدمی اپنی اور دوسروں کی ضرورتوں میں اپنا مال صرف کرے اور عزت، بڑائی، اور ان کاموں میں اسے خرچ کرے جن سے اس کی نیک نامی اور شہرت ہو اور لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت کا سکہ قائم ہو تو اہل دنیا کے نزدیک ایسا مالدار شخص صاحب فضیلت ہوتا ہے، اور اگر وہ نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرے اور اس سے اس کا مقصود رضاے الٰہی اور آخرت کا حصول ہو تو یہ سب کے نزدیک عظمت و فضیلت کا کام ہے لیکن اگر آدمی بخیل اور صرف مال جمع کرنے کا حریص ہو اور وہ اس کو ان جگہوں میں بھی نہ خرچ کرے جہاں خرچ کرنا ضروری ہے، تو باوجود مال والا ہونے کے ایسا شخص محتاج اور قابلِ مذمت ہے اس کا مال بے نتیجہ ہو جو اس کو پستی کے غار میں گرا دینے کا سبب ہوگا،

اس سے ظاہر ہوا کہ مال فی نفسہ قابلِ ستایش، بہتر اور اچھی چیز نہیں ہے بلکہ اسکی خوبی اس وجہ سے ہے کہ وہ ضرورتوں کو پوری کرنے، نیک نامی اور اجر حاصل کرنے اور صحیح مصرف میں خرچ کرنے کا ذریعہ ہے، مال جمع کرنے والا اگر اس کو صحیح اور مناسب مصرف میں خرچ نہ کرے تو وہ غنی کہلانے کا مستحق نہیں کیونکہ اس کا مال بے فائدہ ہے، اور وہ واقعتاً فقیر ہے، اس لیے کہ اس سے کبھی اس سے کوئی غرض نہیں پوری ہوتی، اس کی حیثیت دوسرے کے مال کے خازن کی ہے،

جس کا خود اپنا مال نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اس کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح اس شخص کے پاس مال ہونے کے باوجود وہ اس میں کوئی تصرف نہیں کرتا، اس کے برعکس خرچ کرنے والا مال دار اور غنی کہلانے کا مستحق ہے، کیونکہ وہ اس کے ذریعہ فوائد حاصل کرتا ہے، گو خود اس کے پاس کچھ بھی مال باقی نہیں رہ جاتا،

اب مال کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و معمولات کا مطالعہ کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے خزانے عطا کئے گئے، آپ کے لئے مالِ غنیمت حلال کیا گیا، جو آپ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہیں کیا گیا تھا، آپ کی زندگی میں حجاز و یمن کے شہر، پورا جزیرۂ عرب اس سے متصل ممالک شام و عراق فتح ہوئے، اور ان جگہوں سے غنیمت کا مال، جزیہ، صدقات، اور بادشاہوں کے تحائف آپ کے پاس آئے مگر نہ کبھی آپ نے ان میں سے کوئی چیز اپنے لیے مخصوص کی اور نہ ایک درہم بھی اپنے لیے باقی رکھا بلکہ یا تو سب دوسروں میں تقسیم کر کے انھیں فائدہ پہنچایا یا مسلمانوں کی فوجی ضرورتوں میں خرچ کر کے ان کی جنگی قوت میں اضافہ کیا، ایک دفعہ آپ کے پاس دینار کا ڈھیر آگیا، آپ نے سب تقسیم کر دیا، صرف چھ دینار باقی رہ گئے تھے، اُن کو ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے حوالہ کر دیا، لیکن رات کو اُس وقت تک آپ کو نیند نہ آئی جب تک کہ انھیں تقسیم نہ کر دیا اور جب یہ سب تقسیم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اب جا کر مجھے چین ملا،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اخراجات، لباس و رہائش کے معاملہ میں صرف بقدرِ ضرورت پر اکتفا فرماتے تھے، ماسوا سے کوئی رغبت نہ تھی، جو میسر ہو جاتا وہی زیبِ تن فرما لیتے، آپ کا لباس موٹا جھوٹا ہوتا تھا، آپ کے پاس حریر و ریشم آتا مگر اس کو تقسیم کر دیتے یا ان لوگوں کے لئے محفوظ رکھتے جو اس موقع پر موجود نہ ہوتے تھے، لباس میں

فخر و مباہات بالکل پسند نہ کرتے آپ کے نزدیک آرائش و زیبائش عظمت و برتری کی چیز نہیں۔ لباس میں فخر و مباہات عورتوں کا شیوہ ہے، مردوں کے لیے صاف ستھرا اور اوسط درجہ کا کپڑا پسندیدہ ہے، لباس میں نمود و نمائش شرعاً مذموم ہے، اسی طرح مکان کا حسن اور وسعت، ساز و سامان کی کثرت، خادموں اور سواریوں کی زیادتی بھی فخر و مباہات کی چیز نہیں، البتہ اگر کوئی زمین اور اس کی پیداوار کا مالک ہونے کے باوجود پاکدامنی اور زہد کی بنا پر اُس سے بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرے تو اس کو افضل سمجھا جائیگا،

آب ان عادات و خصائل کو لیجئے جو اخلاق حمیدہ اور آداب شریفہ میں داخل ہیں اور یہ ضروری و طبعی نہیں ہیں۔

یہ عادات و خصائل اگر کسی کے اندر موجود ہوں تو اس کی فضیلت و برتری پر تمام عقلمندوں کا اتفاق ہے، بلکہ اگر ان میں سے کسی ایک ہی عادت سے کوئی شخص متصف ہو تو اس کو بھی افضل و برتر کہا جاتا ہے، شریعت مبارکہ نے بھی ان خصائل کی تعریف کی ہے، اور ان کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اور جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں ان کے لئے دائمی سعادت کا وعدہ کیا ہے، بلکہ بعض کو اس نے نبوت کا جز بھی بتایا ہے، ان ہی فضائل کو حسن خلق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جو نفس کے قوی اور اس کے اوصاف میں اعتدال کا نام ہے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ پورے اعتدال کے ساتھ بدرجۂ کمال موجود تھا، چنانچہ اللہ تعالے نے اس حیثیت سے آپ کی تعریف کی ہے۔

انک لعلیٰ خلق عظیم (قلم) اے پیغمبر بیشک تم خلق عظیم پر فائز ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کا خلق قرآن مجید تھا، آپ کی پسند و رضا اور آپ کی ناپسندیدگی اور غضب اسی کے تابع تھا،" آپ نے خود بھی فرمایا ہے کہ

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میری بعثت حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں خلق کے اعتبار سے عمدہ و احسن تھے محققین کا خیال ہے کہ مکارم اخلاق آپ کی اصل خلقت و فطرت میں داخل تھے ، اور یہ آپ کے اندر طبعی طور پر پائے جاتے تھے ۔ ان کے حصول میں کسب و ریاضت کا کوئی دخل نہ تھا ، بلکہ یہ موہبت الہی اور فیضان ربانی کا نتیجہ تھے ، یہی حال تمام انبیاء علیہم السّلام کا بھی تھا اگر کوئی ان کی سیرتوں کا مطالعہ کرے اور بچپن سے بعثت تک کے واقعات پر غور کرے تو اس پر یہ بات پوری طرح ظاہر ہو جائے گی ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اہل سیر نے بیشمار ایسے واقعات نقل کئے ہیں ، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں فطرۃً سلامتی تھی ، اور آپ کبھی سوء خلق اور برائی میں ملوث نہیں ہوئے تھے خود آپ نے بھی اپنے متعلق بیان کیا ہے کہ مجھے بتوں سے نفرت تھی اور میں نے زمانۂ جاہلیت میں بھی ان کاموں کا کبھی قصد نہیں کیا جن کو لوگ کیا کرتے تھے ، بجز دو بار کے لیکن اللہ نے مجھے دونوں بار بچا لیا اور پھر میں نے ان کا اعادہ نہیں کیا (مسند بزار) نبوت سے سرفراز کئے جانے کے بعد انبیاء علیہم السّلام کا دل انوار الہی سے جگمگا اٹھتا ہے ، اور وہ بغیر کسی ریاضت و ممارست کے اخلاق عالیہ کے مرتبۂ کمال پر فائز ہو جاتے ہیں ، انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں میں بھی بعض اچھے اخلاق فطرۃً موجود ہوتے ہیں اس کی وجہ سے تمام فضائل کو حاصل کرنا اُن کے لئے آسان ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ بعض بچوں میں آغاز خلقت ہی سے اس کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے کہ ان کا ڈھنگ اچھا یا ذہن عمدہ ہے ۔ یا سچائی یا سخاوت کا جوہر اُن میں موجود ہے جب کہ بعض بچے اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں ، مگر کسب سے ان کا نقص رفع ہو جاتا ہے ، اور ریاضت

ردم کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ان کی کمی اعتدال میں تبدیل ہو جاتی ہے،
، حالتوں کے اختلاف کی وجہ سے اخلاق حسنہ میں لوگوں کے درمیان تفاوت
ن کے لیے وہ صورت آسان کی جاتی ہے، جس پر اس کی پیدائش ہوتی ہے، اسی
ے سلف کا خلق کے جبلی یا کسبی ہونے میں اختلاف ہے، ابن جریرؒ نے عبداللہ بن
صریؒ سے بیان کیا ہے، کہ بندہ کے اندر خلق حسن جبلی اور طبعی ہوتا ہے خود انکی
،، مگر ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نبی صلی اللہ
ایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:-

یل یطبع علیہا المومن — خیانت اور جھوٹ کے سوا مومن ہر
منۃ والکذب[۱] — خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے،

ر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جرأت اور بزدلی دونوں خصلتیں ہیں اللہ ان کو جس کے
ستا ہے[۲]

ان جزئیات کا اصل اور مرکزی دائرہ عقل ہے، یہ علم و معرفت کا سرچشمہ ہے،
سابت رائے، جودت ذہن، سرعت انتقال، حسن ظن، عاقبت بینی، مصالح
وت، حسن سیاست، خوبی تدبیر، فضائل کا اختیار، اور رذائل سے اجتناب
. بار ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عقل میں جو اونچا درجہ و مرتبہ تھا وہاں تک
مکن نہیں، آپ کے وفور عقل، قوت حواس اور ذکاوت و ذہانت میں
ہ کی گنجائش نہیں، آپ تمام لوگوں سے زیادہ عقلمند اور ذہین تھے، جو شخص

---

[۱] کو امام احمد نے مسند میں بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں
ؓ سے روایت کیا ہے، اور ابن ابی الدنیا نے صمت میں حضرت سعدؓ سے مرفوعاً و موقوفاً
ایت کیا ہے۔ [۲] الشفا ج ا ص ۱۴۱ ۵ تا ۶۱۳

مخلوقات کے ظاہری و باطنی معاملات میں آپ کی تدبیر و سیاست پر غور کرے گا اور آپ کے حالات، عادات اور انوکھی سیرت کا مطالعہ کرے گا وہ آپ کے وفور عقل و فہم کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایسی واضح حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کسی بحث و تقریر کی ضرورت نہیں۔

کتاب الشفا کا لب لباب تیسرا حصہ ہے، اس میں اُن امور کا ذکر ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان یا خلاف شان ہیں، اس میں ان بشری احوال و اوصاف کی وضاحت بھی کی گئی ہے، جن کی نسبت آپ کی جانب صحیح اور درست ہو سکتی ہے اور جن کی نسبت آپ کے لیے غلط اور محال ہے، اس حصہ پر خود مصنف کو بھی ناز تھا، اسلئے اس کی ایک اہم بحث ملاحظہ ہو اس سے کتاب کی اہمیت اور خصوصیت مزید ظاہر ہو گی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اللہ تعالے کا ارشاد ہے:

وما محمد الا رسول قد خلت	اور محمد تو رسول ہیں، ان سے پہلے بھی
من قبله الرسل افان مات	رسول گذرے ہیں، کیا اگر وہ مر جائیں
او قتل الخ (آل عمران)	یا قتل کر دئے جائیں۔

حضرت مسیح کے متعلق فرمایا:۔

ما المسيح بن مريم الا رسول	مسیح بن مریم تو صرف رسول ہیں جن
قد خلت من قبله الرسل وامه	سے پہلے بھی رسول گذرے ہیں اُن کی
صديقة كانا ياكلان الطعام (مائدہ)	ماں صدیقہ تھیں، دونوں کھانا کھاتے تھے،

دوسری جگہ ہے:۔

وما ارسلنا قبلك من المرسلين	ہم نے تم سے پہلے جن پیغمبروں کو بھیجا وہ

---

[1] المنہاج ص ۲ تا ۴ و جلد اول ص ۷۵ تا ۹۵

الا انهم لیاکلون الطعام	کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں
ویمشون فی الاسواق (الفرقان)	چلتے تھے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلایا گیا کہ

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ	تم کہدو کہ میں تمھارے ہی جیسا ایک
الیّ۔ (کہف)	آدمی ہوں جس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیا علیہم السّلام بشر تھے، اور ان کو انسانوں کے پاس خدا کا پیغام پہچانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اگر وہ بشر نہ ہوتے تو لوگوں کے لئے ان کا پیغام قبول کرنا اور پیغمبروں کے لئے ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنا ممکن نہ ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:۔

ولوجعلنا ملکا لجعلناہ رجلا (انعام)	اور اگر ہم فرشتہ کو پیغمبر بناتے تو اس کو بھی آدمی کر دیتے۔

یعنی فرشتہ بھی رسول بنا کر بھیجا جاتا تو آدمی ہی کی شکل وصورت میں ہوتا تاکہ اسکے لیے انسانوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، بات چیت کرنا، ان کو دیکھنا اور ان کی بات سننا اور سمجھنا ممکن ہوتا۔ ارشاد ہے،

لوکان فی الارض ملائکۃ	اگر زمین میں چلنے پھرنے والے فرشتے
یمشون مطمئنین لنزلنا	ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتے ہی کو
علیہم من السماء ملکا رسولا (اسراء)	رسول بنا کر اتارتے۔

اللہ کی سنت اور طریقہ میں ملائکہ کو ان ہی کی جنس کے لیے رسول بنانے یا ان لوگوں کے پاس بھیجنے کی گنجائش تھی، جن کو خدا نے نوع بشر کے اندر سے اپنی نبوت ورسالت کیلئے

مخصوص اور منتخب کر لیا تھا۔

دراصل انبیاء و رسل خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں، ان کا کام لوگوں تک خدا کے احکام پہچانا، اور ان کو ان باتوں سے آگاہ کرنا ہے، جن سے وہ ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے انبیاء کے ظاہری حالات و اوصاف اور ان کے جسم عام آدمیوں کی طرح بنائے گئے ہیں اور ان کو وہ تمام عوارض و حالات پیش آتے ہیں جو عام لوگوں کو پیش آتے ہیں، مگر ان کا باطن اور ان کی روح عام بشری اوصاف سے بلند اور ممتاز ہوتی ہے، ان کا تعلق ملاء اعلیٰ سے ہوتا ہے، اور ان کے اوصاف فرشتوں کے اوصاف سے مشابہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کے حالات تغیرات و آفات، بشری ضعف و عجز اور نقائص سے محفوظ ہوتے ہیں، کیونکہ اگر ان کے باطنی امور بھی ظاہری امور جیسے ہوتے تو وہ ملائکہ سے اخذ و اکتساب نہ کر سکتے اور ان کے لئے ان سے ملنا اور ان کو دیکھنا اسی طرح ناممکن ہوتا جس طرح کہ عام انسانوں کے لیے ناممکن ہے، اور اگر ان کے ظاہری حالات عام انسانوں کی طرح ہونے کے بجائے فرشتوں کے اوصاف و خصوصیات کی طرح ہوتے تو جن لوگوں کی طرف ان کی بعثت ہوئی تھی ان کیلئے ان پیغمبروں سے ملنا جلنا، ان کی باتیں سننا اور ان کو دیکھنا ممکن نہ ہوتا۔ (باقی)

ہندوستان عربوں کی نظر میں

حیاتِ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ پر کچھ تازہ مواد

از

ڈاکٹر محمد سلیم اختر دی آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کینبرا (آسٹریلیا)

برصغیر ہند و پاکستان کی روحانی فضا کو قرن یازدہم ہجری کے ربع اول میں جن شیفتگانِ راہِ حق و حقیقت نے اپنے مقدس و مطہر انفاس سے عطر آگیں کیا، اُن میں خواجہ محمد باقی باللہ علیہ الرحمہ کے اسمِ نامی اور اسمِ سامی کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ اگرچہ نقشبندی سلسلہ کے کئی اور بزرگ بھی آپ سے پہلے اور خود آپ کے زمانہ میں ماوراء النہر سے ہندوستان تشریف لائے، لیکن جو تقویت اس سلسلہ کو ہندوستان میں آپ کی شخصیت سے پہونچی اور جس طرح یہ نہال نرم و نازک آپ کے انتہائی مختصر قیامِ ہند کے زمانے میں ایک تومند او بار آور درخت کی صورت میں ابھر آیا، بذاتِ خود آپ کی روحانی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ آپ ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ کو بمقام کابل پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد قاضی عبدالسلام خلجی سمرقندی قریشی کا شمار اپنے زمانے کے اربابِ فضل و صفا میں ہوتا تھا، انھوں نے اپنے فرزند ارجمند کی تعلیم و تربیت کی طرف شروع ہی سے خصوصی توجہ دی۔ بزرگی و عظمت کی نشانیاں ابتداء ہی سے آپ کی پیشانی سے آشکارا تھیں، ایک گونہ سنجیدگی اور تلاشِ حق کا جذبہ فطرۃً طبیعت کا حصہ تھا، سارا دن سر جھکائے گوشۂ عزلت میں بیٹھے رہتے۔ علوم رسمی کی تحصیل کے لئے آپ نے اپنے زمانے کے مشہور عالم مولانا صادق حلوائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔[1]

مولانا صادق حلوائی شمس الائمہ حلوائی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، سمرقند میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولانا احمد جندی سے حاصل کی، استاد نے آنکھیں بند کیں تو بیت اللہ کی زیارت کے ارادے سے

---

[1] زبدۃ المقامات، تالیف محمد ہاشم کشمی، کانپور، ۱۸۹۰ء، ص ۶ - ۵۔

گھر سے نکلے اور ہندوستان کی راہ لی، یہ ہندوستان میں بیرم خاں کے اقتدار کا زمانہ تھا، لاہور میں ملا پیر محمد خان شیروانی کے تعمیر کردہ مدرسۂ مہدی خواجہ کی دھوم دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، مولانا نے کچھ عرصہ یہاں تدریس کے فرائض انجام دیئے، جب ۹۶۹ھ میں پیر محمد خان کا انتقال ہوا تو عبداللہ خان اوزبک کی دعوت پر واپس ماوراءالنہر تشریف لے گئے، جب عبداللہ خان اوزبک کا عہد ختم ہوا تو مولانا نے دوبارہ احرام باندھا اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، قیام حجاز کے دوران آپ نے کچھ مدت تک وہاں بھی عقلی و نقلی علوم کی تدریس جاری رکھی، ۹۷۵ھ میں آگرہ لوٹے تو نواب میرزا عزیز کوکہ نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور آپ کے احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ۹۸۵ھ میں آپ ہندوستان سے وطن مالوف کے لئے روانہ ہوئے تو کابل میں محمد حکیم مرزا نے آپ کو روک لیا، اور وہاں متداولات کی تدریس کی فرمائش کی، حکیم مرزا اس حد تک آپ کا گرویدہ ہوا کہ بالآخر اس نے اپنی قلمرو میں سیاہ و سفید کا مالک آپ ہی کو بنا دیا، امین احمد رازی کا بیان ہے :

"... بتدریج نسبتش بجائے انجامید کہ زمام مہمات ملکی و مالی را بکف کفایت او نہاد"[۱]

---

[۱] نفائس المآثر از میر علاء الدولہ کامی قزوینی، بیت "ص" [۲] ہفت اقلیم از امین احمد رازی، باہتمام جواد فاضل، تہران، جلد دوم، ص ۳۸۴ - ۳۸۳، مزید اطلاع کے لئے ملاحظہ ہو، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی، باہتمام احمد علی اکبیر الدین احمد و ناسو لیس، کلکتہ ۱۸۶۴-۶۹ء، ص ۲۵۶ - ۲۵۵۔ طبقات اکبری از میرزا نظام الدین احمد، باہتمام ب دے کلکتہ ۱۹۱۳-۳۱ء ج دوم، ص ۴۵۸، آئین اکبری ابوالفضل علامی، انگریزی ترجمہ از بلاخمان جلد اول، دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۶۱۰، صبح گلشن از سید علی حسن خاں، بھوپال ۱۲۹۵ھ، ص ۴۲ - ۲۴۱، شام غریباں، تالیف لچھمی نرائن شفیق، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، کراچی ۱۹۷۷ء، ص ۴۹ - ۱۴۸، مجمع الشعراء جہانگیر شاہی اثر ملا قاطعی ہروی، تصحیح و تعلیق و مقدمہ راقم الحروف (از انتشارات انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی، کراچی)، زیر طبع۔

پھر صحبت و رفتار کے ساتھ کابل میں چند برس بسر کرنے کے بعد جب مولانا عازم سمرقند ہوئے تو خواجہ محمد باقی بھی اپنی کمسنی کے باوجود آپ کے ساتھ ہو لئے، مولانا صادق حلوائی کی صحبت، تربیت اور توجہ نے جو آپ کے دیگر فضائل و کمالات کے علاوہ اپنی جودت طبع، پاکیزہ تقریر اور فصاحت گفتار کے لئے بھی ضرب المثل تھے، خواجہ محمد باقی کو ایسا صیقل کیا کہ آپ اپنے تمام ہم درسوں میں منفرد اور ممتاز نظر آنے لگے، علوم کی تحصیل سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت درویشی و خداشناسی کی طرف مائل ہو گئی، ماوراء النہر کے بہت سے اہل اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسب فیض کیا، اس سلسلہ میں آپ نے سب سے پہلے خواجگی (عبیدی) علیہ الرحمہ کے خلیفہ مجاز مولانا لطف اللہ کے جانشین خواجہ عبید کی خدمت میں حاضر ہو کر گناہوں سے توبہ کی لیکن آپ توبہ پر زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے، دوسری دفعہ سمرقند میں خواجہ احمد یسوی کے خاندان کے ایک نامور بزرگ بندگی افتخار شیخ کے دست فیض مآثر پر توبہ کی، ابتداء میں تو شیخ افتخار بھی بیعت ہی نہ ہوتے تھے، اور فرماتے کہ تم ابھی نوجوان ہو، لیکن جب آپ کے اصرار اور مصمم ارادے کو دیکھا تو چار و ناچار فاتحہ پڑھ کر دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں استقامت بخشے، اسے اتفاق کہیے یا بدقسمتی کہ اب کی دفعہ بھی کامیابی نہ ہوئی، آپ کا اپنا قول ہے :

"موافق تعزیت آں بزرگوار آں عزیمت برہم خورد و خرابی عظیم روداد"[1]

تیسری مرتبہ توبہ کی غرض سے آپ حضرت امیر عبد اللہ بلخی کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر پھر مقصود ہاتھ آتے آتے رہ گیا، اتفاق کہ پائے ثبات میں پھر لغزش آ گئی، بالآخر خواب میں خواجہ بہاء الدین نقشبند کی زیارت ہوئی اور آپ نے ان کی خدمت میں چوتھی دفعہ توبہ کی، اس واقعہ کے بعد تلاش حق اور تجسس حقیقت کی کسک اور بھی شدید ہو گئی اور پیر کامل اور مرادِ بر حق کی تلاش میں آپ ہندوستان آ نکلے۔[2] آپ کے عزیز و اقارب جو یہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، ان کی خواہش یہ تھی کہ آپ بھی ملازمتِ شاہی

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۰، کلیات باقی باللہ، ص ۲۰ [2] زبدۃ المقامات ص ۱۰ (بقیہ صفحہ پر)

میں شامل ہوکر دنیوی مال و منال سے متمتع ہوں، لیکن عشق و عرفان الٰہیت نے آپ کو اس طرف [illegible]
[illegible] نے دیا،

خلقے بجاہ تکیہ زد و ما ز دیم پا

قسمت کی خوبی دیکھئے کہ اسی اثنا میں آپ ایک پری رو کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے، [illegible]
قیامت نے دم نہ لیا تھا کہ ہجر کی آفت بھی آن پہونچی، دوری کے غم اور مہجوری کے درد نے طبیعت میں
ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیا، آپ نے سکون کے لئے ارباب محبت و معرفت کے آثار میں پناہ لی، مگر
لینے گئے تھے پیغمبری مل گئی، فرماتے ہیں:

"بر سر مطالعہ کتابے از کتب اکابر بودم کہ بر ما تجلی نمودند و ما را از ما بر بودند"[۱]

اس کے ساتھ ہی سالکان راہ حق اور مجذوبان تجلی خداوندی کی مصاحبت و ہمکلامی کا عشق پھر عود کر آیا، اور آپ جذب و کیف و مستی میں شبانہ روز ویرانوں میں گشت کرنے لگے، بقول جامی؎

آہ من العشق و آیاتہ ... احرق قلبی بحر ازاتہ

ما نظر العین الی غیرکم ... اقسم باللہ و آیاتہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۹) اس معاصر شہادت کے برعکس ایس بزمی انصاری (اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ باہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۸ء جلد سوم میں ۹۰۲) بھی ملاحظہ ہو، "بعض ایسے لوگوں کی دعوت پر جو ہندوستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، انھوں [خواجہ محمد باقی] نے اس ملک [ہندوستان] کا سفر اختیار کیا، لیکن ان [illegible] کے خلاف لشکر شاہی میں شامل ہونے کے بجائے اصحاب باطن اور صوفیہ کی جستجو میں لگ گئے"۔ نیز ملاحظہ ہو [illegible] کا تحریر کردہ شذرہ درباب خواجہ محمد باقی باللہ در انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اشاعت جدید لندن سلائیڈن ۱۹۶۰ء، جلد اول ص ۹۵۷۔

[۱] زبدۃ المقامات ص ۷۔

زبدۃ المقامات سے پتہ چلتا ہے کہ راہ طریقت پر چلنے کے اشتیاق اور اہل اللہ کی تلاش میں آپ نے جو سختیاں برداشت کیں ان کی نظیر بہت کم ملتی ہے، برسات کے موسم میں جب پانی اور کیچڑ کے باعث قدم اٹھانا بھی دشوار ہوتا تو آپ انتہائی نحیف و نزار ہونے کے باوجود لاہور کے کوچوں اور قبرستانوں، ویرانوں اور قبرستانوں میں سرگرداں رہ کر صاحب دلوں کی تلاش کرتے، آپ کی یہ تلاش مسلسل رنگ لائی اور آپ ایک مجذوب کی کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے لیکن جب بھی آپ اس کی طرف رجوع کرتے وہ سب وشتم پر اتر آتا اور بڑی بے دردی اور سنگدلی سے آپ کو دھتکار دیتا، آپ نے پھر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، بڑی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضری دیتے رہے، بالآخر اس درویش خدامست کا دل نرم ہوا، آپ کو نزدیک بلایا، پاس بٹھایا اور توجہ سے نوازا، اور آپ کے حق میں حصول مقصد کی دعا کی، خواجہ محمد ہاشم کشمی لکھتے ہیں:

"از نظر و دعائے او ایشاں را فواید نصیب روزگار آمد"[1]

آپ فرمایا کرتے تھے:

"اگرچہ ما ریاضات شاقہ چنانکہ بعضے اہل اللہ کشیدہ نہ کشیدہ ایم لیکن انتظارہا و قلقہائے عظیم دیدہ ایم کہ ریاضتہا و سختیہائے بزرگ را متضمن بود"[2]

آپ کی والدہ ماجدہ جو بعض روایات کے مطابق خاندان سادات سے تھیں، جب آپ کی بے چینی و بے قراری اور ضعف و ناتوانی کو مشاہدہ کرتیں تو بڑی افسردہ خاطر ہوتیں اور گڑ گڑا کر دست بدعا ہوتیں کہ اے بار الٰہا! میرے فرزند نے تیری تلاش میں دنیا کی ہر شے سے منہ موڑ لیا ہے، اور جوانی کی سب لذتوں سے منحرف ہو گیا ہے، تو اس کی مراد کو پورا کر دے، ورنہ مجھے زندہ نہ رکھ کہ مجھ میں اس کی ناکامی، بے آرامی اور اضطراب کو دیکھنے کی ہمت نہیں، حضرت خواجہ کے بقول:

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۸ [2] ایضاً

[illegible] رسالہ [illegible] بشارت [illegible] گیا۔

[illegible] آپ کشمیر [illegible]

حاصل ہونے کا موقع ملا، بابا ولی خراسان کے رہنے والے تھے جو [illegible] میں کشمیر آکر [illegible] کی خانقاہ میں مقیم ہوئے، سلسلۂ نقشبندیہ کے پیر جانتے تھے۔[2] حضرت خواجہ نے آپ کی صحبت میں اس سلسلہ کی نسبت حاصل کی، کچھ ہی عرصہ کے بعد جب بابا ولی کا انتقال ہوا تو حضرت خواجہ کے اشارے پر آپ نے ماوراء النہر جاکر مولانا خواجگی امکنگی سے بیعت کی اور طریقۂ خواجگان اخذ کیا۔

مولانا خواجگی اپنے والد ماجد مولانا درویش محمد امکنگی سے اور مولانا درویش محمد امکنگی اپنے ماموں مولانا محمد زاہد وخشواری سے بیعت تھے جو خود خواجہ احرار کے خلفاء میں سے تھے، اس طرح خواجگی امکنگی کا سلسلۂ نسب دو واسطوں سے خواجہ احرار تک جا پہونچتا ہے، انھوں نے سہ شبانہ روز لیلاً و نہاراً حضرت خواجہ کے ساتھ خلوت میں رہ کر تربیت روحانی کے جملہ مراحل طے کرا دیئے، اور واپس ہندوستان جانے کا حکم تھا، ضمناً یہ نوید بھی دی:

"ایں سلسلۂ عالیہ را آنجا از شما رونقے تمام پدید آید و مستفیدان عالی مقدار آنجا از یمن تربیت شما بروئے کار آیند۔"[3]

ہندوستان پہونچ کر آپ تقریباً ایک برس تک لاہور میں مقیم رہے جہاں بہت سے علماء و فضلاء آپ کے فیضان سے مستفید ہوئے، لاہور سے آپ دہلی تشریف لائے اور قلعۂ فیروزی کے مقام پر جاگزیں ہوئے اور پھر آخری دم تک یہیں رہے۔

آپ کی طبیعت میں انتہا درجہ کی فروتنی پائی جاتی تھی، انکسار کا یہ عالم تھا کہ دعا مانگتے تو کہتے کہ

---

۱ زبدۃ المقامات ص ۸ ۔ ۲ ملاحظہ ہو تاریخ کشمیر اعظمی از خواجہ محمد اعظم شاہ، لاہور، ۱۳۰۲ھ، ص ۱۱۸

۳ زبدۃ المقامات ص ۱۳۔

ہ اپنا یہ شعار تھا کہ ہر شخص کی عیب پوشی کرتے اور مسکینوں کے زمرے میں مجھے محشور کرنا۔ بخل حد تک
اتھ ہمدردی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ لاہور میں قحط پڑا تو کئی روز تک کھانا نہ کھایا۔ فرمانے: یہ کہاں کا
نصاف ہے کہ لوگ بھوک کی وجہ سے مر رہے ہوں اور ہم کھانا کھائیں؟ آپ اپنی مجلس میں غیبت اور چغلی کو ہرگز پسند
نہ کرتے تھے، جونہی محسوس کرتے کہ کسی شخص کے خلاف کچھ کہا جانے لگا ہے تو اس کی تعریف کرنے لگتے،
لیے حاضرین میں سے کسی کو اس کے خلاف بولنے کی جسارت نہ ہوتی۔ دنیوی امور کے بارے میں بھی
بات چیت کی اجازت نہ تھی۔ لقمہ حلال کی طرف خصوصی توجہ فرماتے اور اس سلسلہ میں انتہائی احتیاط سے
کام لیتے۔[1] اگر کسی شخص سے کوئی غیر شرعی امر سرزد ہو جاتا تو بتصریح کچھ نہ کہتے، نہ شدت سے کام لیتے بلکہ
اشارے کنایے سے سمجھا دیتے۔[2] ستر احوال کے سختی سے پابند تھے، بیعت کرنے میں بڑے تامل سے
کام لیتے، سادات و علمائے کرام کی تعظیم مبالغہ کی حد تک کرتے اور جزئی و کلی تمام امور میں ان کی رائے
کا لحاظ رکھتے۔[3] ملاحت سخن اور لطافت کلام کے لئے آپ مشہور تھے اور مزاح و طیبت کو پسند فرماتے،[4]
ان ظاہری محاسن کے ساتھ ساتھ آپ کے باطنی کمالات کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں بھی جوہر استعداد ہوتا،
بلا اختیار آپ کی خانقاہ کی طرف کھنچا چلا آتا۔ آپ کے روحانی تصرف کا یہ عالم تھا کہ افراد پر پہلی ہی ملاقات
میں بے خودی اور وارفتگی کی کیفیت طاری کر دیتے، اور محمد صادق ہمدانی[5] کے بقول:

---

۱ زبدۃ المقامات ص ۲۰ ۲ ایضاً ص ۲۵ ۳ ایضاً ص ۲۲ ۴ ایضاً ایضاً ص ۱۵ ۵ محمد صادق ہمدانی کے
بارے میں مزید اطلاع کے لئے دیکھئے میرے مقالات Maulana Muhammad
Sadiq Kashmiri and Maulana Hasan Kashmi
An Introduction to Two Contemporaries of
Shaykh Ahmad Sarhindi Journal of the
Pakistan Historical Society, Vol XXV part

[illegible] نہایت رقت و نرمی کہ بعضے ارباب سلوک [illegible]

[illegible] زمانے حاصل کردند [illegible]

فراق سہتے رہے کہ آپ کی روحانی عظمت کا کوئی [illegible] اور اپنے مشن کی عظمت و اہمیت کا احساس
[illegible] کی جانب سے ہندوستان کو روانگی کے ارشاد کے ساتھ ہی ہو گیا تھا آپ نے ہندوستان
میں اپنے ارادت مندوں کے نہال فکر کی سرسبزی، ان کی کشت خیال کی سیرابی اور ان کے باطن
کی تعمیر کے لیے جس تندہی اور مستعدی سے کام کیا، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کی خانقاہ کی یگانہ
ہمہ گیری اور آپ کے غیر معمولی باطنی فیض کے بارے میں کم از کم دو انتہائی معتبر اور ثقہ شہادتیں محفوظ
ہیں جن کی باہمی مماثلت خود ان کی صداقت کی منہ بولتی دلیل ہے۔ پہلی شہادت آپ کے معتقد رفیق
اور معاصر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے، جو خانخاناں میرزا عبدالرحیم خان کے نام اپنے ایک
مکتوب میں یوں رقمطراز ہیں:

"... دریں زمان کہ مایۂ حادی حضرت فردی جدید [خواجہ باقی باللہ] از مشرق ولایت و
ہدایت می تابد، بیشک دریں جا سرّے از اسرار الٰہی مضمر است کہ توقف و انکار را در آنجا

(بقیہ صفحہ ۵۴) P.P. 197-218; The Contemporaries of Maulana Sadiq Kashmiri Journal of the Pakistan Historical Society, Vol XXVI Part II P.P. 186-197

کلمات الصادقین تصحیح و تعلیق و مقدمہ راقم الحروف (آمادۂ چاپ) اس کتاب کے بارے میں [illegible] ملاحظہ [illegible]
The Kalimat al-Sadiqin: A Seventh Century Rare Sufi Hagiography

[illegible] باہتمام احمد [illegible] (از انتشارات مجلس ترقی ادب لاہور) ۱۹۶۹ء ص ۳۰۹ - ۳۶۹۔

بدل تنگ است، دلائل حقانیت و ظہور نورانیت وے [او] بایں است وجمعے از طالبان کہ

ذیل تربیت و دولت صحبت و عنایت ایں مظہر حق [خواجہ باقی باللہ] مشغول اند کشف حقیقت

حال و شعور آں داشتہ بہ ایشاں در ذکر الٰہی و ظہور انوار و اسرار شگفت از حیطۂ تعبیر و تقریر بیرون است

همانا مثل ایں حلقہ و اجتماع اہل ذکر در زیر طاس فلک نباشد و اگر باشد کمتر باشد ....[1]"

دوسری شہادت آپ کے منظورِ نظر مرید اور محبوب خلیفہ حضرت شیخ احمد سرہندی معروف بہ امام ربانی مجدد الف ثانی کی ہے آپ اپنے ایک مکتوب میں مرشد کی حقانیت کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

"ایں فقیر بہ یقین می داند کہ مثل ایں صحبت [و] اجتماع و مانند آں تربیت و ارشاد بعد از زمان آں سرور علیہ و علیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات ہرگز بوجود نیامدہ است و شکر ایں نعمت بجا می باید آورد کہ اگرچہ بشرف صحبت خیر البشر علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام مشرف نشدیم باری از سعادت ایں صحبت محروم نماندیم[2]"

حضرت خواجہ باقی باللہ دہلی آنے کے بعد دو تین برس حیات رہے، اس زمانے میں بے شمار اہل اللہ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے، یہ آپ کے معاصر ضرور تھے لیکن ان میں سے آپ کا ہمسر شاید ہی کوئی ہو، آپ نے چالیس برس کے لگ بھگ عمر پائی جس کا معتدبہ حصہ عرفانِ الٰہی کے حصول میں صرف کیا

---

[1] کتاب المکاتیب والرسایل (قلمی)، مملوکہ نقید سعید پروفیسر سید وزیر الحسن صاحب عابدی، لاہور (۱۹۶۲ء) ص ۱۰۷

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لئے ملاحظہ ہو میرا مقالہ: An Introduction to the Life and Works of Shaikh Abdul-Haqq Muhaddith Dihlawi. The Muslim World Vol. LXVIII No 3, PP. 205-214.

[2] رسالہ مبدأ و معاد، نقل از زبدۃ المقامات ص ۱۳۹

حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ قبا و در علویات اینجا ساختہ و در زمان تحریر آں قلعہ آباد نشست،

روزے چند کہ بغایت مرحوم و پسندیدۂ مخلصان بود مدفون شدند، جناب استاذی مجامع ظاہر و باطن

النفر و باطن تکمیل جنب شیخ احمد سلمہ اللہ و جناب افادہ پناہی مختص العنایات العلیہ میاں شیخ

تاج الدین مدتے ست کہ اجازت تام دارند و فیوں [برگ ۳۶] از آنچہ بمقدار نسبت حق متالم بقیاس

صاحب مسودہ فی دیگر کم داشتہ باشد لیکن با جمیع حاضران و مخلصان ہر یک حیران و مضطرب اند، ازیں

واز مردانیکہ حاضر اند کسے سر حلقۂ جمع کمال تو اند بے شبہہ جناب مخدومی ملاذی شیخ میاں عبداد سلمہ

آمدیع تحریر دریں باب متوجہ اند و بعضے دیگر کہ گاہ در خلوت ازاں عالیحضرت شنودہ شد کہ استعداد

تکمیل ورآنہا ست ظہور آثار معلوم نیست کہ دریں نزدیکی شود و جناب مخدومی ملاذی میاں شیخ الہداد

تا ارتع تحریر دریں باب متوجہ نمی شوند حق سبحانہ آخر ایں تفرقہ را بجمعیت مبدل گرداند، اللہم احفظنا

بانیاض من جمیع البلایا والامراض و رحلت آں عالیحضرت بے شبہہ بعد از اتمام چہل سالگی واقع شد لیکن

اختلاف دریں ست کہ بعد از اتمام چہل سال سہ ماہ دیگر گذشت و بعضے می گویند کہ بعد از اتمام چہل

بے ہیچ فاصلہ روزی وہ بی ارتحال واقع شد، چوں ہنوز والدہ ماجدۂ ایشاں از غم و ہیبت آں قدر

بافاقت نیامدہ اند کہ ازیں امور تواں پرسید و ہر دو روایت نوشتہ شد، ان شاء اللہ چوں والدۂ

ایشاں ازیں غم ہلاک نشدہ بشعور تمام آمدند [برگ ۶۶ ب] فاضلے کہ مسودہ را بیاض خواہد برد

تحقیق نمودہ خواہد نوشت، بعد از رحلت بچند روزے از تسوید ایں رقیمہ فراغ حاصل شد. بعضے

از تاریخ دہر شہاکہ از فضلائے منتسباں گفتہ بودند ایراد کردہ می آید۔

لہ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کے وصال کے بعد آپ کی جانشینی کی بابت آپ کے اکابر خلفا میں جس اختلاف رائے کا پتہ چلتا ہے اس کے بارے میں کسی اظہار نظر سے قبل یہ معاصر شہادت بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ بدقسمتی سے راقم کے پیش نظر ماخذ کا یہ حصہ زیادہ واضح نہیں۔

جناب مولانا [illegible] جامع معقول و منقول [illegible]

ارشد پناہی بودند تاریخ گفتہ اند تا بہ دست [illegible]

خواجہ باقی مطلع صفہ ہدایت روے او ہادی اہل طریقت بر صراط مستقیم

کرد تسلیک طریق نقشبندان در جہاں بطریق اصل این مردم بنہاج قویم

ہمچو او نقش نکو بر صفحۂ آخر زماں ہیچ جا صورت نہ بست از کلک نقاش قدیم

در ہدایت آنچہ او در آمد ز فضل و کمال کس ندید اندر نہایت فہ ذلک فضل العظیم

کو کسے بو دست منقض از ملا معرفت دشمن بد نفس او مانند شیطان رجیم

تا بر آمد ہمچو بدر کامل از برج شرف گشت از تیغ عداوت سینۂ حاسد دو نیم

ساحت عزت سراے قوم خیل [مصروان] بوستاں بر دوستاں بر دشمنان نار جحیم

بود سرو باغ فردانیت آزاد از ہمہ شد خراماں آخر از دنیا بجنات نعیم

بود چوں دایم صراط مستقیمش راہ شد سال تاریخ وفاتش "الصراط المستقیم"[1]

(برگ ۹) آں خواجہ کہ پاک بود از وصمت عیب سر حلقۂ اہل فقر بے شبہ و ریب

چوں بود بغیب ذات او مستہلک غیب آمد بتاریخ وفاتش از غیب

تقوی شعار جامع العلوم مولانا محمد یوسف مرغینانی کہ بعد از تحصیل علوم متداولہ بفقر و شکستگی کہ یکے از اشغال ایشاں را دست دہد دریں خانقاہ می بودند و محل الطاف عالیہ گشتہ اند، با وجود [آنکہ] ورزش شعر گفتن ندارند از روے اخلاص تاریخے یافتہ در بیتے چند اندراج نمودہ اند و رباعی نیز از خود آوردہ بودند، اگرچہ دیگرے از فضلا باشیاں تند و کردہ لیکن تبرکا بہ ایں یادداشت خود نوشتہ می شود تا ایں یادداشت [illegible]

[1] فی الاصل "الصراط مستقیم" (= ۹۸۱ ہجری)

خواجہ باقی کہ بود قطبِ جہاں | دیدۂ دل بغیرِ حق نہ کشود

مظہرِ ذات غیب چہرۂ او | زد نمود از دو چہرۂ مقصود

لب لعلش بنطق جاں بخشید | چشم مستش بعشوہ ہوش ربود

ہر کہ دیدے رخش عیاں خواندے | آیتِ صدقِ شاہد و مشہود

شد بر اہل زماں جہاں تاریک | آفتاب جہاں عنروب نمود

صبح در فرقتش گریباں چاک [برگ ۲۶ ب] چرخ در ماتمش لباسِ کبود

چشم انجم ز شام تا بہ سحر | اشک ریزاں چو چشم من نغنود

... ... | ہاتفے گفت : شیخ کمل بود

مولانا حسن[1] نام یکے از فضلاے کہ بشرفِ اخلاص و قرابت مشرف بودند این مضمون را کہ رحلت آں عالیحضرت بعد از اتمام چہل سالگی بود بخوب ترین طریقے آدر دہ تاریخے ہم درآں قطعہ درج نمودہ اند وآں قطعہ اینست ،

نیل اہل سعادت خواجہ باقی آنکہ بود | خاکروبِ آستانش اہل قال واہل حال

ہمچو خورشید حقیقت نور فیض ایزدی | مشرق ومغرب گرفتہ چوں جنوب وچوں شمال

مدتے حق تجلی جمالے کردہ بود | حالیا بر بندگاں دارد تجلی جلال

---

[1] حضرت شیخ احمد سرہندی معروف بہ امام ربانی مجدد الف ثانی اولین مرتبہ آپ ہی کی وساطت سے خانقاہ باقویہ تک پہونچے، مکتوبات امام ربانی اور نقشبندی مجددی تذکروں میں آپ کو بالعموم مولانا حسن کشمیری کے نام سے یاد کیا گیا ہے لیکن کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ آپ کے تعارف کے لئے ملاحظہ ہو میرا مقالہ محولہ در پاورقی شمارہ ۱، (فوق الذکر)

حیف کاں قطبِ زماں بعد از چہل سالِ تمام   چوں مسیحا کرد از دنیاے بالا انتقال

یا دلش فارغ شد از اندیشۂ خلقِ زماں   یا گرفت آئینۂ دلش از صفا کیں گردِ ملال

تا بتکمیلِ ملائک رفت سوے آسماں   تا مشرف سازد آنجا ہم بہ صحبت کمال

یا نہ امنیت دہ آں در شوقِ آں خلوت نشیں   کرد قصد وصل بعد از اربعین بے انفصال

در کمال عشق واصل گشت با محبوبِ خویش   عاشقِ کامل بجت شد ازیں سالِ وصال

جنابِ فضیلت مآب میاں نور محمد[1] ولد میاں عبدالحق قصیدۂ در مرثیہ حضرت ارشاد پناہے گفتہ، و درمیانِ آں بیتہا و مصرعہاے پسندیدہ یافتہ می شود [برگ ۶۰] و بعضے فضلاء می نمایند کہ مصرع از بیت بیت دوم مشارٌ الیہ بخاقانی توارد نمودہ اند،

الحذر کآتش از جہاں برخاست   در کمیں فتنۂ زماں برخاست

بر زمیں جاے سبزہ شعلہ دمید   وز فلک ابر خوں فشاں برخاست

پیرہن چاک [illegible] باغ   بلبل از صبح نوحہ خواں برخاست

گشت یعقوبِ دہر دیدہ سفید   کز برش یوسفِ زماں برخاست

گیتی از غصہ خاک بر سر کرد   کہ سر افسردہ از جہاں برخاست

غرقِ سیلاب دیدہ قافلہ شد   کز میان میر کارواں برخاست

رخت ہستی ازیں سرا بربست   بسوے ملک جاوداں برخاست

از سرِ دیں کلاہ عزت رفت   افسرِ فرق راستاں برخاست

---

[1] حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند اکبر، جانشین معنوی اور شاہجہاں کے عہد میں اکبرآباد کے مفتی شیخ نورالحق کی متخلص بہ مشرقی مراد ہیں۔ شیخ نورالحق شوال ۱۰۷۳ھ میں بسن نود سالگی فوت ہوئے اور دہلی میں حوض شمسی کے علاقہ میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے، صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔

خواجہ باقی کہ از گذاشتنِ او — جاں ز دل رفت و دل ز جاں برخاست

بر رخ از اشک دیدہ آبلہ بست — لالہ از کشتِ زعفراں برخاست

بخدا جانِ ناتواں بے او — خیزد از تن اگر تواں برخاست

اے دریغا کہ از میانہٴ جمع — آں نہاں بین خردہ داں برخاست

قدوہٴ اولیاء ز دیدہ نہفت — مظہر رحمت از میاں برخاست

مسند آرائے ملک فقر گذشت [برگ ۶۸ ب] شہر دیں را خدایگاں برخاست

بہ چنیں دیر پائے پاسستی — کہ نہالے لباں لباں برخاست ؟

پاک تر از گل بہشت دمید — صاف تر از لبِ آسماں برخاست

بیدلے چند حلق بستہ بماند — قطب ارشاد از میاں برخاست

آں ز خود فانی و بحق باقی — کز نشاں سوئے بے نشاں برخاست

بود مستہلکِ تجلی ذات — او نہ امروز از میاں برخاست

بدوام شہود مستغرق — بود نابود ہمچناں برخاست

بحرم گاہِ قدس منزل کرد — پاک ازیں تیرہ خاکداں برخاست

رفت آں کہ خدائے خانہٴ دیں — بام بنشست آستاں برخاست

از گدایانِ خاکِ حضرتِ او — ہوسِ گنجِ شایگاں برخاست

سال فوتش ز مشرقی جستم — از دو دیدہ سیل زماں برخاست

اول خواند شیخ کمل بود — وز پے فکر بعد ازاں برخاست

خواجہ عارفِ الٰہی گفت — بار دیگر پے بیاں برخاست

یا رب ایں برگزیدہٴ خود را — کہ بشوقِ تو بس رواں برخاست

ہمدمِ انبیاء مرسل گشت — کرد ہجرت ازین تنگنائے آن بہ فات

وصلی اللہ علی محمد واصحابہ واولیاءہ [برگ ٦٦] وسلم تسلیما کثیرا کثیرا. مخلص دیگر این قطعہ تضمین کردہ است:

قطبِ ارشاد خواجہ باقی آنکہ — مردم از ماتمش بر آشفتند[1]

سالِ تاریخِ آں یگانۂ عصر — وائے تاریک شد جہاں گفتند

دردا کہ ہیچ ہم نفسے نیست در جہان — تا حالِ خویش عرض تواں کرد پیش آن

اندہ گرفت طبع مرا سخت در کنار — ادبار نخلِ بخت مرا کرد آشیان

پایم بقیدِ محنت و دستم بجیبِ غم — رخسارہ زعفرانی و اشکم ارغوان

صبرم زپا فتادہ، شکیبم ز دست ماند — عقلم بباد شد خردم رفت رایگان

من می طپم بخوں ز ہوائے وصالِ دوست — اندر کمین نشستہ ز ہر سوئے دشمنان

دل ہمدمِ فغان و فغان مونسِ دلم — جان در میانِ آتش و آتش میانِ جان

گیتی بکین و چرخ بخشم و فلک بجور — اغیار در پے ستم و یار ہمچنان

از جورِ غیر شکوہ کنم یا زخوئے یار — ز ایام سر دہم گلہ را یا ز آسمان

در خاطرم ملال و بلب زہر خندگی — تا چند آتشِ دل خود کنم نہان

گر با کسے نگویم سوزِ دل و جگر — ور با کسے بگویم سوزد لب و دہان

ہر لحظہ می زنم سر خود را بسنگِ غم — ہر دم بہ تنگ میشوم از دستِ این و آن

[برگ ٦٦ ب] القصہ دارم از غمِ او حالِ این چنین — تا رفتہ است قطبِ زمان از زمین جہان

دریائے فیض گوہر یکتائے کانِ شرع — خورشیدِ چرخِ معرفت و تاجِ راستان

---

[1] یہ تاریخ کلمات الصادقین میں بھی نقل ہوئی ہے لیکن بیت دوم آسمان در ماتم او الخ شامل نہیں۔

فخر الانام فخر زماں خواجہ باقی آنکہ | پیدا نہ شد چو او دگرے اندریں زماں
آں میر کارواں چو چہل سالگی رسید | بربست بار و رفت سوے ملک جاوداں
شد حور نوحہ گر ملکوتش جنازہ کش | افتادہ ماتمے بسر خلق آنچناں
کز بانگ نوحہ غلغلہ در شش جہت فتاد | وز شور گریہ ولولہ بر ہفت آسمان
آں روز ہچو روز قیامت ہمی نمود | از نفخ صور یاد ہمی داد آں زماں
شبلی وقت بایزید زماں | حضرت خواجہ لجۂ عرفاں
گشتہ دل مضطر از گذشتن او | شدہ خاطر ز رفتنش حیراں
آں گلستان فیض غنچہ صفت | رفت خوش حال و خرم و خنداں
سال فوتش ز عقل پرسیدم | عقل در فکر رفت و شد حیراں
از جہاں رفت قطب الاقطابے | گفت با سوز و درد و نعرہ زناں

ایضًا

تاریخ وفات قطب الاقطاب خواجہ محمد الباقی قدس سرہٗ

رفت ہادی شریعت مرشد اہل زماں | آنکہ بودہ قبلۂ ارباب معنی صورتش
آسماں در ماتم او خرقہ را در نیل زد | صبح پیراہن درید اندر میان فرقتش
کے توانم نطق زد اندر صفات ذات او | ہست سرتاپا ہمہ عالم گواہ عصمتش[1]
پادشاہ نقشبنداں بود آمد زیں سبب | سرگروہ نقشبندیہ حساب رحلتش[2]

متذکرہ بالا عبارت میں "مخلص دیگر" سے مراد مولانا محمد صادق دہلوی کشمیری ہمدانی ہیں مولانا نے

---

[1] الصادقین ، کے توانم نطق زد اندر ذات و صفات او ۔ ہست سرتا سر ہمہ عالم گواہ عصمتش ۔

[2] باقی باللہ کا یہ نسخہ محمد معظم قادری کے ہاتھوں ۸ رجادی الاول ۱۰۹۴ھ کو مکمل ہوا۔

اپنے مرشد کے وصال کے بعد آپ کی منقبت میں ایک نظم اور بھی لکھی جو کلمات الصادقین میں محفوظ ہے اور قارئین کے استفادے کے لیے ذیل میں نقل کی جاتی ہے :

خواجۂ زندہ دلاں خواجہ محمد باقی	واقفِ سرِّ نہاں خواجہ محمد باقی
بادشاہِ دو جہاں خواجہ محمد باقی	سببِ امنِ واماں خواجہ محمد باقی
مہر و مہ مقتبس از پرتوِ انوارِ دلیست	نہ فلک دائرۂ نقطۂ پرکارِ دلیست
از فلک می گذرد کوکبۂ شاہیِ او	رفتہ جائے کہ ملک ماندہ ز ہمراہیِ او
جائے آنست کہ از مرتبۂ جاہیِ او	شیرِ گردوں کند اقرار بہ روباہیِ او
از جمالِ رخِ او شد ہمہ دہلی پُر نور	شعلہ ز آتشِ وے بود تجلّی بر طور
وائے آں دل کہ در فکرِ خیالش نبود	آرزومند و گرفتارِ جمالش نبود
روز و شب در غم و اندوہ و ملالش نبود	دمبدم طالب و خواہانِ وصالش نبود
خستہ بادا جگرے کان ہدفِ تیرش نیست	بستۂ سلسلۂ [حلقۂ] زنجیرش نیست
من کہ بے حاصلم و رندم و رسوا و دغل	فیستا نعدی بکفِ دستِ من از علم و عمل
بندۂ حلقہ بگوشِ تو ایم از روزِ ازل	غیرِ او ہر کہ بود کردم از و قطعِ امل
یا رب از بادۂ مستانۂ وے سرمستم کن	در بغل جام و صراحی بکفِ دستم کن
بکن از جرعۂ خمخانۂ وے مست مرا	عقل و ہوش و خرد من ببر از دست مرا[1]
اے خوش آنکس کہ پئے تربیتش روحِ تو شد	رحم آلودہ بآں دل کہ نہ مجروحِ تو شد
چشمِ لطفے ز تو دارم طمع اے مایۂ ناز	سوئے من بنگر و یک لحظہ بحالم پرداز
می توانی کہ بجانم دہی از سوز و گداز	رحم کن رحم، غلامم دہ و آزادم ساز

[1] اس کے بعد یہ مصرع بھی نقل ہوا ہے : "ساز در حلقۂ آں سلسلہ پابست مرا"۔

یک نگاہے دگر امروز بکارم فرماے　　　بادۂ لطف خودم بخش وخمارم بربائے

[illegible]　　　براہ بنماے کہ آوارہ ام و گمراہم

بلکہ گویم غم خود بندۂ ایں درگاہم　　　از کہ جویم مددے چاکر شاہنشاہم

نیستا غیر از تو مرا ہیچ کسے پشت وپناہ؟　　　دست من گیر و بروں آر ازیں ظلمت چاہ

اے چمن برگ گلستان جلالت خورشید　　　مطرب بزمگہے عیش وصالت ناہید

زائر کعبۂ درگاہ جلالت امید　　　صد چو من حلقہ بگوشان کمالت جاوید

تا بکے دربدر و مایل ہر سو باشم　　　چند آوارہ و سرگشتہ ہر کو باشم

وقت آنست کہ آشفتہ و دیوانہ شوم　　　لامے در کشم و ساکن میخانہ شوم

کنج بگزینم و چوں جغد بویرانہ شوم　　　رو بصحرا کنم و از ہمہ بیگانہ شوم

دہ کہ از دست من خستہ نمی آید ہیچ　　　از عدم نامدم اے کاش [illegible] ہیچ

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی یاد میں

۲۶ محرم ۱۳۹۳ھ ۱۳ اے درخشاں سوسائٹی کراچی ۵

مکرم و محترم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ! امید ہے آپ مع تمام اہل خانہ بخیر و عافیت ہوں گے۔

رمضان شریف کے فوراً بعد میں امریکہ کے سفر پر روانہ ہو گیا جب واپسی ہوئی تو لکھنؤ کے اخبارات اور رسالہ سے محب گرامی مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کے سانحۂ ارتحال کی مفصل خبر پڑھ کر سخت صدمہ ہوا، مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ ایک تیسرے بزرگ ندوی کا انتقال ہو گیا۔ ندوی برادری کو چند ماہ کے اندر پے بہ پے چند سخت صدمے پہونچے، ابھی جوان صالح ہونہار کے صاحب طرز انشاء پرداز اور ادیب محمد الحسنی مرحوم کے انتقال پُر ملال کے صدمہ کا اثر زائل نہیں ہوا تھا کہ مولوی اسحاق جلیس ندوی کے سانحۂ ارتحال کی خبر سُنی اور چند ماہ کے بعد مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے انتقال سے دل کو سخت صدمہ پہونچا اللہ تعالےٰ ان تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے۔

مولانا عبدالسلام صاحب ایک نہایت متواضع، اردو کے انشاء پرداز، دینی بصیرت رکھنے والے، تاریخ اسلام کے عالم تھے، اور ندویوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے، جو لوگ مرحوم کو قریب جانتے تھے، ان کی شریف النفسی، تواضع، انکسار، دوستوں کی قدردانی سے واقف تھے مولانا نے قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تعلیم کا ایک آسان نصاب مرتب کیا تھا، اور عربی کے دس سبق سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا یہاں بھی ان کے شاگردوں نے اس کے ذریعہ قرآن حکیم کی تعلیم کی اشاعت کا کام کیا اللہ تعالےٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور اپنے جوار رحمت میں مقام خاص عطا فرمائے آپ مرحوم کے اہل خانہ تک میری تعزیت پہنچا دیں۔

آپ کا مخلص۔ محمد ناظم ندوی

(سابق پروفیسر مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب)

مولانا افتخار فریدی کا
ایک مکتوب

مراد آباد۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۹ء

محترم و مکرم جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب السّلام علیکم

کرم نامہ ملا، جزاکم اللہ! دسمبر کا معارف نہیں ملا، مجھے معارف میں صرف آپ کے شذرات کے دیکھنے کا اشتیاق رہتا ہے، مدرسہ امدادیہ سے منگا کر دیکھا، ماشاء اللہ، آپ نے ملت کی پوری تاریخ چند سطروں میں جس جامعیت کے ساتھ تحریر فرمائی ہے، پڑھ کر آپ کے لیے دل سے دعا نکلی، کاش آپ اسے ذرا اور وسعت سے مرتب فرما دیں تو ہم جیسے عامیوں اور نونہالان ملت و طلبہ کے لیے بہت ہی مفید ہوگی، مدارس کے کورس کے لیے بھی، کاش کہ اس کا ترجمہ انگریزی و عربی میں بھی ہو سکے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی مثل کہی جاتی ہے، مگر سات سمندر کو کوزے میں بند کرنا آپ ہی کے قلم مبارک کا کمال و برکت ہے، بندہ اس لائق تو نہیں لیکن آپ کے کریمانہ اخلاق نے یہ جرأت دلائی کہ اس میں چند نام اس دور آخر کے اور ہونے چاہئیں، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی جوہر، حسن بنا، مفتی امین الحسینی، امیر شکیب ارسلان، سعید نورسی، مولانا محمد الیاس شیخ التبلیغ، شیخ سنوسی، انور پاشا، غازی عبد الکریم ریفی، نادر شاہ کے ساتھ احمد شاہ ابدالی جوڑ نہیں، یہ تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے منشا سے نجیب الدولہ کے ذریعہ مرہٹوں کے طوفان کو شانے کے لیے آئے تھے، اسپین میں محمد بن تومرت موحدین، تاشقین نے تو اسپینی مسلمانوں کی عمر دو سو سال

بڑھائی، ان کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ حضرت امام غزالی کی کارگزاری تھی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے لے کر سلطان عبدالحمید خاں تک خلافت مسلسل چلتی رہی مصطفیٰ کمال نے اسے توڑا اس سے بڑا حادثہ ملت کی تاریخ میں کوئی دوسرا نہیں ہے، اس اعتبار سے یہ صدی پچھلی تمام صدیوں سے ملت کی بربادی میں بڑھ گئی، خلافت، اسرائیل، بیت المقدس کا نکلنا، بیت اللہ کا حادثہ ایسے ہولناک اور تباہ کن حادثے کسی صدی میں نہیں ہوئے، آپ کو اس میں ذرا وضاحت سے لکھنا چاہئے۔

انگریزوں نے یونان کی، مصطفیٰ کمال کے مقابلہ میں اسی لیے نہیں کی کہ خلافت کے توڑنے کا معاملہ طے کر لیا تھا، وہ دلی سالہ کے نومسلم یہودیوں نے سلطان عبدالحمید خاں کو تخت سے اس بنا پر اتارا، یہودی کو فلسطین کی زمین دینا گوارا نہیں کیا جا سکتا ہے، عباسی صاحب کی تحریک خلافت آپ نے ملاحظہ فرمائی، کاش شبلی و سید کی ارواح کو چین پہونچانے کا شرف آپ کو ملے۔

افتخار فریدی

معارف:- احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں اپنے آخری حملہ میں مرہٹوں سے پانی پت میں لڑا، اس سے پہلے وہ اپنے متواتر حملوں میں مسلمانوں ہی سے لڑتا رہا، ۱۷۵۶ء کے حملہ میں دہلی میں داخل ہو کر اس کو دو مہینے تک ایسا لوٹتا رہا کہ نادر گردی بھی بھلادی گئی، پانی پت کی فتح کے بعد جب دہلی آیا تو مورخین لکھتے ہیں کہ یہاں اتنا مال حاصل کیا جو تصور میں نہیں لایا جا سکتا ہے، وہ یہاں حملہ آور ہو کر ایک ابدالی یا درانی خاندان کی حکومت کا بانی ہو جاتا تو اس کے حملے کا جواز نکل سکتا تھا، مگر وہ یہاں آتا لوٹ مار کر کے واپس چلا جاتا، اس لیے اس کا شمار نادر شاہ ہی کی صف میں ہونا چاہئے۔

••••••<<❀>>••••••

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ ادبیات اردو پر ایک نظر

از

ڈاکٹر قدسیہ نوار الحسن صاحبہ الٰہ آباد

علم و ادب کے شائقین کے لئے یہ بات بڑی خوشی کی ہے کہ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ مرتب کی ہے، اور انیس جلدیں اسکی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، عرصہ سے ایک ادبی انسائیکلوپیڈیا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، پنجاب یونیورسٹی اس کی اشاعت پر اربابِ علم و ادب کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہے،

اس سلسلہ کی پہلی جلد مقدمہ پر مشتمل ہے، اس میں ہند و پاک کے تہذیبی، علمی، رفتی اور تعلیمی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد میں ۷۱۲ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عربی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد فارسی ادب سے متعلق ہے، اس میں ۱۰۰۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے فارسی ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے، چھٹی، ساتویں، آٹھویں نویں اور دسویں جلد اردو ادب کے بارے میں ہے، اس میں ۱۲۰۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کی ادبی سرگذشت ہے، گیارہویں اور بارہویں جلد بنگالی ادب پر مشتمل ہے، تیرہویں اور چودہویں جلد مغربی پاکستان کے علاقائی ادبیات پر، پندرہویں جلد اشاریہ اردو ادبیات، سولہویں جلد اشاریہ بنگلہ ادبیات

سترھویں جلد اشاریہ علاقائی ادبیات، اٹھارھویں جلد اشاریہ فارسی ادبیات، انیسویں جلد اشاریہ عربی ادبیات پر ہے،

اس تاریخ کی تکمیل میں ارباب علم و ادب نے خاصی محنت کی ہے، اس کو ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر عبد القیوم، ڈاکٹر وحید مرزا، پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، پروفیسر وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر وقار عظیم، سید فیاض محمود، ڈاکٹر سید علی اشرف، عبد الغنی، رحمٰن ملک، اور زیادہ تر دوسری نے ایڈیٹ کیا ہے کوئی بھی علمی و تحقیقی کام نقائص سے پاک نہیں ہوتا، متفرق مواد کی یکجائی، اور کتابوں کی ورق گردانی میں غلطیوں کا رہ جانا ناگزیر ہے، اس وقت ہمارے پیش نظر تاریخ ادبیات اردو ہے، اس کی بعض اہم فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلانا ہے، جلد نمبر ۲ ادبیات اردو اول ص ۲۳ پر اکبر کے عقائد کے بارے میں عبد القادر بدایونی کے مقابلہ میں رائے چودھری وغیرہ کے بیان پر اعتماد کرنا نامناسب ہے، رائے چودھری کی کتاب "دین الٰہی" تحقیقی نقطۂ نظر سے غلط بیانیوں اور جھوٹ کا مجموعہ ہے، سنجیدہ علمی حلقہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں، اس کے علاوہ اکبر کا دین الٰہی اسلام کے بالکل ہی متوازی مذہب تھا، اس کو محض بدعت کبیرہ سے تعبیر کرنا مداہنت اور ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہے، عامۃ المسلمین کو عوامۃ المسلمین لکھا گیا ہے (ایضاً ص ۲۴) جامعۂ ازہر مصر کو صرف الاظہر تحریر کیا ہے، اس میں املا کی غلطی کے علاوہ صرف ازہر لکھنے سے عام آدمی کا ذہن اس جامعہ کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا، وہاں کے جو شیوخ ترجمۂ قرآن کو گناہ خیال کرتے تھے، ان کے نام اور حوالے تحریر کرنا چاہیئے تھا، تاکہ مراجعت میں سہولت ہوتی، (جلد، ص ۲۶۲) شاہ حاتم کے حالات میں لکھا ہے کہ پہلے وہ رمزی تخلص کرتے تھے، حالانکہ ان کا تخلص رمز تھا، ان کی شاعری کا آغاز ۱۱۲۹ھ یا ۱۱۳۰ھ سے ہوا، حاتم کی ولادت بالاتفاق ۱۱۱۱ھ میں ہوئی، ان کی ۱۱۶۴ھ کی غزل کا ایک شعر ہے،

اڑتیس برس ہوئے کہ حاتم ۔۔۔ مشاق قدیم ریختہ گو ہے

اس سے ان کا آغاز شاعری ۱۱۲۹ھ کے بجائے ۱۱۲۶ھ متعین ہوتا ہے، (ایضاً جلد نمبر ۶ ص ۳) دیوان بقا

کے مرتب کا نام مرزا صباح الدین لکھا ہے، جبکہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہونا چاہیے، یہ دیوان ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا، (ایضاً ص ۲۳۱) شاہ رؤف احمد رافت مجددی کی جائے پیدائش لکھنؤ لکھی ہے، یہ صحیح نہیں، ان کی ولادت رامپور میں ہوئی، تذکرہ کاملانِ رامپور وغیرہ میں بھی یہی درج ہے، مقالہ نگار نے رافت تخلص اور رامپوری نسبت لکھنے کے بجائے سرہندی تحریر کر دیا ہے، اس کی وجہ سے ان کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہوتا، کیونکہ ۱۱۲۰ھ میں جب سکھوں نے سرہند کو تاخت وتاراج کیا تو اس خاندان کے چشم وچراغ شاہ شعور احمد مجددیؒ (والد بزرگوار رافت) رامپور تشریف لے آئے، اس طرح مجددی خاندان کا مسکن ومامن رامپور بن گیا، تاہم رافت کا تعلق حضرت مجدد سرہندیؒ سے تھا، (ایضاً ص ۳۴۹) خلیق احمد نظامی کو خلیق دہلوی لکھا ہے، (ایضاً ص ۲۳) مخدوم اشرف جہانگیر سمانی لکھا ہے، صحیح سمنانی ہے، اسی طرح "جہاں تک تحقیق ہو" غلط ہے "تحقیق ہو سکی" (ایضاً ص ۴۰۴) مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمۂ قرآن کا نام موضح القرآن غلط لکھا ہے صحیح نام موضح القرآن ہے، (ایضاً ص ۱۰۴)

جلد ۸، (ادبیات اردو سوم) ص ۱۰۹، مفتی صدر الدین خاں آزردہ کا تذکرہ چند سطروں میں کر دیا گیا ہے، وہ بڑے صاحب علم وفضل اور جنگ آزادی کے مجاہد تھے، اس لئے ان کا ذکر تفصیل سے کرنا چاہئے تھا، ان کے متعلق لکھا ہے کہ "نثر میں ان کی یادگار صرف چند خطوط ہیں"، جبکہ ان کا فارسی واردو کلام "خمخانۂ جاوید، آثار الصنادید، اور گل رعنا وغیرہ میں ملتا ہے"، بلکہ سرسید مرحوم نے آثار الصنادید میں انکے چند عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں، ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو نامہ کراچی بابت اپریل ۱۹۶۳ء میں آزردہ کا کچھ اردو کلام جمع کرکے شائع کیا تھا، اور حال ہی میں عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے آزردہ پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اس میں ۱۳ غزلیں، ایک شہر آشوب اور کچھ متفرق اشعار دیئے ہیں، ان کے جس فارسی تذکرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "اب ناپید ہے" اس کے

[illegible] ۴۴ صفحات کا ایک قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، ڈاکٹر مختار الدین احمد
آرزو نے سہ ماہی تحریر دہلی میں اس کا مفصل تعارف کرایا ہے (ملاحظہ ہو جلد نمبر ۴ شمارہ ۲ سنہ ۱۹۷۱ء).
مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کا نام مدرسہ علوم تحریر کیا ہے، (جلد ۹ ص۲۵) دیوبند میں مدرسہ رحیمیہ
دہلی کا نصاب تھا کے بجائے درس نظامی ہونا چاہیے (ایضاً ص۲۶) لکھا ہے کہ بریلوی پارٹی نے شدت
سے قدیم حنفی طریقوں کی حمایت پر کمر باندھی" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب حنفی کی ترویج و اشاعت
میں اصل حصہ اسی جماعت کا ہے، جو صحیح نہیں ہے، حنفی مسلک کی اشاعت میں علمائے دیوبند نے بھی بڑا
حصہ لیا ہے، مگر بریلوی جماعت کو علمائے دیوبند سے شدید اختلاف ہے، (ایضاً ص۲۹) آسان و سہل
مکتوب نگاری کا سہرا یقیناً غالب کے سر ہے، لیکن سرسید، حالی، اکبر اور شبلی کے خطوط کو ان کے خطوط کے ہم پایہ نہیں
کہا جا سکتا، ان سب میں صرف مولانا شبلی کے خطوط میں رنگینی و بے تکلفی ہے، اور ان کے کچھ خطوط تو بالکل
ہی غالب کے رنگ میں ہے، (ایضاً ص۶۲) آثار الصنادید کی صرف دو اشاعتوں ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۴ء کا ذکر کیا گیا ہے
جبکہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۲ء میں چھپا تھا، ۱۸۵۴ء غلط ہے، حال ہی میں
اس کا ایک ایڈیشن پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر معین الحق کے مقدمہ اور حواشی کے
ساتھ شائع ہوا ہے، جس کی وجہ سے اس کی ضخامت دوگنی ہو گئی ہے، (ایضاً ص۶۳) لکھتے ہیں کہ قاضی [illegible]
کے حالات مطبع معارف مارچ ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا، اس کو رسالہ معارف اعظم گڑھ لکھنا چاہیے تھا
نیز "یہ مضمون مقالات شیرانی میں شامل تھے" مقالاتِ شیرانی کے بجائے مقالاتِ شیروانی
اور "تھے" کے بجائے تھا ہونا چاہیے، (ایضاً ۱۲۱) ڈاکٹر عبد القیوم نے حالی کی حیاتِ جاوید
کے نقائص واضح کیے ہیں، اور بعض دوسرے اہل قلم کو بھی ان کے اسلوبِ نگارش پر اعتراض ہے، ایسی
صورت میں شبلی کے اس کو "کتاب المناقب" یا "دلّل مداحی" کہہ دینے پر کیوں برہمی ظاہر کی گئی ہے، یہ دہرا
معیار ٹھیک نہیں، (ایضاً ص۱۲۹) حدیث کی مشہور کتاب سنن ترمذی کو سنن ترمذی لکھا گیا ہے
(ایضاً ص۱۳۰) لکھتے ہیں کہ الفاروق کا عربی ترجمہ شائع ہو گیا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، (ایضاً ص۱۳۲)

لکھتے ہیں "شعر العجم (شبلی) کا پانچواں حصہ جو ان کی تحقیقات کا نچوڑ ہے، فارسی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکا ہے" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو دوسرے حصوں کے ترجمے کا حال معلوم نہیں، صحیح یہ ہے کہ شعر العجم کے پانچوں حصے فارسی میں ترجمہ ہو کر ایران سے شائع ہو چکے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۰۰) عبدالرزاق کانپوری کی البرامکہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "البرامکہ ایک قابل قدر اضافہ ہے، جو عہد سرسید نے اردو سوانح میں کیا" یہ کتاب عہد سرسید کے بعد تحریر کی گئی، اس لئے اس کو اس عہد کی تصانیف میں شمار کرنا صحیح نہیں، البتہ سرسید نے اردو میں جس سلاست نگاری کی بنیاد ڈالی اس کا یہ نمونہ ہے۔ (ایضاً ص ۱۰۵) لکھتے ہیں "شبلی نے جہانگیر اور تزک جہانگیری کے عنوان سے یوں تصریح کیا ہے تصریح کی ہو لکھنا چاہئے تھا (ص ۱۰۹)

جلد نمبر ۱۰ (ادبیات اردو پنجم) ص ۲۴۲ پر لکھا ہے "علامہ شبلی کی وفات اسی صدی کا واقعہ ہے، مگر تعجب ہے، کہ مختلف اہل قلم نے سنہ وفات تک کے بیان میں اختلاف کیا ہے" حالانکہ ان کی وفات ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کے بارے میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، خطبات مدراس کے سلسلہ میں حاشیہ میں تحریر ہے "کتاب کا پہلا حصہ ۱۹۱۵ء میں مکمل ہو گیا تھا، (ایضاً ص ۲۵۲) یہ بالکل غلط ہے "خطبات مدراس" صرف ایک ہی جلد میں ہے جو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرت نبوی پر دیئے گئے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، تفصیل کے لئے حیات سلیمان ص ۲۵۹ دیکھئے، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" کا سنہ اشاعت ۱۹۹۱ء لکھا ہے، جب کہ ۱۹۶۱ء صحیح ہے، یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے، مگر بہت افسوسناک ہے (ایضاً ص ۲۵۸) مولانا حفظ الرحمٰن کا نام مولانا حفیظ الرحمٰن لکھا ہے، (ایضاً ص ۳۶۲) مولانا حاجی معین الدین ندوی کی کتاب مہاجرین کی ۳ جلدیں نہیں دو ہی جلدیں ہیں، (ایضاً ص ۳۷۱) عبدالرزاق قریشی کی کتاب "مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا اردو کلام" پی، ایچ ڈی کا مقالہ نہیں ہے، یہ کتاب پہلے بمبئی سے اور

حسن کی حیات مولانا محمد یوسف، عبداللطیف اعظمی کی حیات عبدالحق، محمد ظہیر الدین کی محمود گاواں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ... ، سید شہاب الدین دسنوی کا ترجمہ محمد علی جناح، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ڈاکٹر سید محمود، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی حیات عبدالحیٰ، پروفیسر جلیل الرحمٰن کی ابن الطیب متنبی، ڈاکٹر سید وحید اشرف کی حیات سید اشرف جہانگیر سمنانی، مولانا عبدالسلام ندوی کی حکمائے اسلام، مفتی رضا انصاری کی بانی درس نظامی، قاضی عبدالغفار کی حیات اجمل، غلام محمد کا تذکرۂ سلیمان، یوسف کوکن عمری کی حیات ابن تیمیہ، مولانا ظفر احمد عثمانی کی حیات منصور حلاج، ممتاز علی آہ کی سیرت امیر مینائی، محمد ایوب قادری کی مولانا احسن نانوتوی، عزیز الرحمٰن جامعی کی رئیس الاحرار، مولانا شاہ معین الدین ندوی کی حیات سلیمان، معارف سلیمان نمبر، مولانا منظور نعمانی کا تذکرہ حضرت مجدد الف ثانی، خورشید مصطفیٰ رضوی کی حیات ذاکر حسین وغیرہ (ایضاً ص ۶۱۲) قلمی خاکوں اور جھلکیوں کے ضمن میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی یاد رفتگاں، ضیاء الدین برنی کی عظمت رفتہ اور رئیس احمد جعفری کی دید و شنید کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ (جلد ۱، ص ۶۱۴) ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی آپ بیتی 'یادوں کی دنیا' کا ذکر بھی نہیں کیا گیا، حالانکہ یہ کتاب سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، حیرت ہے کہ جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات کا ذکر ہے جبکہ سنجیدہ سوانح عمریوں میں اس کا شمار مشکل ہے (ایضاً ص ۶۲۱) مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے مکاتیب کا جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس کا صحیح نام مکتوبات سلیمانی ہے، اس کو دو جلدوں میں صدق جدید بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے (ایضاً ص ۶۴۳) "شعرائے اردو کے تذکرے" کے مصنف کا نام ڈاکٹر محمد حنیف فوق تحریر کیا گیا ہے، ان کا نام حنیف نقوی ہے، (ایضاً ص ۷۰۵) ۱۸۵۱ء رضا برسی کی کتاب

"اردو صحافت" ایک کے بجائے تین جلدوں میں ہے۔ (ایضاً ص ۲۲۰) "اسلام اور غیر اسلامی مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر محمد نذیر کی نہیں ڈاکٹر محمد عزیر کی تصنیف ہے۔ (ایضاً ص ۲۴۰) الادب المفرد امام باری کی نہیں امام بخاری کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ (ایضاً ص ۲۲۲) بلوغ المرام کو بلوغ الحرام تحریر کیا ہے، عجالۂ نافعہ مع شرح فوائد جامعہ کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تصنیف بتایا ہے، حالانکہ شاہ صاحب کے رسالہ کا نام صرف عجالۂ نافعہ ہے، یہ نام مولانا عبدالحلیم چشتی کی شرح کا ہے، اس میں پہلے اصل فارسی متن، پھر اس کا اردو ترجمہ اور آخر میں شرح درج ہے، لیکن مقالہ نگار نے مولانا عبدالحلیم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ (ایضاً) اصح السیر کے مصنف مولانا حکیم عبدالرؤف دیناپوری نہیں داناپوری ہیں۔ (ایضاً ص ۲۴۱) عبدالعظیم شرف الدین کی عربی کتاب کا نام "حیات ابن القیم لکھا ہے، جب کہ حیات ابن قیم ہے۔ (ایضاً ص ۲۴۳) تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نہیں بلکہ یہ ان کی سوانح حیات ہے، اس کے مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ہیں (ایضاً ص ۲۴۴) سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ (ایضاً ج ۲، ص ۲۵۴) اقبال کنانی کے مصنف ظہیر الدین جامعی کو ظہور الدین الجامی تحریر کیا گیا ہے (ایضاً ج ۲، ص ۸۰) اقبال امام ادب کے مصنف رئیس احمد جعفری ہیں نہ کہ انیس احمد جعفری (ایضاً ج ۲، ص ۸۰) مولانا عبدالسلام ندوی کی تصانیف میں "عمر خیام" کو شامل کیا گیا ہے، جب کہ یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب ہے، اسی طرح تاریخ التشریع الاسلامی کے مصنف شیخ الخضری ہیں نہ کہ محمد ظفری (ایضاً ج ۲، ص ۳۰۶) اسلام کا قانون فوجداری مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف نہیں بلکہ اردو ترجمہ ہے۔ (ایضاً)

اردو ادبیات کی پندرہویں جلد اردو ادبیات کے اشاریہ پر مشتمل ہے یہ اشاریہ مفصل ہے اور اس میں اخبارات و رسائل، ادارے، ادبی اصطلاحات، ادوار، اشخاص، اصنافِ ادب، اقوام و قبائل، السنہ، امکنہ، تعلیم و تدریس، تحریکات، تہذیب و تمدن، تہوار، روایات شعر و شاعری، علوم و فنون، عمارات، کتب، مناصب اور واقعات کے تحت الگ الگ اشاریے دیئے گئے ہیں، ذیل میں صرف کتابوں کے اشاریے کی غلطیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے،

اخلاقِ جلالی کو جلال الدین سیوطی کی تصنیف لکھا گیا ہے، دراصل نام میں مشابہت کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی ہے، یہ علامہ جلال الدین دوانی کی مشہور کتاب ہے (۳۳۰) اردو ادب کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی محرکات، (ڈاکٹر محمد حنیف فوق لکھا ہے، جبکہ محمد حنیف نقوی لکھنا چاہیئے، (ص ۳۳۱) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب کا نام ایک جگہ "اردو ادب کے مکتوبی ادب کا ارتقاء" اور دوسری جگہ "اردو میں مکاتیب نگاری کا ارتقاء" لکھا گیا ہے، آخر الذکر صحیح ہے، (۳۳۴) اسلام کا سیاسی نظام کے مصنف کا نام نہیں لکھا گیا، اس کے مصنف مولانا محمد اسحق سندیلوی ہیں، (ص ۳۳۰) اشرف السوانح کے مصنف خواجہ عزیز الحسن مجذوب ہیں، (ص ۳۳۰) اسی طرح الرائی الصحیح فی من ھو الذبیح نہیں الذبیح لکھنا چاہیئے، (ص ۳۴۱) العلم والعلماء، یہ علامہ ابن عبد البرؒ کی تصنیف جامع العلم و فضلہ کا ترجمہ ہے، جو مولانا ابو الکلام آزاد کے ایماء سے مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی نے کیا تھا، (ایضاً) انوار العیون کے مرتب شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ ہیں، یہ شیخ عبد الحق ردولویؒ کے حالات و ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس کا ایک اچھا قلمی نسخہ ذخیرہ عبد السلام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے، انوار العیون کا اردو ترجمہ در مکنون کے

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخی مقالات : مرتبہ جناب محمد اسلم صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر صفحات ۲۰۸

مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ روپے، پتہ :- ندوۃ المصنفین، ۹۵۰، دین، سمن آباد، لاہور۔

جناب محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی کا نام علمی حلقوں کے لئے نامانوس نہیں ہے، ان کے
ظر علمی و تاریخی مضامین کے مجموعہ میں تیرہ مضامین درج ہیں پہلے مضمون میں اس مشہور اور زبان زد قصہ کی
دید کی گئی ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکر کے حبالۂ عقد میں سلطان غیاث الدین بلبن کی کوئی صاحبزادی تھیں" آخری
مون میں حضرت داتا گنج بخش کی لاہور میں آمد کا جو سنہ بتایا جاتا ہے اس کو اور آمد متعلق واقعہ کو بے سر و پا ثابت کیا ہے
مضمون میں اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا حصہ دکھایا ہے، اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی
ان کے خلفاء و اولاد کا خاص طور پر ذکر ہے، مقالہ نگار کے خیال میں دارا شکوہ کے الحاد و بدعقیدگی کی وجہ
ے دین پسند طبقہ کی تائید و حمایت اورنگ زیب کو حاصل ہو گئی تھی، چند مضامین میں نادر اور اہم کتابوں کا تعارف
ور ان کے مصنفین کے حالات درج ہیں بعض مضامین میں مسلمانوں کی جغرافیائی، علمی اور تعمیری خدمات اور فن حکمرانی
وسیقی سے دلچسپی کا ذکر ہے، مگر یہ مختصر ہیں جس کا پیش لفظ میں پروفیسر شیخ عبد الرشید نے بھی ذکر کیا ہے، ان موضوعات
ستقل کتابیں اور مفصل مقالے پہلے سے موجود ہیں، مصنف نے ان پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا، کہیں کہیں انداز تحریر
یستگی کے خلاف ہے، جیسے "مؤرخین نے بلبن کی جس درویش نوازی کا بڑے زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹا ہے"
(۲) اسی طرح حضرت داتا گنج کے لاہور آنے کے متعلق فوائد الفواد کی ایک روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ روایت
ت سے تذکروں میں پائی جاتی ہے کہ اب ہر شخص بلا چون و چرا اسے تسلیم کر چکا ہے اور اس کا منکر بدعقیدہ اور بدمذہب ہونے کی تہمت
ں بچ سکتا" (۲۰۰) اس روایت کے بے اصل ثابت کرنے کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں حضرت داتا گنج کو ایک جگہ
خ علی ہجویری، دوسری جگہ خواجہ ہجویری تیسری جگہ علی ہجویری لکھا گیا ہے، اگر اس طرح روایتیں بے اعتبار ہونے لگیں تو

کوئی روایت مستند نہیں ہو سکتی تو زیر نظر [illegible] صفحہ پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا نام تین طرح سے لکھا گیا ہے، سلطان المشائخ [illegible] سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء، کیا اس کی وجہ سے اس تحریر کو بے اصل اور الحاقی قرار دیا جا سکتا ہے

ابن کثیر۔ مرتبہ ڈاکٹر مسعود الرحمن خاں ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات [illegible]

قیمت [illegible] پتہ شعبۂ نشر و اشاعت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

حافظ ابن کثیرؒ آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز علما میں تھے، ڈاکٹر مسعود الرحمن خاں ندوی نے ان پر عربی زبان میں تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، اس مقالہ کا ابھی پہلا حصہ شائع ہوا ہے، اس کے شروع کے تین ابواب میں ابن کثیر کے زمانہ کی علمی، فکری، سیاسی اور تمدنی حالت ان کے نسب، خاندان، اسرہ اور وطن کے متعلق معلومات اور ان کی تعلیم و تربیت، علمی سفر اور اساتذہ وغیرہ کا تذکرہ ہے، چوتھا باب ابن کثیر کے کارناموں پر مشتمل ہے، اس میں ان کے درس، تصنیفات، شاعری اور تلامذہ کا ذکر ہے، لائق مصنف نے ابن کثیر کی تصنیفات کو خاص ماخذ بنایا ہے، اس طرح اس میں ان کے بعض ایسے شیوخ، تلامذہ اور تصنیفات کا بھی ذکر ہے جن سے قدیم تذکرے خالی ہیں، مصنف نے بعض غلط واقعات کی تردید اور مختلف روایتوں میں جمع و تطبیق بھی دی ہے، ان کی محنت لائق تحسین ہے مگر پہلا باب مختصر ہے، اس میں ابن کثیر کے پرآشوب دور کا اور مفصل ذکر ہونا چاہئے تھا،

ضروری تصحیح۔ گذشتہ شمارہ کے آخری صفحہ پر کتابت کی غلطی سے یہ چھپ گیا ہے "سیرت شامی کوئی کتاب نہیں" اس کو یوں لکھا گیا تھا "سیرت شامی کوئی قدیم کتاب نہیں" کیونکہ محمد بن یوسف (م ۹۴۲ھ) کی کتاب سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد کا شمار قدیم کتب سیر میں نہیں ہوتا، یہ سیرت شامی کے نام سے مشہور اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس نمبر میں اس کی تصحیح کی جانے والی ہی تھی کہ معارف کے دیرینہ کرمفرما اور نامور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پیرس سے اپنے مکتوب گرامی میں اس کی جانب توجہ دلائی جس کے لیے ہم ان کے بہت شکر گذار ہیں، ان ہی سے معلوم ہوا کہ اگر چھپی تو دس بارہ جلدوں میں آئے گی۔
(ض)

جلد نمبر ... فروری سنہ ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت پندرہ روپے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلس ادارت

جلد ۱۲۵۔ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۰ء ۔ عدد ۲

مضامین

مقالات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

ندوۃ العلماء کے ناظم، دارالمصنفین کی روحِ رواں، ہندوستان کے جید عالم، عربی اور اردو کے ولنواز ادیب و انشاپرداز، عالمِ اسلام کے نامور مصنف اور خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس سال شاہ فیصل ایوارڈ ملا ہے، جو اسلامی ممالک کا گویا نوبل پرائز ہے،

سعودی عرب کے سابق فرمانروا شاہ فیصل شہید پر دنیا کے مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے، وہ اپنی اسلامی حمیت اور غیرت کے لحاظ سے فخرِ اسلام تھے، اُن ہی کی یاد میں یہ ایوارڈ قائم ہوا ہے، اس کا پہلا ایوارڈ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دیا گیا، دوسرا جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ملا جس سے نہ صرف اُن کی ذاتِ گرامی بلکہ ہندوستان کے نام کو بھی اسلامی ممالک میں فضیلت حاصل ہوئی، اب تک ہندوستان کی تین جلیل القدر شخصیتوں کو نوبل پرائز بھی مل چکے ہیں، سر رابندرناتھ ٹیگور کو اُن کے شعری اور ادبی کارنامے، سر سی وی رمن کو اُن کی سائنسی تحقیقات اور ابھی مدر ٹریسا کو اُن کی انسانی ہمدردی و خدمات پر، اس انعام سے نوازا گیا، ہندوستان کو ان تینوں شخصیتوں پر فخر ہے، تو اب اس کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جلیل القدر ہستی پر بھی ناز ہے کہ شاہ فیصل ایوارڈ سے اُن کے علم و فضل کا اعتراف اسلامی دنیا میں کیا گیا،

وہ اس وقت نہ صرف علم کی آبرو ہیں بلکہ اپنی گوناگوں ذاتی خوبیوں کی وجہ سے عطرِ مجموعہ ہیں، نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، پاک دل، اور پاکباز، ع:

اُن کی ادا دل فریب، اُن کی نگہ دل نواز

وہ اپنی گفتار کی شان اور کردار کی آن میں ان بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو دین کے بُرہان رہے ہیں، وہ ایام کے مرکب کبھی نہیں بنے بلکہ اس کے راکب بن کر زندگی بسر کر رہے ہیں،

وہ بڑے اچھے خطیب اور بڑے اچھے اہلِ قلم بھی ہیں، اردو میں بولنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صداقت، عدالت اور پیامِ انسانیت کا درس دے کر اپنے سامعین کو دنیا کی امامت کے لئے تیار کر رہے ہیں، عربی میں بولتے ہیں تو اپنے مغلوب گمان حاضرین کے دل میں یقین پیدا کرتا چلا جاتا ہے کہ

محبت کی زبان، معارجات اور دنیا کی عزت و ناموس کے پاسبان ہیں، اُن کی تقریریں قلمبند کردی جاتی ہیں تو ان میں دل نشین تحریروں کی لذت ملتی ہے، اور پھر اُن کی بعض تحریریں ایسی بھی ہیں جن کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دل پذیر تقریر سامعہ نواز ہو رہی ہے، ان کا شمار اس وقت اسلامی ممالک کے ممتاز ترین خطیبوں میں ہوتا ہے،

اُن کے قلم کی گل فشانیاں بہت سی کتابوں میں ظاہر ہو چکی ہیں، اُن میں نغمۂ عشرت بھی ہے اور نالۂ ماتم بھی، سرمایۂ گداز بھی ہے، اور نوائے درد بھی، وہ جب کوئی چیز اردو میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے پر یہ اثر طاری ہوتا ہے کہ وہ اُن کے ضمیر الا میں چراغ آرزو روشن کر رہے ہیں، عربی میں لکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث سوز و سازِ زندگی بیان کر رہے ہیں، شام کے مشہور ادیب علی طنطاوی نے لکھا ہے کہ وہ ان کی عربی نثر میں کھویا ہوا نغمہ پاتے ہیں اور بے ردیف و قافیہ کی شاعری بھی،

ان کی شہرت سیرت سید احمد شہید سے پھیلی جس میں یہ پیام ہے کہ دنیا میں ثبات زندگی ایمان محکم ہی سے ہے اور ایک راسخ مسلمان تنہا رہ کر کس طرح کوہ و بیاباں سے گذر سکتا ہے، اور بقول استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھوں میں رشد و ہدایت اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ ہے، انھوں نے اس کا عطر کھینچ کر عربی ممالک کے لئے عربی میں بھی إِذَا هَبَّتْ رِيحُ الْإِيمَانِ کے نام سے پیش کیا، جو اردو میں "جب ایمان کی بہار آئی" کے عنوان سے شائع ہوئی،

ان کا رسالہ "مذہب و تمدن" وہ مقالہ ہے جو ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک منتخب جلسہ میں پڑھا گیا، اس میں انھوں نے اس وقت اپنے سامعین کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ اگر اُن کو زندہ رہنا ہے تو اُن کو موجودہ مادی تمدن کے دریا کے رخ کے خلاف تیرنا پڑے گا، بلکہ اس کا رُخ بھی پھیرنا ہوگا، اُن کو اپنے افکار و خیالات اور رسوم و عادات کی سب سے پہلے قربانی دینی ہوگی، جو مادی تمدن اور نظام حیات میں رہنے کی وجہ سے اُن کی زندگی کا جزو بن گئی ہیں، یہی پیام وہ اپنی پوری زندگی میں دیتے رہے ہیں،

عربی میں ان کی ایک اہم تصنیف "مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِيْنَ" ہے جس کا اردو ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" ہے، اس میں انھوں نے بڑی دلسوزی اور [illegible] سے اس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں میں جب حاسۂ مذہبی اور خدا طلبی کا عالمگیر فقدان ہوا

اور دنیا بھی کئی بحرانوں میں مبتلا ہے، تو چوٹوں کی بے حقیقت پست خیالی سے کوئی انسانی عقل و دل
گیا، مگر وہ یہ بھی پیغام دیتے ہیں کہ ان کی خاکستر میں اب بھی شرار آمادہ ہے، وہ خواب گراں سے نکل کر
اشکِ صبح گاہی سے وضو کریں تو اب بھی ناموسِ ازل کے امین بن کر معمار جہاں بن سکتے ہیں، یہی صدا ان کے
دل سے برابر اٹھتی رہی،

اُن کی کتاب "مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت" میں اس دعوت تبلیغ کے عملی اصول اور
اس تبلیغ کے عملی آئین کا ولولہ انگیز تذکرہ ہے جس سے نام کے مسلمان، کام کے مسلمان اور قومی مسلمان اصلی مسلمان بن سکتے ہیں،
۱۹۵۱ء میں مصر، سوڈان، شام اور فلسطین کے سفر پر گئے، تو انھوں نے عربی میں اپنا سفرنامہ
مُذکراتِ سائحٍ فی الشرقِ العربی کے نام سے لکھا جس کو جماعۃ الازہر للتالیف والترجمہ
والنشر نے شائع کیا، اردو میں مزید اضافہ کے ساتھ یہ شرق اوسط کی ڈائری کے نام سے چھپا،
اس سفر میں وہ اسلامی تحریکات کے داعیوں، عالموں، مفتیوں، تعلیمی اداروں کے استادوں، طالب علموں
اور حکومتوں کے عہدیداروں سب ہی سے ملے، وہاں کی علمی مجلسوں میں جو تقریریں کیں یا جو مضامین
پڑھے، یا وہاں کے لوگوں سے جو باتیں کیں، ان سب میں اُن کے سوز دل کی وہی چنگاریاں ہیں جو اُن
کے دل میں برابر بھڑکتی رہتی ہیں، اُن کے دو اور سفرنامے دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں اور دریائے
کابل سے دریائے یرموک تک ہیں، ان میں بھی ان ممالک کی ذہنی اور روحانی کشمکش کا
محاسبہ ہے، وہ دارالعلوم دیوبند میں ایک مقالہ پڑھنے کے لئے مدعو کئے گئے تو انھوں نے اپنے مقالہ
طالبانِ علوم نبوت کا مقام" میں دورِ جدید کے فتنوں کی طرف توجہ دلاکر اُن کو یہ پیغام دیا
کہ نئے ماحول کی ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست کھانا مردوں کا کام نہیں، یہ ایک
رسالہ کی صورت میں بھی شائع ہوا،

اسی زمانہ میں انھوں نے یو پی کے مختلف شہروں میں تقریریں کیں جن میں یہ بتایا کہ دنیا پر
خود غرضی اور بد اخلاقی کا افسون چھایا ہوا ہے، اسے جادوروں سے نہیں روکا جاسکتا ہے، مگر ہم اپنے
کو اس طرح سنوار سکتے ہیں، کہ ہم انسانیت کا درد محسوس کریں، اور اپنے ملک کو ایک نمونہ کا ملک

بنا دیا جس میں ایمان ویقین، اخلاق، ہمدردی، اور ایثار کی فضا ہو، ان تقریروں کا مجموعہ

پیامِ انسانیت کے نام سے طبع ہوا، اور یہ پیام اُن کی رگِ جاں بن گیا ہے،

ان کی تاریخِ دعوت و عزیمت میں ایک قلم کی رعنائی اور تحریر کی رعنائی سے ان کے ایمانی جوش کے وولولے انگریزی

کچھ اس طرح نمایاں ہوئی ہے کہ اس کی تین جلدیں جاودانی میں مردوں کے لئے شمشیر بن گئیں، ایک ترجمہ انگریزی اور عربی میں بھی ہو گئے ہیں

انھوں نے تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی میں ایسی دوکان سجائی، جہاں سے جذب و

شوق اور درد و محبت کا سودا مل سکتا ہے،

دمشق کے رسالہ المسلمون میں عربی میں ایک مضمون رِدّۃ جدیدۃ لکھ کر اسلامی ممالک کے لوگوں کی

کی توجہ اس ذہنی ارتداد کی طرف دلائی جو یورپ کی لادینی سیاست اور مادی تمدن کی تاخت کے پیچھے آرہا ہے،

اس کے مقابلہ کرنے کی کوشش کو مقدس ترین جہاد قرار دیا، اس کا اردو ترجمہ نیا طوفان کے نام سے شائع ہو

پھر عربی میں اَلقَادِیَانِیُّ وَالقَادِیَانِیَه اور اردو میں قادیانیت لکھ کر اس کو محض ایک مذہبی جسارت

جہالت اور نبوتِ محمدی کے خلاف ایک گہری سازش قرار دیا، یہ کتاب قادیانیوں کے سر پر ایک خنجر بن کر لٹکی

ہندوستانی مسلمان ان عربی تقریروں کا مجموعہ ہے جو عرب ممالک کیلئے ان کے نذر کی گئیں، یہ عربی میں

المسلمون میں بھی شائع ہوتی رہیں، مزید اضافہ کے ساتھ اردو میں بھی شائع ہوئیں، اس سے ہندوستانی

تمدن و تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے،

اُن کی سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری میں اخلاص، عشقِ الٰہی، استقامت علی الشریعت اتباعِ

اصلاح اور ارشاد کی شمع فروزاں ہے، بڑے درد دل کے ساتھ عربی میں مَوْقِفُ العَالَمِ الاِسْلَامِی

تُجَاهَ الحضارۃ الغربیۃ لکھی جو اردو میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کے نام سے طبع

اس میں اس کا اظہار ہے کہ تجدد و مغربیت کے اثر سے اسلامی ممالک کے عوام و خواص میں اخلاقی کینسر پیدا ہو رہا ہے

مگر اس کا علاج یہ ہے کہ اگر اُن میں طاقتور ایمانی جذبہ، اللہ کے نام پر اتباع و انقیاد کا ولولہ اور اخلاص پیدا

ہو جائے تو وہ نبی خاتم کی خیرِ امت کی حیثیت سے موجودہ دور کی انسانیت کی آخری آس بن سکتے ہیں

عربی میں اُن کی ایک اہم تصنیف اَلنُّبُوَّۃُ وَالاَنبِیَاءُ فِی ضَوْءِ القُرآن بھی ہے جس کا اردو

منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین جو سیرت نبوی کی ... کے تحت انبیاء کرام
کے احسانات دکھائے گئے ہیں، وہ مختلف وقتوں میں لکھے گئے، ۱۹۵۶ء میں اندلس کے سفر پر گئے تو وہاں یونیورسٹیوں
اور علمی مجلسوں میں عربی میں تقریریں کیں، بعض میں پڑھے، ان سب میں پیام تھا کہ یورپ کے مسلمان طلبہ
وہاں کے تمدن سے متاثر نہ ہوں، کیونکہ اس کا ظاہر روشن ہے اور باطن تاریک ہے، وہ اس سرزمین میں رہ کر بھی نگہ
رہیں، اسلام کی ابدیت پر پورا اعتماد رکھ کر مغرب و مشرق کے درمیان نئی تہذیب کی تعمیر کرنے کے خیال سے
اپنے وطن کو واپس جائیں، اردو میں یہ مجموعہ کچھ اضافہ کے ساتھ مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں کے نام سے شائع ہوا،

الطریق الی المدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مسحورانہ انداز
کی تقریریں اور تحریریں ہیں، اس کا اردو ترجمہ کاروانِ مدینہ کے نام سے چھپا، پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا،
۱۹۶۷ء میں یہودیوں سے عربوں کو جو شرمناک شکست ہوئی تو مولانا کی اسلامی غیرت برہم ہو کر آئی، اس المیہ کو عرب
دوسرے ملکوں میں بڑی درد انگیز تقریریں کیں، مضامین لکھے، مصر کے صدر جمال ناصر پر بڑی جرات مندانہ تنقیدیں کیں،
ان کا مجموعہ کویت سے المسلمون وقضیۃ فلسطین کے نام سے شائع ہوا، مضامین کا اس کا
اردو ترجمہ عالم عربی کا المیہ کے عنوان سے چھپا، اس میں بڑی بیباکی لیکن بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کی طرف
توجہ دلائی گئی کہ عربوں کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں پر تیشہ زنی، فکری انارکی، ابن الوقتی، جھوٹے سیاسی نعروں
سپر اندازی، باصرہ اور سامعہ کی لطف اندوزی کی بدولت یہ رسوا کن ہزیمت ہوئی، ان جائزوں سے عربوں کی غیرت ضرور جاگی

مولانا بھوپال کے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بے حد متاثر ہوئے، ان کی باتوں
سوغات ہند سمجھ کے دوستوں کے سامنے پیش کرتے رہے، ان کی اٹھائیس مجلسوں کے ملفوظات کو اپنے ایک پرمغز
مقدمہ کے ساتھ صحبتے با اہل دل کے نام سے مرتب کیا تو یہ عرفانیات کا ایک گلدستہ بن گیا،

مولانا کے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحی اپنے دور میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے بھی بلند تر پایہ کے مصنف اور
عالم تھے، ان کی یادوں کی جوت حیات عبدالحی میں اس طرح جگائی ہے کہ ان کے حقیقی اخلاق اور آفاق سامنے آجاتے ہیں،
علامہ اقبال پر بھی عربی میں روائع اقبال کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اقبال کے پیام عشق الٰہی اور عشق رسول
سے خود بخود نظر آتے ہیں، اور اپنے ناظرین کو بے خود بنانا چاہتے ہیں، عرب ممالک میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سے بھی

جیسے اس کا اردو ترجمہ نقوشِ اقبال کے نام سے ہوا، انگریزی میں بھی یہ ترجمہ کی گئی،
الصّراعُ بَیْنَ المَادِّیَۃِ وَالرُّوحَانِیَۃِ کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھ کر یہ بتایا ہے کہ اگر سورۂ کہف کے مضامین کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو اُس میں عہدِ حاضر کی مادی تہذیب کی ملمع سازی اور باطل آرائی کے زہر کا تریاق مل جائیگا، اس کا اُردو ترجمہ ایمان اور مادیت کے نام سے ہوا،
انھوں نے عربی میں الْاَرْکَانُ الْاَرْبَعَۃ لکھ کر نماز روزہ زکوٰۃ اور حج کی دینی اور روحانی حکمتوں اور اُن کی مطلوب کیفیتوں کی تشریح ایسی ادبی خوبیوں کے ساتھ کی کہ یہ جدید حجۃ اللہ البالغہ کہلائی، یہ اُن کی تصنیفی سرگرمیوں کا شاہکار ہے، اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہوا،
اُن کی اہم تقریریں رسالوں کی صورت میں شائع ہوتی رہی ہیں، انھی میں ایک اہم مجموعہ پاجا سراغِ زندگی ہے جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کو یہ پیام دیتے رہے ہیں کہ شاخِ ملت انھی کے دم سے ہری ہو سکتی ہے، پُرانے چراغ میں بہت ہی محبت اور درد سے اپنے ان محبوبوں کی بزم سجائی ہے جو اب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں،
وہ امریکہ کے سفر پر بھی گئے ہیں، وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں اور مجلسوں میں جو تقریریں کیں، اُن کا مجموعہ عربی میں احادیثِ صریحۃ فی امریکا کے نام سے شائع ہوا جس کا ترجمہ اردو میں بھی کیا گیا، وہاں انھوں نے صاف صاف کہا کہ امریکہ میں مشینوں کی تو بہار دیکھی لیکن آدمیت اور روح کا زوال پایا، وہ مسلمانوں کو تعلق باللہ، اپنے کاموں میں اخلاص اور للہیت کی روح پیدا کرنے کی تلقین کی یہی پیام وہ ہر جگہ دیتے رہتے ہیں، جو کوئی نیا نہیں لیکن وہ اس کو اپنی تقریر اور تحریر میں کچھ ایسے ایمانی ولولے، قلبی درد اور داعیانہ انداز سے کہتے اور لکھتے ہیں، کہ سننے اور پڑھنے والے زبانِ حال سے کہہ اٹھتے ہیں، ع : ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا،
وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا بڑا احترام کرتے، اُن کے علمی کارناموں کے بھی معترف رہے، مگر وہ اس کے قائل نہیں کہ اسلام کو سمجھنے کا حق صرف اُن ہی کو تھا، اس لئے اسلامی تعلیمات سے متعلق اُن کی نظری و فکری تعبیرات سے اختلاف عالمانہ اور مخلصانہ انداز میں اپنے رسالہ عہدِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح میں کیا، اس کا ترجمہ عربی میں بھی کیا گیا،

عربی میں اُن کی تازہ ترین تصنیف السیرۃ النبویہ ہو اس کے کلمات گویا اُن کے ہر بُنِ مو سے یہ آواز نکل رہی ہو:۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

اس کے ترجمے اردو اور انگریزی میں بھی ہوئے ہیں،

مولانا کے ان علمی کمالات اور دینی خدمات کا اعتراف شاہ فیصل ایوارڈ سے ضرور کیا گیا، اگرچہ ان کی یہ دین قلیل اور مقاصد جلیل ہوں تو ع :۔ ہے اُن کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

اس ایوارڈ کے ساتھ اُن کو لاکھوں کی رقم بھی ملی، مگر انھوں نے اعلان کیا کہ یہ ساری رقم افغانستان پناہ گزینوں، مکہ معظمہ کے ادارۂ تحفیظ القرآن اور مدرسۂ صولتیہ میں تقسیم کر دی جائے، اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ رکھا، ع :۔ جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے،

ایوارڈ کے ملنے سے زیادہ وہ اپنی اس شانِ استغنا کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں، مردانِ خدا کا یہی شیوہ رہا ہے، نواب کلب علی خاں والی ریاست رام پور نے مولوی محب اللہ رامپوری کے ذریعہ سے مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے پاس یہ پیام بھیجا کہ اگر وہ رامپور تشریف لائیں تو ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ کا نذرانہ خوشی سے پیش کیا جائے گا، جب مولوی محب اللہ رامپوری یہ پیام لے کر ان کے پاس پہونچے، تو وہ عشقِ الٰہی پر گفتگو فرما رہے تھے، نواب رامپور کی خواہش ظاہر کی گئی، تو انھوں نے فرمایا میاں لاکھ روپے پر خاک ڈالو، باتیں سنو،

جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو دل کو بہ از جامِ جم دیکھتے ہیں،

پھر عشقِ الٰہی ہی پر باتیں کرتے رہے،

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی آرائش گاہ کے کمرے میں ٹاٹ بچھے ہوئے ہیں، ان کو اس پر بیٹھ کر جو حقیقی سکون ملتا ہے، وہ شاہجہاں کو تختِ طاؤس پر بیٹھنے میں نہ ملا ہوگا، وہ چاہتے تو اپنے ٹاٹ کو مخملیں فرش میں تبدیل کر سکتے تھے، مگر

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

مقالات

مولانا شبلیؒ اور اُن کی فارسی خدمات

از۔ ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ

(۲)

انصاف اور دیانت کے منافی ہوگا اگر اس سلسلے میں ہندوستان کے بڑے محقق اور مورخ مرحوم پروفیسر شیرانی کی کتاب تنقید شعر العجم کا ذکر نہ کیا جائے، یہ فاضلانہ تنقید شیرانی مرحوم کے تبحر علمی اور غیر معمولی محققانہ صلاحیت کی بین مثال ہے، لیکن ایک بڑا واضح نقص اس تنقید کا یہ ہے کہ اس میں شعر العجم کی اس عظمت کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے جس کی وہ مستحق تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاصرانہ چشمک کی بنا پر یہ کتاب معرض وجود میں آئی، اس میں کوئی کلام نہیں کہ فاضل مصنف نے تنقید میں بڑی داد تحقیق دی ہے، اور بعض امور جو شعر العجم میں ناقص یا تشنہ رہ گئے تھے، ان کی نشاندہی کی ہے، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر امور تحقیقی وہ ہیں جو نقص مواد یا کمی مواد کا نتیجہ ہیں، مثلاً مولانا شبلی کے پیش نظر دیوان رودکی کا وہ نسخہ تھا جس میں قطران کے بھی اشعار شامل تھے، اُسوقت تک قطران کا الگ دیوان متداول نہ تھا، اس بنا پر قطران کے بعض شعر رودکی کی طرف منسوب ہوگئے۔ لیکن اس غلط فہمی میں تنہا صاحبِ شعر العجم ہی نہ تھے، ایرانی نسخوں میں بھی قطران کے منظومات شامل تھے، اس لئے وہاں بھی قطران کے اشعار رودکی کی طرف منسوب ملتے ہیں، دراصل تاریخ نگار جسکو ہزاروں شاعروں کے کلام سے واسطہ پڑتا ہے اس سے ہر شاعر کے کلام کے صحیح تعین کی توقع غلط ہے، انوری کے

دیوان میں تاج ریزہ کا کچھ کلام شامل ہے، اگرچہ شعرالعجم میں ریزہ کے اشعار سے انوری کے خصوصیات شاعری پر استشہاد نہیں ہوا ہے، لیکن تنقید شعرالعجم میں دیوان انوری میں الحاق کی ایک نہایت طویل مگر دلچسپ اور دقیع بحث شامل ہے، یہ بحث اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ دیوان انوری کے متداول نسخے کا الحاق اور ایک ہندوستانی شاعر ریزہ کے کلام کا باقاعدہ تعین ہوگیا، مگر اس بحث کا تعلق شعرالعجم سے نہیں، اس بنا پر تنقید شعرالعجم میں اس کا شمول نامناسب تھا، گو اپنی جگہ اس بحث کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، یہ بحث پروفیسر شیرانی کی غیر معمولی ناقدانہ صلاحیت پر دال ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہوگی کہ دیوان انوری کا وہ نسخہ جو پروفیسر سعید نفیسی کے اعتناد سے چند سال پہلے ایران سے شایع ہوا ہے، اس میں اب بھی الحاقی کلام موجود ہے، اور یہ بات عجیب ہے کہ نفیسی صاحب نے بعض الحاقی کلام کا تعین کر کے انوری کے دیوان سے خارج کیا، اور یہ خارج شدہ کلام سراجی خراسانی کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ اس کا سراجی سے تعلق نہیں، یہ ریزہ کا کلام ہے، لیکن ریزہ کے دوسرے الحاقی کلام کا تعین نہ کرسکنا، واقعی قابل حیرت ہے،

میری غرض یہ ہے کہ جب ناقدانہ متن الحاق سے خالی نہو تو تاریخ نگار سے اگر اشتباہ ہو تو اس میں نہ تعجب کا موقع ہے، اور نہ گرفت کی گنجایش۔

اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر شیرانی کا فن تنقید شعرالعجم اپنے عروج پر ہے، انھوں نے زبان وادب کے مسائل پر بڑے تبحر علمی سے گفتگو کی ہے، لیکن یہ ساری بحثیں تنقید شعرالعجم سے براہ راست تعلق نہیں رکھتیں، استاد شیرانی کا رسالہ "فردوسی پر چار مقالے" فن تحقیق کا شاہکار ہے، اگر وہ تنقید شعرالعجم میں شامل کر لیا جاتا تو اس کے سارے اعتراضات کا رخ مولانا شبلی کی طرف ہوتا اس لئے کہ عام روایت کے مطابق مولانا نے بھی یوسف زلیخا کو فردوسی کی ملکیت سمجھا ہے، اور "فردوسی پر چار مقالے" میں ایک مقالہ یوسف زلیخا کے اصل مصنف کے تعین پر ہے، پروفیسر نوا

پروفیسر براؤن اور دوسرے سیکڑوں دانشور یہی لکھتے آئے ہیں کہ یوسف زلیخا فردوسی کی تصنیف ہے، اس لیے محض مولانا شبلی ہی کیوں ہدفِ اعتراض ہوئے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ علامہ شبلی کے انتقادِ شعر کے بارے میں تنقید میں کہیں اعتراض نہیں ہوا ہے، اور اگر کوئی دوسرا شیرانی ہوتو پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران پر تنقید شعرالعجم سے زیادہ ضخیم حجم کی کتاب ترتیب دے دیتا، لیکن جس طرح تنقید شعرالعجم سے شعرالعجم کی شہرت و مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، اسی طرح تنقید تاریخ ادبیات براؤن تاریخ ادبیات کی مقبولیت و شہرت پر کوئی خراب اثر مرتب نہ کرسکتی۔

انتقادِ شعر کے علاوہ نثری ادب پاروں کی پرکھ جس طرح مولانا شبلی نے کی ہے اُس سے ان کے علمی تجسس اور تنقیدی ذہن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، یہ تنقیدی مضامین مقالاتِ شبلی میں شامل ہیں اور ان میں سے ہر مقالہ مولانا شبلی کی غیرمعمولی ناقدانہ صلاحیت کا شاہد ہے۔ ان میں بعض مقالے فارسی ادب و تاریخ سے متعلق ہیں، مثلاً مآثر رحیمی والا مضمون، یا وہ مقالہ جو انھوں نے تزکِ جہانگیری پر لکھا یا گلبدن بیگم کے ہمایوں نامے پر لکھا، ذیل میں اس آخری مقالے کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جاتی ہے، جس سے علامہ کے ناقدانہ ذہن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ہمایوں نامہ۔ ہمایوں کی بہن اور اکبر بادشاہ کی پھوپھی گلبدن بیگم کی تصنیف ہے، اس کا تنقیدی متن لیڈی بیورج نے مرتب کر کے ۱۹۰۲ء میں لندن سے شایع کیا تھا، متن حسب ذیل امور کے ساتھ مرتب ہوا ہے،

۱۔ گلبدن بیگم کی مفصل سوانحعمری۔

۲۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ

۳۔ ترکی الفاظ کی فرہنگ۔

۴۔ شاہی خاندان کی خواتین کی فہرست مع حالات۔

۵۔ فہرست اعلام۔

مولانا شبلی نے اپنی ناقدانہ بصیرت سے اس کتاب کے سارے اوصاف کو نہایت عمدہ انداز مین پیش کیا ہے، انھوں نے اس کتاب پر حسب ذیل حیثیتوں سے نظر ڈالی ہے۔

(۱) انشاپردازی، فارسی میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کے عمدہ نمونے تزک جہانگیری رقعات عالمگیری ہیں، ان میں جو سادگی اور لطافت ہے، اس کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور وقائع نعمت خان عالی ہیچ ہیں، لیکن ہمایوں نامہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے، اس کتاب کے چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف انداز بیان، روزمرہ اور عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی بے اختیار دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حمیدہ بانو بیگم سے جب ہمایوں بادشاہ نے شادی کرنا چاہی تو وہ راضی نہیں ہوتی تھی، بڑی مشکلوں سے راضی ہوئی، اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"غرض تا چہل روز از جہت حمیدہ بانو بیگم مبالغہ و مناقشہ بود، بیگم راضی نشدند، آنحضرت والدہ نصیحت کردند کہ آخر خود بکسی خواہی رسید، بہتر از پادشاہ کہ خواہد بود؟ بیگم گفتند آری بہ کسی خواہم رسید کہ دستِ من بگریبان اور سد نہ آنکہ بہ کسی رسم کہ دستِ من میدانم بدامن او نرسد،"

مولانا شبلی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اس آزادی اور بلند حوصلگی کو دیکھو کہ ایک بادشاہ ذی الاقتدار شادی کرنا چاہتا ہے، حمیدہ بانو نہیں مانتی اور جب بادشاہ بیگم نے کہا کہ آخر کسی کے پلے تو بندھو گی تو کہتی ہے، کہ ہاں اس کے بندھو گی، جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچے، نہ اس سے کہ میرا ہاتھ

اس کے دامن تک نہ پہنچے یعنی اس سے شادی کروں گی جس سے برابری کا دعوی ہو سکے، بادشاہ کا اور میرا جوڑ کیا۔

انشا پردازی پر طویل بحث کے بعد ہمایوں نامے سے کچھ محاورے منتخب ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

ایستادہ دریافتن	کھڑے کھڑے ملنا
پیشواز آمدن	استقبال کو آنا
قلعی شدن	محاصرہ ہونا
طرفگی کردن	شوخی کرنا
یکدیگر را دریافتن	گلے ملنا
مقدار شدن	لمبا ہونا
پای دادن	بار جانا
آب را تنگ کردن	پانی بند کرنا وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد اسکی تاریخی و تمدنی اہمیت سے بحث کی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) واقعات جن کو خود دیکھا ہے، لکھا ہے، جو آنکھوں کے سامنے نہیں گذرا اس کے متعلق لکھا ہے کہ فلاں شخص سے سنا۔

(۲) اس کتاب سے اس عہد کی معاشرت اور زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اس کے بعد مصنف نے ان کی شادی کا واقعہ نقل کیا ہے، اور اس سے حسب ذیل نتائج نکالے ہیں۔

لہ ایک مورخ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حمیدہ بانو کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ اس کا ہاتھ بادشاہ کے دامن تک نہیں پہنچتا تھا، فارسی دانی کی اس سے بہتر مثال اور کہاں ملے گی۔

(ا) عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فنون سپہ گری سے واقف ہوتی تھیں، گھوڑے کی سواری بھی کرتیں، اور بعض خواتین مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں۔

(ب) عورتوں میں موسیقی کا رواج تھا، خاندان کے آدمی جب مل بیٹھتے اور مجلس غیروں سے خالی ہوتی تو عورتیں گا نا بھی گاتی تھیں۔

(ج) عورتوں کا نہایت احترام ہوتا تھا، بابر کی بیوی ماہم بیگم جب کابل سے ہندوستان آئی تو بابر دو کوس پا پیادہ استقبال کو گیا، اور جب بیگم کی سواری سامنے آئی تو بابر کو پیدل دیکھ کر سواری سے اترنا چاہا تو بابر نے روکا، خود سواری کے ساتھ پیدل چلکر محل تک آیا۔

(د) ملکی معاملات میں عورتوں سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا۔

(ہ) عورتوں کو اپنی شادی کے معاملے میں ایک حد تک آزادی تھی احمیدہ بانو بیگم کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے۔

(و) عورتیں بے نقاب اور برقع کے باہر نہیں نکلتی تھیں، ہمایوں نے نکاح سے قبل حمیدہ بانو بیگم کو بلایا تو بیگم نے کہا کہ آداب سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ بادشاہ کے سلام کو جا چکی ہوں، دوبارہ جانا محرم کے سامنے جانا ہے۔

اس طرح کے متعدد مباحث اس مضمون میں سامنے آئے ہیں۔

مولانا شبلی فن تنقید کے علاوہ فارسی زبان کے دقیق مسائل سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے، اسی کے تقاضے سے بعض مواقع پر دوستوں کے اشعار کی اصلاح بھی ہے، اور ان کی اصلاح و تنقید کبھی کبھی زبان کے دقیق مسائل پر مبنی ہوتی، ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی صاحب کو لکھتے ہیں۔

"غزل کے متعلق اپنی رائے پیش کرتا ہوں، ہندوستان میں آنکھوں میں محبت لپٹا تیرا

میدان میں یاد نہیں آتا، اس لئے: "بچشم شوخ ما صبای الفت موجزن خواہد شدن"

کھٹکتا ہے، وہاں بہر دمحبت کو نگاہ کے ساتھ باندھتے ہیں۔ جان تازہ وصل، جانم آخر تازہ

کی ہ کو اتنا لمبا[1] اور پورا نہیں ادا کرتے، بلکہ اس لہجے میں ادا کرتے ہیں،

ع کہ بدام آمدہ ام تازہ گرفتار مشب

دل کہ پامال و خراب آخر اس شعر کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ویرانہ انجمن بن جائے، خراب

ویرانہ کو بھی کہتے ہیں، اس لحاظ سے مقصد ادا ہوتا تھا، لیکن پامال کے لفظ نے

پہلو کمزور کر دیا، صرف خراب ہوتا تو خوب ہوتا۔ یا یوں کر دیجئے:

ع دل کہ ویران کردہ صد ترکتاز حسرت است،

مولانا شبلی کی فارسی شاعری

علامہ شبلی نعمانی کو ابتدا ہی سے فارسی میں شعر کہنے کا ذوق پیدا ہو چلا تھا، اور جیسا کہ خود انھوں نے تحریر فرمایا ہے، یہ ذوق اُن کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی کے فیض صحبت

---

[1] اس سلسلہ میں مولانا شبلی نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، دراصل تازہ کی ہ ہائے غیر ملفوظ یا ہائے مختفی ہے جو پڑھنے میں نہیں آتی، اس کا مصرف اپنے ماقبل کے فتحے کا اظہار ہوتا ہے، لیکن ہندوستانی آواز میں وہ الف کا بدل قرار پائی، اسی وجہ سے بیسیوں ہندوستانی لفظوں اور ناموں میں اس کا مصرف ہوا ہے، (حالانکہ یہ صرف فارسی علامت تھی) جیسے راجہ، ڈرامہ، نانڈہ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ، انتہا یہ ہے کہ بعض عربی الفاظ میں الف مقصورہ کی جگہ ہائے مختفی نے لے لی ہے، جیسے تماشہ، معمہ وغیرہ، اورنگ زیب نے ہندی لفظوں میں فارسی ہائے مختفی کے استعمال کی ممانعت کر دی تھی اور اس سلسلے میں ایک حکم جاری کیا تھا، اس سلسلے کی مفصل بحث کے لئے میرا مضمون "ہائے مختفی" فکر و نظر، علی گڑھ میں ملاحظہ فرمائیے۔

کا نتیجہ ہے، کم عمری ہی میں انھیں دیوان مرتب کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا، ۲۵ فروری ۱۸۸۳ء کو مولوی عبدالسمیع کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،

"تم تو قصیدے مانگتے ہو، دو کون؟ ایک عید کا قصیدہ، تو البتہ میں نے لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے ابھی تم کو بھیج دوں گا، میرے ہاتھ کا لکھا ہے اور صاف لکھا ہے، دوسرا میں نہیں جانتا کیا لکھئے زمانے کے موافق نہیں، ورنہ اب کی پورا قصد تھا، کہ دیوان فارسی مرتب کروں،

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی خواہش پوری ہوئی اسلئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی اطلاع کے بموجب اسی سال یعنی ۱۸۸۳ء میں دیوان مرتب ہو کر چھپ گیا،

علی گڑھ کے قیام کا مولانا کی شاعری پر زبردست اثر ہے، علی گڑھ تحریک کے مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا، اُن میں سے پہلی چیز ملت کی بربادی اور زبون حالی کا احساس تھا، مسلمانوں کی زبون حالی اُن کی اکثر نظموں کا موضوع بن گئی، اسی سال یعنی ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی، اس موقع پر قصیدۂ عیدیہ لکھا جس میں ملت کے عشق میں خون کے آنسو بہائے ہیں، (حسن اتفاق سے یہ قصیدہ اُن کے دیوان میں شامل ہے) اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

حیف کیں شور طرب یک دو نفس بیش نماند	چہ کند عید بدردے کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدف تیر بلا	خود چہ گنج باخت یا شاں فلک عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت ز محرم تا عید	آہ از فتنہ گری ہائے سپہر کج باز
شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ مخواہ	شب بود کوتہ و افسانہ دراز است دراز

مولانا کی شاعری کا یہ موڑ کالج کی ناموری بڑھانے میں بہت موثر ثابت ہوا، اس دور

میں چندہ کا پرعلی گڑھ آتے، اُن کو اپنی شاعری کے ذریعہ درد ملت سے آشنا کرتے، اور علی گڑھ کالج کی امداد کی طرف متوجہ کرتے، یہ کالج اُن کی نظروں میں غرناطہ بغداد اور اصفہان سے کم نہ تھا،

ابھی کالج میں آئے چند روز ہوئے کہ سالار جنگ اول کا انتقال ہوگیا، وہ کالج کے محسنین میں تھے، اُن کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا، اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو،

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانی است نوحہ گر　　آہ ایں چہ ماتم است کہ خوں شد دل و جگر

تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر　　ہم شرع را نماند کنوں معنی دگر

سالار جنگ مرد جہاں گشت تیرہ تر

شادی ز دل رمید و دل زاں مید تر

مولانا کے مخصوص انداز سے اس مرثیہ کا رنگ پھیکا ہے، اس بنا پر دیوان سے خارج کردیا گیا ہے،

مارچ ۱۸۸۳ء میں کالج کے ایک سرپرست خلیفہ سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ علی گڑھ تشریف لائے، اس موقع پر سید محمود کی فرمایش پر چند بند پڑھے جس سے محفل میں عجب سماں بندھ گیا، ایک بند یہ ہے،:-

ایں دل ایں مایہ انتظار کہ بود؟　　آخر ایں مستی از خمار کہ بود

چشم شوقت بہ رہگذار کہ بود؟　　ہوس سرمۂ غبار کہ بود

ایں ہمیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست؟

پردۂ دیدہ فرش راہ کہ ہست

۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامراء مدار المہام حیدر آباد کی تشریف آوری

کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس میں علی گڑھ تحریک اور کالج کے مقاصد کا بھی ذکر کیا ہے یہ قصیدہ بھی کلیات سے خارج ہے، چند شعر سنئے:

در جہاں چوں سخن از شوکتِ ایشاں گذرد — نامِ دستورِ دکن بر سرِ عنواں گذرد
ایں دبستاں بشل تازہ گلستانی ہست — خواجہ ابری است کہ بر طرفِ گلستاں گذرد
گذر افتادہ بما کوکبۂ جاہش را — تشنہ بنگر کہ بر چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سرِ خاک — موکبِ خواجہ بما نیز بدیساں گذرد

۱۸۸۸ء میں نواب آسمان جاہ بہادر وزیرِ اعظم حیدرآباد کے ورود علی گڑھ کے موقع پر رودکی کی زمین میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صرف تین شعر محفوظ رہ گئے ہیں:

ہم خیال با نسیم گرمِ گفتگو — قاصد از دور ناگہاں آید ہمی
انگلند شور مبارکباد وبس — ایں حدیثش بر زباں آید ہمی
آسماں جاہ از سوی ملکِ دکن — جانبِ ہندوستاں آید ہمی

یہ اور اس طرح کے تمام منظومات کلیات سے نکال ڈالے گئے، دراصل مولانا کی آزاد طبیعت "جو فیاضیوں کے قصے سے مزا لینے کو گدا طبعی قرار دیتی ہو" اس طرح کے اشعار کی ملکیت کی متحمل نہیں ہوسکتی، اُن کا نصب العین عرفی کا یہ شعر تھا،

بیا بہ ملکِ قناعت کہ در دو سرِ نکشی — ز قصہ ہا کہ بہ تہمت فروش طے بستند

اب میں مولانا کے کلیات پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں، اس میں چھوٹے بڑے نو قصیدے ہیں، جن میں تین چار خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں، اُن میں پہلا عیدیہ ہے، جس کے بارے میں شروع میں عرض ہو چکا ہے،

دوسرا قصیدہ بہت اہم ہے، اس لئے کہ اس میں رسمی ڈگر سے الگ راہ نکالنے کی سعی ملتی ہے!

مولانا خود واضح طور پر اس بات کا اعلان کر کے لکھتے ہیں،

جادۂ پیشرواں رفتم و دانم کہ خود | اندریں شیوہ نہ با من پیدا را ماند
تنگ ہمت بود آری کہ زباں تازہ کنی | ہم از ان جرعہ باقی کہ بہ مینا ماند
نیست جز دوزنی فطرت کہ بہ بازار کمال | چشم دوزی بہ متاعے کہ بہ یغما ماند
داستاں چند تواں کرد ز محمود و ایاز | تا کجے خود سخن از وامق و عذرا ماند
گر نسیم از شکن زلف کشاید گرہی | فکر را با تو صد آویزش بیجا ماند
شیوۂ مدح و غزل گرچہ دل آراوشی است | بندل گشت نجنداں کہ گوارا ماند
ہاں وہاں چند تواں بود بہ تقلید اسیر | وائے آنکس کہ بہ رہ سلسلہ بر پا ماند
جادۂ منعر بیاں گیر کہ ایں طرز نوی | دلپذیر است و دل آویزہ دلہا ماند

مولانا شبلی کا ایک قصیدہ حالاتِ سفر روم پر ہے، اس میں نہایت مفید معلومات اکٹھا کئے گئے ہیں، یہ مولانا کی اُپج تھی کہ انھوں نے قصیدہ کو واقعات نگاری کے لئے مخصوص کر دیا، ان کا قصیدۂ کشمیر یہ بھی واقعہ نگاری کی اچھی مثال ہے، اس میں اپنے سفر کشمیر اور وہاں کے قیام کا حال لکھا ہو کشمیر پر جو نظم لکھی جائے اس میں وہاں کے گل و گلزار کی تعریف ناگزیر ہے، یہ قصیدہ عمدہ تشبیہات و بلند تخیل کا نمونہ ہو، چند شعر گوش گذار کئے جا رہے ہیں،

بسکہ جوشید زہر سوی گل و لالہ بدشت | از کراں تا بکراں روی زمیں ناپیداست
جادہ را خود زبیاباں نتواں کرد تمیز | بسکہ گل صف زدہ سر تا سر اطراف چپ و راست
نقش بند چمن طبع زتر دستی فیض | وسعت را ہم بہ گل و لالہ و نقشا آراستہ است
سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سر تا بن | یا قبائے است کہ بر قامت شخص آید راست
راہرو راند ہد دل کہ نہد گام براہ | بسکہ ہمہ قدمش لالہ و گل در تہ پاست
دیدۂ طفل کہ بر دامنِ مادر غلطد | جنبشِ باد بداں گونہ بروی صحراست

سرو اگر پائے بدامن نکشد خود چہ کند | زانکہ از جوشش گل عرصۂ چمن تنگ شدست
بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغے بنہند | در شبِ تار کسی گم نشود ماندہ درست

مولانا کے کلیات میں چند ترکیب بند بھی پائے جاتے ہیں، ان میں ایک ترکیب بند ۱۸۹۶ء میں ندوۃ العلما کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا، اس سے مولانا کی طبیعت کا جوش ٹپکتا ہے، چند اشعار حاضر خدمت ہیں،

اے کہ نیرنگ سرا پردۂ عالم دیدی | جامِ کیخسرو و فرِ حشم جم دیدی
گوناگوں بازیِ گردوں بہ نگہ آوردی | پیکر آرائی این بر شدہ طارم دیدی
مسند آرائی جم را بہ نظر آوردی | تاجِ سلجوقی و خم طرۂ دیلم دیدی
داستانہائے جہانگیریِ خسرو خواندی | زور بازوی کمند افگنِ رستم دیدی
فرۂ افسر و دیہیم تماشا کردی | سر برافراختنِ رایتِ پرچم دیدی

لیک حالا تہ از یں جملہ جہانے دگر است
کہ درو کالبدی دیگر و جانی دگر است

۱۸۹۸ء میں امرتسر میں ندوہ کی مجلس خاص میں ایک پرشور ترکیب بند پڑھا جس میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے تذکرے کے بعد قدیم تعلیم کی تنقید اور جدید تعلیم کی ضرورت بتائی ہے، اس کے ایک بند کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں،

ای کہ پرسی چہ کسانیم و چہ ساماں داریم | آنچہ با ہیچ نیرزد بجہاں آں داریم
ما نہ آنیم کہ دیہیم سکندر طلبیم | ما نہ آنیم کہ اورنگِ سلیماں داریم
ما نہ آنیم کہ بر شیوۂ ارباب حشم | ردے و دا ہے بدر دولت سلطاں داریم
ما نہ آنیم کہ با حاجب و درباں باشیم | ما نہ آنیم کہ بام و در عالی ایواں داریم

ما نہ آنیم کہ باشد د بالین ارزیم | ما نہ آنیم کہ سرداب و شبستان داریم
فخر نزیم بہ دان پایہ کہ چون مختشان | جامہ از قاقم واستبرق و کتان داریم
ما نہ آنیم کہ یک شیوہ بآئین گیریم | ما نہ آنیم کہ یک کار بہ سامان داریم
خاکساران جہانیم و از اسباب جہان | بوریائی است کہ در کلبۂ احزان داریم
جز نئے خامہ و اوراق پریشان نبود | بیش و کم آنچہ بہ پیدا و بہ پنہان داریم

ہم بیک حال بود بی سر و سامانیِ ما
کہنہ ہرگز نشود جامۂ عریانیِ ما

مولانا کے کلیات میں چار مرثیے ہیں جن میں وہ مرثیہ جو اپنے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی موت پر ۱۸۸۷ء میں لکھا ہے، زیادہ پُر درد ہے، کیوں نہ ہو عالم کی موت عالم کی موت ہے، چند شعر ملاحظہ فرمایئے،

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم | جہانی را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم
بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح | دمی بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد | ہنر بر خویشتن گرید چو من بی خویشتن گریم
دو تا غم دارم و ہر یک ز دیگر حسرت افزاتر | بمرگش گریم و آنگاہ بر مرگِ سخن گریم
گہی بیخود بہ بزمِ گشتنِ کار ہنر نالم | گہی بی خویش بر روزِ سیاہ علم و فن گریم
بیکبار انجمن برہم زدی تا از میان رفتی | ہنر دمن گرد ہیں ماتم چو شمعِ انجمن گریم

چہ در دل داشتی تا اندکہ رنجیدی چرا رفتی
ز ما بگسستۂ مولائے ما آخر کجا رفتی؟

مولانا شبلی کا اصل میدان غزل ہے، اُن کی جمالیاتی حس بڑی ہی تیز تھی، کم عمری ہی میں

ان کی شاعری میں پختگی پیدا ہوگئی، علی گڑھ آئے تو ان کے ذوق کو جلا ملی، اور اب وہ اساتذہ کی زمینوں میں کامیاب غزلیں لکھنے لگے، ایک واقعہ اس طرح پر ہے کہ اپریل ۱۸۸۳ء میں حیراں و فراواں کے قافیے اور چہ کنم کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی جو اس زمانے کے دو مشہور استادوں، خواجہ عزیز الدین صاحب پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی اور مرزا غالب کے شاگرد نیر دہلوی کے پاس صلاح کیلئے بھیجی گئی، دونوں نے تسلیم کیا کہ مولوی شبلی نے جو لکھا ہے وہ اہلِ زبان کا کلام ہے، نیر دہلوی نے بہت تعریف کی، اور لکھا کہ سلف کے ہم پلہ ہے اس غزل کے تین شعر باقی رہ گئے ہیں،

گر کم عقل نہ گیرم من حیراں چہ کنم — می دہد منبچہ ام بادہ فراواں چہ کنم
خود گرفتم کہ بہ لغش نظرو نیم دل و دیں — در بغاوت بر آں نرگسِ فتاں چہ کنم
چاکی از دست جنوں بہرہ من باشد دگر — ارمغانش نفرستم بگریباں چہ کنم

مولانا شبلی کی غزلیں چار عنوان کے تحت ملتی ہیں، سب سے قدیم وہ ہیں جو دیوان میں شامل تھیں، بعد کی غزلیں تین عنوان کے تحت پائی جاتی ہیں، دستۂ گل، بوئے گل، اور برگِ گل، قدیم غزلوں میں بڑی قطع و برید ہوئی، یہاں تک کہ کوئی غزل کامل طور پر اب موجود نہیں جستہ جستہ اشعار باقی رہ گئے ہیں، بلکہ اکثر کا مطلع بھی غائب ہے، دستۂ گل کی غزلیں قیام بمبئی کی یادگار ہیں، اس کی غزلیں اور دوسری غزلوں سے جوش و سرمستی میں بڑھ کر ہیں خود مولانا کو اس کا احساس ہے، چنانچہ ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-

"بوئے گل کی نسبت تمام اہلِ نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے، واقعی دونوں کے شانِ نزول مختلف ہیں جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے، ایک شعر میں خود یہ راز

کھل پڑا ہے"

یا جگر کا دیِ آن نشترِ مژگاں کم شد

یا کہ خود زخمم مرا لذّتِ آزار نماند

بہر حال مولانا حالی کی رائے بوئے گل کی غزلوں کے حق میں تھی، مولانا شبلی اوپر والے خط میں لکھتے ہیں:

مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں، وہ بوئے گل کو حال بتاتے ہیں، اور دستۂ گل کو قال، لیکن اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ دستۂ گل کو مولانا حالی ناپسند کرتے تھے، اس کی غزلوں کی بابت حالی کی یہ رائے ہے،

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولینا رومؒ جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شرابِ دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیاتِ حافظ کا وہ حصہ جو محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں"۔

بمبئی کے قیام کا اُن کی غزل گوئی پر خاص اثر پڑا ہے، چنانچہ مولانا خود ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

" واپس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا، یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا، اپالو بیاں عجیب سیر گاہ ہے، اور اور چوپاٹی اس کا جواب ہے، خواجہ حافظ کے مصرعے کو یوں بدل دیا ہے:

کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را"

پوری غزل کلیات میں نقل ہے، سنئے،

نثار بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را	طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را
بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ دیدم	گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را
فغان از گرمیِ ہنگامہ خوبانِ دلِ دشتی	بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را
بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت	کنار آب رچوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

متعدد غزلوں میں بمبئی کی یاد ملتی ہے، چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

دامنِ عیش ز دستم نرود تا شبلی	دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم
بمبئی بود مرا منزلِ مقصود و عبث	پیش ازیں گام طلب در رہِ حرمان زدہ ام
زہی جان بخشیِ آب و ہوائے بمبئی شبلی	طرازِ دلِ خلیج و نوشادِ فرخارات پندازی
ایں غزل اول فیض اثر بمبئی است	باش تا بادۂ ایں میکدہ در جوش آید
شبلیا آں جلوۂ نیر نگہائے بمبئی،	بردتا دقتی کہ من خواب گرانی داشتم
شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی	حالیا شبلی شدم رندِ غزل خوان نیستم

مولانا شبلی کی غزلوں میں اچھی غزل گوئی کی جملہ خوبیاں موجود ہیں، ان میں جوش و سرمستی، سوز و گداز، تغزل، سادگی، روانی، جدتِ اسلوب، بلاغت، واردات عشق سب کچھ پایا جاتا ہے، چند مثالوں سے اس کی تصدیق ہوسکے گی،

جوش و سرمستی کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوی	سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
ساغرِ می چند بہ یادِ رخِ رنگیں خوردم	قدحی چند در آغوشِ گلستاں زدہ ام
آں نگارِ عجمی چہرہ بداماں افروخت	کہ آتش اندر دم و در خرمنِ ایماں زدہ ام

جامۂ زہد چو بر قامت من راست نبود — شیشۂ تقویٰ سالہا بہ سنداں زدہ ام
کارم افتادہ بہ آں پادشہ کشور حسن — دست رد بر حشم قیصر و خاقاں زدہ ام

برق عشقی کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود — ایں ہمانست کہ بر وادی ایمن زدہ بود
دیدی اے دوست کہ تا دامن ایماں برسید — شعلۂ آں چاک کہ در جامۂ من زدہ بود

شب کہ تیر نالۂ من برگ و ساماں کردہ بود — رخنہا در گنبد گردون گرداں کردہ بود

سادگی و روانی کی مثال میں ایک غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

امشب نماند خلوتیان حجاب ناز را — دیدی تطاول خم زلف دراز را
ذوقے دگر بود بہ تماشا گہ وصال — چشمے بخواب در شدۂ نیم باز را
لعل لبش اگرچہ بکام شکر نریخت — با ما سری است آں نگہ جاں نواز را
ہرگز کسے بخوبی و رعنائی تو نیست — ما دیدہ ایم کج کلہان طراز را
ما از بلند و پست جہاں درگذشتہ ایم — از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را
چیزے ز لطف نیز بیامیخت در ستم — تا اعتدال دادہ ای ترکتاز را
ناوک بزد بغیر و مرا در جگر نشست — قرباں شوم خطای نگہ ہای ناز را
ما خود نخواہیم اینکہ بر افتد حجاب راز — اما چہ چارہ کلک حقیقت طراز را

وقوع گوئی و معاملہ بندی | عشق و ہوسناکی میں جو حالات پیش آتے ہیں، ان کے ادا کرنے کو وقوع گوئی یا معاملہ بندی کہتے ہیں۔ امیر خسرو کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں، متاخرین شعرا میں شرف جہاں، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی دی۔ شبلی نے اس طرز کے بہت سے اشعار لکھے ہیں، چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں،

شرم از لبت مہر حیا گرچہ برنداشت — شادم بہ اینکہ غمزۂ او فن بکار بود

پوری غزل کلیات میں نقل ہے، سنئے،

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را ۔ طراز مسند جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ بے پروا ۔ گذشتن از سرِ رہ مشکل افتاد است رہرو را

فغاں از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ بندر دشتی ۔ بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔ کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

متعدد غزلوں میں بمبئی کی یاد ملتی ہے، چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

دامنِ عیش ز دستم نرود تا شبلی ۔ دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم

بمبئی بود مرا منزلِ مقصود و عبث ۔ پیش ازیں گام طلب رہ حرمان زدہ ام

زہی جاں بخشیِ آب و ہوائے بمبئی شبلی ۔ طراز دہلی و نوشاد و فرخارات پنداری

ایں غزل اوّل فیضِ اثرِ بمبئی است ۔ باش تا بادۂ ایں میکدہ در جوش آید

شبلیا آں جلوۂ تیز نگاہے بمبئی، ۔ بود تا وقتی کہ من خوابِ گرانی داشتم

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی ۔ حالیا شبلی شدم رندِ غزل خواں نیستم

مولانا شبلی کی غزلوں میں اچھی غزل گوئی کی جملہ خوبیاں موجود ہیں، اُن میں جوش و سرمستی، سوز و گداز، تغزل، سادگی، روانی، جدتِ اسلوب، بلاغت، واردات عشق سب کچھ پایا جاتا ہے، چند مثالوں سے اس کی تصدیق ہو سکے گی،

جوش و سرمستی کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوی ۔ سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام

ساغری چند بہ یادِ رخِ رنگیں خوردم ۔ قدحی چند در آغوشِ گلستاں زدہ ام

آں نگارِ عجمی چہرہ بداں ساں افروخت ۔ کہ آتش آوردم و در خرمنِ ایماں زدہ ام

جامہ زہد چو بر قامت من راست نبود — شیشہ تقوی سی سالہ بہ سندان زدہ ام

کارم افتادہ بدان پادشہ کشور حسن — دست رد بر چشم قیصر و خاقان زدہ ام

برق عشقی کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود — این ہمان است کہ بر وادی ایمن زدہ بود

دیدی اے دوست کہ تا دامن ایمان برسید — عشق آن چاک کہ بر جامہ دامن زدہ بود

شب کہ تیر نالہ من برگ و ساماں کردہ بود — رخنہ ہا در گنبد گردون گرداں کردہ بود

سادگی و روانی کی مثال میں ایک غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

امشب نماند خلوتیان حجاز را — دیدی تطاول خم زلف دراز را

ذوقے دگر بود بہ تماشا گہ وصال — چشمے بخواب در شدہ نیم باز را

لعل لبش اگرچہ بکام شکر نہ ریخت — با ما سری است آن نگہ جاں نواز را

ہرگز کسے بخوبی و رعنائی تو نیست — ما دیدہ ایم کج کلہان طراز را

ما از بلند و پست جہاں درگذشتہ ایم — از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را

چیزے ز لطف نیز بیامیز در ستم — تا اعتدال دادہ باشند ناز را

ناوک بزد بغیر و مرا در جگر نشست — قرباں شوم خطای نگہای ناز را

ما خود نخواہیم اینکہ برافتد حجاب راز — اما چہ چارہ کلک حقیقت طراز را

وقوع گوئی و معاملہ بندی | عشق و ہوسناکی میں جو حالات پیش آتے ہیں، اُن کے ادا کرنے کو وقوع گوئی یا معاملہ بندی کہتے ہیں، امیر خسرو کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں، متاخرین شعراء میں شرف جہاں، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی دی، شبلی نے اس طرز کے بہت سے اشعار لکھے ہیں، چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں،

شرم از لبت بہ حیا گرچہ بر نداشت — شادم بہ این کہ غمزہ بہ من بکار بود

اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

آں شوخ چوں از پردہ بیکبار برآمد ہنگامہ مستوری زاہد بسرآمد

لب تشنہ زخم است ہماں بسمل بیتاب کان ناوک بیچین کز و می بجگر آمد

ممنون سبک پائی مرگم کہ شب ہجر از صبح دمیدن قدری پیشتر آمد

روح و تدبالا کردل فروزتونازم کاب دم شمشیر ترا تا کمر آمد

تردستی آن غمزہ چالاک تو ان دید تیری کہ بزد و تیز دگر بر اثر آمد

لب راز تبسم نتوانست نگہ داشت وقتیکہ ز جان دادن شبلی خبر آمد

تشبیہات شبلی کی غزلوں میں اکثر سادہ تشبیہات کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں، ذیل میں چند نمونے درج ہیں:

وصل کی تشبیہ می خوشگوار سے:

ع: ازبسکہ تند بود می خوشگوار وصل

جنون کی تشبیہ غنچۂ ناشگفتہ سے:

غنچۂ ناشگفتہ جنوں تافتن آوردہن تا دگر از اثر باد بہاری چہ سود

ایمان کی دامن سے:

دیدی اے دوست کہ تا دامن ایماں برسید

عشق آن چاک کہ در جامہ بدامن زدہ بود

تقوی کی شیشہ سے:

سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام شیشۂ تقوی سی سالہ بہ سنداں زدہ ام

گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقوی چہ کنم مایۂ تقوی سی سالہ فراہم شدہ است

شوق کی خمیازہ سے :۔

ع : خمیازہ ہائے شوق ہاں برقرار بود

زلف کی سایہ سے اور ہجر کی شام سے :۔

رفتم و در سایۂ زلفش پناہ آوردہ ام زاں ستم ہائے کہ بر من شام ہجراں کردہ بود

خرد و ہوش کی اساس سے :۔

ع : یک بارہ اساس خرد و ہوش برافتاد

راز کی گنجینہ سے :

ع : فغاں کہ آں ہمہ گنجینہ ہائے راز مرا

مولانا شبلی نے با محاورہ زبان لکھی ہے، چند غزلوں سے محاورات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے:

بہ بند غم شدن، برجا شدن، می زدن، راز از پردہ بروں افتادن، طوفانِ سہانی طرح نہادن، دم زدن، نوا زدن، گام زدن، سنگ بر شیشہ زدن، جام طرب زدن، قدح زدن، بادہ زدن، پیمانہ بر سرپیاں زدن، داستاں گردیدن، دست رد بر چیزے زدن، آتش در خرمنِ ایماں زدن، شیشہ بر سنداں زدن، نقش بر ورقِ جاں زدن، دست بہ پیماں زدن، دل زدن، طوفاں زدن، ساغر زدن، بوسہ زدن، طعنہ زدن، گرہ زدن، از مذاق افتادن، خون ریختن، حدیث از چیزے بودن، برہم گشتن، بر کار بودن، بہ چیزہا از جائے حرفے از چیزے بودن، تنگ در آغوش فشردن، بہ حال رسیدن، حریف دل بودن، راہ گرفتن، چاک در چیزے زدن، دیدہ از چیزے باز گرفتن، پرواز گرفتن، دل گرفتن، دل دادن، نظر برُخ کشودن وغیرہ،

مولانا شبلی حافظ سے متاثر تھے اس کی ایک شکل یہ ہے کہ حافظ کے بعض مصرعوں اور

فقروں کو انھوں نے اپنی غزلوں میں شامل کیا ہے، مثلاً فرماتے ہیں۔

ناز غرورِ حسن نہ دادش اجازتے ۔۔۔ ورنہ سوالِ بوسہ ما را جواب بود

پہلا مصرعہ حافظ کی اس بیت سے ماخوذ ہے ؎

غرورِ حسن اجازت مگر نداد اے گل ۔۔۔ کہ پرسشے بکنی عندلیب شیدا را

صد چمن لالہ و گل جوشدم از جیب و بغل ۔۔۔ قرعۂ فال ہم آغوشیِ جاناں زدہ ام

قرعۂ فال کا فقرہ حافظ کی بیت سے لیا گیا ہے،

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حافظ کے معتبر نسخوں میں یعنی نسخۂ گورکھپور اور نسخۂ خلخالی وغیرہ میں قرعۂ کار ہے لیکن شہرت قرعۂ فال کی ہے، اور یہی روایت مولانا نے اختیار کی ہے،

دوش رفتیم و بدیدیم کہ طوطیِ چمن ۔۔۔ داستانہا ز لبِ لعلِ شکر خا می کرد

"لبِ لعل شکر خا" کا فقرہ حافظ کی حسبِ ذیل بیت سے لیا گیا ہے،

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

حافظ کی مشہور بیت ؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنارِ آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلےٰ را

کو اپنی ایک غزل میں مولانا نے اس طرح شامل کیا ہے،؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنارِ آبِ جو پاٹلی و گلگشتِ ایالورا

حافظ کی بعض غزلوں پر شبلی کی غزلیں

حافظ	شبلی
یک دو جامم دی سحر گہ اتفاق افتادہ بود	دردش آں دلدار را من ہم وثاق افتادہ بود
وز لب ساقی شرابم در مذاق افتادہ بود	غلغلے در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود
سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد	صوفی آن سر حقیقت کہ ہویدا می کرد
وانچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد	ہر حدیثے کہ بپا کرد وہم از ما می کرد

مولانا شبلی کا نثری اسلوب نگارش

مولانا شبلی کی کوئی مستقل تصنیف فارسی نثر میں نہیں البتہ انکے مکاتیب کے مجموعہ میں ۲۳ چھوٹے بڑے خط فارسی میں ملتے ہیں، ان کی تحریر کی خصوصیات یہ ہیں

۱۔ فارسی نثر میں وہ غالب سے متاثر ہیں، اسی وجہ سے اُن کے بعض الفاظ و تعبیرے مولانا نے لے لئے ہیں، جیسے ہمانا، تختی، برآن بودن، مایہ برخورداری، بادیہ پیمائی، ہرزہ درائی، ستیزۂ چرخ، آویزش بخت، آبی بر آتش زدن، چشم غمخواری، پاسخ، کشاکش غم، ہرزہ گردی، از ہر جہ می سخن، زغن، دندان بدل فشردن، چہ مایہ، انصاف بالاے طاعت است، آ دروغ، دروغ راست مانا، بیچ است، اندیشہ بدامن خاطر آویخت، کالا ہے راستی،

غالب کی پیروی میں ماضی تمنائی کا استعمال جیسے سخن پیوستے درد دل گفتمی، برخوردی

حالانکہ زیادہ متداول صورت ماضی استمراری کا استعمال ہے یعنی سخن می پیوستم وغیرہ،

۲۔ خطوط کی عبارت اکثر مسجع ہوتی ہے:-

"انجمنے از یاران ساز پذیرفتہ است وہر یکے از ہر دری سخن پیوستہ،

تن بہ رضا دادہ و دست از طلب باز داشتہ سر بفرمان نہادہ'

من لحاظ ہے خموشم ودو تے در دفع این مطاعن می کوشم،

سر بسنگ آمد و فسحت خانۂ دل از تمنا کم از تنگ آمد،
مگر از من دامن التفات بر چیدہ اند کہ از پاسخ نامہ روی درہم کشیدہ اند،
مگر شبلی را بخت بدیار است کہ دوستی از و بیزار است،
تاہم شما را بر ہمگنان مزیتے باشد و ہم مدرسہ را زیب و زینتی،

۳۔ مولانا شبلی اپنے خطوط میں بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں، چند محاورے ملاحظہ ہوں

"تن بہ رضا دادہ، دست از طلب باز داشتید، سر بفرمان حاسدان نہادہ، برمن خردہ نتوان گرفت، روی و راہی نیست، نساختہ باشم، دلے برجای ندارم، کار بدستِ من افتد، در اندیشہ می گداختم، زمامِ اختیار بدستِ من رسید، دل با ایشان پیوند گرفت، برخوردم، دل زدہ، بہ بہتی دل بستم، کاسۂ آرزو بر سر شکستن، سر بسنگ آمد، دل از افکار تنگ آمد، پای در دامن کشیدم، بچیزے نرسیدم، این خود چہ حرفست، دامن التفات برچیدہ اند، روے کشیدہ اند، آبی بر آتشم زد، بحال اورسیدی، بجوی نیرزد، تن در نمی دہم، بجاے کارم نرسید نہ ہی"،

مولانا کے خطوط میں بعض خطوط ایسے ہیں اور اُن کا اسلوب ادیبانہ ہے، مثلاً ایک خط عم مکرم کے نام ہے، اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں،

"غریب وحشی روی داد و گوناگوں اندیشہ بدامن خاطر در آویخت، ہمہ آں سخنہا کہ عزیزان در وطن من میوزنند بیاد آمد، و دیدہ و دل را بجز ناپروائی خواند و دیدہ می گردد کہ بجنبہ دیاران بیاز ندیمہ خفتہ است و ہرکے از ہر دوے سخن بالا چیدہ تا سخن بدیں جا رسانیدند کہ دیں باید برخوردار ی کہ در علی گڑھ واری

چونست کہ تن برضا دادہ و دست از طلب باز داشتہ سر بفرمان نہادہ ام،
من گاہی خموشم و وقتی در دریغ این مقام گوشم ، بہر یار ان اضطراب بالا طاعت
است ، چون زمام اختیار نہ بدست من باشد ، دیگر بر من خردہ نتوان گرفت"

مولوی محمد سمیع کے نام کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"غریب تر حالی است ، منکہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن بہ آمیزش کس
نمی دادم ، اکنون از فرخی طالع و ہمایونی بخت کار بجاروخس افتادہ است ، مگر من
و فدائے من کہ این ہمہ محنت پژوہی و نفس گدازی از ان دوست تر دارم کہ ترپاقی
چند در ہم بافند و دروغ راست مانا را بہ پیش کسان جلوہ ظہور و فروغ قبول دہند
نفسی چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا ودیعت آوردہ ام ، سزائے آنست کہ سررشتہ اش
با این چند کار ہا بند باشد ، دیگران ندانم کہ در سر چہ دارند ، من خود در خیال
از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ با این ہمہ خواری ہمان شبلی ام کہ بودہ ام
و اگر گاہی بختم یاوری کرد ، ہمان خواہم بود کہ ہستم"

مگر اوبیانہ طرز اور با محاورہ زبان کے باوجود کہیں کہیں اردو رنگ غالب ہے، چند مثالوں
کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :۔

"بکرایہ گیرفت ۔ مصرف شد ، جائے قیام ۔ جائے اقامت ، دوماہ دادو دو روپیہ
کرایہ = کرایہ دو ماہہ دو روپیہ ،

. بچندان کفایت بسر بردہ ام = چندان باحتیاط بسر بردہ ام ، دیگر چہ گویم ،
(قابل حذف) تاخیر از ارتحام باعث خواہد بود = تاخیر موجب آزار خواہد شد
بخیریت ہستم ، ذخیر خواہ مزاج اقدس = بندہ بخیر ہستم ، و امید دارم خیریت بالا

بصحت سلامتی باشند، در قریب روزگاری، بزودی، درچند روزی مدرسہ اینجا تعطیل خواہد یافت پس از چند روز، مدرسہ تعطیل خواہد شد ایں قدر نا غہ تواں کرد ایں قدر غیبت مناسب نیست، وغیرہ وغیرہ،

ان خطوط کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہو کہ علامہ نے نثر کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں کی ورنہ ان میں وہ جوہر فطری طور پر موجود تھا کہ فارسی نثر میں بھی ان کا وہی مرتبہ ہوتا جو شعر میں تھا،

مولانا شبلی نعمانی کی فارسی خدمات کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے بخوبی واضح ہے کہ بحیثیت نقاد وہ اس حد تک کامیاب تھے، کہ نقد الشعر میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بڑی حد تک ایران میں بھی اُن کے معاصرین میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا، فارسی شاعر کی حیثیت سے وہ ایک بلند مقام کے مالک ہیں لیکن اس میدان میں وہ اہل زبان سے بڑھ نہیں سکے ہیں لیکن اُن کی شاعری میں ایک فطری شاعر کا جوہر بدرجۂ اتم موجود ہے، فارسی نثر میں اُن کا درجہ زیادہ بلند نہیں لیکن اگر اس کی طرف قرار واقعی توجہ کرتے تو وہ کامیاب نثر نویس ہوتے، اس لئے کہ ان میں وہ فطری جوہر موجود تھا جو کسی فن میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

سیرت نبویؐ کی ایک اہم کتاب
الشفاء پر ایک نظر
(۲)

ضیاء الدین اصلاحی

اس تمہید سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگرچہ بشر تھے مگر قطعی دلائل اور اجماع سے ثابت ہے کہ آپ کی نوعیت عام لوگوں سے مختلف تھی، اور آپ بے شمار عوارض وآفات سے محفوظ تھے، آگے اسی مسئلہ کو واضح کیا جا رہا ہے۔

نبوت کے وقت ہی سے آپ کا توحید پر جزم واعتقاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت منصب نبوت پر فائز کئے گئے اسی وقت سے آپ کے دل میں توحید کا عقیدہ رچ بس گیا تھا، اور آپ اللہ، اسکی ذات، اس کی حقیقت اور اس کی صفات سے پوری طرح واقف ہو گئے تھے، آپ کا اللہ تعالیٰ اور وحی کی جانی والی ساری چیزوں پر ایمان نہایت پختہ ہو گیا تھا، اور ان سب امور کے بارہ میں آپ کو کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہ گیا تھا۔ یہ سارے مسلمانوں کا متفق علیہ مسئلہ ہے جو قطعی اور واضح دلائل سے بھی ثابت ہے، اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتیٰ	خداوندا مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردوں
قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلیٰ	کو زندہ کرے گا، اللہ نے کہا کیا تم کو
وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (بقرہ)	ایمان نہیں، حضرت ابراہیمؑ نے کہا

کیوں نہیں ؟ لیکن تاکہ میرا دل مطمئن
ہو جائے۔

کیونکہ حضرت ابراہیم کو اس بات میں شک و شبہ نہ تھا کہ اللہ تعالےٰ ہی مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور عدم سے وجود میں لاتا ہے، بلکہ ان کو مردوں کے زندہ کئے جانے کے عمل کے وقوع کا پورا پورا علم و یقین تھا۔ البتہ وہ اطمینانِ قلب چاہتے تھے، اور ان کی خواہش یہ تھی کہ مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔

یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیم کو شک نہ تھا بلکہ ان کا سوال صرف یقین و اطمینان کی زیادتی کے لیے تھا، اس لئے کہ علم ضروری و نظری[۱] میں قوت و زیادتی کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے، نظریات میں تو شک کا احتمال رہتا ہے، مگر ضروریات میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی پس حضرت ابراہیم کو نظر و خبر کے ذریعہ جو بات معلوم ہوئی تھی اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا علم یقین عین یقین میں تبدیل ہو جائے، مشہور مثل ہے فلیس الخبر کالمعاینۃ یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ[۲]

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کے بعد انبیاء علیہم السّلام کی عصمت قطعی طور پر ثابت و مسلّم ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات کسی طرح بھی درست

---

[۱] نظری وہ علوم کہلاتے ہیں، جو فکر و نظر کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، حضرت ابراہیم کا علم نظری تھا جو گو یقین پر مبنی تھا، اور اس میں شک کی گنجائش نہ تھی تاہم نظریات میں بہرحال شک کا احتمال ہوتا ہے جبکہ ضروریات میں قطعاً نہیں ہوتا جیسے دو کا آدھا ایک یا دو متضاد چیزیں اکٹھا نہیں ہو سکتیں وغیرہ [۲] مصنف نے اسکی مزید توجیہات بھی بیان کی ہیں، اور متعدد دوسری آیتیں اور حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن سے اسطرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں پھر ان کا مدلل جواب دیا ہے مگر طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کر دیا گیا۔

اور یہ صحیح نہیں ہو سکتی کہ آپ جس بات کو پہچانے پر مامور کئے گئے تھے، اس کو آپ نے نہیں پہچانا، یا آپ نے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی یا شرک سے آپ کا دامن آلودہ ہوا یا اللہ کے متعلق آپ نے کوئی جھوٹی بات کہی یا گڑھی یا آپ کبھی راہ راست سے بھٹک گئے یا کفار و منافقین کے کہنے میں آگئے۔

نبوت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ نبوت سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام اللہ کی ذات وصفات سے واقف ہوتے ہیں، اور ان کو اس بارہ میں کسی طرح کا شک و تردد نہیں ہوتا، انبیاءؑ کے واقعات وحالات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی پیدائش ہی کے وقت سے ان نقائص سے پاک ہوتے ہیں، اور ان کی نشو و نما توحید اور ایمان پر ہوتی ہے، نبوت کے بعد اُن پر انوار و برکات الٰہی کا فیضان ہوتا ہے، کسی مورخ اور واقعہ نگار نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ کوئی ایسا شخص نبی بنایا گیا ہو، جو نبوت سے پہلے کفر و شرک میں ملوث رہا ہو۔ قریش نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر طرح کے الزام لگائے اور گذشتہ انبیاءؑ پر بھی ان کی کافر قوموں نے ہر قسم کے اعتراضات کئے جن کی صراحت قرآن مجید نے بھی کی ہے، اور اہل سیر و تاریخ نے بھی ان کو نقل کیا ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ انبیاءؑ کو اس پر مطعون کیا گیا ہو کہ کل تک وہ جن معبودوں کی خود پیروی کر رہے تھے، آج ان کو بھلا بیٹھے، یا اس بات کے لیے ان کی مذمت کی گئی ہو کہ انھوں نے اس چیز کو ترک کر دیا، جس کو کل تک ہمارے ساتھ کیا کرتے تھے، اگر اس طرح کی بات ان نبیوں کی جانب سے ہوئی ہوتی تو کفار ضرور اس پر معترض ہوئے ہوتے اور ان کے اس اعتراض میں بڑا وزن بھی ہوتا۔ مگر جب کفار کی پوری جماعت کی جانب سے یہ اعتراض نہیں ہوا تو یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کو اسکی

باہی گنجایش نہ مل سکی اگر کوئی گنجایش مل ہوتی تو وہ خاموشی نہ اختیار کرتے جس طرح کہ
بلد بدلنے کا حکم ہوا تو انھوں نے اعتراضات شروع کر دیئے تھے، اور یہ کس طرح ممکن
تھا کہ آپ کا دامن کفر و شرک سے آلودہ ہوتا جب کہ بچپن ہی میں حضرت جبریلؑ نے آپ کا
سینہ چاک کرکے اس کی آلائشیں دور کر دی تھیں، اور پھر اس کو دھوکر اسے حکمت
ایمان سے بھر دیا تھا آپ کا یہ ارشاد اوپر گذر چکا ہے کہ مجھکو بتوں سے سخت نفرت تھی ایک
دفعہ آپ اپنے چچا ابو طالب کے اصرار سے قریش کے کسی تہوار میں چلے گئے مگر وہاں سے
دہشت زدہ ہوکر واپس لوٹے، آپ فرماتے تھے کہ جب میں کسی بت کو چھونے کا ارادہ
کرتا تو ایک لمبا اور سفید شخص نمودار ہوکر میرے پیچھے آجاتا اور مجھے اس سے روک
دیتا، اس کے بعد آپ پھر ان کے کسی میلہ اور تہوار میں نہ شریک ہوئے، اسی طرح جب
بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ شام گئے اور بحیرا راہب آپ سے ملا تو اس نے آپ کے
اندر نبوت کی علامتیں دیکھیں اس لیے امتحان کے طور پر اس نے آپ سے لات وعزیٰ
کی قسم لینی چاہی، مگر آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے ان دونوں سے
زیادہ بغض کوئی چیز نہیں۔

دنیوی معاملات سے آپ کی باخبری، | جو معاملات دنیا سے متعلق ہیں، اُن میں انبیاء کے لئے عصمت ضروری نہیں، اس طرح کے امور سے وہ ناواقف بھی ہوسکتے

ہیں، اور ان کے بارہ میں خلاف واقعہ رائے قائم کر سکتے ہیں، اس میں کوئی نقص
و عیب بھی نہیں، اس لئے کہ انبیاء کا اصلی مطمح نظر آخرت، اس کے حالات اور
شریعت کے احکام و قوانین ہیں، اس کے برخلاف جن لوگوں کا مرکز و محور دنیا
ہوتی ہے ان کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ

......يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ — وہ لوگ دنیوی زندگی کے ظاہر سے
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ — واقف ہوتے ہیں، اور آخرت سے
الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (روم) — غافل رہتے ہیں۔

مگر انبیا علیہم السّلام کے بارہ میں یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ دنیا کے امور و مسائل سے سرے سے ناواقف ہوتے ہیں، کیونکہ یہ تو غفلت اور بے خبری ہوئی جس سے وہ قطعی منزہ ہوتے ہیں، اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ ان کی بعثت دنیا والوں کی طرف ہوتی ہے اور ان کے سپرد ان کی سیاست و ہدایت اور دینی و دنیاوی معاملات کی نگرانی کی جاتی ہے، ایسی حالت میں وہ دنیوی امور سے بالکل ہی ناواقف اور بے خبر کیسے رہ سکتے تھے،

اگر دینی معاملات ہوں تو ان میں آنحضورؐ کی لاعلمی اور ناواقفیت کا خیال غلط ہے کیونکہ ان سے آپ کو وحی کے ذریعہ مطلع کردیا جاتا تھا، اس لئے ان امور کے بارہ میں آپ کو علم یقین حاصل ہوجاتا تھا، البتہ جن چیزوں کے بارہ میں آپ پر وحی نہیں نازل ہوتی تھی، اور ان پر آپؐ اجتہاد فرماتے تھے، تو یہ اجتہاد بھی برحق اور صحیح ہوتا تھا، اس بارے میں جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ ناقابل التفات ہے، البتہ جن شرعی حوادث و واقعات میں آپؐ کوئی متعین اور قطعی بات عدم واقفیت کی بنا پر نہ کہتے تو ان میں وحی کا انتظار فرماتے اور جب وحی کے ذریعہ اللہ آپؐ کو ان سے مطلع فرماتا تو آپ خود واقف ہوجاتے اور دوسروں کو بھی بتادیتے۔

یہ بات کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان نہیں ہوسکتی تھی کہ جس شریعت کی دعوت دینے کے لیے آپ بھیجے گئے تھے، اس کی تفصیلات سے واقف نہ رہے ہوں کیونکہ جس چیز سے آپ واقف ہی نہ ہوں اس کی دعوت کس طرح دیتے؟ اب رہا آسمانی

ین کی ملکوت (بادشاہی) خدا کے اسماء حسنیٰ کی تعیین، آیات کبریٰ، امور آخرت،
بات قیامت، اہل سعادت و اہل شقاوت کے احوال، اور گذشتہ و آیندہ کا
وغیرہ تو ان کے متعلق آپ صرف وحی ہی کے ذریعہ واقف ہوتے تھے، لیکن ان سب کی
یلات کے بارہ میں آپ کی واقفیت ضروری نہیں ہے، گو ان امور کا آپ کو
، قدر علم تھا وہ عام انسانوں کو نہ تھا، آپ کا ارشاد ہے،

انی لا اعلم الا ما علمنی ربی میں نہیں جانتا مگر ان ہی باتوں کو
(بیہقی) جنھیں میرے رب نے سکھایا ہے۔

اسی طرح صحیحین کی روایت میں ہے کہ خدا نے جنت میں اپنے صالح بندوں کے لیے
ین تیار کی ہیں، ان کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا۔ نہ کسی کان نے سنا ہوگا، اور نہ کسی
میں ان کا خیال ہی گزرا ہوگا، نیز آپ نے فرمایا۔

اسئلک باسمائک الحسنی جن ناموں کو تو نے مجھے بتایا اور جن کو نہیں
ما علمت منھا وما لم اعلم بتایا ان سب کے ذریعہ میں تم سے سوال کرتا ہوں"

خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ،

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (یوسف) ہر علم والے کے اوپر خدائے علیم کی ذات ہے،
غرض خدا کے معلومات کی حد و انتہا نہیں اور ان کا کوئی شخص احاطہ نہیں کر سکتا۔

ایں نبی کی عصمت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی خبر دی ہے، ان کی صداقت
ہے، یہ آپ کی شان کے سراسر خلاف ہے کہ آپ نے شریعت کی جن باتوں کو پہنچایا یا
ے بارہ میں آپ کو وحی کے ذریعہ مطلع کیا گیا، اور پھر ان کی آپ نے لوگوں کو خبر دی
، کوئی بات خلافِ واقعہ یا غلط ہوئی ہو خواہ یہ بات آپ نے خوشی کی حالت میں کی ہو

ناراضگی کی حالت میں اور تندرستی کے زمانہ میں بھی ہر یا علالت کے زمانہ میں حضرت
عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا اے خدا کے رسول کیا جو کچھ آپ سے سنتا ہوں
سب کو لکھ لوں آپ نے فرمایا ہاں، میں نے عرض کیا کیا غصہ میں بھی آپ جو کچھ فرمائیں لکھ بھی
لیا کروں ارشاد ہوا ہاں میری زبان سے صرف حق ہی بات نکلتی ہے۔ خدا کا بھی
ارشاد ہے کہ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ — نبی اپنی خواہش سے نہیں کہتا وہ جو کچھ
هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم) — کہتا ہے اس کی اس کو وحی کی جاتی ہے

نیز فرمایا :۔

وَقَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ — اور تمہارے پاس تمہارے خداوند کی
بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ — طرف سے رسول حق لیکر آیا ہے۔

اگر نبی کے لئے سہو و غلط [illegible] جائز مانا جائے تو حق و باطل میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔
آگے چلکر مصنف نے اقوال کی طرح اعمال میں بھی انبیاؑ کی عصمت ثابت کی ہے، اور
لکھا ہے کہ ان سے فواحش و کبائر کا صدور نہیں ہوا، اور انہوں نے خدا کے حکم کو پہنچانے
میں اخفا، کمی اور کوتاہی نہیں کی۔

نبوی عوارض | اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء بشر تھے انکے
جسم اور ظاہری حالات بھی عام انسانوں جیسے تھے [illegible] ان پر مختلف حالات [illegible]
[illegible] رہتے تھے، اور وہ آفات و مصائب سے بھی دوچار ہوتے تھے تکیفیں اٹھاتے تھے
[illegible] ہوتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے موت کا پیالہ بھی پیا۔ جیسا کہ ہر فرد بشر کے ساتھ
ہوتا رہتا ہے، اور یہ کسی نقص اور عیب کی دلیل نہیں ہے، آنحضرت صلعم کا بیمار ہونا بھی

بیماری کی شدت سے پریشان ہونا ثابت ہے، آپ کو گرمی اور سردی بھی لگتی تھی، اور بھوک پیاس بھی لاحق ہوتی تھی۔ غصہ بھی آتا تھا، اور آپ پر گھبراہٹ بھی طاری ہوتی تھی، آپ تھکان بھی محسوس کرتے تھے، کمزوری اور بڑھاپا بھی آپ کو لاحق ہوا، گھوڑے سے گرے تو دائیں پہلو میں چوٹ آگئی، کافروں نے زخم لگایا، اور دندان مبارک شہید ہوگئے آپ کو زہر پلایا گیا، اور آپ پر جادو بھی کیا گیا، آپ نے دوائیں کیں پچھنا لگوایا، پھر انتقال فرما گئے، یہ سارے حالات عام لوگوں کو بھی پیش آتے ہیں، اور آپ کے علاوہ دوسرے انبیاء کو اس سے بھی زیادہ سخت اور دشوار حالات پیش آئے، بعض قتل کر دیئے گئے بعض کو آگ میں ڈال دیا گیا، اور بعض کے جسم پر آرے چلائے گئے اور بعض کو اللہ نے ان شدائد سے بچا لیا، جس طرح کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچایا۔

یہی حال آپ کے بعض فیصلوں کا بھی تھا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ میں بھی تمہاری طرح آدمی ہوں، تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو ممکن ہے کوئی شخص اپنی بات زیادہ اچھے ڈھنگ سے بیان کرے اور میں اس سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اس لئے اگر میں نے کسی کو اس کے بھائی کا حق دیدیا ہو تو وہ اس کو نہ لے کیونکہ یہ آگ کا ٹکڑا ہے،

گویا آپ کے فیصلے ظاہر حال اور غلبۂ ظن کے مطابق ہوتے تھے، آپ وہ گواہوں سے شہادت اور مدعی سے قسم لے کر جس چیز کو قرین قیاس سمجھتے اس کا فیصلہ فرما دیتے، یہی اللہ کی حکمت کا تقاضا بھی تھا، وہ اگر چاہتا تو آپ کو لوگوں کے پوشیدہ معاملات اور بھیدوں سے واقف کر دیتا اس طرح آپ براہ راست پورے علم و یقین سے فیصلہ صادر فرماتے اور کسی اقرار و ثبوت کی آپ کو ضرورت نہ ہوتی، مگر چونکہ اللہ نے امت کو آپ کی اتباع کا حکم دیا ہے،

یا اگر وہ اس طرح کے معاملات میں آپ کچھ لوگوں کے اسرار و خفی باتوں سے آگاہ
دیا تو اس حد تک ہے کہ آپ کے اتباع کی کوئی صورت باقی نہ رہتی، وہاں یہ آپ کے جیسے
احکام ظاہر حال پر مبنی ہوتے تھے تاکہ ان میں آپ کو دوسروں پر کوئی امتیاز اور خصوصیت
ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے خاص ہے، وہ
اسے کسی کو مطلع نہیں کرتا البتہ اپنے منتخب رسولوں کو جن امور غیب کی چاہتا ہے خبر دیتا ہے

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیوی باتوں اور خبروں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
جھوٹ سرزد نہیں ہوا، البتہ تعریض وکنایہ آپ کی شان کے منافی نہیں ہے، خصوصاً ایسے
نع پر جب کوئی مصلحت اس کی متقاضی ہو، چنانچہ لڑائیوں میں آپ اپنی سمت بتانے میں
ہ سے کام لیتے تھے تاکہ دشمن چوکنا نہ ہو سکے، اسی طرح مزاح میں بھی آپ سے اس طرح کی باتیں منقو
کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی دلجوئی اور خوشی کے لیے کبھی کبھی مزاح بھی فرمایا کرتے
، ایک دفعہ ایک صاحب نے آپ سے سواری کے لیے اونٹ مانگا، آپ نے فرمایا کہ میں تم کو
اری کیلئے ابن الناقہ (اونٹ کا بچہ) دوں گا، انھوں نے کہا یہ میرے کس کام کا؟ آپ نے فرمایا
فی ہی تو اونٹ جنتی ہے، اس لئے اونٹنی ماں اور اونٹ اس کا بچہ ہوا، اسی طرح ایک خاتون نے
، سے اپنے شوہر کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ وہی شخص ہیں جن کی آنکھ میں سفیدی ہے
ںوں نے کہا نہیں، ان کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، تب آپ نے فرمایا کہ ایسا کون آدمی
جس کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہوتی۔

گو یہ سب تفریح اور دلچسپی کی باتیں تھیں، مگر سب درست اور صحیح تھیں اسی لئے آپ نے
یا کہ میں مذاق اور تفنن کرتا ہوں مگر صحیح بات ہی کہتا ہوں۔ اسی طرح دنیوی کاموں میں بھی
یچ گنا ہوں اور مکروہات سے بچتے تھے۔

کتاب الشفا اور قرآن مجید | کتاب الشفا کا ایک ماخذ قرآن مجید ہے، اس کی ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ومنقبت کے متعلق مختلف قرآنی آیتیں درج ہیں اور ان کے بعد بھی جابجا آپ کے اوصاف وخصائل اور خصوصیات وامتیازات کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید سے ثبوت پیش کیا گیا ہے، علامہ شبلی سیرۃ النبی میں ایک باب قرآن اور سیرت محمدیہ کے نام سے مرتب کرنا چاہتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اس تجویز کے خاص محرک و موید تھے، وہ رقمطراز ہیں:

"لوگوں نے حیات و سیرت طیبہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاتر تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف قرآن حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی سیرت وحیات پر کیسی روشنی پڑتی ہے، اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں، اسی طرح اپنے حامل ومبلغ کے وجود وحیات کے بیان میں بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں؟ اصحاب سیر و محدثین کرام نے فضائل و مدائح منصوصہ قرآنیہ کے تو باب باندھے ہیں مثلاً قاضی عیاض نے شفا کے متعدد ابواب میں قرآن حکیم کی آیات متعلق فضائل و مدائح جمع کی ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دائرہ استناد واخذ محدود رکھکر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے، جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا، میں نے کہا آپ سیرت میں ایک خاص باب، یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے "قرآن اور سیرت محمدیہ" اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط وترتیب جمع کر کے دکھلائیے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت

(مضامین کے چند حصے وقائع ویام معلوم ہوسکتے ہیں" زندگی دو البلاغ پریس کلکتہ)

علامہ شبلیؒ نے سیرت کے اس باب کی تکمیل مولانا آزاد ہی کے ذمہ کردی تھی، انھوں نے اس پر کافی مواد بھی اکٹھا کرلیا تھا مگر ان کے مسودہ کا کچھ پتہ نہیں، آیندہ جب بھی اس موضوع پر کام کیا جائے گا، کتاب الشفا سے اس میں مدد ملے گی۔

قاضی عیاض نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے جن مسائل پر گفتگو کی ہے ان کے سلسلہ میں اولاً انھوں نے کلام مجید ہی سے شواہد نقل کئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کی زندگی قرآن حکیم کی عملی تفسیر اور جیتی جاگتی تصویر تھی، اس کی توضیح ان مثالوں سے ہوگی۔

۱۔ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی تھی اس لئے آپ کے مخالفین آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے، اور آپؐ اپنے دشمنوں کے ضرر اور ایذا رسانی سے محفوظ رہتے تھے، اس کا ثبوت حسب ذیل آیتیں ہیں:۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ، ۶)	اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھیگا۔
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا	اور تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار
(طور ۴۸)	میں صبر کئے رہو تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو

تیسری آیت میں ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (زمر ۳۶)	کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں؟
اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ ٥	ہم تمھیں ان لوگوں کے شر سے بچانے
(حجر: ۹۵)	کیلئے جو تم سے استہزا کرتے ہیں کافی ہیں

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ خطرے کے وقت صحابۂ کرام آپؐ کی نگرانی کیا کرتے تھے اس پر واللہ یعصمک الخ نازل ہوئی اس کے بعد آپ نے لوگوں کو منع کردیا اور فرمایا کہ میرا رب میرا محافظ ہے

ایک دفعہ آپ ایک درخت کے نیچے استراحت فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر تلوار سونت لی اور کہا کہ آپ کو مجھ سے کون بچائے گا، ارشاد ہوا میرا اللہ، وہ کانپنے لگا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھا لی مگر اس کو معاف کر دیا (ج ۳ ص ۲۲۵ تا ۲۳۲)

۲۔ اللہ نے ملائکہ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کی اور جنوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، متعدد صحابہ نے ملائکہ اور جنوں کو دیکھا، قرآن میں ہے۔

وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ (تحریم : ۴)	اور اگر پیغمبر کی ایذا رسانی پر تم دونوں باہم اعانت کرو گی تو خدا اور جبریل اور نیک کردار مسلمان ان کے حامی ہیں اور ان کے علاوہ (اور) فرشتے بھی مددگار ہیں۔

دوسری جگہ ہے :۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ ۝ (انفال : ۹)	جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کر لی (اور فرمایا کہ تسلی رکھو) ہم ہزار فرشتوں سے جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے تمہاری مدد کریں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا :۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ	جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمہارے

فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۔ ... ساتھ ہوں تم مومنوں کو تسلی دو [illegible]
[illegible] (انفال : ۱۲) ... ثابت قدم رکھو [illegible]

جنوں کے سلسلہ میں فرمایا :-

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا	اور جب ہم نے جنوں میں سے کئی جن
مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ	تمھاری طرف متوجہ کئے کہ قرآن سنیں

(احقاف : ۲۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں کئی بار صحابہ کرام نے ملائکہ کو دیکھا، بعض صحابہ نے حضرت جبرئیلؑ کو آدمی کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام وایمان کے بارے میں سوالات کرتے سنا۔ حضرت ابن عباسؓ اور اسامہ بن زید نے آپ کے پاس جبرئیلؑ کو دحیہ کلبیؓ کی صورت میں دیکھا اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جنوں کو اس رات میں دیکھا جس میں آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ ایمان لائے (ج ۳ ص ۲۷۷ تا ۲۸۳)

۳۔ نبی کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی مکمل اتباع واقتدا کی جائے، اور ہر حال میں آپ کے احکام کی پابندی کی جائے اور نافرمانی سے بچا جائے ۔ ملاحظہ ہو

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ	(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ۝	خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری
(آل عمران ۔ ۳۱)	پیروی کرو خدا بھی تمھیں دوست رکھیگا ۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت واحکام کو ہر چیز یہاں تک کہ اپنی خواہشات پر بھی مقدم رکھے، اس کی دلیل یہ ہے :-

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَ	اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مہاجرین
الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ	سے پہلے ہجرت کے گھر (یعنی مدینے) میں
مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ	مقیم اور ایمان میں مستقل رہے اور جو
فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا	لوگ ہجرت کرکے ان کے پاس آتے ہیں
اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	ان سے محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ ان کو
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ،	ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور
(حشر ۹)	خلش) نہیں پاتے، اور ان کو اپنی جانوں سے
	مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج
	ہی ہو۔

ان لوگوں سے بغض و نفرت کی جائے جو خدا اور اس کے رسول کو مبغوض ہوں اور جو لوگ آپؐ کی سنت کے مخالف اور دین میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے ہوں ان سے کنارہ کش رہا جائے، خدا کا ارشاد ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	جو لوگ خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ	ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (مجادلہ ۲۲)	سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

کتاب الشفا میں جو قرآنی آیتیں نقل کی گئی ہیں ان کی مختلف پہلوؤں سے تشریح کی گئی ہے، جیسے اختلاف قرات کا ذکر، خطاب کی تعیین، مشکل لفظوں کی وضاحت، دقیق مباحث کی تشریح، آیات کی تاویل و توجیہ اور ان کے مفہوم و مطلب کی وضاحت وغیرہ، آیتوں کی تفسیر میں ان باتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے:۔

۱۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے، کیونکہ اس میں جو چیز ایک جگہ مجمل بیان ہوئی ہے، وہی دوسری جگہ

مفصل بیان کی گئی ہے۔

۲۰۰ احادیث سے، ۳۰ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے مفسر نے تفسیر کی ہے۔ مصنف عام طریقے کے مطابق سلف کے اقوال پر اعتماد کرتے ہیں، وہ علمائے مجتہدین کے نقطۂ نظر کو مرجح قرار دیتے ہیں، تاہم ضعیف اور مرجوح اقوال کی نشاندہی اور غلط تفسیری اقوال کی تردید بھی کرتے ہیں اس طرح اس میں بکثرت تفسیری اقوال درج ہیں، کہیں کہیں آیات پر وارد ہونے والے اشکالات و شبہات کا جواب بھی دیا ہے، (باقی)

مولانا سید محمد شاہ نقوی محدث رامپوری

از

جناب سید بہاء الحق صاحب رضوی ایم، اے، علیگ

مولانا سید محمد شاہ نقوی محدث رامپوری ابن مولانا سید حسن شاہ صاحبؒ محدث ابن سید شاہ حسین ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں رامپور میں محلہ زینہ عنایت خاں میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلۂ نسب بخارا کے مشہور بزرگ حضرت سیدنا شاہ جلال بخاریؒ سے ملتا ہے، آپ کے جدامجد ہندوستان تشریف لائے اور رامپور میں آباد ہوئے،

ان کا تذکرہ نزہۃ الخواطر٭ میں مولانا سید عبد الحیٔ نے ان الفاظ میں کیا ہے،

احد کبار العلماء .... وهو	وہ بڑے علماء میں سے تھے، ....
منور الشیبہ حسن الاخلاق	... وہ خوبصورت شکل وصورت کے،
حلو الکلام قد غشیہ نور	اخلاق کے بہت اچھے، ان کے کلام میں شیرینی،
الایمان وسیماء الصالحین انتھی	اُن میں نور ایمانی کا غلبہ تھا، صالحین
الیہ الورع وحسن السمت و	کی نشانیاں پائی جاتی تھیں، پرہیزگاری
التواضع والاشتغال بخاصۃ	انتہائی درجہ کی تھی، عمدہ طریق کار،
النفس واتفق الناس علی	تواضع وانکساری اور احتساب نفس
الثناء علیہ والمدائح لشمائلہ،	کی خوبیاں اُن میں موجود تھیں، لوگ

٭ نزہۃ الخواطر از مولانا عبد الحیٔ صاحب، جلد (۸) صفحہ ۴۴۳ - ۴۴۴ .

ان کی بزرگی اور حسن عادات کی وجہ
سے ان کی تعریف میں متفق تھے،

حکیم مولانا سید عبدالحیؒ نے آپ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میاں صاحب نے سند حدیث بروایت شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی بذات خود عطا کی،

ان کے والد مولوی سید حسن شاہ ایک مشہور معروف محدث تھے، ان کا تذکرہ نزہۃ الخواطر میں ان الفاظ میں ہے[1]،

الشیخ العالم المحدث حسن شاہ	مولوی سید حسن شاہ ابن شاہ حسینی حنفی
ابن سید شاہ الحسینی الحنفی	علم حدیث کے ایک مشہور عالم تھے...
الامروہی احد العلماء المشهورین	..........سید
بالحدیث..............	شاہ سادات کرام کے ایک معزز
... وکان من خیار السادة النبلاء	خاندان کے فرد تھے، اور بزرگی کی
الفضلاء القادة له من محاسن	وجہ سے عظیم رہنما کا مرتبہ رکھتے تھے،
الاخلاق ومکارم الصفات	حسن اخلاق اور عمدہ صفات کے
لیس لغیره مع عقل رصین و	ساتھ ساتھ عقل وفہم کی پختگی اور دین
دین متین واشتغال بخاصة	محکم رکھتے تھے، جس کی مثالیں کم ملتی
النفس وعفاف وعزة نفس	ہیں، چالیس سال تک لوگوں کو
وجلالة في القلوب وفخامة زائدة	فائدہ پہنچایا، اور ان سے ان کے
عند جمیع الناس درس وافاد	صاحبزادے سید محمد شاہ اور علما کی
بلدة اربعین سنة اخذ عنه ولده	بڑی جماعت نے علم حاصل کیا۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۰۸۔

السید محمد شاہ خلق کثیر من العلم
توفی بھا فی ثانی عشرین من صفر سنۃ
اثنتی عشرۃ و ثلث مائۃ و الف
ببلدۃ رامفور.

ان کا وصال ۲۲ صفر ۱۳۱۲ھ
میں رام پور میں ہوا۔

مولانا سید حسن شاہؒ حضرت شاہ عالم علی نگینوی محدث (مراد آبادی) کے شاگرد رشید تھے، اور شاہ عالم علی صاحب حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ محدث دہلوی کے شاگرد خاص تھے. تراجم علماے حدیث[1] مولفہ مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے غلط طور پر سید حسن شاہ صاحب کو شاہ اسحٰق صاحب کا شاگرد لکھ دیا ہے، حالانکہ وہ شاہ عالم علی صاحب نگینوی کے شاگرد تھے،

مؤلف تراجم علماے حدیث کے پیش نظر تذکرہ کاملانِ رام پور[2] تھا، جس میں تلمذ کا سلسلہ درج ہے، غالباً اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب سید حسن شاہ صاحب کو حدیث کی تکمیل کا شوق ہوا تو یہ تردد ہوا کہ حضرت شاہ اسحٰقؒ سے دہلی جا کر تحصیل علم کریں یا مراد آباد میں شاہ عالم علیؒ سے، اسی تردد کے دور میں خواب میں حضرت نبی علیہ السلام کی زیارت ہوئی اور اس کے بعد طبیعت میں یکسوئی پیدا ہو گئی اور حضرت شاہ عالم علیؒ سے مراد آباد میں چھ سال رہ کر حدیث شریف کی تکمیل کی اور سند حاصل کی،

مولانا محمد شاہؒ نے ابتدائی تعلیم گھر پر شروع کی اور اپنے والد صاحب سے صرف و نحو کی مروجہ کتابیں پڑھیں اور ان سے ہی فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں، مینا بازار، اور ظہوری فارسی کے مشہور عالم شیخ احمد علی صاحب سے پڑھیں،

---

[1] تراجم علماے حدیث جلد اول، مؤلفہ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی، ص، ۵۰۴ - ۵۰۶ [2] تذکرہ کاملان رام پور، مولفہ احمد علی خاں شوق، ص، ۳۵۷،

فقہ کی چند کتابیں اور اصول فقہ کی چند کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور بقیہ کتابیں اصول فقہ کے استاذ زمانہ مولوی عزیز اللہ خاںؒ ولایتی سے پڑھیں اور معقولات کی تحصیل مولوی معظم شاہؒ ولایتی (شاگرد مفتی سعد اللہؒ) سے کی،

خواب | وہ علوم متداولہ کی تحصیل کر چکے تھے، لیکن حدیث شریف کی باقاعدہ تعلیم شروع نہیں کی تھی کہ ایک روز خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر خرمہ کا ایک درخت ہے جس سے توڑ کر خرمے کھا رہے ہیں، غیب سے آواز آئی کہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے درخت سے خرمے کھا رہے ہو، جس کی تعبیر آپ نے یہ کی کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے مراد حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا خاندان اور خرمے کے درخت سے اپنے والد ماجد اور خرمہ سے مراد علم حدیث، اس خواب کے بعد (۱) کو علم حدیث کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا، مشکوٰۃ شریف، صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور دوسری کتب حدیث نہایت محنت و کاوش سے والد صاحب سے پڑھیں اور تفسیر کی کتب بھی اپنے والد سے پڑھیں اور مسلم شریف اپنے والد کے شیخ حضرت شاہ عالم علی صاحب سے پڑھی اور اس کے بعد درس دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

قیام بنارس | جس زمانہ میں نواب محمد علی خاں معزولی کی حالت میں بنارس میں مقیم تھے، نواب صاحب کے قریب کی مسجد میں محمد شاہ صاحب کا قیام تھا، نواب صاحب نے اپنے لڑکے عبد الوہاب خاں کو حدیث پڑھانے کے لئے کہا، شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر عبد الوہاب خاں کو پڑھانے کے لئے تیار ہو گئے، نواب صاحب بھی مسجد میں لڑکے کو تعلیم دلوانے پر رضامند ہو گئے، انھوں نے ان کو حصن حصین، مشکوٰۃ شریف اور شمائل ترمذی پڑھائیں، بنارس سے گھر آئے اور خواب میں دیکھا کہ سید معصوم صاحب کی مسجد کے بالاخانہ پر جو ضلع مالدہ بنگال میں ہے، شاہ عبد العزیز صاحبؒ حدیث شریف کا درس دے رہے ہیں، سید صاحب نے عرض کیا کہ نواب صاحب کے لڑکے کو پڑھانے بنارس جاتا ہوں، یہ امر

مجھ پر شاق ہے آپ دعا فرمایئے کہ میں گھر پر درس دیا کروں، شاہ صاحب نے فرمایا "اچھا" اور دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے، اس کے بعد وہ بنارس نہیں گئے، اور گھر پر درس دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا،

کچھ عرصہ بعد مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی کی تحریک پر اُن کا تعلق مدرسۂ عالیہ رام پور سے ہوگیا اور مدرسہ میں حدیث کے طلبہ کو درس دینے لگے، نواب خلد آشیاں کے بعد مدرسہ میں انگریزی افسران کی آمد شروع ہوگئی، جو معائنہ کے لئے آتے، وہ درس کے دوران نہ خود تعظیم کرتے، اور نہ طلبہ کو تعظیم کرنے دیتے، اس وجہ سے مدرسہ کی خدمت سے علٰحدہ کر دیئے گئے، اور ریاست کی جانب سے گھر پر تعلیم دینے کے لئے کہا گیا، اور مدرسہ کی تنخواہ مقرر کر دی گئی اور طلبہ کے وظیفے مدرسہ کی طرح مقرر کئے گئے، جس کو انھوں نے ریاست کی جانب سے مجبور کرنے پر قبول کرلیا، اس کے بعد ان کے درس کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبہ آتے اور سیراب ہوکر جاتے اور آخر دم تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، تقریباً پچاس سال تک گھر پر بیٹھ کر علم حدیث کی شمع کو روشن رکھا، ہندوستان اور بیرون ہند سے طلبہ پروانہ وار آتے اور روشنی حاصل کرکے واپس جاتے، ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے،

ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ اُن کے شاگرد گئے، جنھوں نے شمع حدیث کو روشن کیا ان کی زندگی میں ان کے بہت سے شاگردوں کی بھی شہرت کافی ہو چکی تھی، اور بطور محدث اور عالم مشہور ہو گئے تھے، ان کے شاگردوں میں شمس العلماء مولوی منور علی رام پوری کی شہرت بہت زائد ہوئی، مولوی منور علی نے سید صاحب سے حدیث کی تکمیل کی اور سند حاصل کی، وہ مدرسہ عالیہ رام پور میں درجۂ حدیث کے استاد مقرر ہوئے، اور ان کے کثیر شاگرد ہوئے، ان کا طریقہ تھا کہ مدرسہ عالیہ میں جب تعلیمی سال شروع ہوتا اور درجۂ حدیث میں طلبہ داخل ہوتے تو

پہلے سبق کے لئے طلبہ کو سید صاحب کے مکان پر لیجاتے اور خود طلبہ کی صف میں بیٹھ کر اپنے استاد سے حدیث شریف شروع کراتے اور اس کے دوسرے روز سے مدرسۂ عالیہ میں سبق کا سلسلہ شروع ہوتا۔

مولوی منور علی شاگرد مولانا سید محمد شاہؒ کا تذکرہ بھی مولانا عبدالحئی نے "نزہۃ الخواطر" جلد ۸ صفحہ ۴۸۳ پر ان الفاظ میں کیا ہے،

"الشیخ العالم المحدث منور علی بن مظہر الحق الحنفی الرام پوری احد العلماء المشہورین"

وفات ۱۲۵۱ھ تاریخ وفات

"مرقد آفتاب حدیث ۱۲۵۱" (تاریخ وفات ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۵۱ھ)

سید صاحب کے دوسرے اہم شاگرد حافظ محمد وزیر محدث تھے، سید صاحب حافظ وزیر کو بہت چاہتے تھے اور اکثر طلبہ کو حدیث اور دیگر علوم کے حصول کے لئے حافظ محمد وزیر کے پاس بھیجتے تھے، اور ان کو کسی طرح بھی مولوی منور علی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالواحد صواتی، مولوی محمد امین صاحبزادہ الطاف علی خاں، مولوی عبدالغفور صواتی (جو بیس سال تک ڈابھیل میں درس حدیث دیتے رہے) مولانا حافظ عبدالوہاب خاں، مولوی نجم النبی اور خود آپ کے فرزند مولانا سید حامد شاہ (قاضی شہر رام پور) شہرت وعظمت کے مالک ہوئے۔

ان کے شاگردوں میں مولوی منور علی، حافظ محمد وزیر، حافظ عبدالوہاب خاں نے مدرسۂ عالیہ میں حدیث شریف اور دوسرے علوم کے درس دئے، مولوی منور علی کو انھوں نے اپنی زندگی میں رام پور سے باہر جانے نہیں دیا، حالانکہ اکثر مقامات سے ان کو بلایا گیا، سید صاحب کے انتقال کے بعد مولوی منور علی ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی اور حدیث کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

ان کے صاحبزادہ مولوی سید حامد شاہ صاحب محدث شہر رام پور کے قاضی ہوئے، اور عرصۂ دراز تک اپنے مدرسہ عزیزیہ میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ (انتقال یکم صفر ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۳۶ء)

ان کے شاگرد عبدالوہاب خان کافی شہرت کے مالک ہوئے، اور مشہور مدرس ہوئے، سید صاحب کی زندگی میں آخر وقت تک بطور طالب علم حاضر ہوتے اور مسند امام احمد بن حنبل سبقاً سبقاً سناتے،

نزہۃ الخواطر میں مولانا عبدالوہاب کا تذکرہ صفحہ ۳۱۸ پر ان الفاظ میں ہے، ۔

"الشیخ الصالح عبد الوھاب بن محمد عمر خان الحنفی رامپوری، احد العلماء الصالحین وکان عالماً زاھداً کثیر القناعۃ آمراً بالمعروف ناھیاً عن الشرک والبدعۃ ملازماً لقیام اللیل فی جماعۃ فی مسجد محافظاً علی الصلوات فی اول وقتھا۔" (مات سنہ ۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء)

مولانا سید حامد شاہ صاحب اکثر کلکتہ تشریف لے جاتے تھے، اور کلکتہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے سید صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان سے عرض کیا کہ آپ دوران قیام کلکتہ حدیث شریف کا سبق دیا کریں، سید صاحب راضی ہو گئے اور ترمذی شریف کا درس شروع ہو گیا، مولانا ابو الکلام آزاد بھی اس درس میں شریک ہوئے، اور اس طرح مولانا آزاد کو بھی سید صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا، مولانا آزاد کا تأثر ان کے ہی الفاظ میں سنئے[1]،

"اس زمانہ میں اگرچہ سرسید کی تصانیف کے مطالعہ کی وجہ سے میرے دماغ میں ایک نیا طوفان اٹھ چکا تھا، اور علماء کی جانب سے طبیعت میں بدظنی اور انکار پیدا ہو چکا تھا، مجھ پر مولوی محمد شاہ کا بہت ہی اچھا اثر پڑا، ان کی بزرگانہ صورت، بڑا ہی نرم متین

[1] امام الہند (تعمیر افکار) مولانا ابو سلمان الہندی، ص ۱۲۸ - ۱۲۹،

لہجہ اور پُر محبت تخاطب اور صاف صاف سیدھی سیدھی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ میں نے دیکھا اس وقت پڑھا رہے تھے اور کسی حدیث کے سلسلے میں سورۂ والعصر کی تفسیر بیان کر رہے تھے، اور یہ کہہ رہے تھے کہ جو اساسی عقائد ہیں ان کے تحفظ کے بعد کسی کی تکفیر نہیں کی جا سکتی ہے۔"

مولانا آزاد دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ۔

"مجھے ان کی سیدھی سادی باتیں اور بے لاگ طرزِ بیان اور مولوی نذیر الحسن کی تھکا دینے والی لسّانیوں کے مقابلہ میں بڑی دھیمی اور نرم باتیں اتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ میں چپکے سے دوسرے روز گیا اور کہا کہ جتنے دن آپ کا قیام ہو مجھے ایک گھنٹہ دیجئے، میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں، مجھ کو بالکل ایک کمسن لڑکا دیکھ کر ان کو بہت تامل ہوا، لیکن کچھ تو والد مرحوم کا نام سن کر اور کچھ تھوڑی دیر گفتگو سے اندازہ کر کے بڑی خوشی ظاہر کی اور مجھ سے کہا کہ ترمذی شریف ہی میں شریک ہو جاؤ۔ چنانچہ میں تقریباً دو مہینہ تک پڑھتا رہا[1]۔"

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق ان کا درس بہت سادہ اور محدود تھا اور اُن سے استفادہ کی مدت بھی صرف دو ماہ تھی، لیکن یہ سادہ اور محدود درس اور چند دن کی صحبت بھی بے اثر[2] نہیں کہی جا سکتی اور جتنا اثر مولانا نے چند دن کی صحبت سے لیا، دوسرے اساتذہ کی طویل اور برسوں کی صحبت سے بھی نہیں لیا۔

شاہ صاحب حنفی المذہب تھے اور بقول مولانا آزاد خلافیاتِ حنفیہ کے ثابت کرنے پر زور دیتے تھے،

---

[1] امام الہند (تعمیرِ افکار) مولانا ابو سلمان الہندی، ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔ [2] امام الہند (تعمیرِ افکار) مولانا ابو سلمان الہندی، ص ۱۲۹۔

مولانا کو تصوف سے لگاؤ تھا، سلسلۂ قادریہ میں اپنے والد ماجد مولانا سید حسن شاہؒ سے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں شیخ کرامت علی جونپوریؒ سے بیعت تھے اور ایک زمانہ تک موصوف کی صحبت میں رہے[1]

دلائل الخیرات کی اجازت شیخ عبد السلام بدایونی (والد مولوی شمس الاسلام بدایونی) سے حاصل کی، قصیدہ بردہ، حرز یمانی، اسمائے اہل بدر، اور حزب البحر اپنے والد کو سنائے اور اجازت حاصل کی، سفر و حضر میں اپنے والد کی خدمت میں حاضر رہے، انھوں نے بہت سفر کئے اور جس مقام پر جاتے، وہاں کے اہل اللہ کے مزارات پر جاتے اور فاتحہ پڑھتے، اجمیر، دہلی، آگرہ، کرنال، گنگوہ، جون پور، گلبرگہ دکن، بنگالہ اور دیگر مقامات کے متعدد سفر کئے، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شریک ہوئے اور بعض جلسوں کی صدارت کی[2]

مدرسہ عزیزیہ | شاہ صاحب نے بہ یادگار حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ، ایک مدرسہ عزیزیہ ۱۳۲۴ھ .... میں قائم فرمایا اور اپنے شاگرد رشید اور اپنے فرزند سید حامد شاہ صاحب جو قاضی شہر بھی تھے کو مدرسہ میں حدیث شریف کا درس دینے کے لئے مقرر کیا، اور دیگر علماء اور اپنے شاگردوں کو مختلف علوم کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، شاہ صاحب کے پوتے سید احمد شاہ صاحب اپنے والد کے انتقال کے بعد قاضی شہر ہوئے اور اہم علمی درس گاہ مدرسہ عالیہ میں حدیث شریف کے مدرس رہے اور عرصہ تک مدرسہ عالیہ میں درس دیتے رہے، وہ شاہ صاحب کے خاندان کے چوتھے محدث ہیں، سید حامد شاہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ حاجی سید محمود شاہ مہتمم مدرسہ عزیزیہ ہیں، مدرسہ مذکور شاہ صاحب کے مکان کے برابر ایک بلند عمارت میں قائم ہے، بزرگوں کی یاد

---

[1] تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۳۵۷، نزہۃ الخواطر، ص ۴۴۳، تراجم علمائے حدیث، ص ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ [2] تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۳۵۷۔

میں حدیث شریف کا ایک اہم حصہ ہے اور عوام مولوی محمد اسلم خان حدیث شریف کا درس دیتے ہیں۔

کتب خانہ[1] | قیام مدرسہ کے علاوہ شاہ صاحب نے ایک اہم کتب خانہ قائم فرمایا جو بفضلہ آج بھی قائم ہے، کتب خانہ مذکور میں تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور کلام وغیرہ کی منتخب اور نادر کتابیں جمع کی گئیں جو آج بھی اہمیت اور عظمت رکھتی ہیں۔

تصانیف | شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک "بحر العلم شرح عین العلم" ہے جو سنہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں طبع ہوئی اور ۸۰۰ صفحہ کی کتاب ہے، دوسری والعصر کی تفسیر ہے جو طبع ہو چکی ہے اور اب نادر ہے، اس کے علاوہ چند رسائل تصنیف فرمائے جو طبع نہ ہو سکے۔

مسلک | شاہ صاحب مذہباً حنفی تھے، لیکن محدثانہ انداز کے ساتھ کسی فرقہ کو برا کہنا یا برا سمجھنا ان کے یہاں بالکل نہ تھا، اختلافی مسائل میں تشدد کو بہت برا جانتے تھے، ان کے مسلک کے اعتدال اور معقولیت کی وجہ سے بہت سے علماء اور مشائخ مداح تھے اور عقیدت رکھتے تھے، لیکن ان کے اعتدال کی وجہ سے ہر قسم کے انتہا پسند مغائرت رکھتے تھے، اس سلسلے میں دو لطیفے تذکرہ کے لائق ہیں، شہر کے بعض متشدد مولوی اپنے مسلک سے اختلاف رکھنے والوں سے سلام علیک بھی نہ کرتے، ایک مرتبہ شہر کے ایک متشدد مولوی شاہ صاحب کے قریب سے گزرے، لیکن سلام علیک نہیں کی، بلکہ شاہ صاحب نے سلام علیک کی اور مزاج پرسی کی جس کا مولوی صاحب نے کوئی جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا، مولانا عبد الواحد صاحب جو شاہ صاحب کے شاگرد تھے، ان کو اور دوسرے شاگردوں کو جو اس وقت موجود تھے، ناگوار گذرا اور استاد کے احترام کو مجروح ہوتے دیکھ کر رنج اور غصہ کی کیفیت کے ساتھ شاہ صاحب سے کہا کہ ایسے لوگوں کو کیوں سلام کرتے ہیں، اور ان مولوی صاحب کو بھی خشمگیں نظر سے

---

[1] کتب خانہ مذکور کا تذکرہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "پرانے چراغ" کے ص، ۲۹۰ پر فرمایا ہے، اور تذکرہ مذکور ہی اس مضمون کا محرک ہوا۔

سے دیکھا، شاہ صاحب نے شاگردوں کو روکا اور کہا کہ وہ سنت کو ترک کرتے ہیں تو ہم کیوں ترک کریں، وہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں تو ہم ان کی وجہ سے اپنا نقصان کیوں کریں اور سنت کے ترک کے مرتکب ہوں،

دوسرا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک متشدد غیر مقلد رام پور کے اسٹیشن پر اترے اور انھوں نے کسی غیر مقلد کا مکان معلوم کیا، کسی صاحب نے زینہ عنایت خان پر مولوی محمد شاہ صاحب کا مکان بتادیا، وہ صاحب زینہ عنایت خان پہنچے اور اس مسجد میں گئے جس میں شاہ صاحب درس دے رہے تھے، انہوں نے نہایت اخلاص اور عقیدت سے مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور سبق ہو رہا تھا وہ سننے لگے، تھوڑی دیر میں یہ اندازہ کرکے کہ یہ تو حنفی ہیں، ادھر ادھر دیکھنے لگے، معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی ڈھونڈھ رہے ہیں، شاہ صاحب نے کسی شاگرد سے کہا کہ جاؤ اور مولوی صاحب کے ہاتھ دھلوادو، اور معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے، مولوی صاحب یہی کہہ کر چلے گئے کہ مجھے تو پتہ چلا کہ آپ کوئی غیر مقلد بزرگ ہیں، .

اس قسم کے واقعات کے علاوہ بھی بہت سے واقعات ایسے ہیں، جن سے شاہ صاحب کے حلم، بردباری اور رواداری کا پتہ چلتا ہے، موصوف غیبت کو بھی نہایت ناپسند کرتے تھے، لوگ اتفاقاً ایسے لوگوں کا تذکرہ ان کی مجلس میں کرتے تھے، جن کی شہرت خراب ہوتی تھی، اور شاہ صاحب ان کی کوئی نہ کوئی خاندانی خوبی، شرافت نسبی، حسن ظاہری یا بہادری کا تذکرہ فرما دیتے اور گفتگو کا سلسلہ کسی دوسرے موضوع کی طرف موڑ دیتے،

انتقال ۲۲ر شعبان ۱۳۳۲ھ بروز بدھ مطابق ۱۲ر مئی ۱۹۲۳ء کو عرصۂ دراز تک علم حدیث کی خدمت کرنے کے بعد ایک بڑی تعداد کو شاگرد، عقیدت مند اور مداح چھوڑ کر رخصت ہوگئے، مزار حضرت شاہ بغدادی صاحب کے چبوترے پر دفن ہوئے، حضرت جلیل مانک پوری نے تاریخ وفات کہی ہے،

ثبت بر لوح مزارش کن جلیل — وارث دین رسول دوسرا

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی
کے
مکتوب پر تبصرہ

از

جناب آغا رشید مرزا صاحب کلکتہ

۱۷ر جنوری سنہ ء　　　مکرمی و محترمی جناب صباح الدین صاحب　　　السلام علیکم

نومبر کے شمارہ "معارف" میں محترم ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کا "مکتوب مکہ" پڑھا، خط دلچسپ اور انداز تحریر دلپذیر ہے، اس پر کچھ اظہار خیال اور اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

حافظ کے شعر

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

پر غالب کا بے جا اعتراض کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمارے بیشتر شعرا حافظ کے خوشہ چین ہیں، ان میں کچھ خوشہ چین بھی ہیں اور نکتہ چین بھی، حافظ اس شعر میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کی ساری اہمیت دوسرے مصرعہ میں ہی ہے، پہلے مصرعہ میں جو اظہار بے بسی ہے، اس کو بیان دوسرے مصرعہ میں وسیع کرنے سے بات کچھ اور ہی ہو جاتی اور شاعر کا وہ نقطۂ خیال و رہں کا حسن جو اسی سبکساران ساحل پر طنز سے پیدا کیا ہے ختم ہو جاتا، ہر شاعر اپنے جذبات کا اظہار اپنے احساسات اپنے تخیل اور اپنی فکر کے مطابق کرتا ہے، اس پر کسی معترض یا مبصر کا اپنے فکر و خیال کا ٹھونپنا بے معنی سی بات ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب مزید آگے فرماتے ہیں،

"چنانچہ غالب نے عرفی کی زمین میں جو غزل کہی ہے، عصا خفتہ است جفا خفتہ است

اس میں ایک شعر ناخدا ہی کے مفہوم کو وسیع کر کے کہا ہے۔ ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز | گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

سوال یہ ہے کہ جب اس درجہ ہولناک صورتِ حال ہو تو اس وقت ناخدا کو نیند کیونکر آسکتی ہے، یہ وقت تو وہ ہے کہ وہ چوکنا ہو اور آخری تدبیر اپنی کشتی کو بچانے کی کر ڈالے، نہ کہ پڑا سوتا رہے، یہ اور بات ہے کہ وہ غالب کے ساتھ اولڈ ٹام یا کاسن ٹین کی بوتلیں چڑھا کر نشہ میں مردہ کے مانند پڑا ہو، مگر اس صورت میں خفتہ است کے بجائے مردہ است ہونا چاہیئے تھا۔ ـــــ"

پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ یہاں غالب پر اس طنز سے (خط کے ادبی رنگ کو کچھ بے رنگ کر دیتا ہے، اور معیارِ تحریر میں بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے جسے پڑھنے کے بعد ناظرین کی نظر میں نقاد کا کردار گر جاتا ہے اور وہ مرتبہ قائم نہیں رہتا جو انھیں شیخ عبدالقادر "مدیر مخزن" نے "بانگ درا" کے دیباچہ میں دیا ہے، شیخ صاحب فرماتے ہیں۔

"غالب اور اقبال میں بہت سی مشترک باتیں ہیں اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو و فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا، اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔ ـــ"

جہاں تک غالب کے شعر کے معنی کا تعلق ہے، غالب کہتے ہیں، رات تاریک، مخالف ہوا بحرِ طوفاں

خبر ہے، کشتی کا لنگر ٹوٹا ہوا ہے اور ناخدا سویا ہوا ہے، اب سوال یہ ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جب صورتِ حال اس درجہ ہولناک ہو تو اُس وقت ناخدا کو نیند کیوں کر آسکتی ہے؟ میں عرض کروں گا ایسی صورت میں ناخدا کا سوتے رہنا کوئی بعید از قیاس یا غیر فطری عمل نہیں، مثل مشہور ہے اور محاورہ بندی بھی ہے کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف محاورہ بندی اور ردہ نری شاعری ہے، حقیقت دونوں میں نہیں، لیکن ذرا آپ غور فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آئے دن اخبارات میں پڑھنے میں آتا رہتا ہے اور اکثر مشاہدہ میں بھی آتا ہے کہ مکان میں آگ لگ گئی ہے مکین سوئے ہوئے ہیں، باہر سے بچانے اور جگانے والوں کے شور و غل کا طوفان بھی انھیں جگا نہیں پاتا،

دوسری مثال یہ عرض کروں گا، کلکتہ میں دریائے ہگلی کے کنارے چھوٹی بڑی سیکڑوں کشتیاں لنگر انداز ہیں، دن بھر وہ باربرداری اور مسافروں کو ادھر سے اُدھر لانے لے جانے کا کام کرتی ہیں، رات کو ساحل کے ساتھ ساتھ بندھی ان کشتیوں میں ایک زندگی ہوتی ہے مانجھی ان میں کھاتے پکاتے اور سوتے ہیں، یہی ان کا گھر ہوتا ہے، دریا کی موجیں اور پانی کے تھپیڑے ان کے کام میں دخل انداز نہیں ہوتے، کشتی ڈگمگاتی رہتی ہے اور وہ لمبی تانے سوتے رہتے ہیں یہ ان کی زندگی کا روزانہ کا معمول ہے، ان کی زندگی طوفانوں سے کھیلتے پانی میں گذر جاتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر متوقع دریا میں (Bore Tide) مدوجزر اٹھتا ہے پورٹ کے نگراں خطرے کا سائرن بھی بجاتے ہیں، کشتیوں کے لنگر ٹوٹ جاتے ہیں، پُرشور موجیں گرجتی ہوئی اٹھ کر ساحل سے ٹکراتی ہیں، لیکن مانجھی سوئے ہی رہ گئے ہیں، ایسی حالت میں یا تو کشتیاں غرقاب ہو جاتی ہیں یا خدا ان ناخداؤں کو بچا لیتا ہے،

ایک اور مثال عرض کروں گا، اس پر بھی آپ غور فرمائیں کہ انسان اپنے قریب ترین

خون کے رشتوں کو بھی کچھ بغیر وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں دو جی نہیں سکتا، بے یار و مددگار اور
بے آسرا ہو جاتا، اور جب وقت آتا ہے تو اپنے ہی ہاتھوں منوں مٹی کے نیچے دبا آتا ہے اس
بڑھ کر اس غم زدہ کی زندگی میں ہولناک طوفان اور کیا ہو گا لیکن جب وہ تھکا ہارا گھر لوٹتا
تو زندگی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی اور صورتِ حال کی اس ہولناکی کے باوجود نیند
اسے آدبوچتی ہے، اور وہ اُن تمام طوفانوں سے بے خبر ہو کر سو جاتا ہے،

یہ تو صوری اور لغوی معنی ہوئے شعر کے دوسرے علامتی (Symbolic) معنی بھی ہو
ہیں جہاں شاعر اشارہ کنایہ، تشبیہ و استعارہ میں بات کرتا ہے، ظاہری معنی سے مقصو
کچھ اور ہی ہوتا ہے، چنانچہ یہاں "ناخدا خفتہ است" سے واقعتاً اس کی نیند مراد نہیں ہو بلکہ
حقیقتِ حال سے اس کی غفلت اور بے خبری کی طرف اشارہ ہے، اگر آپ بنظرِ غائر ملاحظ
فرمائیں تو یہ حقیقت فی زمانہ، اس دور میں، اس وقت بھی ہمارے آپکے سامنے ہے، ہم اور آپ
خود اسی صورتِ حال سے گذر رہے ہیں، اخلاقی پستی، مادیت پرستی، جاہ طلبی حرص و ہوس کا
طوفانِ بلاخیز سر سے اونچا ہو چکا ہے، ہر شئی گراں صرف انسانی خون سستا اور انسانیت
عنقا ہے، غریب بے بس کشتی کے مسافر خوفزدہ بیم و رجا کی حالت میں صبر و ضبط کا دامن تھ
ہوئے ہیں کہ فریاد و فغاں سوائے خدا کے کوئی سننے والا نہیں خاموش خون کے آنسو دل۔
رواں زندگی کا بارِ گراں لئے تاریکی میں چاروں طرف دیکھ رہے ہیں، راہزنوں کو راہبر سمجھ کر ا
کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں، آس لگاتے ہیں لیکن ناخدایان
ملک و ملت طوفان کی شدت اور طوفان زدوں کی ہیبت اور بے چینی دیکھتے ہوئے بھی کور
ہیں، سنتے ہوئے بھی بہرے ہیں، اور جاگتے ہوئے بھی خوابِ گراں میں مدہوش پڑے ہیں
عالمی سطح پر بھی کچھ یہی عالم ہے، نوعیت قدرے مختلف ہے، طاقتور ملک کمزور ملک

عادی ان پر اپنے مفاد کے لئے اپنی پالیسی ، اپنا نظریہ تھوپنے ، بڑھانے اور پھیلانے میں مصروف ، اندرون و بیرون ملک ساز شیں کرنے کرانے میں منہمک سیاسی ہیں۔ اس سیاسی بازیگری اور رقابت کی رسہ کشی کی بدولت چھوٹے کمزور ملکوں میں آپس ہی میں جنگ وجدل ، کشت وخون ہو رہے ہیں ، بے گناہوں کے کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں اور عالمی سیاست کے ناخدا طوفان کی بلا خیزی سے بے خبر خوابِ غفلت میں پڑے ہیں ایسے وقت غالب کا یہ شعر پیشین گوئی ہی ثابت ہوتا ہے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

یہاں سیماب کا ایک شعر بدوں کی جگہ "ناخداؤں" کے تصرف کے ساتھ پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا ، اگرچہ مضمون مختلف ہے ؎

جلالِ کبریائی چھانے والا ہے دنیا پر   کوئی دن اور ناخداؤں کو خدا سی کھیل لینے دو

میں نے اپنے تاثرات کا اظہار صرف بغرضِ تبادلہ خیالات کیا ہے میرے ذہن میں غالب کے شعر کے جو معنی و مطالب ہیں ممکن ہے محترم مکتوب نگار کا ذہن اسے قبول فرما سکے ، جہاں تک فی نفسہ غالب کے ذکر کا تعلق ہے برسبیلِ تذکرہ میں نے بھی اظہارِ خیال کردیا ، اعتراض مقصود نہیں زیرِ نظر غالب کے شعر کے معنی یہی سمجھے

امید ہے کہ میرے یہ تاثرات محترم ڈاکٹر عبد اللہ صاحب تک پہونچا دیئے جائیں گے ، آپ کی "بزمِ صوفیہ" پڑھی اور کئی بار پڑھی ، ہر بار ایک روحانی کیف حاصل ہوا ، بزرگانِ دین کی یہ بزم آپنے خوب سجائی ، اور اپنی طرزِ تحریر سے خوب بنائی سنواری ، آپنے یہ بہت بڑا اور بہت اہم کام کیا ہے کہ

اہم تذکرے تاریخی روشنی میں جامع طور پر جو ارجات کے ساتھ یکجا کر دیئے ہیں اسے پڑھنے کے بعد اور دوسری کتاب دیکھنے کی ضرورت اور جستجو نہیں رہتی، ایک سیری سی ہو جاتی ہے اور وہ تشنگی باقی نہیں رہتی جو اور دوسری کتابوں کے دیکھنے کے بعد اکثر رہتی ہے آپنے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے، اللہ تعالے آپ کی محنت قبول فرمائے اور اس کا اجر عطا فرمائے۔

اس بزم میں بہت سے صوفیائے کرام شمولیت سے رہ گئے ہیں، مثلاً خواجہ باقی باللہ دہلوی ان کے دونوں صاحبزادگان خواجہ کلاں و خواجہ خورد، ان کے خلفا میں سے مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ حسام الدین دہلوی، ان کے علاوہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی سرمت ان کا مزار جامع مسجد دہلی کے سامنے میدان میں ہے، جسے کبھی پریڈ گراونڈ کہا جاتا تھا، یہ بزرگ برہنہ رہتے تھے، اور غالباً اورنگ زیب کے حکم سے ان کا سر قلم کیا گیا تھا، وہیں ایک اور بزرگ ہرے بھرے صاحب کے نام سے خوابیدہ ہیں، ان دونوں بزرگوں کے بارے میں کہیں کوئی مستند تحریر نظر سے نہیں گذری ممکن ہے کبھی کچھ لکھا گیا ہو۔

خدا آپ کو توفیق دے کہ "بزم صوفیہ" کی توسیع کر سکیں اور اس بزم کی اور رونق بڑھا سکیں، آپ کا آغا رشید مرزا۔

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ کی جلد ہفتم

سیرت جلد ششم کے ختم ہونے کے بعد سید صاحب نے سیرت جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اس سلسلہ میں چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ مکمل نہیں ہو سکی، یہ بعض چند متفرق مضامین اور مباحث کا مجموعہ ہے، جن سے اس کے حصہ کا اندازہ ہو سکتا ہے،

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (حصہ دوم)

(عربی ادب)

از

محمد منصور نعمانی ندوی (رفیق دار المصنفین)

پنجاب یونیورسٹی لاہور نے تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کے ساتھ عربی ادبیات پر بھی ایک جلد مرتب کرائی ہے، عرصہ سے ایسی تاریخ کی شدید ضرورت تھی، مگر یہ موضوع بڑا طویل تھا، تقریباً بارہ سو سال کے عربی ادب کا جائزہ بڑی توجہ، دقتِ نظری اور کافی وقت کا محتاج تھا، ہند و پاک کے اکابر علماء نے مختلف علوم و فنون پر بکثرت عربی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ان طویل خدمات کا احاطہ آسان نہیں، اسی لئے اب تک ایسا کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا، مذکورہ بالا تاریخ کے سلسلہ میں تعجب ہے کہ اتنے اہم اور بڑے کام کے لیے صرف ایک جلد مخصوص کی گئی، جبکہ دیگر زبانوں کے ادبی جائزہ کے لیے کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں، اس میں قدیم ادبی تصنیفات کے ساتھ دورِ جدید کے عربی ادب کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، لیکن عربی کتابوں کے ذکر کے بجائے اکثر ان کے اردو ترجموں پر اکتفا کر لیا گیا، حالانکہ طبعزاد عربی کتابوں کا ذکر ہونا چاہیئے تھا، بعض جگہ عربی میں لکھنے والے مصنفین کی عربی تصانیف کے بجائے انکی اردو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، عربی ادب کا سرسری جائزہ لیا جاتا تو اس سے کام [illegible]

ہو جاتا اور تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ مہیا ہو جاتا۔ کسی علمی و تحقیقی کام کا نقائص سے پاک ہونا مشکل ہے، بالخصوص مواد کی یکجائی، سن و سال اور اسمائے کتب اور شخصیتوں کی غلطیوں کا رہ جانا تعجب انگیز نہیں ہے۔ جنوری ۱۹۸۴ء کے معارف کے شذرات میں اس جلد کی بعض فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، اس کتاب کا جائزہ بعد میں لیا گیا تو بعض اہم غلطیاں نظر آئیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح ہو جائے اور جو چیزیں چھوٹ گئی ہیں ان کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔

یہ جلد ۱۲۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک عربی ادب کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس کو سید فیاض محمود، پروفیسر عبدالقیوم اور ان کے معاون ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے مرتب کیا ہے، اس جلد میں مقدمہ ملا کر دس ابواب اور ۴۴۲ صفحات ہیں، اس میں ڈاکٹر محمد یوسف، ممتاز احمد پٹھان، پروفیسر محمد منور، ڈاکٹر احسان الٰہی رانا، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مولانا عبدالقدوس ہاشمی، پروفیسر عبدالقیوم کے مقالات شامل ہیں، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "ابن حجر اور سخاوی کے جو ہندوستانی علما حجاز میں فیض یاب ہو کر لوٹے ان میں شیخ جمال الدین محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ اور یعقوب بن الحسن کشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ ہیں" (ص ۱۰۸) یہ صحیح نہیں ہے، جس شیخ جمال الدین کا ذکر ہے وہ طاہر پٹنی نہیں بلکہ شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک المعروف بحرق حضرمی ہیں، یہ ہندی الاصل نہ تھے حضر موت ان کا وطن تھا، سخاوی سے کسب فیض کے بعد گجرات آئے، بڑے ادیب، شاعر، محدث اور مصنف تھے، وفات ۹۳۰ھ میں پائی (ظفر الوالہ ص ۱۱ و ص ۱۱۱) شیخ طاہر پٹنی اور یعقوب کشمیری علامہ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے جو ابن حجر عسقلانی اور سخاوی سے متاخر ہیں، عمر بن اسحاق الہندی کی تاریخ وفات ۷۳۹ھ لکھی گئی ہے، (ص ۱۱۰) میں ۷۷۳ھ ہے، علامہ طاہر پٹنی کا ذکر سراج الدین عمر ہندی سے پہلے کیا گیا ہے جبکہ ان دونوں کو زمانی تقدم حاصل ہے، "محی الدین بن عبدالقادر" (ص ۲۱۰) صحیح نہیں ہے، ان کا نام عبدالقادر، ابوبکر کنیت اور محی الدین لقب ہے، والد کا نام شیخ بن عبداللہ

مخطوطات کی تفصیل کے لئے اینور اکتابوز دیکھئے) کشاف اصطلاحات الفنون کے مصنف کا نام محمد علی تھانوی لکھا گیا ہے، (ایضاً) اسی مصنف نے محمد اعلیٰ درج کیا ہے، اصل کتاب پر مصنف کا نام محمد علی بن شیخ علی حنفی تھانوی درج ہے۔

البیرونی کے مصنف کا نام سید حسن برنی لکھا گیا ہے (ص ۱۱۴) جبکہ صحیح سید حسن برنی ہے، مخلص بن عبد اللہ دہلوی اور قاضی حمید الدین دہلوی (ص ۱۶۲) کو دو الگ الگ شخص سمجھا گیا ہے جبکہ دونوں ایک ہی ہیں، مخلص بن عبد اللہ نام ہے اور حمید الدین لقب، اس غلط فہمی کی وجہ سے مخلص بن عبد اللہ کی شرح ہدایہ کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ "اب نادر الوجود ہے" اور قاضی حمید الدین کی شرح ہدایہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب کے حوالہ سے درج ہے کہ "اس کا ایک نسخہ برلن میں پایا جاتا ہے" اسی طرح عمر بن اسحق متوفی ۷۷۳ھ کے ذکر کے بعد کشف الظنون کے حوالہ سے دوسرے شخص ابو حفص سراج عمر بن اسحق الغزنوی الحنفی کا ذکر کیا گیا ہے (ایضاً) ان دونوں ناموں میں التباس ہو گیا ہے، دراصل دونوں ایک ہی شخص ہیں، ان کا نام عمر، والد کا نام اسحاق اور دادا کا نام احمد ہے، ابو حفص کنیت اور سراج الدین لقب ہے، ان کے آباؤ اجداد غزنہ سے ہندوستان آئے، اس نسبت سے غزنوی بھی کہلائے، متصلب حنفی المذہب تھے اس لئے حنفی بھی نام کا جزو بن گیا، لقب اور ہندوستان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے "سراج ہندی" کہلائے، ہدایہ ان کو مستحضر تھی اس لئے قاری ہدایہ کہلائے، اصل میں غلطی صاحب کشف الظنون خلیفہ چلپی سے ہوئی ہے، اس کی تردید مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے الفوائد البہیہ کے حاشیہ (ص ۱۴۸) پر کر دی ہے، دوسرے جو شخص قاری ہدایہ کے لقب سے مشہور تھے اور جن کے فتاوی "فتاوی سراجیہ" کے نام سے مشہور ہیں ان کے متعلق علامہ سیوطیؒ نے حسن المحاضرہ (ج ۱ ص ۲۰۱) پر صراحت سے لکھا ہے کہ ان کا نام عمر بن علی اور لقب سراج الدین تھا، شہرت قاری ہدایہ کے لقب سے پائی، ان کا سنہ وفات ۸۲۹ھ ہے،

... مطبوعہ قاہرہ کے سلسلہ میں درج ہے کہ "اس کی تاریخ اشاعت ندارد" (ص ۴۰
یہ کتاب مکتبہ قدسی قاہرہ سے بارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور اس پر تاریخ اشاعت سرورق
پشت دونوں پر ۱۳۵۱ھ درج ہے، اسی طرح ابن الدمامینی کے حالات میں اس کتاب کے صفحات
حوالے بھی صحیح نہیں ہیں، مثلاً ص ۱۱ کے بجائے، ص ۱۰۴ ہونا چاہئے، شیخ علی مہائمی کا سالِ ولادت
۸۸۶ھ لکھا گیا ہے (ص ۱۰۰) جبکہ صحیح ۱۰ محرم ۷۷۶ھ ہے، تفسیر مہائمی کے سلسلہ میں ہے کہ "جمال الدین
وزیر بھوپال کے خرچ پر ۲ جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی (ص ۱۰۷) یہ جمال الدین وزیر نہیں ہو
جمال الدین دہلوی مدار المہام وزیر اعظم ریاستِ بھوپال تھے، مولانا اسحٰق دہلویؒ کے فیض یافتہ
علم دوست اور علم پرور، نواب صدیق حسن خاں کے خسر تھے، اسی طرح ارأة الدقائق فی شرح
الحقائق کے سلسلہ میں ہے کہ "یہ جام جہاں نما کا ترجمہ ہے" (ص ۱۰۰) یہ غلط ہے محمد عز الدین المغر...
فارسی زبان میں جامِ جہاں نما نامی کتاب لکھی، مخدوم علی مہائمی نے مرأة الحقائق کے نام سے ا...
عربی کا جامہ پہنایا، یہ ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، بعد میں انھوں نے محسوس کیا کہ اس کے مضامین
تفصیل کے محتاج ہیں تو اسی مرأة الحقائق کی شرح ارأة الدقائق کے نام سے لکھی جیسا
نزہۃ الخواطر میں بھی درج ہے، ابو الفضائل سعد الدین دہلوی کا ذکر کشف الظنون کے
سے لکھا گیا ہے "سعد الدین بن عبد اللہ بن عبد الکریم دہلوی" (ص ۱۰۳) لیکن کشف الظنون (
ص ۹۱۵) پر سعد الدین ابو الفضائل الدہلوی درج ہے، ابو الوفا قرشی نے اپنی کتاب الجواہر المضیئہ
فی تراجم الحنفیہ (ج ۲ ص ۱۶۲) میں لکھا ہے کہ ان کا نام محمود بن محمد دہلوی اور لقب سعد الدین
اور یہی صحیح ہے، ان کا سنہ وفات بھی کشف الظنون سے ۸۹۱ھ درج ہے، یہ بھی غلط ...
عبد القادر قرشی صاحبِ الجواہر المضیئہ کا انتقال بالاتفاق ۷۷۵ھ میں ہوا، یہ دوسرے شخص
سے بھی نہیں ہو سکتے کہ قرشی نے المنار کی شرح افاضۃ الانوار انہی سے منسوب کی ہے

یہاں بھی اسی شہر کے متعلق لکھا گیا ہے [illegible]
پر سنہ وفات ۹۰۰ھ لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

قاضی چکن حنفی کی کتاب خزانۃ الروایات کو دقیق و مستند فقہی کتاب لکھا گیا ہے (۱۰۰) جبکہ حنفی فقہا میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے النافع الکبیر ص۳۵ پر اس کتاب کے متعلق میں لکھا ہے کہ یہ غیر معتبر کتاب ہے ترجیح دی گئی ہے اور اس میں رطب و یابس کو جمع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے موضوع احادیث بھی شامل ہیں، اسی ضعف کے سبب علامہ مخدوم محمد جعفر بوبکانی نے اس کے تمام غیر معتبر و غیر مستند مواد کو خارج کرکے متعلقہ مسائل اور قوی روایات کا اضافہ کرکے "المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ" نام کی کتاب لکھی، یہ کتاب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ لجنۃ احیاء الادب السندی کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی ہے، اس لئے اس کا ذکر نہ کرنا شدید غفلت پر محمول کیا جائے گا، مراجع و مآخذ میں رسالہ معارف درج ہے (ص۲۱۱) اس سے دارالمصنفین کے ترجمان معارف کی طرف ذہن جاتا ہے، اس کے بجائے المعارف لاہور ہونا چاہئے۔ ابن حجر کی ذکر ۹۷۴ھ کے سلسلہ میں ہے کہ جب وہ ملیبار آئے تو اس خانقاہ میں ٹھہرے تھے (۱۹۴) اس سلسلہ میں حوالہ رسالہ زمانہ کانپور کا دیا ہے، شیخ ابن حجر کی کا ہندوستان آنا محل نظر ہے، ان کے حالات و سوانح کے مستند تذکرے اس ذکر سے خالی ہیں، انہوں نے ۹۴۰ھ سے مکہ مکرمہ میں مجاورت اختیار کر لی تھی اور درس و افتاء کا سلسلہ زندگی کی آخری سانس تک اسی مقدس سرزمین میں قائم رکھا، اسی بنا پر مکی ان کے نام کا جزو ہو گیا، حالانکہ وہ مصری المولد تھے، شذرات الذہب ج ۸ ص ۳۷۰ پر ان کا سنہ وفات ۹۷۳ھ درج ہے۔ رفیع الدین محدث شیرازی کا سنہ وفات ۹۵۶ھ لکھا گیا ہے (ص۲۳)، یہ صحیح نہیں ہے، ان کا سال وفات ۹۵۴ھ ہے، ان کا تذکرہ گلزار میں ہے (بوستان [illegible] اخبار الاخیار ص ۲۳۶)

اعلام بأعلام بیت اللہ الحرام کے مصنف قطب الدین حنفی نہروالی مفتی مکہ کے تذکرہ میں لاہوری
کا اضافہ کیا گیا ہے (ص ۲۲۵) اس سلسلہ میں حوالہ بھی نہیں ہے، نہروالہ تو گجرات میں پٹن کے
علاقہ کو کہا جاتا ہے، اغلب یہی ہے کہ ان کی ولادت احمد آباد میں ہوئی ہو، (اسی کتاب کے
ص ۱۵ اور ص ۲۲۳ پر نہروالہ کو صوبہ گجرات پٹن لکھا گیا ہے) ان کی مشہور تاریخ وفات تو ۹۹۰ھ ہے
لیکن ظہور احمد اظہر کے حوالے سے ۹۹۶ھ بھی لکھا گیا ہے، اس موقع پر یاد ایام مصنفہ مولانا حکیم
عبد الحی کا ذکر بھی ہونا چاہئے تھا، جس میں ۹۹۰ھ درج ہے، اسی طرح قطب الدین نہروالی کے بھتیجے
بہاء الدین عبد الکریم قطبی کے سلسلہ میں ہے کہ "انھوں نے اعلام بیت اللہ الحرام کی تلخیص کی ہے
اور اس کا ایک نسخہ بانکی پور میں ہے" (ص ۲۵۹) جبکہ اس کے کئی نسخوں کا پتہ چل چکا ہے ایک قلمی
نسخہ مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ اور ایک دار الکتب المصریہ میں بھی ہے، ان ہی دونوں
نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد یہ تلخیص "تاریخ البلد الحرام" کے نام سے احمد محمد جمال اور عبد العزیز
الرفاعی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں مکتبہ الثقافہ باب السلام مصر سے عربی ٹائپ میں
طبع ہو چکی ہے صفحات کی تعداد ۴۰۶ ہے، حاجی محمد بن عمر آصفی مصنف ظفر الوالہ کا ذکر ص ۲۹۳ پر ہے، ص ۲۹۴
پر عبد القادر حضرمی کے ذکر میں پھر مصنف ظفر الوالہ کا ذکر آگیا ہے، اور ص ۲۹۵ کے نصف تک
ان ہی کا ذکر ہے، دونوں کا تذکرہ گڈمڈ ہو گیا ہے، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "آصفی نے اپنی کتاب
(ظفر الوالہ میں) ان تمام کتب تاریخ سے استفادہ کیا ہے، جو اس وقت دستیاب تھیں مثلاً
ابو الفضل، الجورجانی، ضیاء برنی" (ص ۲۹۴) یہ نام کتابوں کے نہیں ہیں بلکہ مصنفین کے ہیں
ان مصنفین کی کتابوں کے نام یعنی اکبرنامہ، طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی ہونا
چاہئے تھا، الجورجانی نہیں الجوزجانی صحیح ہے، اسی طرح ملا عبد السلام دیوی کو "عظمی" لکھا
(ص ۲۹۹) اس سلسلہ میں حوالہ نزہۃ الخواطر کا دیا ہے حالانکہ اس کتاب میں دیوی کو مفتی لکھنؤ

بیان کیا گیا ہے، دراصل دیوی (لکھنؤ کے قریب ضلع بارہ بنکی کا مشہور قصبہ) کے شیخ عبدالحق
محدث دہلوی کے صاحبزادے نور الحق دہلوی ۹۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے کیونکہ سنہ
ولادت ۹۸۳ھ اور سنہ وفات ۱۰۷۳ھ ہے اس حساب سے ۹۰ سال کی عمر ہوئی، الفوائد البہیہ فی
تراجم الحنفیہ اور التعلیقات السنیہ علی الفوائد البہیہ دونوں کو مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی
تصنیف قرار دیا ہے (ص ۲۴۳) پھر آگے چل کر شکوہ کیا ہے کہ اس کتاب میں متقدمین حنفی فقہاء کے
ذکر پر زور دیا گیا ہے اور برصغیر کے حنفی علماء کو نظرانداز کر دیا ہے (ص ۲۵۲) یہاں مقالہ نگار سے
صریحاً غلطی ہوئی ہے مولانا نے مقدمہ میں صراحت کر دی ہے کہ یہ تالیف ہے علمائے احناف کا کوئی
خاطر خواہ تذکرہ نہ تھا وہ تذکرہ مرتب کرنے والے ہی تھے کہ اسی دوران اُن کو کفوی متوفی ۹۹۰ھ
کی مشہور کتاب "کتائب اعلام الاخیار" مل گئی جو "طبقات کفوی" کے نام سے بھی معروف ہے
مولانا نے علماء و مصنفین کے احوال کو اختصار کے ساتھ اس سے نقل فرمایا اور جو مواد انہوں
نے اس سلسلہ میں جمع کیا تھا، اس کو بھی اس میں شامل کر دیا، کتاب کی ترتیب میں اس کا
اہتمام رکھا کہ طبقات کفوی کے مطالب نقل کرنے کے بعد دوسرے ذرائع سے اخذ کردہ حالات
وسوانح کو قال الجامع کے تحت آگے نقل کر دیں، اس سلسلہ میں کفوی سے جو غلطیاں ہوئی
ہیں ان کی بھی تصحیح کرتے گئے ہیں اور بر سبیل تذکرہ جن اشخاص و اعلام کا ذکر و حوالہ آیا ان کے
مختصر احوال و خدمات اصل کتاب کے حاشیہ پر درج کرتے گئے ان حواشی کا نام التعلیقات السنیہ رکھا
اس طرح اس تالیف میں یہ شکوہ بیجا ہے کہ برصغیر کے حنفی علماء کو نظرانداز کیا گیا ہے، اسی طرح
مولانا کی تصانیف میں دو اہم کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے "الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ"
اور "الرفع والتکمیل" یہ دونوں کتابیں ۱۳۸۴ھ و ۱۳۸۸ھ میں استاذ عبدالفتاح ابو غدہ
کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ مکتب المطبوعات الاسلامیہ حلب سے شائع ہو چکی ہیں نواب صدیق حسن

[تا]ریخ وفات ۹ مئی ۱۹۰۰ءجو لکھی ہے (ص۲۰۳) حالانکہ ان کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں
نے سیرت والاجاہی (ص۳۰-۲۰۰) میں ۹ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء لکھی ہے
[ا]یک جگہ ذکر ہے کہ "مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی ندوہ کے معتمد بھی رہے" (ص۲۰۸) یہ صحیح نہیں ہے
پہلے مولانا مددگار ناظم ہوئے اس کے بعد ناظم مقرر ہوئے، (تفصیل کے لئے حیات عبدالحیٰ
دیکھئے) ایک جگہ مولانا اعزاز علی کی تصانیف کا ذکر ہے (ص۳۸۴) اس میں انھوں نے شاہ ولی اللہ
[د]ہلوی کی فارسی تصنیف اصولِ تفسیر میں الفوز الکبیر کے حروف مقطعات والے حصہ کا جو عربی
[ت]رجمہ کیا ہے اس کا ذکر رہ گیا، معجم المصنفین کے مصنف کا نام محمد حسن خان درج ہو گیا ہے (ص۴۷۷)
[ب]لکہ مولانا محمود حسن خاں ٹونکی (متوفی ۱۳۶۶ھ) ہونا چاہیئے، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "مولانا حبیب الرحمٰن
[اعظ]می نے مسند الحمیدی ایڈٹ کی" (ص۴۱۳) صحیح نام المسند الحمیدی ہے جو دو جلدوں میں ۱۳۶۳ھ
[می]ں شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق،
[ام]ام عبدالرزاق کی المصنف کی گیارہ جلدیں، طاہر پٹنی کی مجمع بحار الانوار ۵ جلدیں، سعید بن منصور
[ک]ی کتاب السنن بھی ایڈٹ کی ہیں اور یہ شائع بھی ہو چکی ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ایک جگہ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "مولانا شبلی کی تمام تصانیف اردو زبان میں ہیں" (ص۱۴)
صحیح نہیں، مولانا شبلی عربی کے بھی صاحب نظر عالم اور ادیب تھے، انھوں نے سب سے پہلے "اسکات
[المع]تدی علی انصات المقتدی" کے نام سے ۴۴ صفحات پر عربی زبان میں رسالہ لکھا جو مطبع نظامی
[کا]نپور سے ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوا، علی گڑھ کالج میں طلبہ کے اندر ذوق رسالت آپ نے عقیدت
[پ]یدا کرنے کے لئے "تاریخ بدء الاسلام" نامی عربی میں ایک کتاب لکھی یہ کالج میں عرصے تک
[دا]خل نصاب رہی، ۴۴ صفحات میں مطبع مفید عام اکبر آباد سے غالباً ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی
[ا]ن کا ترجمہ پہلے مولانا فراہی نے فارسی میں کیا، اور اس فارسی ترجمہ سے اردو ترجمہ نوا[ب] [illegible]

[illegible] شاہ [illegible] بھوپال سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا، مولانا نے [illegible]
[illegible] جواب تحریر کیا تھا بعد میں اپنے بھتیجے [illegible] کا نام [illegible] کو یورپ
روشناس کرانے کے لیے [illegible] اس کا عربی ترجمہ کیا جو الجزیہ کے نام سے مفید عام [illegible]
میں ۱۰۰ صفحات پر شائع ہو چکا ہے، مسیحی مؤرخ و ادیب جرجی زیدان کی تاریخ التمدن
الاسلامی کا بہت مبسوط و مدلل جواب الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے لکھا، اس
رسالہ سے مولانا کی شہرت عالم اسلام میں خوب ہوئی، یہ ۱۳۲۰ھ میں مطبع آسی لکھنؤ سے ۸۸
صفحات پر شائع ہوا ہے، اس کے علاوہ حیاتِ شبلی میں مولانا کی کچھ عربی تحریریں اور کچھ
عربی خطوط بھی نقل کئے گئے ہیں، سفرنامۂ مصر و شام کے آخر میں جدید عربی الفاظ کی ایک فرہنگ
بھی مولانا نے اپنے قلم سے شامل کی ہے، مقالہ نگار نے لکھا ہے "سیرۃ النبی کا عربی ترجمہ شائع ہو چکا
ہے" مصر میں اس کا عربی ترجمہ تو ہوا ہے لیکن یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے، یہی مقالہ نگار
لکھتے ہیں "مولانا سید سلیمان ندوی پٹنہ کالج میں عربی اور فارسی کے استاد رہے" (ص ۱۹۱) یہ صحیح
نہیں، دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا (تفصیل
کے لیے حیاتِ سلیمان ص ۶۲ دیکھئے) وہ آگے چل کر لکھتے ہیں "انھوں نے عربی زبان میں کوئی تصنیف
یادگار نہیں چھوڑی" یہ بھی صحیح نہیں ہے، عربی زبان میں بچوں کے لیے دروس الادب کے
نام سے دو حصے لکھے، علامہ سیوطی کی "عین الاصابۃ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابۃ" کی
تصحیح اور تعلیق کی اور اس کو سیرت عائشہ کے آخر میں شامل کیا، اسی طرح انھوں نے اپنی محققانہ
کتاب "خیام" میں عمر خیام کے پانچ عربی رسالے تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع
کیے، (تفصیل کے لیے خیام کا مطالعہ کیجیے) اسی طرح مولانا حمید الدین
فراہی (متوفی ۱۹۳۰ء) کی "امعان فی اقسام القرآن" دار المصنفین کی طرف سے مصر سے طبع

کتا تھا، اس کے آخر میں ۲۸ صفحات کا ایک تذکرہ ترجمۃ صاحب نزہۃ الرسالۃ کے عنوان سے
لکھا جس میں مولانا فراہیؒ کی علمی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ ہے، یہ قاہرہ سے ۱۳۸۹ھ میں شائع
ہو چکا ہے، اس کے علاوہ کتاب المتبر و صاحبہ ایک طویل عربی مضمون بھی لکھا
جو دائرۃ المعارف حیدرآباد کی دعوت پر وہاں پڑھا گیا، عربی مقالات کے مجموعے مطبوعہ حیدر
آباد ۱۳۵۹ھ میں یہ مضمون شامل ہے، اس مضمون کا اردو ترجمہ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
نے کیا تھا جو معارف میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے، لغات جدیدہ بھی ان کی ایک اہم یادگار
ہے جو مطبوعہ ہے، مکاتیب سلیمان (مرتبہ مولانا مسعود عالم ندویؒ) میں کچھ عربی خطوط بھی
سید صاحب کے موجود ہیں،

اردو کے ذریعہ عربی و اسلامی علوم کی خدمت کرنے والوں میں مولانا عبد الرشید
نعمانی کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اس میں ان کی ایک کتاب کا نام "شرح ماجہ" لکھا گیا ہے (ص ۱۴۲)
یہ اردو کی نہیں عربی زبان کی کتاب ہے، "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجۃ" یہ بڑے
سائز پر اصح المطابع آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے، اس کے علاوہ مولانا کی اور کتابوں
کا ذکر نہیں کیا مثلاً دراسات اللبیب محمد معین سندھی کو ایڈٹ کیا اور اس پر ایک مقدمہ
بھی تحریر فرمایا، یہ کتاب لجنۃ احیاء الادب السندی کراچی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہے
اور علامہ عبد اللطیف محمد ہاشم الحارثی التتوی السندی کی ذب ذبابات الدراسات عن
المذاہب الاربعۃ المتناسبات بھی مولانا کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی
ایک جگہ لکھا ہے "مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم کا کارنامہ نفحۃ العنبر ہے" (ص ۱۴۹) اس سے
بھی زیادہ اہم مولانا کا کارنامہ امام زیلعیؒ کی مشہور کتاب "نصب الرایۃ للاحادیث الہدایۃ"
کی تحقیق و تعلیق ہے، یہ ۱۳۵۷ھ میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع

[illegible] شاہ [illegible] سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا [illegible]
لیے مصر کے [illegible] دنیا میں تحریک اتحاد میں اپنے حصے کا [illegible] کو روشناس
روشناس کرانے کے [illegible] اس کا عربی ترجمہ کیا جو الجزیہ کے نام سے [illegible]
میں ۱۰۰ صفحات پر شائع ہو چکا ہے، عیسائی مؤرخ و ادیب جرجی زیدان کی تاریخ تمدن
اسلامی کا بہت مبسوط و مدلل جواب الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے لکھا اس
رسالے سے مولانا کی شہرت عالم اسلام میں خوب ہوئی یہ ۱۹۱۲ء میں مطبع آسی لکھنؤ سے ۸۸
صفحات پر شائع ہوا ہے اس کے علاوہ حیاتِ شبلی میں مولانا کی کچھ عربی تحریریں اور کچھ
عربی خطوط بھی نقل کئے گئے ہیں۔ سفرنامہ مصر و شام کے آخر میں جدید عربی الفاظ کی ایک فرہنگ
بھی مولانا نے اپنے قلم سے شامل کی ہے، مقالہ نگار نے لکھا ہے "سیرۃ النبی کا عربی ترجمہ شائع کیا
ہے" مصر میں اس کا عربی ترجمہ تو ہوا ہے لیکن یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے، یہی مقالہ نگار
لکھتے ہیں "مولانا سید سلیمان ندوی پٹنہ کالج میں عربی اور فارسی کے استاد رہے" (ص ۱۹۸) یہ صحیح
نہیں، دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا (تفصیل
کے لئے حیاتِ سلیمان ص ۶۲ دیکھئے) وہ آگے چل کر کہتے ہیں "انھوں نے عربی زبان میں کوئی تصنیف
یادگار نہیں چھوڑی" یہ بھی صحیح نہیں ہے، عربی زبان میں بچوں کے لئے دروس الادب کے
نام سے دو حصے لکھے، علامہ سیوطی کی "عین الاصابۃ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابۃ" کی
تصحیح و تعلیق کی اور اس کو سیرتِ عائشہ کے آخر میں شامل کیا، اسی طرح انھوں نے اپنی محققانہ
کتاب "خیام" میں عمر خیام کے پانچ عربی رسالے تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع
کیے ہیں، (تفصیل کے لئے خیام کا مطالعہ کیجئے) اسی طرح مولانا حمید الدین
فراہی (متوفی ۱۹۳۰ء) کی "امعان فی اقسام القرآن" دار المصنفین کی طرف سے مصر سے طبع

کتا ۱۹۵۲ء اس کے آخر میں ۲۵ صفحات کا ایک تذکرہ "ترجمہ صاحب نہ الرسالۃ" کے عنوان سے لکھا جس میں مولانا فراہی کی علمی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ ہے، یہ قاہرہ سے ۱۳۸۶ھ میں شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ کتاب المعتبر و صاحبہ ایک طویل عربی مضمون لکھا جو دائرۃ المعارف حیدر آباد کی دعوت پر وہاں پڑھا گیا، عربی مقالات کے مجموعے مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۳۰ء میں یہ مضمون شامل ہے، اس مضمون کا اردو ترجمہ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے کیا تھا جو معارف میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے، لغات جدیدہ بھی ان کی ایک اہم یادگار ہے جو مطبوعہ ہے، مکاتیب سلیمان (مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی) میں کچھ عربی خطوط بھی سید صاحب کے موجود ہیں،

اردو کے ذریعہ عربی و اسلامی علوم کی خدمت کرنے والوں میں مولانا عبد الرشید نعمانی کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اس میں ان کی ایک کتاب کا نام "شرح ابن ماجہ" لکھا گیا ہے (ص ۱۳) یہ اردو کی نہیں عربی زبان کی کتاب ہے، "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجۃ" یہ بڑے سائز پر اصح المطابع آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے، اس کے علاوہ مولانا کی اور کتابوں کا ذکر نہیں کیا مثلاً دراسات اللبیب محمد معین سندھی کو ایڈٹ کیا اور اس پر ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا یہ کتاب لجنۃ احیاء الادب السندی کراچی سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی ہے اور علامہ عبد اللطیف محمد ہاشم الحارثی التتوی السندی کی ذب ذبابات الدراسات عن المذاہب الاربعۃ المتناسبات بھی مولانا کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی لیکن جگہ لکھا ہے "مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم کا کارنامہ نفحۃ العنبر ہے" (ص ۱۹۸) اس سے بھی زیادہ اہم مولانا کا کارنامہ امام زیلعی کی مشہور کتاب "نصب الرایۃ للاحادیث الہدایۃ" کی تحقیق و تعلیق ہے یہ ۱۹۳۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع

ہو چکی ہے مولانا کا دوسرا اہم کارنامہ ترمذی کی عربی شرح ہے، جس کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، اسی طرح انھوں نے مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کی مشکلات القرآن پر ایک طویل عربی مقدمہ "یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن" کے عنوان سے لکھا جو ۱۳۵۶ھ میں دہلی سے شائع ہو چکا ہے، ان تینوں کارناموں کا ذکر بھی نہیں کیا گیا،

عربی خدمات میں حیرت ہے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ذکر نہیں کیا گیا، جبکہ انھوں نے عربی زبان وادب اور علوم القرآن کی غیر معمولی خدمت کی ہے، ان کی تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان، امعان فی اقسام القرآن، دلائل النظام، اسالیب القرآن، التکمیل فی اصول التاویل، مفردات القرآن، دیوان المعلم اور جمہرۃ البلاغۃ وغیرہ کا ذکر رہ گیا ہے، اسی طرح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تفسیر المعوذتین کا ذکر بھی رہ گیا ہے، جبکہ یہ کتاب مجلس معارف القرآن دیوبند سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکی ہے، ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر مولانا سعید انصاری کی تحقیق و تعلیق سے "ملتقط جامع التاویل لمحکم التنزیل" کے نام سے ۱۳۴۰ھ میں قاہرہ سے طبع ہو کر دار المصنفین سے شائع ہو چکی ہے، اس کا ذکر بھی رہ گیا ہے، مولانا فضل اللہ الجیلانیؒ کی شرح "فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد" کا ذکر نہیں کیا گیا جبکہ یہ مکتبہ سلفیہ قاہرہ سے ۱۳۷۸ھ میں شائع ہو چکی ہے، مولانا عبد الخالق خان افغانی نے مصنف ابن ابی شیبہ فی الاحادیث والآثار کو تین جلدوں میں ایڈٹ کیا اور یہ ۱۳۸۶ھ میں حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے، اسی طرح مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری کی شرح ترمذی "تحفۃ الاحوذی" اور مولانا عبید اللہ رحمانی کی شرح مشکوۃ "مرعاۃ المفاتیح" کا ذکر نہ کرنا بڑی افسوسناک بات ہے، مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی، حجۃ الوداع وعمرات النبی اور الابواب والتراجم للبخاری کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے، یہ دونوں کتابیں بھی مطبوعہ ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ کی ایڈٹ کی ہوئی کتاب

ملفات وصحہم، نہیں بلکہ کتاب النبات ہے، اسی طرح ان کی کتابوں میں "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ" کا ذکر رہ جانا تعجب خیز ہے یہ ۱۹۴۱ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے، مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "شرح معانی الآثار" آپ ہی یادگار ہے (ص ۴۱۴) یہ بھی صحیح نہیں ہے، یہ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی شرح ہے جو امانی الاحبار شرح معانی الآثار للطحاوی کے نام سے ہے، مولانا ابو عبداللہ محمد سورتی کا ذکر کیا گیا ہے (ص ۴۰۹) اور مولانا بدر الدین علوی کا ذکر رہ گیا ہے انھوں نے مختار المختار کو ایڈٹ کر کے بڑے اہتمام سے قاہرہ سے طبع کرایا ہے، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے (ص ۴۱۵) اور ان کی کتابوں میں صرف موقف العالم الاسلامی، القادیانیہ اور روائع اقبال کا ذکر ہے جبکہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ان کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام، المسلمون فی الہند، الارکان الاربعۃ اور السیرۃ النبویۃ وغیرہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اسی طرح نواب صدیق حسن خاں کی نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام نواب علی حسن خاں کی فتح العلام شرح بلوغ المرام، مولانا اویس نگرامی کی تفسیر ابن قیم، مولانا امتیاز علی عرشی کی ایڈٹ کردہ تفسیر سفیان ثوری کا بھی ذکر نہیں کیا، ڈاکٹر عبد العلیم کی عربی خدمات سے بھی اغماض برتا گیا ہے انھوں نے پی، ایچ، ڈی کا مقالہ "اعجاز القرآن" پر لکھا جو عربی زبان میں ہے اور شائع ہو چکا ہے، اسی طرح انھوں نے ابو الحسن بن عیسیٰ الرمانی (متوفی ۳۸۶ھ) کی "النکت فی اعجاز القرآن" کو بھی ایڈٹ کیا جو ۱۹۳۴ء میں دہلی سے اور محمد بن محمد الخطابی (متوفی ۳۸۸ھ) کی "البیان فی اعجاز القرآن" کو ایڈٹ کیا، یہ علی گڑھ سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے نزہۃ الطرب اور معرفۃ المذاہب کو بھی ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، ڈاکٹر صمد الدین نے موفق ابی محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ الدمشقی (متوفی ۶۲۰ھ) کی کتاب الوصیۃ کو ایڈٹ کر کے

کچھ مطبوعات کا تذکرہ اور ان کا ذکر کیا گیا ہے، (ص ۲۲۰) نولکشور لکھنؤ کی خدمات صرف تذکرہ
بیروت کی بحث ہے، اسی طرح مجلس علمی ڈابھیل و کراچی، بمبئی کی شرف الدین الکتبی واولادہ،
لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد، مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں، المکتبۃ السلفیہ بنارس،
تحقیقات و نشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ، ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد جیسے عربی کی خدمت
کرنے والے اداروں سے اغماض برتا گیا ہے، بروکلمن نے عبدالقادر عیدروسی کی ۵ تصنیفات
کے نام گنائے ہیں، جو تمام کی تمام بوہار کے کتب خانہ میں موجود ہیں (ص ۲۹۵) ان کی ۳ تصنیفات
کا پتہ چل چکا ہے، معارف جولائی و دسمبر [illegible] کے شماروں میں ان کی نشان دہی کی گئی ہے، ان میں سے
ایک دوسری کتاب فضائل الاحیاء ہے، جو احیاء العلوم غزالی کے حاشیہ پر مصر سے شائع
ہو چکی ہے، (تفصیل کے لئے مذکورہ بالا معارف دیکھئے) جمال الدین محمد بن عمر ابی بحر الشلی نے
النور السافر کا جو ذیل لکھا ہے اس کا نام تکملۃ النور السافر ہے (ص ۲۰۰) اس کا صحیح نام السنا
الباہر بتکمیل النور السافر ہے، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی مرتب کردہ کتاب کا نام انوار العلوم (ص [illegible])
نہیں بلکہ انوار العیون ہے، شیخ عبدالنبی گنگوہیؒ کی کتاب وظائف النبی کے صرف ایک مخطوطہ گوتھ
کا ذکر کیا ہے (ص ۲۴۰) جبکہ اس کا ایک مخطوطہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی ہے جو دسویں
صدی ہجری کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے، ایک جگہ ذکر ہے "مقبول مفتی غلام سرور مقبول عام خاص (ص ۲۹۶)
اس کو مقبول مفتی غلام سرور ہونا چاہئے، ایک اور جگہ ہے "کتاب المنتخب من الشفا جو عیاض قاضی
کی الشفا کا خلاصہ ہے" (ص ۱۹۵) یہ صحیح نہیں ہے یہ قاضی عیاض کی الشفا ہے،

عربی ادب کی اس تاریخ میں الفاظ و بیان، تعبیر و اسلوب میں بھی کچھ خامیاں نظر آتی ہیں،
ذیل میں اس کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں "عربی کی شخصیت اور زیادہ ابھری اور اسے پھولنے
کی ترتیب دکھا کر اپنی قوت و شرف کی نمائش کا موقع ملا" (ص ۴۰) "عباسی خلیفہ کے زمانہ خلافت میں

صبح پر لگے" (ص ۱۳۰) "ایک نے اسی مذہب کی پیروی کی" (ص ۱۱۱) "جوان کی شعر وادب سے جڑ" (ص ۱۳۲) "مولانا ناصر الدین الترمذی دہلی آئے" (ص ۱۳۶) "النوق" (ص ۱۳۸) شمس الدین محمد یحییٰ الملادی (ص ۱۳۸) "حضرت نظام الدین کی شمع روشن کی جس نے تشخیص دماغ کے ساتھ دل کی تربیت کا سامان مہیا کیا" (ص ۱۴۰) "علم اور محبت کی جوت جلائی" (ص ۱۴۳) "ایک جب خلافت آل عباسیہ کے سایہ میں پہلی بار بیٹھا" (ص ۱۴۱) "تمام ہو گذرے ہیں" (ص ۱۴۲)۔

تاریخ ادبیات کی انیسویں جلد عربی ادبیات کے اشاریہ پر مشتمل ہے، اس کو رحمان علی اور منادر زیدی نے ایڈٹ کیا ہے، نظرثانی پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور سہیل احمد خان نے کی ہے، یہ اشاریہ بہت مفصل اور جامع ہے، اشخاص، امکنہ اور کتب کے علاوہ ادبی وعلمی اصطلاحات، اقوام وقبائل، علوم وفنون، اصناف ادب، مدارس، ادارے اور واقعات سب کے الگ الگ اشاریے اس میں شامل ہیں، اس میں ۱۴۴ صفحات ہیں، تلاش وتحقیق کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہتر گائڈ کا کام دیگی، ذیل میں ہم صرف اشخاص اور کتب کے حصہ کی فروگذاشتوں پر توجہ دلا رہے ہیں،

ابن ابی اصیبعہ (ص ۱) ابن ابی اصیبعہ ہے، ابن حجر ہیتمی (ص ۲) ابن حجر ہیتمی کا ہونا چاہئے۔ قاضی اطہر (ص ۷) صحیح قاضی اطہر مبارکپوری ہے، جلال الدین محمد الحمیدی الشافعی (ص ۸) یہ الحمیری ہے، جلال الدین دوانی (ص ۱۰) نہیں دوانی ہے، شہاب الدین دولت آبادی ابن الدمامینی (ص ۱۴) دراصل یہ دو نام ہیں، مگر اس انداز سے لکھا گیا ہے جیسے کہ ایک ہی نام ہو، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا انتقال ۸۴۹ھ میں جونپور میں ہوا، اور بدر الدین ابن الدمامینی کی وفات ۸۲۷ھ میں گلبرگہ میں ہوئی، صاحب قاموس (ص ۱۴) یہ دراصل قاضی عیاض صاحب الشفا ہونا چاہئے، مولانا عبدالحق چشتی (ص ۱۹) مولانا حکیم عبدالحی حسنی صحیح ہے، عبدالسلام

الحنفی (ص ۳۷) صحیح عبدالسلام دیوی ہے، عبدالقادر عیدروس اور عبدالقادر حضرمی دونوں ایک ہی ہیں
مگر ان کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے (ایضاً) قاضی عنایت اللہ مونگیوری (ص ۳۲) صحیح مونگیری ہے، محمود حسن
خان ٹونکی (ص ۳۰) صحیح محمود حسن خان ہے، شیخ علی بن احمد المہائمی الشافعی ابن نکی المکی (ص ۳۱) الدکنی
ہونا چاہیے، مولانا عبدالزمان خان رشید (ص ۳۳) صحیح شہید ہے، آداب احمد ملا جیون (ص ۳۴)
صحیح آداب احمدی ہے، اخبار الاخیار (ص ۳۶) صحیح اخبار الاخیار ہے، اصول الشاہی (ص ۲۵) یہ
اصول فقہ کی مشہور کتاب اصول الشاشی ہے، اضافۃ المنار شرح المنار (ایضاً) صحیح نام افاضۃ
الانوار فی شرح منار الانوار ہے، ترکلی الاعدم (ص ۲۶) صحیح الاعلام ہے، البیان والتبیین لیعقوبی
(ص ۷۰) یہ جاحظ کی مشہور زمانہ کتاب ہے، الضوء اللامع از شمس الدین سخاوی دوسری جگہ حافظ
شمس الدین (ص ۷۰) دونوں ایک ہی ہیں مگر ان کا ذکر دو جگہ دو شخص سمجھ کر کیا گیا ہے، الفتاوی
العالمگیریہ اور الفتاوی الہندیہ (ص ۷۱) دونوں ایک ہی کتاب کے نام ہیں، مگر دو کتابیں خیال کر کے
الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، الفتح الربانی (ص ۱۱۶) صفحات کا ہندسہ صحیح نہیں اس کا ذکر ص ۷۱
پر ہے، القاموس مجدالدین فیروزآبادی (ص ۲) صحیح مجد الدین ہے، اللآلی فی شرح امالی العالی
(ص ۲) صحیح نام امالی القالی ہے، امانی الاخبار شرح معانی الآثار (ص ۴) صحیح نام امانی الاحبار ہے،
انوار العلوم شیخ عبدالقدوس گنگوہی (ص ۵) صحیح نام انوار العیون ہے، بغیۃ الوعاۃ (ص ۶) کے
مصنف کا نام نہیں لکھا، اس کے مصنف علامہ سیوطی ہیں، تاریخ الامت از احمد سعید دہلوی (ایضاً)
صحیح نہیں ہے، اس کے مصنف و مترجم مولانا اسلم جیراج پوری ہیں، تاریخ فتنۃ الہند از مولانا فضل حق
خیرآبادی (ص ۷۰) صحیح نام الثورۃ الہندیہ ہے، تحقیق ملل الہند از البیرونی (ص ۸۰) صحیح نام تحقیق ما للہند
حاشیہ ہدایہ، حاشیہ خیالی و حاشیہ شرح صحائف و شرح منار مفتاح از عبدالسلام الحنفی (ص ۱۰۲، ۱۰۴
۱۰۵) یہ عبدالسلام دیوی کی ہیں، رجال السند والہند از پروفیسر محمد اسحاق دوسری جگہ قاضی اطہر مبارکپوری

یں) آخر الذکر غلط ہے، زاد الطالبین از محدث کبیر (ص ۹۸) اس کا نام یہ ہے علی بن حسام الدین
متقی ہندی (متوفی ۹۷۵ھ)، زبانۃ المصابیح (ص ۹۰) صحیح زجاجۃ المصابیح ہے، شرح جامی از عبدالرحمٰن
(ص ۱۲۳) صحیح عبدالرحمٰن جامی ہے، طبقات تاج الدین (ص ۹۵) پورا نام طبقات الشافعیہ
فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر مرتب معراج السندی (ص ۹۰) یہ بڑی افسوسناک غلطی ہے معراج
سندی کا انتقال ۱۳۰۳ھ میں ہوا ہے، اور یہ فہرست دو ایک سال میں استاد محمد علی الببلاوی و شیخ احمد
لیمی کی محنت و کاوش سے مرتب ہوئی ہے، اور ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۱۱ھ کے عرصہ میں اس کی آٹھ جلدیں
شائع ہوئی ہیں، معجم الابا، یاقوت (ص ۱۰۳) صحیح نام معجم الادبا ہے، معجم المؤمنین از عمر رضا کحالہ صحیح
نام معجم المؤلفین ہے، منتخب التواریخ از قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد حنفی یزدانی اردو
ترجمہ از بدایونی (ص ۱۰۶) یہ بھی صحیح نہیں ہے، یہ فارسی زبان میں ملا عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی
کی مشہور تاریخ ہے، اس کا اردو ترجمہ محمود احمد فاروقی نے کیا ہے، اور یہ پاکستان سے شائع
ہوا ہے، ہدایۃ العارفین از اسمٰعیل پاشا البغدادی (ص ۱۰۷) اس کا صحیح نام ہدیۃ العارفین ہے

ایسی بہت سی اور فروگذاشتیں ہیں جو پاکستان کے علمی حلقے کی بدنامی کا باعث ہیں، ضرورت
ہے کہ اس کو پھر سے پوری احتیاط اور محنت کے ساتھ ترتیب دیا جائے،

اسلامی علوم و فنون ہندستان میں

اسلامی علوم و فنون پر ہندوستانی علماء نے جو خدمات انجام دی ہیں اس پر مولانا سید عبدالحی صاحب نزہۃ
الخواطر نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک بڑی محققانہ کتاب لکھی تھی، یہ اس کا
ترجمہ ہے، اور اپنے موضوع پر بہت جامع ہے، قیمت ۲۰/۱۰

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

آثار دکن مولفہ سید علی اصغر بلگرامی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ، صفحات ۱۴۳، قیمت مجلد ۳۲ روپیے، پتہ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور۔

دکن میں مسلمانوں نے چھ سو سال تک حکمرانی کی، اس طویل عرصہ میں وہاں اپنی تہذیب وثقافت کا گہرا اثر چھوڑا ہے، قلی قطب شاہ اور اس کے جانشینوں نے اس سرزمین میں بہت سی نادر عمارتیں تعمیر کرائیں جو ان کے اعلیٰ تعمیری ذوق کا ثبوت ہیں، جناب سید علی اصغر بلگرامی صاحب ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۲ء تک ناظم سررشتہ آثار قدیمہ رہے، اس عرصہ میں انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب مرتب کی، اس میں حیدرآباد، گولکنڈہ اور اس کے اطراف کے مقبروں اور عمارتوں کا ذکر ہے، ان کا ارادہ تھا کہ اسی انداز پر وہ اور عمارتوں اور یادگاروں کے بارے میں قیمتی دستاویز تیار کریں، مگر سرکاری مصروفیات رہیں اور عمر نے بھی وفا نہیں کی، اس لیے یہ کام اسی پر ختم ہوگیا، اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں حیدرآباد اور اس کے مضافات، دوسرے میں گولکنڈہ اور اس کے نواح کی عمارتوں کا ذکر ہے، چارمینار، مقبرہ احمد شاہ، مدرسہ محمود گاواں، رصد خانہ بادشاہی، ہفت گنبد، دارالشفاء، کتہ پل، علی برید کا گنبد، جامع مسجد، شاہان گولکنڈہ کے مقبروں وغیرہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کیے گئے ہیں، جس سے مولف کی تلاش وتحقیق کا اندازہ ہوتا ہے، عمارتوں کی تاریخی اور

(ص ۸۸) آخر الذکر صحیح ہے، شذرات الذہب از فہرست کبیر (ص ۸۸) صحیح نام یہ ہے علی بن حسام الدین المتقی المتوفی ۹۷۵ھ، زجاجۃ المصابیح (ص ۹۸) صحیح زجاجۃ المصابیح ہے، شرح جامی از عبدالرحمن (ص ۹۳) صحیح عبدالرحمن جامی ہے، طبقات تاج الدین (ص ۹۵) پورا نام طبقات الشافعیہ ہے فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر مرتب محمد راج السندی (ص ۹۰) یہ بڑی افسوسناک غلطی ہے، محمد راج سندی کا انتقال ۱۲۳۶ھ میں ہوا ہے، اور یہ فہرست زمانہ حال میں استاد محمد علی البیلاوی و شیخ احمد الیمنی کی محنت و کاوش سے مرتب ہوئی ہے، اور ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۱۱ھ کے عرصہ میں اس کی آٹھ جلدیں شائع ہوئی ہیں، معجم الادبا یاقوت (ص ۱۰۲) صحیح نام معجم الادباء ہے، معجم المومنین از عمر رضا کحالہ صحیح نام معجم المؤلفین ہے، منتخب التواریخ از قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد حنفی یزدانی اردو ترجمہ از بدایونی (ص ۱۰۶) یہ بھی صحیح نہیں ہے، یہ فارسی زبان میں ملا عبدالقادر ابن ملوک شاہ بدایونی کی مشہور تاریخ ہے، اس کا اردو ترجمہ محمود احمد فاروقی نے کیا ہے، اور یہ پاکستان سے شائع ہوا ہے، ہدایۃ العارفین از اسمٰعیل پاشا البغدادی (ص ۱۰۸) اس کا صحیح نام ہدیۃ العارفین ہے، ایسی بہت سی اور فروگذاشتیں ہیں جو پاکستان کے علمی حلقے کی بدنامی کا باعث ہیں، ضرورت ہے کہ اس کو پھر سے پوری احتیاط اور محنت کے ساتھ ترتیب دیا جائے،

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

اسلامی علوم و فنون پر ہندوستانی علماء نے جو خدمات انجام دی ہیں اس پر مولانا سید عبدالحی صاحب نزہۃ الخواطر نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک بڑی ہی محققانہ کتاب لکھی تھی، یہ اس کا ترجمہ ہے، اور اپنے موضوع پر بہت جامع ہے، قیمت: ۲۰/-

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

مآثر دکن مولفہ سید علی اصغر بلگرامی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات ۲۳۰، قیمت مجلد ۲۲ روپئے، پتہ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور۔

دکن میں مسلمانوں نے چھ سو سال تک حکمرانی کی، اس طویل عرصہ میں وہاں اپنی تہذیب وثقافت کا گہرا اثر چھوڑا ہے، قلی قطب شاہ اور اس کے جانشینوں نے اس سرزمین پر بہت سی نادر عمارتیں تعمیر کرائیں جو ان کے اعلیٰ تعمیری ذوق کا ثبوت ہیں، جناب سید علی اصغر بلگرامی صاحب ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۳ء تک ناظم سررشتہ آثار قدیمہ رہے، اس عرصہ میں انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب مرتب کی، اس میں حیدرآباد، گولکنڈہ اور اس کے اطراف کے مقبروں اور عمارتوں کا ذکر ہے، ان کا ارادہ تھا کہ اسی انداز پر وہ اور عمارتوں اور یادگاروں کے بارے میں تحقیقی دستاویز تیار کریں، مگر سرکاری مصروفیات رہیں اور عمر نے بھی وفا نہیں کی، اس لیے یہ کام اسی پر ختم ہو گیا، اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں حیدرآباد اور اس کے مضافات، دوسرے میں گولکنڈہ اور اس کے نواح کی عمارتوں کا ذکر ہے، چارمینار، مقبرہ احمد شاہ، مدرسہ محمود گاوان، عاشور خانہ بادشاہی، ہفت گنبد، دارالشفاء، کستہ پل، علی برید کا گنبد، مکہ مسجد، جامع مسجد، شاہان گولکنڈہ کے مقبروں وغیرہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں، جس سے مولف کی تلاش وتحقیق کا اندازہ ہوتا ہے، عمارتوں کی تاریخی اور

[illegible]

... تاریخی حیثیت اور ان کے [illegible] بیان کرنے میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ محکمہ آثار قدیمہ کے دستاویز، نقشے، فوٹو، اور روداد دوں سے مدد لی ... خود مولف نے ان کا ذاتی مشاہدہ بھی کیا ہے، عمارتوں کی تعمیر کا سنہ شاہ وقت کی حکومت ... مناسبت سے قیاساً درج کیا گیا ہے، اس کے شروع میں تعارف ڈاکٹر معین الدین عقیل کے قلم سے ہے، جس میں مولف کے حالات اور ان کے علمی کارناموں کا ذکر ہے ... میں قیمتی اور نادر تصویریں بھی ہیں، آخر میں انڈکس بھی شامل ہے، ۱۹۳۲ء ہی میں حیدرآباد سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی، لیکن اب نایاب تھی، حافظ محمد حید رمیموریل اکیڈمی کراچی کی طرف سے یہ بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، جس سے حیدرآباد کی عظمت رفتہ پھر سامنے آگئی ہے، امید ہے کہ یہ شوق و دلچسپی سے پڑھی جائے گی،

حجاب، ایک تحریک چار کہانیاں نمبر مرتبہ مائل خیرآبادی، تقطیع خورد، کاغذ، طباعت، کتابت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت ۵ روپیہ، ملنے کا پتہ مکتبہ حجاب رامپور

ماہنامہ حجاب رامپور خواتین اور طالبات میں دین کی دعوت کا کام عرصہ سے انجام دے رہا ہے، اس کے خاص نمبر بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں، زیر نظر شمارہ میں چار کہانیاں ہیں، جو اسلامی ذہن کی تعمیر میں ... مددگار و معاون ثابت ہوں گی، ان کہانیوں کی زبان بہت سلیس ہے، کہانیوں کے اندر حکیمانہ مقولے، اشعار ... ہیں اور آیات قرآنی نگینوں کی طرح جڑی گئی ہیں، ان کہانیوں میں سب سے سبق آموز کہانی نگار دہی ہے، اس میں ... سادگی کے باوجود جس طرح سنت رسول کی حفاظت کی اور اس راہ میں اس نے جس طرح وطن چھوڑنا اور ... دو چار ہونا پڑا بہت کم لوگ ایسی مردانگی کی ہمت کر سکتے ہیں، دیگر کہانیاں بھی دلچسپ اور سبق آموز ہیں،

(ع م ...)

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

......✲......

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۵ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ضروری تصحیح

اس شمارہ میں ۲۴۵ سے ۲۵۲ تک ہندسے غلط ہوگئے ہیں، ناظرین اُن کو ۱۶۵ تا ۱۷۲ سے تصحیح فرمالیں،

"منیجر"

شذرات

کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی طرف سے ۱۵،۱۶ مارچ سنہ ء کو عمر خیام کی نو سو سالہ سالگرہ منائی جارہی ہے، امید ہے کہ اس علمی تقریب میں خیام کا مطالعہ صحیح معنوں میں کیا جائے گا،

خیام کی شہرت مغربی ممالک میں زیادہ ہے، ایڈورڈ فٹزجیرالڈ نے اس کی رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں کیا تو پھر یورپ کی اور زبانوں میں بھی ان کے ترجمے ہوئے، فریڈرک روزن کا بیان ہے کہ انجیل کے بعد یورپ میں خیام کی رباعیات ہی مشہور ہوئیں، مگر یہ بھی علمی ستم ظریفی ہے کہ خیام کی شہرت جن رباعیات کی وجہ سے ہوئی، وہ تحقیق کے بعد اس کی ثابت نہیں ہوتیں، مگر ان جعلی رباعیات کی بنا پر ایک جرمن مستشرق فان ہیمر نے اس کو ایک آزاد خیال اور مذہب کا تمسخر کرنے والا شاعر قرار دیا، لارڈ ٹینی سن نے اس کو ایک عظیم کافر تصور کیا، طامس کارلائل نے اس کو ایک ایرانی بدمعاش اور بدقماش کی حیثیت سے پیش کیا، اور ایک عیسائی پادری نے جل کر کہا کہ وہ جبلاتہ الملک شیطان کا ایک غیر معمولی سفیر اور پیامبر ہے، مگر یہ تصویر اصلی خیام کی نہیں بلکہ جعلی خیام کی ہے،

علامہ شبلی نعمانیؒ نے شعر العجم کی پہلی جلد میں خیام پر جو کچھ لکھا ہے اس سے خیام کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں، اس میں خیام کی شاعری پر ناقدانہ تبصرہ زیادہ ہے، سوانح کی تفصیل کم ہے لیکن اس کے فضل و کمال کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس کو زمانہ شاعر کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن وہ فلسفہ میں بو علی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب و تاریخ میں امام وقت تھا، وہ قرأت و تجوید میں بھی ماہر تھا، اور فن نجوم و فقہ میں بھی مہارت رکھتا تھا،

اور جب علامہ مرحوم اس کی رباعیات پر تبصرہ کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ دنیا کی بے ثباتی اور عبرت زا ہونا بزرگ پایہ شعراء کا سب سے بڑا موضوع ہے، اس موضوع کی ابتدا درحقیقت خیام نے کی، اور اس درجہ تک پہونچا دیا کہ سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اس کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں، توبہ و استغفار ایک فرسودہ مضمون ہے لیکن جس طرح خیام اس کو ادا کرتا ہے سننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں، اس کے یہاں لاعلمی کا فلسفہ بھی ہے یعنی تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟

کیا کرتے ہو؟ کہاں جاؤگے؟ وہ ان سوالوں کی تحقیق کرنے کی تلقین کرتا ہے، جبر صحیح ہو یا غلط، خیام جبر کا قائل اور معتقد تھا،

علامہ شبلیؒ نے خیام کے خمریات کے متعلق لکھا ہے کہ جس طرح عربی زبان میں ابونواس شراب کا جاں دادہ ہے، فارسی میں خیام دور جام کا ستم زدہ ہے، اکثر مضامین اور خیالات جو اس نے شراب کے متعلق ظاہر کئے ہیں، خواجہ حافظ نے ان ہی کو لے کر زیادہ شوخ کردیا ہے، تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بےخودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، خواجہ حافظ اس حد تک نہیں پہونچے، خیام کا فلسفۂ زندگی بظاہر اپیکورس کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے، یعنی گذشتہ اور آئندہ سے کچھ بحث نہیں جو کچھ ہے حال ہے، اس میں کھاؤ، پیو، خوش رہو، خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہوسکتی، اس نے بہت سی رباعیوں میں معاد، جزا، اور سزا کا اقرار کیا ہے، نکوکاری اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے، اس کے یہاں اخلاقی تعلیم بھی ہے، اس کے نزدیک ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے، اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی،
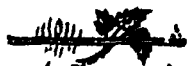
علامہ شبلیؒ کی شعرالعجم میں خیام پر صرف ایک باب ہے، ظاہر ہے کہ وہ اس میں اس سے متعلق ساری باتیں بہت پھیلا کر نہیں لکھ سکتے تھے، اس کی تلافی استاذی المحترم مولٰنا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی ضخیم تصنیف خیام ہی میں کی، اس میں خیام کے سوانح، علم و فضل اور اس کے شاعرانہ کمالات کی نوعیت پر کچھ ایسے عالمانہ مباحث ہیں کہ بقول علامہ محمد اقبال "اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کرسکے گا"

خیام کے سنہ ولادت اور وفات پر اتفاق نہ تھا لیکن اس کتاب میں بڑی تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کی ولادت کا تقریبی سال سنہ ۴۲۲ھ ہے، اور اس کا سال وفات سنہ ۵۲۶ھ وہ نیشاپور میں پیدا ہوا، اس نے ہیئت میں ابوالحسن الانباری سے تعلیم پائی، فلسفہ میں ابوعلی سینا کے تلامذہ سے مستفید ہوا، تمام تذکرے اس پر متفق ہیں کہ فلسفہ و حکمت میں ابوعلی سینا کے بعد اسی کا درجہ ہے، اس کا دماغ ریاضیات کے لئے بھی موزون تھا، مساحت، جبر و مقابلہ اور اقلیدس

کمزرت بھی اس کا میلان تھا، اس فن پر اس کی دو کتابیں البرهان علی استخراج اضلاع المربعات والمکعبات اور جبر و مقابلہ ہیں وہ ترکستان کے ایک خانی دربار سے منسلک ہوا، تو اس نے ملک شاہ سلجوقی کے زمانہ میں ایک رصد خانہ کی تعمیر کی، جس کے ذریعہ سے آفتاب کی حرکت کی صحیح تحقیق کر کے صحیح شمسی سال کی تعیین کی، اور نوروز یعنی مالیہ کا آغاز سال مقرر کیا، اُس نے سنہ جلالی کی سالانہ تاریخوں کی تعیین کے لئے ایک تقویم یعنی جنتری کی جدولیں بھی قائم کیں،

اُس نے رسالہ مصادرات اقلیدس کے نام سے ایک کتاب لکھکر اقلیدس پر اپنی معلومات کا اظہار کیا، اس کے ایک رسالہ کا نام رسالہ طبیعیات ولوازم الامکنہ ہے جس کے مباحث علت اختلاف ہوائے بلاد و اقلیم ہے،[?] اس نے اپنے رسالہ میزان الحکم و رسالہ معرفۃ مقداری الذہب والفضۃ میں کسی چیز میں چاندی اور سونے کے ملے ہوئے اجزا کے وزن کو معلوم کرنے کے طریقے بتائے ہیں، اس کے رسالہ کون و تکلیف میں ان دو سوالات کے جوابات ہیں کہ خدا نے دنیا اور انسان کو کیوں بنایا اور انسانوں کو عبادات بجالانے کی تکلیف کیوں دی، مسئلہ وجود پر اُس کے چار رسالے ہیں، رسالہ موضوع کلی، رسالہ فی الوجود، رسالہ تابعجیہ لعمر بن الخیام فی کلیات الوجود، اور رسالہ وصف و موصوف ان رسالوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ مسئلہ توحید کی اہمیت اور بزرگی، اور خدائے تعالیٰ کی عظمت خیام کے دل میں گہرے طور پر منقوش تھی،

خیام کی فارسی رباعیات پر بہت ہی فاضلانہ بحث کر کے استاذ ذی الحزم نے یہ ثابت کیا ہے کہ خیام کی رباعیوں کی اصل تعداد کو دریافت کرنا سخت مشکل ہے، کیونکہ اس کی رباعیاں دوسرے شعراء کی رباعیوں سے مخلوط ہیں، اور جن کے اصلی مالک کا پتہ لگانا مشکل ہے، اس کی رباعیوں سے کچھ لوگ اس کو دہری، صوفی اور کچھ لوگ اس کو رندلاابالی ثابت کرنا چاہتے ہیں، مگر درحقیقت وہ نہ یہ تھا اور نہ وہ، وہ متکلم حکیم بھی نہ تھا، فلسفی حکیم بھی نہ تھا، اسماعیلی حکیم بھی نہ تھا، اگر تھا، تو صوفی حکیم، اور اسی طریق کو وہ پسندیدہ اور صواب جانتا تھا، مگر بہر حال میں اس کا مذہب اسلام تھا، لیکن مشائیت آمیز فلسفیانہ اسلام جس کا خاکہ فارابی کی فصوص الحکم، اخوان الصفا، اور بوعلی سینا کی اشارات اور الہیات میں نظر آتا ہے وہ مسلمان تھا اور رسول کا قائل تھا، اس نے حج بھی کیا تھا،

امید کہ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی تقریب میں خیام کو اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی،

مقالات

سیرۃ نبوی کی ایک اہم کتاب الشفاء پر ایک نظر

(۳)

از

ضیاء الدین اصلاحی

کتاب الشفاء اور احادیث کتاب الشفاء کا دوسرا ماخذ احادیث و روایات ہیں، اس کے ایک باب میں وہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول کا اُس کے یہاں کتنا اونچا درجہ و مرتبہ تھا، اس کے علاوہ مختلف مباحث کے ضمن میں بھی بے شمار حدیثیں نقل ہوئی ہیں، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ قاضی عیاض کا پایہ حدیث و شرح حدیث میں بلند تھا، اس لئے انھوں نے صرف روایتوں کو نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ایک ماہر فن کی طرح اُن پر مفصل بحث و کلام بھی کیا ہے، وہ عموماً حدیثیں سنداً نقل کرتے ہیں، اور اُن کے طرق کی کثرت و تعدد کا ذکر بھی کرتے ہیں، سند و متن کے فرق و اختلاف، ایک مفہوم کی متعدد روایتوں یا ایک ہی حدیث کے الفاظ کا باہمی فرق بھی دکھاتے ہیں، احادیث کی صحت، قبول و شہرت یا عدم صحت و نکارت، وضعف کے علاوہ راویوں کی قوت وضعف، اعتبار و عدم اعتبار کی تصریح بھی کرتے ہیں، اس سلسلہ میں محدثین، ائمہ رجال، اور علمائے اصول کے اقوال نقل

کرتے ہیں، اور حدیثوں کے مفہوم و مطلب کی دلنشین تشریح کرتے ہیں، محدثین و شارحین کے بیان کردہ مطلب کو نقل کرتے ہیں، الفاظ حدیث کی تشریح میں علمائے لغت کے اقوال تحریر کرتے ہیں، ایک حدیث کا مفہوم واضح کرنے کے لیے دوسری حدیثیں بھی نظیر کے طور پر بیان کرتے ہیں، اور حدیثوں کے متعلق شکوک و اعتراضات کا جواب دیتے ہیں، روایتوں کے قبول و عدم قبول کے بعض خاص اصول بھی بیان کئے ہیں، مثلاً حضرت عائشہؓ معراج کو روحانی مانتی تھیں، قاضی عیاض نے ان کی روایت کو اس اصول کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے کہ وہ مشاہدہ پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ معراج کے وقت حضرت عائشہؓ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں تھیں، اور نہ ان کی عمر ہی اتنی تھی کہ واقعہ کو ضبط کر سکتیں، پس جب حضرت عائشہؓ واقعہ کی عینی شاہد نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اس کو دوسرے صحابہ سے سن کر بیان کیا ہے تو ان کی روایت قابل ترجیح نہیں ہوسکتی، جبکہ دوسروں نے اس کو صراحتہً بیان کیا ہے، (ج ۲ ص ۳۰۵، ۳۰۶)

انھوں نے ایک اصول یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب کسی شخص کا جھوٹ ایک روایت میں ثابت اور مشہور ہو جائے تو اس کی ہر ہر خبر مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے اور وہ لوگوں کی نظر میں متہم ہو جاتا ہے، اور اس کی کوئی روایت قابل یقین نہیں سمجھی جاتی، یہی وجہ ہے کہ محدثین نے ان لوگوں کی روایتوں کو ترک کر دیا ہے جو کثرت سے غلطی کرتے ہیں، اور جن کا وہم و غفلت اور سوء حفظ معروف ہوتا ہے، باوجودیکہ وہ ثقہ اور معتبر ہوتے ہیں، (ج ۲ ص ۱۳۰)

احادیث کے نقل و بیان کے سلسلہ میں ان کا یہ نکتہ اور اصول خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جن حدیثوں میں آنحضرتؐ اور دوسرے انبیاءؑ کے ایسے احوال اور واقعات بیان ہوئے ہوں جو ان کے شایان شان نہ ہوں، یا جو حدیثیں محتاج تاویل ہوں، اور ان میں احتمال و تردد کی گنجائش ہو تو ان کو نقل و بیان کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ صحیح و ثابت حدیث کا مفہوم بھی اگر واضح نہ ہو تو اس کی

بیان کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، امام مالکؒ اُن حدیثوں کی روایت ناپسند کرتے تھے جن میں اللہ کی تشبیہ اور صفات وغیرہ کا ذکر ہے، اور جو عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہیں، ان کا ارشاد ہے "آخر لوگوں کو اس طرح کی حدیثیں بیان کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے"، ان سے کہا گیا کہ مشہور ثقہ محدث محمد بن عجلان تو ایسا کرتے ہیں، فرمایا کہ وہ فقہاء میں سے نہیں ہیں، اس لئے احادیث کی دقت و نزاکت سے ناواقف ہیں"، کاش لوگ اس معاملہ میں امام مالکؒ کے ہمنوا ہوتے، اور ایسی حدیثوں کے بیان کرنے سے باز آجاتے جن میں اشکال و تردد ہے، اور جن کی عملی زندگی میں کوئی ضرورت نہیں پیش آتی" (ج ۲ ص ۳۸۴، ۳۶۹)

انھوں نے بعض جگہ ضعیف حدیثیں نقل کی ہیں مگر ان کی تائید و توثیق کے لئے صحیح اور مشہور حدیثیں بھی نقل کر دی ہیں، اس طرح ضعیف حدیثوں کی حیثیت محدثین کے اصول کے مطابق شواہد و متابعات کی ہوئی، البتہ جب وہ کوئی خارق عادت واقعہ نقل کرتے ہیں تو اس کو بیان کرنے والے کثیر اشخاص کا ذکر کرتے ہیں، تاکہ حدیث کا تواتر ثابت ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو اتنے زیادہ اشخاص نے بیان کیا ہے جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہے، چنانچہ آنحضرتؐ کی برکت سے کھانا زیادہ ہو جانے اور آپؐ کی انگلیوں سے پانی نکلنے کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اس سلسلہ کی اکثر حدیثیں کتب صحاح میں درج ہیں، اور اس کو متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم اور اتنے زیادہ تابعین و تبع تابعین نے بیان کیا ہے جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا" (ج ۲ ص ۲۷۰)

اسی طرح آپؐ کے ایک اور معجزہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "ابن عمرؓ، بریدہؓ، جابرؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، یعلیٰ بن مرہؓ، اسامہ بن زیدؓ، انس بن مالکؓ، علی بن ابی طالبؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے صحابہ نے بعینہٖ یا قریب قریب اس کو بیان کیا ہے اور ان سے کچھ چند تابعین نے بیان کیا ہے، پس اس کی روایت اس قدر کثرت سے کی گئی ہے کہ

اس کی قوت و صحت میں شک کی گنجائش نہیں" (ج ۳ ص ۵۰)

فقہی و کلامی مسائل | قرآن و حدیث کی طرح اس میں گوناگوں فقہی بحثیں اور مختلف اعتقادی مسائل بھی تحریر کئے گئے ہیں اور اس ضمن میں معروف و غیر معروف فقہاء و متکلمین کے اقوال و مسالک بھی بیان کئے گئے ہیں، اس قسم کی بحثیں کتاب میں جابجا ملیں گی، لیکن اس کے آخری حصہ میں خصوصیت سے فقہی مسائل کا ذکر ہے، جہاں رسول اللہ کو سبّ و شتم کے احکام بیان ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں مسلم و غیر مسلم وغیرہ کے الگ الگ احکام و مسائل کا ذکر ہے، یعنی اگر مسلمان رسول اللہ کی شان میں ناروا حرکت کا مرتکب ہو تو اس کے کیا فقہی احکام ہیں، اور ذمی شانِ رسالت میں گستاخی کرے تو کیا حکم ہوگا، اس حصہ میں خدا، قرآن، انبیاء، ملائکہ، صحابہ کرام، ازواج مطہرات اور رسول اللہ کی آل و اولاد کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے فقہی احکام بھی بیان کئے ہیں اور آنحضرت کی طرح ان جگہوں اور مقامات کی حرمت و تقدیس کے مسائل بھی لکھے ہیں جن سے آپ کا تعلق رہا ہے، اسی طرح روضۂ قبر نبوی کی زیارت اور مسجد نبوی کے ادب و احترام کے احکام کا ذکر بھی ہے، اور ان سب بحثوں میں ائمۂ فقہ کے اقوال اور علماء کے باہمی اختلافات کی پوری تفصیل دی ہے، جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی فقہی جزئیات پر بھی گہری نظر تھی، اور وہ مسائل سیرت کے بارے میں علماء و ائمۂ فقہ کے اقوال سے پوری طرح واقف تھے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ کتاب الشفا میں تفسیر، حدیث، فقہ، اور کلام ہر ایک کے مباحث موجود ہیں، ان کے ضمن میں مصنف نے ان فنون کے ماہرین و ائمۂ سلف کے اقوال کا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، وہ جس طرح اختلافِ اقوال و کثرتِ آراء کا ذکر کرتے ہیں، اسی طرح مختلف اقوال میں جمع و تطبیق اور ترجیح و محاکمہ بھی کرتے ہیں، اور بیانِ قول

ان کے نزدیک ضعیف ہوتا ہے، اس کی تردید کرتے ہیں، ایک مثال سے کتاب کی یہ ساری خصوصیات سامنے آجائیں گی،

رویت باری علم کلام کا ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے، اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، قاضی عیاض کے نقطۂ نظر سے چاہے پورا اتفاق نہ کیا جائے مگر یہ لائق ذکر ہے، ملاحظہ ہو:۔

رویت کے مسئلہ میں سلف کا اختلاف ہے، حضرت عائشہؓ اس کی منکر ہیں ان سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ یہ بات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، جو شخص یہ کہے کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا تھا، وہ جھوٹا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (انعام: ۱۰۳) (اللہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں)

محدثین کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے، مشہور روایت کے مطابق عبد اللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی قول ہے، اور یہ حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے، ان کا خیال ہے کہ رسول اللہؐ نے خدا کے بجائے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھا تھا، مگر ان سے دوسرا قول بھی منقول ہے، محدثین، فقہاء، اور متکلمین کی ایک جماعت دنیا میں اللہ کے رویت کی منکر ہے، مگر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبیؐ نے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ابن اسحاق صاحب مغازی بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرؓ نے ان کے یہاں آدمی بھیج کر دریافت کیا کہ کیا خدا کو آنحضرتؐ نے دیکھا تھا، تو انھوں نے اثبات میں جواب دیا، وہ فرماتے تھے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو کلام اور حضرت ابراہیمؑ کو اپنی دوستی کا شرف بخشا تھا، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دیدار سے مشرف کیا تھا، ان سے مشہور روایت یہی ہے، جو متعدد طرق سے مروی ہے، مگر عطا نے ان سے یہ روایت کی ہے کہ آپؐ نے اللہ کا اپنے قلب سے مشاہدہ کیا تھا، ابو العالیہ کا بھی یہی خیال ہے، حضرت ابن عباسؓ کا استدلال اس آیت سے ہے:۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ أَفَتُمَارُونَهُ جو کچھ اس نے دیکھا اس کے دل نے اس کو جھٹلایا نہیں

عَلَىٰ مَا يَرَىٰ جو کچھ وہ دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو، اور

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ (نجم ۱۱-۱۳) اُس نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا،

امام ابوالحسن ماوردی فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے کلام اور رویت کو حضرت موسیٰ اور محمدؐ کے درمیان تقسیم کردیا تھا، پس محمدؐ نے اللہ کو دوبار دیکھا، اور حضرت موسیٰ نے اللہ سے دوبار کلام کیا، ابوالفتح رازی اور ابواللیث سمرقندی نے حضرت کعبؓ سے بھی اس کی حکایت کی ہے، عبداللہ بن حارث روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ابن عباسؓ اور کعبؓ اکٹھا ہوئے تو ابن عباسؓ نے کہا "ہم بنوہاشم یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ نے اللہ کو دوبار دیکھا، یہ سن کر حضرت کعبؓ بہت مسرور ہوئے، اور انھوں نے زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا، اور فرمایا کہ اللہ نے رویت وکلام کو محمدؐ اور موسیٰؑ کے مابین تقسیم کردیا تھا، آیت کی تفسیر میں حضرت ابوذرؓ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا، سمرقندی محمد بن کعب قرظی اور ربیع بن انس سے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ کیا آپؐ نے اپنے رب کو دیکھا؟ تو آپؐ نے فرمایا میں نے آنکھ کے بجائے قلب سے دیکھا، حضرت معاذؓ نے آپؐ سے روایت کی ہے کہ میں نے خدا کو دیکھا، حسن بصری قسم کھا کر کہتے تھے کہ محمدؐ نے اپنے خدا کو دیکھا، عکرمہ سے بھی اس کی روایت کی گئی ہے، امام احمدؒ فرماتے تھے کہ میری رائے حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ہے کہ آپؐ نے اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھا،

اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے، اس کی تاویل میں اختلاف ہے، ابن عباسؓ اور عکرمہ کا خیال ہے کہ آپؐ نے اپنے قلب سے خدائے ذوالجلال کا مشاہدہ کیا، اور ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ اس آیت میں آپؐ کے حضرت جبریلؑ کو دیکھنے کا ذکر ہے، عطاؒ نے

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (انشراح:۱) (اے محمدؐ) کیا ہم نے تمھارا سینہ کھول نہیں دیا،

کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ آپ کا سینہ رویت کے لئے اور حضرت موسیٰ کا سینہ کلام کے لئے کھول دیا گیا، امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ "دوسرے انبیاء کو جو معجزے دیئے گئے اسی طرح کے معجزے ہمارے رسولؐ کو بھی دیئے گئے، مزید برآں آپ رویت سے بھی سرفراز کئے گئے،

سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ "نہ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے خدا کو دیکھا تھا، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ آپ نے نہیں دیکھا تھا" ہمارے بعض مشائخ نے بھی اس باب میں سکوت و توقف اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں رویت کی کوئی واضح اور صریح دلیل موجود نہیں، مگر یہ عقلاً محال نہیں ہے، ہمارے نزدیک دنیا میں رویت کے جواز و امکان میں کوئی شبہ نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اللہ سے اس کا سوال کیا تھا، ظاہر ہے کہ کوئی نبی اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ کون سی چیز اللہ کے لئے روا اور ممکن ہے، اور کون سی چیز اس کے لئے ناروا و محال ہے، اس لئے ان کا سوال ایک جائز اور ممکن چیز کے لئے تھا، جو لوگ رویت کو محال قرار دیتے ہیں ان کے لئے (لن ترانی) اور (تبت الیک) سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ پہلا حکم عام نہیں ہے بلکہ یہ صرف حضرت موسیٰ کے لئے خاص تھا، نیز جو لوگ اس کا یہ مفہوم بتلاتے ہیں کہ تم مجھ کو ہرگز دنیا میں نہیں دیکھ سکتے، وہ ایک تاویل ہے، اور رویت کے ناممکن ہونے کی اس میں کوئی صراحت نہیں ہے، اور جب معاملہ تاویلات اور احتمالات تک پہونچ جائے تو اس سے کوئی قطعی دلیل قائم ہونے کی گنجائش نہیں رہتی، رہی حضرت موسیٰ کی توبہ تو وہ اس بنا پر تھی کہ انھوں نے ایک ایسی چیز کے بارہ میں سوال کیا جو اللہ نے ان کے لئے مقدر نہیں کی تھی،

اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انھوں نے دعا کی رب اشرح لی یعنی خداوندا میرا سینہ کھول دے، جب حضرت موسیٰ نے خدا کے دیدار کی تمنا کی تو اس کے جواب میں خدا نے یہ کہا کہ تم مجھ کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے، حضرت موسیٰ کے ہوش میں آنے کے بعد کی دعا کی،

بعض سلف اور متکلمین رویت کو دنیا میں اسی لیے محال خیال کرتے ہیں کہ اہل دنیا کے اجسام و اعضاء کی ترکیب ضعف پر ہوئی ہے، نیز ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور وہ حوادث و آفات سے بھی دوچار ہوتے رہتے ہیں، اور موت کا نشانہ بن جاتے ہیں، اس لیے رویت پر ان کو قوت نہیں ہوتی، لیکن عالم آخرت میں جب ان کے اجسام کی دوسری ترکیب کی جائے گی، اور ان کو باقی رہنے والے قویٰ عطا کئے جائیں گے، اور ان کی آنکھوں اور دلوں کی روشنی مکمل ہو جائیگی تو وہ رویت پر قادر ہو جائیں گے، امام مالکؒ سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کو نہیں دیکھا جا سکتا، کیونکہ وہ باقی رہنے والا ہے، اور باقی کو فانی کے ذریعہ نہیں دیکھا جا سکتا، پس جب آخرت میں لوگوں کو باقی رہنے والی نگاہیں بخشی جائیں گی تو باقی کو باقی کے ذریعہ دیکھا جا سکے گا، یہ نہایت اچھا اور عمدہ قول ہے، اس میں رویت کے محال ہونے کی دلیل ضعفِ قدرت کے اعتبار سے بتائی گئی ہے، سو اللہ اپنے جس بندے کو چاہے قدرت دیدے، اور وہ رویت کا بارِ گراں اٹھانے کا متحمل ہو جائے تو اس کے لئے رویت ناممکن نہ ہو گی، حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کو یہ قوت بخشی گئی تھی،

بہرحال رویت کے جواز میں کوئی شک و شبہ نہیں، اب رہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کا معاملہ تو اس کا نہ قطعی ثبوت ہے، اور نہ یہ صراحۃً ثابت ہی ہے، اس لئے کہ سارا دارومدار صرف سورۂ نجم کی دو آیتوں پر ہے، جن کی تاویل میں سلف سے اختلاف چلا آ رہا ہے، اس لئے احتمال دونوں باتوں کا ہے، اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خود کوئی قطعی اور متواتر حدیث بھی ثابت نہیں ہے، حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے صرف ان کے اپنے مسلک کا پتہ چلتا ہے

(حاشیہ بقیہ ص۲۰۵) طرف اشارہ ہے، کہ میں تیرے حضور میں توبہ کرتا ہوں، اسی بات کو مرزا غالبؔ نے اس طرح کہا ہے، ؎ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب × آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

وہ مستند نہیں ہے، حضرت ابوذرؓ کی حدیث کا بھی یہی حال ہے، یہی حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث تو اُس کی تاویل میں احتمال ہے، نیز اس کی سندوں اور متن میں اضطراب ہے، اس مسئلہ میں حضرت ابوذرؓ سے ایک اور حدیث بھی مروی ہے، مگر اس کے الفاظ میں اختلاف اور معنیٰ میں احتمال و اشکال ہے، اس کی روایت تین طرح سے کی گئی ہے (۱) نور اَنّیٰ اراہ، اللہ تعالیٰ تو نور ہے میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں، (۲) نورانیٌّ اراہ، یعنی وہ نور ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں، (۳) رایتُ نوراً یعنی میں نے نور دیکھا، ایسی صورت میں ان کی حدیث سے رویت کی صحت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، اگر آخری صورت کو صحیح مانا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ آپ نے اللہ کو نہیں دیکھا، بلکہ ایک نور دیکھا جو خدا کی رؤیت میں حجاب بن گیا، اسی طرح پہلی روایت کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں جبکہ نور کا حجاب درمیان میں تھا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے خدا کو دونوں آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے قلب سے دیکھا، کیونکہ اللہ نگاہ کے ادراک کو دل میں پیدا کرنے پر قادر ہے،

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اگر کوئی صریح اور واضح حدیث اس مسئلہ میں موجود ہو تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا اور اسی کو اختیار کیا جائے گا، اس لئے کہ اس میں محال کی کوئی بات نہیں۔
(ج ۲ ص ۲۰۰ تا ۲۰۵)

کتبِ سیر و تاریخ | سیر و تاریخ کی وہ کتابیں بھی الشفا کا ماخذ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات درج ہیں، گو اس کی نوعیت سیرت کی عام کتابوں سے مختلف ہے، اس لئے اس میں اصلاً اور براہِ راست آپ کے احوال و واقعات نہیں بیان کئے گئے ہیں، تاہم آپ کے درجات و مراتب اور امتیازات و خصائص کو ثابت کرنے کے لئے آپ کے متعدد واقعات بھی تحریر کئے گئے ہیں، اور اس سلسلہ میں حدیث، سیر، مغازی، اور تاریخ کی ان کتابوں سے مصنف نے اخذ و استفادہ

کیا ہے جو ان سے پہلے لکھی گئی تھیں، یہاں ان کتابوں کی فہرست لکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ واقعات کے نقل و تحریر کے سلسلہ میں کتاب "الشفا" کی بعض خصوصیات دکھانا ہیں،

۱۔ مورخین اور اہل روایت دو واقعات کو باہم ملا ملا کر کے ایک واقعہ بنا دیتے ہیں ایسے موقع پر صاحب شفا نے ایک دیدہ ور مورخ اور نقاد کی طرح ان واقعات کو جدا جدا بتایا ہے اور مورخین کے خلط مبحث کی صراحت کر دی ہے، مثلاً واقعۂ معراج کے عجائب متعدد حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں، ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گوناگوں خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں کتب شفا میں ثابت بنانی کے واسطہ سے حضرت انس بن مالک کی ایک طویل حدیث نقل ہوئی ہے، جو صحیح مسلم میں مذکور ہے، اور جس میں آپ کے بیت المقدس جانے، ساتوں آسمان کی سیر کرنے، انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کرنے، عالم ملکوت کا مشاہدہ کرنے اور آخر میں نماز کی فرضیت اور اس کی رکعتوں کی تعداد میں تخفیف کے لیے بارگاہ خداوندی میں کئی بار جانے کا ذکر ہے، اس حدیث میں جو باتیں چھوٹ گئی ہیں ان کو دوسری حدیثوں سے مکمل کیا گیا ہے، اسی سلسلہ میں راویوں کے دو واقعے گڈمڈ کرنے کا اس طرح ذکر کرتے ہیں،

ثابت کے علاوہ دوسرے رواۃ نے اس روایت میں واقعات کو گڈمڈ کر دیا ہے، شریک بن ابی نمر نے اس کے شروع میں یہ بیان کیا ہے کہ "فرشتہ جب رسول اللہؐ کے پاس آیا تو اس نے آپ کا سینہ چاک کر کے اسے زمزم کے پانی سے دھویا"

مصنف لکھتے ہیں کہ سینہ چاک کرنے اور اسے دھونے کا واقعہ آپ کے بچپن کے زمانہ کا ہے جب آپؐ پر وحی بھی نازل نہیں ہوئی تھی[1]، خود شریک کی حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ نزول وحی سے پہلے کا ہے حالانکہ بالاتفاق اسرار کا واقعہ وحی اترنے کے بعد کا ہے بعض

---

[1] بعض مورخین کا خیال ہے کہ سینہ چاک کئے جانے کا واقعہ کئی بار پیش آیا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہجرت سے ایک سال قبل اور بعض کے خیال کے مطابق اور پہلے پیش آیا تھا، حماد بن سلمہ نے ثابت کے واسطے سے حضرت انسؓ کی جو روایت بیان کی ہے اس سے پتہ چلتا ہو کہ حضرت جبرئیلؑ آپکے پاس اس وقت آئے تھے جب آپ حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس طائف گئے تھے، جنھوں نے آپؐ کو دودھ پلایا تھا ظاہر ہے اس واقعہ کا اسرار اور معراج کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہو، اس کو شریک کے علاوہ بعض دوسرے راویوں نے بھی بیان کیا ہے، پس رات میں آپ کا بیت المقدس اور سدرۃ المنتہیٰ تک جانا الگ واقعہ ہے، اور بچپن میں آپؐ کے سینہ کا چاک کیا جانا علٰحدہ واقعہ ہے[1]،

۲- مذکورۂ بالا مثال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کسی خاص اشکال کو رفع کرنے یا کسی اور غرض اور حکمت کی بنا پر واقعات کے وقت اور زمانہ کی تعیین وتصریح بھی کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اسرا (معراج) کے زمانہ کی تعیین میں اختلاف ہوا (۱) زہری کے قول کے مطابق یہ ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے، جو بعثتِ نبویؐ کے ڈیڑھ برس بعد پیش آیا، (۲) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہجرت سے پانچ سال قبل کا واقعہ ہے، (۳) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہجرت سے ایک سال پہلے کا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے[2]،

۳- یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ کتاب الشفا میں واقعات کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے اسی لئے جو واقعے بہت مشہور ہیں ان کی شہرت کی بنا پر ان کی جانب صرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور ان کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامات کے سلسلہ میں متعدد واقعات کی طرف مصنف نے محض اشارہ کر دیا ہو اور اُن کی انتہائی شہرت کی بنا پر ان کی تفصیل نہیں بیان کی ہے،

---

[1] کتاب الشفاء ج ۲ ص ۲۵۳ تا ۲۶۰، [2] ایضاً ص ۳۰۴، ۳۰۵

۴۔ طویل واقعات کے صرف ضروری حصوں کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، اور غیر ضروری حصوں کو نظر انداز کر دیا ہے، جیسے ایک جگہ صحابۂ کرام کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی محبت اور الفت کے بیان میں عہدِ فاروقی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے،

"زید بن اسلم کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ رات میں گشت کر کے لوگوں کی خبرگیری اور نگرانی کرتے تھے، ایک رات انھوں نے کسی گھر میں چراغ جلتا ہوا دیکھا، تو وہاں تفتیش کے لئے پہونچ گئے، معلوم ہوا کہ ایک بوڑھی عورت روئی کات رہی ہے اور یہ اشعار پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہے،

علیٰ محمدٍ صلوٰۃُ الابرار — صلّٰی علیہ الطیبون الاخیار

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نیک، پاکیزہ اور برگزیدہ لوگوں کی طرف سے درود و سلام ہو

قد کنتَ قوّاماً بکاً بالاسحار — یا لیتَ شعری والمنایا اطوار

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سحر کے وقت عبادت کرتے اور خدا کے سامنے گڑگڑاتے تھے، کاش مرنے کے بعد (عالمِ آخرت میں)

ہل یجمعنی وحبیبی الدار

میں اور میرے محبوب اکٹھا ہوتے، یعنی میں آپ کے دیدار سے مشرف ہوتی،

اشتیاق و محبتِ نبویؐ کا یہ پُر اثر منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ رونے لگے[1]۔"

مصنفؒ نے اسی قدر واقعہ نقل کیا ہے، کیونکہ اتنے ہی سے ان کا مدعا و منشا واضح ہو جاتا ہے۔

۵۔ مصنف واقعات کے نقل و بیان میں احتیاط سے کام لیتے ہیں اور صحت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اسی لئے معجزات و خوارقِ عادات کے بیان میں جو واقعے نقل کئے ہیں، ان کو معتبر راویوں کے

---

[1] ایضاً ج ۳ ص ۲۹۶، ۲۹۔

حوالے سے تحریر کیا ہے، اور یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ اس کو اتنے زیادہ اشخاص نے بیان کیا ہے کہ سب کا جھوٹ پر متفق ہو جانا محال ہے[1] اس طرح کے بعض واقعات نقل کرنے کے بعد ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ سب مشہور و مشاہد واقعات ہیں، واقعہ وہی بیان کرنا چاہیے جو صحیح، صحیح اور ثابت ہو، اور غیر معروف و مجہول واقعات کو نظر انداز کر دینا چاہیے[2]"

۶۔ وہ بعض امور کو صحیح اور محقق ثابت کرنے کے لئے یہ بتاتے ہیں کہ مورخین اور اہل نقل نے ان کو بالاتفاق بیان کیا ہے، اس لئے ان کی صحت و قطعیت شک و شبہ سے بالاتر ہے، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ رسول کریمؐ کی ذات گرامی تمام اوصاف و کمالات اور گوناگوں اوصاف و محامد کی جامع تھی، یہ امر واقعات و اخبار بیان کرنے والوں کے نزدیک بالکل مسلّم اور متفق ہے، اس میں کسی سے کوئی اختلاف منقول نہیں، اس لئے یہ بات قطعی طور پر ثابت و مسلّم ہے[3]،

۷۔ مگر جو واقعات غیر محقق اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہوتے ہیں، ان کی مدلل اور پر زور تردید کرتے ہیں مثلاً حضرت داؤدؑ اور اوریا کے تعلق سے قصہ گو مورخین و مفسرین نے جو رطب و یابس واقعات تحریر کئے ہیں، ان کے بارے میں نہایت سخت لب و لہجہ میں لکھا ہے،

"حضرت داؤد کے واقعہ میں قصہ گو حضرات اور بعض مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی طرف مطلق التفات کرنے کی ضرورت نہیں، یہ اسرائیلی روایات اُن اہل کتاب سے منقول ہیں جنہوں نے خدا کی کتاب میں تحریف و تغیر کیا تھا، ان میں سے کوئی واقعہ نہ تو قرآن میں مذکور ہے، اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا کوئی ذکر ہے[4]"

اسی طرح ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

---

[1] کتاب الشفاء ج ۱ ص ۱۴۰ [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۰۴ [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۱ [4] مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے

وہ مفسرین اور تاریخ نگاروں نے ان کے بارے میں جو قصے نقل کیے ہیں اور ان کی

ابتلاء و آزمائش کے متعلق حضرت علیؓ و ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی جاتی ہے

سراسر بے بنیاد ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نہ اس بارہ میں کوئی چیز آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول و ثابت ہے، اور نہ یہ قیاس سے مستنبط کی جانے والی چیز ہے

قرآن مجید نے ان کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، اس کے مفہوم میں مفسرین اور

علمائے سلف کا اختلاف ہے، اب رہے یہ واقعات تو وہ یہودی روایتوں اور کتابوں

سے ماخوذ ہیں، جو ان کے افتراء کا نتیجہ ہیں، قرآن نے خود اس قصہ کی ابتداء میں

یہود کی اس افتراء پردازی کا ذکر کیا ہے، جو وہ حضرت سلیمانؑ کے بارہ میں کرتے تھے"[1]

کتاب کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں الفاظ و لغات کی تشریح و تحقیق کی گئی ہے اور اس میں لغت و عربیت کے ماہرین کے اقوال نقل کئے گئے ہیں، اور اشعار عرب سے شواہد پیش کئے گئے ہیں، طوالت سے بچنے کی خاطر یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

مصنف وحی کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"وحی کے اصل معنی اسراع (تیزی کرنا) ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کو جو خدا کی طرف سے ان کے پاس آتی تھی، اخذ کرنے میں جلدی اور تیزی کرتے تھے، اس لئے اس کو وحی (سرعت سے اخذ کی گئی چیز) کہا جاتا ہے، اور اسی کی مشابہت سے تمام الہامی چیزوں کو بھی وحی کہا جاتا ہے، لکھنے والے کے ہاتھ کی حرکت کی تیزی کی وجہ سے خط کو بھی وحی کہا جاتا ہے، آنکھ کے اشارے اور پلک کے

حاشیہ بقیہ ص ۲۵۱ ان دونوں کا متعین طور پر فرشتہ ہونا قرآن، احادیث اور اجماع سے ثابت و متحقق نہیں،

[1] ج ۲ ص ۱۵۹۰ ۔ مگر ان کا یہ خیال محل نظر ہے کتاب الشفا ج ۲ ص ۱۵۹ ۔

چھپکے میں بھی سرعت ہوتی ہے، اس لئے اس کو بھی وحی کہا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّعَشِیًّا (مریم)

یہاں اوحی کے معنی رمز وایما کے ہیں، اہل عرب اوحا، اوحا کہتے ہیں، اس کے معنی تیزی کے ہیں، بعض لوگوں نے وحی کے معنی لکھنا لیا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وحی کے اصل معنی سرواخفا کے ہیں، اسی لئے الہام کو وحی کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ — یعنی شیاطین ان کے دوں
اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِهِمْ (انعام) — میں وسوسہ ڈالتے ہیں،

دوسری جگہ ہے۔

وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰی (قصص) — اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں خیال ڈالا

نیز فرمایا۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ — اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ
اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا (شوریٰ) — اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ

مطلب یہ ہے کہ اللہ بغیر کسی واسطہ کے آدمی کے دل میں القا کرتا اور خیال ڈال دیتا ہے

(کتاب التشا ج ۲ ص ۲۹۲، ۲۹۳) الفاظ کی طرح اس میں کلام کے اسالیب پر بھی بحث کی گئی ہو

مثلاً یہ آیت ملاحظہ ہو:۔

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (ص) شیطان نے مجھ کو ایذا اور تکلیف دے رکھی ہے

اسلوب کلام سے عدم واقفیت کی بنا پر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ کی بیماری شیطان کی چھوت کا نتیجہ تھی، حضرت یوسفؑ کے قصہ ہے:

فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ ۔۔۔ لیکن شیطان نے اسکا اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا،

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قریب ایک وادی میں رات بسر کی اور صبح کو سوتے
رہے، یہاں تک کہ نماز کا وقت جاتا رہا تو آپ نے فرمایا "یہ شیطان کی وادی ہے"، حضرت موسیٰ
کے مکہ مارنے سے قبطی مر گیا تو فرمایا:-

هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (قصص) ۔۔۔ یہ کام تو شیطان (کے بہکانے) سے ہوا،

عربی زبان کا یہ عام قاعدہ اور اسلوب ہے کہ قبیح شخص کو شیطان سے اور اس کے قبیح فعل کو
شیطانی عمل سے تعبیر کرتے ہیں، فرمایا:-

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ ۔۔۔ اس درخت (زقوم) کے خوشے ایسے
الشَّيٰطِيْنِ (صافات) ۔۔۔ ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے والے کے آگے سے گزرنے والے شخص کو شیطان کہا ہے
(کتاب الشفاء ج ۲ ص ۲۳ تا ۸۰) اس کتاب میں نحوی مسائل اور بلاغت کے نکتے بھی بیان کئے گئے ہیں

علمی نکات: ذیل میں کتاب الشفاء سے چند علمی لطائف و نکات پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی شفقت اور ملاطفت کے ساتھ
خطاب کرتا ہے، چنانچہ فرمایا:-

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ) ۔۔۔ خدا تمہیں معاف کرے تم نے ان کو اجازت کیوں دی

یہ کتنا بڑا اعزاز و اکرام ہے کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ذنب
(لغزش) سے مطلع کرنے سے پہلے ہی عفو سے باخبر کر دیا اور عتاب سے پہلے ہی معافی
کا ذکر فرما دیا، بالفرض اگر آپ سے ذنب سرزد بھی ہوا تھا تو اس کے عفو کا پہلے ہی اعلان کر دیا

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ ۔۔۔ اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے تو تم

ثُمَّ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (اسراء) کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے،
بعض متکلمین کہتے ہیں کہ دوسرے انبیاءؑ کو ان کے زلات اور لغزشوں کے صدور کے بعد عتاب کیا گیا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زلات کے وقوع سے پہلے ہی عتاب کر دیا گیا، تاکہ آپؐ ان سے محفوظ رہیں، یہ لطف وعنایت کی انتہا ہے، (ج ۱ ص ۱۶۲ تا ۲۴۵)
اسی طرح کا ایک اور نکتہ ملاحظہ ہو:۔
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وامتیازات میں یہ بات بھی ہے کہ اللہ نے عام انبیاء علیہم السلام کو ان کے ناموں سے مخاطب کیا ہے، جیسے یا آدم، یا نوحؑ، یا ابراہیم، یا موسیٰ یا داؤد، یا عیسیٰ، یا زکریا، یا یحییٰ، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے نام کے بجائے اس طرح مخاطب کیا یَا اَیُّہَا النَّبِیُّ، یَا اَیُّہَا الرَّسُولُ، یَا اَیُّہَا الْمُزَّمِّلُ، یَا اَیُّہَا الْمُدَّثِّرُ اسی طرح آپؐ کے علاوہ خدا نے کسی شخص کی عمر اور زندگی کی قسم نہیں کھائی (کتاب الشفاج ۱ ص ۲۲۳، ۲۲۸)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے سلسلہ میں وہ متعدد نکات بیان کرتے ہیں
اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

مَا مِنْ نَبِیٍّ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ اِلَّا وَقَدْ	ہر نبی کو ایسے معجزے دیئے گئے
اُعْطِیَ مِنَ الْاٰیَاتِ مَا مِثْلُہٗ اٰمَنَ	جس کی وجہ سے لوگ اس پر
عَلَیْہِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا کَانَ الَّذِیْ	ایمان لائے، اور مجھے وحی کا معجزہ دیا گیا،
اُوْتِیْتُہٗ وَحْیًا اَوْحَی اللّٰہُ اِلَیَّ فَاَرْجُوْ	پس مجھے امید ہو کہ قیامت کے روز
اَنْ اَکُوْنَ اَکْثَرَہُمْ تَابِعًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ	میرے متبعین زیادہ ہوں گے،

محققین نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آپؐ کا معجزہ اس وقت تک باقی رہیگا جب تک یہ دنیا باقی رہے گی، دوسرے انبیاءؑ کے تمام معجزات وقتی اور عارضی تھے،

اور ان .... کا مشاہدہ ان ہی لوگوں نے کیا جو معجزات کے ظہور کے وقت موجود تھے، اس کے مقابلہ میں معجزۂ قرآنی کا لوگ ہر دور اور ہر زمانہ میں قیامت تک مشاہدہ کرتے رہیں گے اور ان کو اس سے واقفیت و اطلاع کے لئے دوسروں کے نقل و بیان کی ضرورت نہ ہوگی، علاوہ ازیں اور پیغمبروں کے معجزے اُن کی وفات کے بعد ختم اور معدوم ہو گئے، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ختم اور معدوم نہیں ہو سکتا، بلکہ آپؐ کے بعد بھی اس کی تازگی باقی اور برقرار رہے گی۔ یہ بھی واضح رہے کہ آپؐ کے معجزات نمایاں اور واضح تھے جب کہ آپؐ سے پیشتر انبیاءؑ کو جو معجزات دیئے گئے وہ اُن کے زمانہ کی رعایت اور اس دور کے لوگوں کی ہمتوں کے مطابق تھے چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے لوگوں کے علم کا منتہا سحر تھا، اس لیے ان کو ایسے معجزے دیئے گئے جن سے ان لوگوں کا سحر و شعبدہ باطل ہو گیا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کا زور تھا اس لئے اللہ نے ان کو ایسے معجزے دیئے جن کے مقابلہ کی اس دور کے لوگوں کو ہمت نہ ہوئی، چنانچہ وہ بلا طبی علاج و معالجہ کے اندھوں اور بہروں کو اچھا کر دیتے تھے یہی حال دوسرے نبیوں کے معجزات کا بھی تھا مگر آپؐ کے معجزات کی نوعیت تمام انبیاءؑ کے معجزات سے مختلف تھی۔

درود کے متعلق یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے۔

"محققین کا مذہب اور میرا میلان وہی ہے جو امام مالکؒ اور امام ثوریؒ کا خیال ہے اور اسی کی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی روایت کی گئی ہے، اور متعدد فقہاء و متکلمین کا مختار قول بھی یہی ہے کہ غیر انبیاء پر درود نہیں بھیجنا چاہیئے، کیونکہ یہ صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے آن کی توقیر اور اعزاز کی بنا پر مخصوص ہے، جس طرح کہ تنزیہہ و تقدیس اور تعظیم وغیرہ محض اللہ کے لئے خاص ہے، اور اس میں غیروں کو شریک نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح صلوٰۃ و تسلیم کی تخصیص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے انبیاء علیہم السلام کے لئے ضروری ہے اور اس میں

ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو شریک نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا ہے،

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (احزاب) ان (محمدؐ) پر درود اور سلام بھیجا کرو،

انبیاءؑ کے علاوہ ائمہ اور بزرگانِ دین کے لئے مغفرت اور رضوان کے الفاظ استعمال کئے جائیں گے، ارشادِ ربانی ہے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ... وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ

اے خداوندا ہمارا اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف کر دے..... اور جن لوگوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان مہاجرین وانصار کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہے

یہ غیر انبیاء کے لئے صلوٰۃ وتسلیم کا طریقہ صدر اول میں رائج نہ تھا یہ اہل تشیع کی ایجاد ہے، انھوں نے اس کو بعض ائمہ کے لئے استعمال کر کے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی قرار دے دیا حالانکہ آلِ نبی پر محض تبعاً اور آپ سے نسبت وتعلق کی بنا پر درود بھیجا جاتا ہے اور وہ بھی جب کہ آپ کے آل وازواج کا آپ ہی کے ساتھ ..... ذکر ہو مگر ان کو مخصوص طور پر درود بھیجنے کا کوئی ثبوت نہیں (ج ۲ ص ۶۱ ۵)

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے فرماتے ہیں:۔

وہ امام طبری اور امام طحاوی نے متقدمین ومتاخرین کا اس پر اجماع بتایا ہو کہ تشہد کے بعد نماز میں درود پڑھنا واجب نہیں ہے، لیکن امام شافعیؒ اس باب میں سب سے منفرد ہیں، ان کے نزدیک اگر کسی شخص نے آخری رکعت میں تشہد کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے آنحضورؐ پر درود وسلام نہیں بھیجا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی، اس لئے اس کا اعادہ لازمی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تشہد سے پہلے درود پڑھنا بھی کافی نہ ہوگا، مگر سلف میں کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہے، خود شوافع بھی اس کے قائل نہیں ہیں، (باقی)

حضرت قطب الدین بختیار کاکی

کے

مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین کا مطالعہ

از

جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی صاحب

"حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین کا مطالعہ ذیل کے مضمون میں جس طرح کیا گیا ہے، اس سے ہمارے ناظرین کی تشفی اور تسلی ہو جائے تو فاضل مضمون نگار کی سعی مشکور ہو گی، یہ یقین ہے کہ اگر فاضل مضمون نگار نے فوائد السالکین کے قدیم اور مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کو فاضلانہ انداز میں مفید حواشی اور تعلیقات کے ساتھ [illegible] کیا، تو یہ نہ صرف ایک بڑی خدمت ہو گی، بلکہ سنین اور اسمار کے غلط اندراج و کتابت سے جو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی، اور خواجگانؒ چشت کے فدائی اُن کے ملفوظات کے روحانی سرمایہ سے برابر مستفیض ہوتے رہیں گے"

"معارف"

فوائد السالکین فارسی نسخہ مطبوعہ ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۱ء مطبع مجتبائی، دہلی، (انڈیا) حجم ۳۶ صفحات، سائز ۲۶×۲۰ مسطر ۱۹ سطری، یہ کتاب قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز المتوفی ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء کے گراں قدر ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے حضرت بابا فرید مسعود گنجشکر

قدس اللہ سرہ العزیز مسعود شیخ ۶۶۴ھ نے مدون فرمایا تھا، یہ مجموعہ ملفوظات ساٹھ مجالس پر مشتمل ہے، ہر مجلس کے آغاز میں لفظ مجلس اور اس کا شمارہ جلی قلم سے لکھا ہوا ہے، جس سے مجالس کی ترتیب بخوبی واضح ہو۔ ابتدائیہ میں ہے :۔

"از زبان فقیر حقیر بندہ درویشان بلکہ خاک قدم ایشان فرید مسعود اجودھنی"[1]

(فوائد السالکین ص ۲)

فوائد السالکین کے ناشر مولوی عبدالاحد مرحوم نے خاتمہ پر لکھا ہے :۔

اصل ایں نسخہ صحیح نا بود ہر چند کہ نسخہ دیگر پیدا شد تاہم فیما بین متغائر تے یافتہ شد، لیکن بقدر وسع در رفع اغلاط کوشیدہ آمد،

(فوائد السالکین ص ۳۶)

اس نسخہ کی اصل یعنی وہ نسخہ جس سے مطبوعہ نسخہ منقول ہے، صحیح نہ تھی، اور اگرچہ دوسرا نسخہ بھی دستیاب ہوا تھا لیکن دونوں میں فرق بہت تھا، لہذا بقدر امکان رفع اغلاط کی کوشش کی ہے،

مولوی عبدالاحد مرحوم نے جو بھی تصحیح فرمائی، وہ بسا غنیمت اور لائق شکریہ ہے تاہم مطبوعہ

---

[1] اجودھنی میں کلام ہے کیونکہ اجودھن (پاکپتن) میں حضرت بابا صاحبؒ کا قیام عمر کے آخری ربع میں تھا، اس سے پہلے نہ تھا، ایسا لگتا ہے کہ فرید اجودھنی چونکہ زبان زد خلائق ہے، اور سلاسل کے شجرات میں شامل ہے، جو اکثر پڑھے جاتے ہیں، لہذا کسی کاتب و ناقل نے یا کسی مطالعہ کرنے والے نے بطور تعارف اپنے صوابدید سے اجودھنی کا اضافہ کر دیا ہے، جو نقل ہوتا چلا آیا ہے، ایسے تصرفات قلمی نسخوں میں ملتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ کسی کتاب کے استناد کا دارومدار ظنیات نہیں حقائق پر ہوتا ہے،

نسخہ بھی اغلاط سے پاک نہیں ہے، لیکن اگر وہ طبع نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ہم اس کے مطالعہ کی سعادت سے محروم رہتے، کیا اچھا ہوتا جو موصوف یہ بھی لکھ دیتے کہ نسخہ دیگر میں متبادل کیا کیا کچھ تھا، اور جو نسخے انھیں دستیاب ہوئے تھے، وہ کس کس عہد کے مکتوبہ تھے، کیونکہ ایسے نسخوں کا رواج بھی رہا ہے، جو ان بزرگ کے عقیدتمند اچھے اچھے خوشنویسوں سے نقل کراتے، اور تبرکاً اپنے پاس رکھتے تھے، جو عموماً صحت سے عاری ہوتے تھے،

مطلوب الطالبین نام سے فوائد السالکین کا اردو ترجمہ بھی مولوی عبدالاحد مرحوم نے ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کیا تھا، اس کے مترجم محمد بیگ نامی کوئی ذی ہوش عالم تھے، انھیں اس مجموعۂ ملفوظات کے ناقص ہونے کا احساس تھا، انھوں نے دیباچہ میں لکھا ہے، :-

"اس میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات ہیں، جن کو حضرت بابا صاحبؒ نے خود جمع کرکے مرتب کیا ہے، غالباً یہ کتاب بڑی ہوگی، جو مرور زمانہ سے پوری نہیں ملتی، (مطلوب الطالبین ص ۲)

مترجم کا یہ احساس بلاشبہ بجا و درست ہے، قلمی نسخوں کو اسی طرح دیکھنا اور پرکھنا چاہئے، فوائد السالکین بظاہر موجودہ صورت میں کامل نہیں ہے، شاہ محمد بولاق مرحوم نے روضۃ الاقطاب تالیف ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء (مطبوعہ ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء مطبع محب ہند دہلی) میں فوائد السالکین سے ایک روایت نقل کی ہے، جو فوائد السالکین کے مطبوعہ فارسی نسخہ میں نہیں ہے، اور وہ یہ ہے،

"وقتے در خدمت خواجہ قطب الدین قوالاں در رسیدند و این بیت را بصوت زیبا و آہنگ دلربا آغاز گردانیدند، بیت

سرود چیست کہ چندین فسون عشق در وست
سرود محرم عشق ست و عشق محرم اوست

خواجہ ایں بیت درگرفت و ہفت شبانہ روز بیہوش ماند جبل بہ طعام و شراب نداشت

اما وقت نماز از دست نمی داد و بیہوش باز می ماند و نماز ہا بدستور قدیم می گزاشت"[1]

(روضۃ الاقطاب ص ۶۳-۶۴)

گمان غالب یہ ہے کہ مطبوعہ نسخہ کسی ایسے نسخے سے منقول ہے کہ جو دستیاب شدہ کچھ اوراق پریشاں کا مجموعہ تھا، فوائد السالکین کے کچھ قدیم نسخے ہند و پاک کے معتبر کتب خانوں (لائبریریوں) میں محفوظ ہیں، میرے علم میں اس کا ایک قدیم نسخہ جو ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء کا مکتوبہ ہے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے، تلاش و تجسس سے بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی قدیم تر کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے، بہر حال مطبوعہ نسخہ بحالت موجودہ جیسا کچھ ہے سالکان راہ طریقت کیلئے خضر راہ اور عقیدتمندوں کے لئے سرمۂ چشم ہے،

فوائد السالکین کی قدامت: فوائد السالکین کی قدامت اور اس کے استناد کا اہم ترین و معتبر ثبوت یہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ مولانا برہان الدین غریب متوفی ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء نے اپنے لائق ترین مرید مولانا رکن الدین عماد دبیر کاشانیؒ سے تصوف میں کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الانقیاء[2] ترتیب کرائی تھی اس کی فہرست ماخذات میں فوائد السالکین بھی ہے، جو اس کی قدامت کی بین دلیل ہے، اور اس سے فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے،

---

[1] بصورت زیبا و آہنگ دلربا اور بدستور قدیم تینوں مرکب حضرت باباصاحبؒ کے اسلوب سے ممیز ہیں، بدستور قدیم بے محل و بے مصرف ہے، اگر حسب معمول ہوتا تو مضائقہ نہ تھا ورنہ ضرورت تو اس کی بھی نہیں،

[2] شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء مکتوبہ سنہ ۱۱۳۰ھ کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے، ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں ہے جو ۱۱۲۴ھ کا مکتوبہ ہے، ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، جو ۱۲۳۲ھ کا مکتوبہ ہے، ایک نسخہ مولوی

اس کے علاوہ فوائد السالکین کی قدامت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی بعض روایتیں ان کتابوں میں بھی منقول ہیں، جو ادب صوفیہ میں بے مثل اور نہایت درجہ مستند مانی جاتی ہیں[۵] گویا کہ فوائد السالکین مستند و معتبر کتب تصوف کا ماخذ بھی ہے،

یہ بھی ہے کہ معاصر کتابوں میں کسی کتاب کا یا کسی واقعہ کا ذکر نہ ہونا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں، ہر اہل قلم کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے، جو کچھ لکھتا ہے، اپنے ہی صوابدید سے لکھتا ہے، ایسا بھی ممکن ہے، کہ بعض معلومات کسی کی دسترس سے باہر ہوں اور بر وقت دستیاب نہ ہو سکیں، ایسی ہی وجوہ کی بنا پر زندہ اہل قلم کی کتابوں کے ابتدائی مطبوعہ نسخے بعد کے مطبوعہ نسخوں سے مختلف ہوتے ہیں، لہذا اگرچہ درر نظامی کا ذکر سیر الاولیاء میں نہیں ہے لیکن اس کا وجود مسلم ہے، اسی طرح اگر فوائد السالکین کا ذکر صراحۃً فوائد الفواد و خیر المجالس اور سیر الاولیاء میں نہیں ہے، تو نہ سہی، یہ اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں، اس کا وجود دیگر معتبر شواہد سے مسلم ہے، اور اس کے مندرجات بذات خود اس کے وجود کی اور اس کی قدامت کی بین دلیل ہیں، واقعات کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے، مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب رقمطراز ہیں، :-

"حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فیوض و برکات سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہو گیا، وہ وارث النبی فی الہند ہو کر یہاں جلوہ افروز رہے، مگر ملفوظات نا مکمل

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۷) نسیم احمد صاحب فریدی مفتی امروہہ نے مجھے مستعار بھیجا تھا، جس سے میں نے استفادہ کیا ہے جو ۱۲۳۰ھ کا مکتوبہ ہے، ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے جس میں سنہ کتابت نہیں ہے، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۶۹ء ص ۳۵۶ کے حاشیہ میں ہے کہ یہ کتاب ۱۳۴۷ھ میں اشرف پریس حیدرآباد سے شمائل الاتقیاء کے نام سے شائع ہو چکی ہے،

[۵] فوائد الفواد ص ۷-۲۳-۲۳ سیر الاولیاء ص ۴۲-۴۴-۴۷-۵۷-۵۳-۳۳۴،

"تاج المآثر اور فرشتہ کی تاریخ مبارک شاہی جیسی معاصر تاریخوں میں ان کے کارناموں کا مطلق ذکر نہیں، ان کا اسم گرامی بھی ان تاریخوں کے صفحات میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا، اب کوئی عیب جو اہل قلم یہ دعوی کرے کہ ان کے کارناموں کو بعد کے تذکرہ نگاروں نے محض گھڑ لیا ہے، تو یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی روحانی تاریخ پر شدید ضرب ہو کاری لگانی ہوگی"

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۶۹ء ص ۲۰۱)

سلطان ناصر الدین محمود متوفی ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء کا اور اس کے لشکر کا حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر اسرار الاولیاء (ص ۲۰) اور فوائد الفواد (ص ۱۴۵) میں موجود ہے، لیکن طبقات ناصری میں نہیں ہے، جو اس عہد کی معتبر تاریخ ہے، اور سلطان ناصر الدین محمود سے منسوب و معنون ہے، تو کیا ان بزرگوں پر بد گمانی کی جاسکتی ہے جن کے ملفوظات کا مجموعہ مذکور ہیں، جن کے صادق القول ہونے میں شبہ کو بھی دخل نہیں ہو، اس لئے اگر فوائد السالکین کا ذکر و حوالہ فوائد الفواد، دررِ نظامی، خیر المجالس اور سیر الاولیاء میں نہیں ہے، تو کیا مضائقہ ہے؟ وہ بذات خود معتبر و مستند ہے، کیونکہ اس کے وجود و قدامت کے دیگر مستند و معتبر شواہد دستیاب ہوتے ہیں، لہذا یہ ماننا ہوگا کہ فوائد السالکین بلاشبہ قدیم مجموعہ ملفوظات ہے اور مستند و معتبر ہے۔

تاریخی اندراجات | قدیم ترین کتب ملفوظات انیس الارواح اور دلیل العارفین کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہے کہ کتب ملفوظات میں تاریخی اندراجات کا رواج عہد قدیم میں نہ تھا، فوائد السالکین میں جو تاریخی اندراجات ہیں وہ بھی مشکوک و مشتبہ اور نا تمام ہیں، گمان غالب یہ ہے کہ کسی نے سیر الاولیاء (ص ۹۱) کی الحاقی عبارت سے متاثر ہو کر تاریخی اندراجات کی سعی

---

[1] الحاق کنندہ کو اتنا بھی علم نہیں کہ ۵۸۸ھ میں نہ تو دہلی فتح ہوئی تھی، اور نہ دہلی میں حضرت

کی ہے لیکن کر نہیں سکا ہے، اور ناتمام ہی چھوڑ دینا پڑا ہے کیونکہ بعیت وارادت کا جو سنہ اس میں مرقوم ہے، وہی فوائد السالکین میں ہے، اور وہ بالکل غلط ہے جس کا ذکر آئندہ آئے گا، لہذا یہ خیال قرینِ قیاس ہے کہ قدیم کتبِ ملفوظات کے مثل فوائد السالکین میں بھی تاریخی اندراجات نہ تھے،

فوائد السالکین کے فارسی نسخے (مطبوعہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۴ء مطبع مجتبائی دہلی) میں جو تاریخی اندراجات مطالعہ میں آئے ہیں، وہ سعی ناکام کی نشان دہی کرتے ہیں، اور وہ یہ ہیں ا۔

(۱) مجلس اول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ دن نہ تاریخ نہ مہینہ نہ سنہ

(۲) مجلس دوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " " " " "

(۳) مجلس سوم دوشنبہ ماہ شوال ۶۱۳ھ اگر تاریخ بھی ہوتی، تو تقویم تصدیق یا تردید کر سکتی

(۴) مجلس چہارم دوشنبہ ماہ ذیقعدہ ۶۱۳ھ تاریخ بھی ہوتی تو تقویم تصدیق یا تردید کر سکتی

(۵) مجلس پنجم ماہ ذی الحجہ ۶۱۳ھ دن اور تاریخ دونوں ندارد

(۶) مجلس ششم روز جمعہ، شوال " تاریخ ندارد، ذی الحجہ کے بعد شوال تو سنہ مذکور چہ معنی دارد،

(۷) مجلس ہفتم روز چہارشنبہ " تاریخ نہ مہینہ، سنہ مذکور عجب شے ہے،

کیا بلا تحقیق ان ادھورے اور بے تکے اندراجات کو معتبر مانا جاسکتا ہے، اور ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے،؟

مطلوب الطالبین (مطبوعہ ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء مطبع مجتبائی دہلی) فوائد السالکین کا اردو ترجمہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۹) قطب صاحب قیام فرما تھے، دہلی ۵۸۹ھ میں فتح ہوئی، اور ۵۹۰ھ میں دہلی کو پایہ تخت بنایا گیا،

اس میں خلا کو پُر کرنے کی کچھ کوشش کی ہے، مگر اتنی ہی کہ پہلی اور چھٹی مجلس کے تاریخی اندراج میں قدرے تصرف کیا ہے، باقی فارسی نسخے کے مطابق ہے ۶۶۶ھ ہی ہے، جو غلط ہے،

ہشت بہشت خواجگان چشت کے آٹھ مجموعۂ ملفوظات کا اُردو ترجمہ ہے جس میں فوائد السالکین کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس میں پہلی، دوسری اور پانچویں مجلس کے تاریخی اندراج میں قدرے تصرف کیا ہے، باقی فارسی نسخے کے مطابق ہیں، سنہ وہی ۶۶۶ھ ہے جو خلاف واقعہ ہے،

مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے سنہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں مجموعہ ملفوظات خواجگان چشت کے نام سے پانچ کتب ملفوظات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا، جس میں فوائد السالکین کا ترجمہ بھی ہے، مگر صرف چھ مجالس کا ترجمہ ہے، بلکہ چھٹی مجلس بھی ناتمام ہے، ساتویں مجلس کا ترجمہ شامل ہی نہیں ہے، تاریخی اندراجات اس میں بھی ناتمام ہیں، البتہ مجلس دوم و چہارم اور پنجم میں مکمل ہیں، مگر غلط ہیں، تقویم سے اُن کی تصدیق نہیں ہوتی، سنہ مجوزہ رو زگار ہے، اور وہ ہے ۶۴۲ھ، اگرچہ مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے اردو سیر الاولیاء کے نام سے سنہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں خود سیر الاولیاء کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا، جس کے ص ۶۲ - ۶۳ میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے سنہ وفات ۶۳۳ھ کا ذکر موجود ہے، حیرت ہے کہ پھر انھوں نے ۶۴۲ھ کیوں لکھا ہے، ان کارستانیوں سے یہ حقیقت آشکارا ہے، کہ ان صاحبوں کے پیش نظر فوائد السالکین کا کوئی قدیم و مستند ایسا نسخہ نہیں ہے، جو صحیح تاریخی اندراجات کا حامل ہوتا، اور یہ اندراجات ہرگز کسی صحیح نسخے سے منقول نہیں ہیں، بلکہ مابعد کی جدت کا ثمرہ ہیں، جو سراسر غلط ہے، اور اس یقین کے لئے کامل گنجائش ہے، کہ فوائد السالکین تاریخی اندراجات سے قطعاً مبرا ہے، اور یہ اندراجات ہرگز اس لائق نہیں کہ ان پر اعتبار کیا جائے، یا تنقید کے لئے انھیں محور بنایا جائے، بلاشبہ انھیں مسترد قرار دیا جائے گا،

سیر الاولیا کی الحاقی عبارت | سیر الاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن) میں اگرچہ متعدد الحاقی عبارتیں ہیں،

مگر ہمارے موضوع سے متعلق صرف وہ عبارت ہے جو ص ۱۹۰ پر ہے جس کا آغاز پوشیدہ نماند سے ہوتا ہے، اور وہ مجموعہ ہے حضرت بابا صاحبؒ کے سنین ولادت، ارادت اور وفات وغیرہ کا جن کے سارے ہی سنہ خلاف واقعہ ہیں، ان ہی میں سنہ ارادت ۵۸۴ھ ہے، اور یہی فساد کی جڑ ہے، ان سب ہی کا تجزیہ کرنا ہوگا تاکہ مفروضہ سنہ ارادت ۵۸۴ھ کا غلط ہونا واضح ہو جائے، طوالت کے خوف سے اصل عبارت نقل نہیں کرتے، اس کا لب لباب نقل کئے دیتا ہوں

۱۔ حضرت بابا صاحب کا سنہ ولادت ۵۶۹ھ ۴۔ وفات کے وقت حضرت بابا صاحبؒ کی عمر ۹۵ سال

۲۔ حضرت بابا صاحب کا سنہ ارادت ۵۸۴ھ ۵۔ حضرت بابا صاحب کا سنہ وفات ۶۶۴ھ

۳۔ عمر بوقت بیعت و ارادت ۱۵ سال ۶۔ بیعت و ارادت کے بعد مدت حیات ۸۰ سال

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان معلومات کا ماخذ کیا ہے، جو سراسر غلط ہے، اور جس کی تصدیق فوائد الفواد و سیر الاولیا، بلکہ دیگر مستند کتب تاریخ و تذکرہ سے بھی نہیں ہوتی، اس میں سنہ بیعت و ارادت ۵۸۴ھ ہے، ہمارے نزدیک اس سے فوائد السالکین میں تاریخی اندراج کی کوشش

سلہ سیر الاولیا ص ۱۹۰ کی الحاقی عبارت،

"پوشیدہ نماند کہ تولد حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدین مسعود گنج شکر در سنہ ۵۶۹ پانصد و شصت و نُہ بود، و وفات حضرت ایشاں در شش صد و شصت و چہار بود، عمر حضرت ایشاں نود و پنج ۹۵ باشد واللہ اعلم وارادت آوردن حضرت گنج شکر بحضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز در پانصد و ہشتاد و چہار ۵۸۴ بود و بعد از ارادت آوردن ہشتاد سال در عقد حیات بود طیب اللہ مرقدہ وجعل حظیرۃ القدس مثواہ۔ حضرت سلطان المشائخ پرسیدند کہ عمر شریف حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز چند سال بود فرمودند کہ نود و پنجاہ ۹۵ سال

کی گئی ہے، جو ناتمام رہی، اور جس میں کامیابی نہ ہو سکی،

الحاقی عبارت کے خلاف شواہد | ناظرین کو حیرت ہو گی کہ نہ صرف ۶۶۴ھ کی، بلکہ جملہ مفروضہ الحاقی سنین کی تردید حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیانات سے ہو جاتی ہے، اگرچہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے لیکن میں نہایت اختصار سے ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں،

(۱) امیر خورد کرمانی ناقل ہیں، اور لکھتے ہیں:۔

"حضرت محبوب الٰہیؒ نے خود اپنے مبارک قلم سے لکھا ہے، کہ ۲۵ رجمادی الاول ۶۶۹ھ جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ حضرت باباصاحبؒ نے مجھے بلایا، اور اپنا لعاب دہن مبارک میرے منھ میں ڈالا، (سیر الاولیا۔ ۱۲۳)

یہ بیان تاریخی اعتبار سے مکمل ہے، دن بھی ہے، تاریخ بھی ہے، مہینہ بھی ہے، اور سنہ بھی ہے، حتی کہ وقت بھی ہے، تقویم آج بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، یہ بیان بتاتا ہے، کہ حضرت باباصاحب ۶۶۹ھ میں بقید حیات تھے، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا ایک بیان اور بھی نقل کیا ہے، جو عطائے سند خلافت سے متعلق ہے، لکھا ہے:۔

"حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ ۱۳ر رمضان المبارک ۶۶۹ھ کو حضرت باباصاحبؒ نے مجھے بلایا، اور دریافت فرمایا، کہ نظام! تمھیں یاد ہے جو میں نے کہا تھا، میں نے عرض کیا جی ہاں یاد ہے، فرمایا کاغذ لاؤ تاکہ اجازت نامہ (خلافت نامہ) لکھا جائے، کاغذ لادیا، اور خلافت نامہ لکھا گیا"

(سیر الاولیاء ص ۱۱۶)

اس بیان سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت باباصاحبؒ رمضان المبارک ۶۶۹ھ میں بقید حیات تھے، خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ (س۔ ن۔ ج۔ م۔ ی) نے یہ بھی لکھا

"حضرت محبوبِ الٰہی سے دریافت کیا کہ آپ کیا حضرت بابا صاحبؒ کے وصال کے وقت حضرت بابا صاحب کی خدمت میں موجود تھے، تو آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا نہیں، مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا تھا، اور حضرت بابا صاحبؒ کا وصال پانچویں محرم کی رات کو ہوا ہے" (فوائد الفواد ص ۲۵)

اس بیان سے واضح ہے کہ شوال کی کسی تاریخ سے پانچویں محرم تک کا فصل ہے یعنی تین ماہ کے اندر ہی اندر حضرت بابا صاحبؒ کا واقعۂ ارتحال پیش آیا تھا، معتبر اہلِ قلم اس پر متفق ہیں کہ حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ وفات ۶۶۴ھ ہے، حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے ارشاد سے بھی سنہ وفات ۶۶۴ھ ہی کی تصدیق ہوتی ہے، مذکورہ الحاقی عبارت میں حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ وفات ۶۶۶ھ لکھا ہے، جو حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے بیانات کے منافی اور غلط ہے، بے سند اور خلافِ واقعہ بھی ہے، جو ہرگز قابلِ قبول نہیں،

(۲) خواجہ امیر حسن علائے سجزیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کی مدت عمر کے متعلق حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا مبارک بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے، :-

"حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے حضرت بابا صاحبؒ کی عمر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا نود و سہ سال بود یعنی ۹۳ سال کی تھی،" (فوائد الفواد ص ۵۳)

الحاق کنندہ نے ۹۵ سال لکھی ہے، جو حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے بیان کے خلاف اور غلط ہے،

(۳) جب تحقیقی نقطۂ نظر سے اور حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ وفات ۶۶۴ھ ہے، اور مدتِ عمر ۹۳ سال ہے، سنہ ولادت لازماً ۵۷۱ھ ہے، الحاق کنندہ نے سنہ ولادت ۵۶۹ھ لکھا ہے جو حضرت محبوبِ الٰہی کے ارشاد کے منافی اور غلط ہے،

(۴) حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق بیعت و ارادت کے وقت حضرت باباصاحب کی عمر ۱۸ سال کی تھی، مولانا حامد جمالی متوفی ۹۴۲ھ لکھتے ہیں :۔

"سلطان المشائخ حضرت نظام الملۃ والدین سے منقول ہے کہ جب حضرت قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حضرت باباصاحبؒ شرف بیعت و ارادت سے مشرف ہوئے، تو آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی" (سیر العارفین فارسی ص ۳۶)

شہزادی جہان آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ نے بھی اس قول کو اپنایا ہے، (مونس الارواح ص ۱۰ فارسی) اس اعتبار سے بیعت و ارادت کا سنہ ۵۹۵ھ متعین ہوتا ہے، الحاقی عبارت میں ۵۸۴ھ ہے، اور الحاق کنندہ نے جو سنہ ولادت ۵۶۹ھ لکھا ہے، اس کے اعتبار سے ۵۸۴ھ میں حضرت باباصاحبؒ کی عمر پندرہ سال کی ہوتی ہے، اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ۵۸۴ھ میں آپ کی عمر ساٹھ سال کی ہوتی ہے، اور اس عمر میں بیعت و ارادت کی کسی اعتبار سے بھی تصدیق نہیں ہوتی۔

(۵) بیعت و ارادت کے عہد سے وفات تک کا وقفہ تحقیقی نقطۂ نظر سے ۷۵ سال ہے اگر الحاق کنندہ نے ۸۰ سال بتایا ہے، اگرچہ اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن بتانا مقصود یہ ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کی ولادت سے وفات تک کے تمام سنین مصدقہ طور پر محفوظ ہیں، اگر جذبۂ تلاش اخلاص پر مبنی ہے تو سب کچھ صحیح صحیح دستیاب ہو جاتا ہے، سہولت کار کے لئے مذکورہ سنین کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے :۔

حضرت باباصاحبؒ کی ولادت تا وفات کے صحیح اور اہم سنین کا نقشہ

(۱) حضرت باباصاحبؒ کا سنہ ولادت ۵۲۴ھ

(۲) حضرت باباصاحبؒ کا سنہ بیعت و ارادت ۵۹۵ھ

---

[1] ملفوظ [illegible]

(۳) حضرت بابا صاحبؒ کی عمر بوقت بیعت وارادت ۱۸ سال

(۴) وفات کے وقت حضرت بابا صاحبؒ کی عمر ۹۳ سال

(۵) حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ

(۶) بیعت وارادت سے وفات تک کی عمر ۷۵ سال

ان سنین کے مصدقہ ہونے کی اہم دلیل یہ ہے کہ یہ سنین حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے مبارک ارشادات پر مبنی ہیں، جو اس باب میں سب سے زیادہ واقف حال بزرگ تھے، کیا کوئی آپ کے ارشادات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے، ؎

سر بریدہ قلم درین شب تار
بے معنی خفتہ کرد بیدار

وہ اہلِ قلم جو یہ لکھتے ہیں، کہ فوائد السالکین وغیرہ کتب ملفوظات کی بعض روایات کو تاریخ بھی رد کرتی ہے، تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے تاریخی اندراجات کی اسی طرح تحقیق فرمائی ہے، بلاتحقیق کچھ لکھنا کہاں کی دانائی ہے،

الغرض اس تحقیق وتفصیل سے یہ واضح ہے کہ فوائد السالکین میں مندرجہ سنین بیعت وارادت اور تمام اندراجات سب ہی غلط ہیں، اور نہ صرف یہی بلکہ اکثر اہل قلم جنھوں نے بلاتحقیق اس الحاقی عبارت کو جو گوناگوں انشائی معائب سے بھرپور ہے، امیر خوردکرمانیؒ کی نوشتہ تصور کرکے اعتماد کیا ہے، انھوں نے بھی غلط سنین کو اپنایا ہے، جو قابلِ قبول نہیں ہیں، اس لئے کہ امام ابن ہمام کا ارشاد ہے:۔ وکثیراً مایقلد الساھون الساھین؛

ؔ انوار الفرید ص ۳۰، مطبوعہ پاکستان؛

نقاد ہو یا محقق یا سیرت نگار اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اخلاص اور موضوع سے ہمدردی کے ساتھ لفظاً لفظاً کا جائزہ لے اور جانچے پرکھے، اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد قلم اٹھائے، یہ نہیں کہ کسی نے کہہ دیا کہ کوا کان لے گیا، کوے کے پیچھے دوڑنے کا کوئی تک نہیں،

فوائد السالکین زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ تاریخی اندراجات سے بری ہے۔ ع میری سنو! جو گوش حقیقت نیوش ہے، اس کے مطبوعہ فارسی نسخہ میں جس قدر تاریخی اندراجات ہیں، وہ بعد کے اضافے ہیں، اس قسم کے اختراعی اندراجات سے کسی کتاب کو جعلی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، یہ ستم تاریخ کی معتبر کتابوں میں بھی ہے، اگر اس بنا پر جعلی قرار دیا جائے گا تو بہت بڑے علمی ذخیرہ کو دریا برد کرنا ہوگا۔

بہرحال پھر بھی اگر کوئی غلط سنین پر اعتماد کر کے انھیں تنقید کے لئے محور بناتا ہے تو اتنا بھی کہ وہ فن تنقید سے نابلد اور بے بہرہ ہے، اس کے قول و فعل پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا،

فوائد السالکین کا عہدِ تدوین: ان صاحبوں کے مطالعہ میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی سیرت و سوانح ہے، انھیں علم ہے کہ حضرت قطب صاحبؒ اکثر اوقات تلاوتِ قرآن پاک میں محو و مستغرق رہا کرتے تھے، اور بہت کم کلام فرماتے تھے، البتہ طالبوں کو جو ہدایتیں فرمانی ہوتیں وہ برمحل فرماتے، فوائد السالکین کا مطالعہ شاہد ہے کہ وہ حضرت بابا صاحبؒ کے بیعت ہونے کے وقت سے حضرت قطب صاحبؒ کے آخری ایامِ حیات تک کے بیانات و واقعات کی جامع ہے، حضرت بابا صاحبؒ کا سنِ بیعت ارادت ۵۹۵ھ ہے، لہٰذا فوائد السالکین کا عہدِ تدوین ۵۹۵ھ تا ۶۳۳ھ کا درمیانی وقفہ ہے، اس میں ۶۳۳ھ جو الحاق ہے، وہ بالکل غلط ہے، دہلی ۶۳۳ھ میں فتح ہوئی ہے

فتح دہلی سے پہلے حضرت قطب صاحب کا دہلی میں قیام ثابت نہیں تھا

فوائد السالکین بلاشبہہ سادہ و ریانی وقفہ کی اُن مجالس کے بیانات و واقعات کا مجموعہ جو گاہ بگاہ منعقد ہوئی تھیں، اور ان میں سے جن بیانات و واقعات کو حضرت بابا صاحب نے مناسب سمجھا انھیں قلم بند فرمایا تھا، جو آج بھی مشعلِ رشد و ہدایت ہیں۔ ان سب کا ہر اعتبار سے الحاقی کہ

مافوق الفطرت عناصر

فوائد السالکین میں بعض روایتیں بلاشبہہ مافوق الفطرت ہیں لیکن فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیاء کی نسبت قدرے قلیل ہیں اتنی ہی کہ انگلیوں پر گنی جا سکیں، اور ایسی بھی نہیں جیسی خیر المجالس (ص ۵۲) میں مجذوب کی حکایت ہے، جو آپ اپنی مثال ہے، مافوق الفطرت روایات کا تعلق عصری حالات سے بھی ہے، اور روحانی کمالات سے بھی۔

عہد وسطیٰ کا ادب مشرقی ہو یا مغربی اس وصف سے خالی نہیں، اگر فوائد السالکین میں ایسی روایات نہ ہوتیں تو وہ عصری اثرات سے معرّیٰ مانی جاتی جو اس کی خوبی نہیں بلکہ کا نقص متصوّر ہوتا، اور اسے اس عہد کی تالیف قرار دینے میں تکلف ہوتا، اور روحانیت سے اس کا رشتہ منقطع رہتا۔

معجزہ ہو یا کرامت ان کا تعلق مافوق الفطرت ہی سے ہے، یہ تبلیغِ دین میں ممد و معاون تو ہیں، لیکن عین ارکانِ تبلیغ نہیں ہیں، ان کا اپنا اپنا دائرۂ عمل ہے، اس سے الگ کوئی توقع امید موہوم ہے، یہ کہنا یا سمجھنا کہ ایسے شعبدے اور کرامتیں دکھا کر مسلمان بنایا گیا ہوتا تو آج شاید ہی کسی دوسرے مذہب کا وجود ہوتا، یہ خیال معجزہ اور کرامت کے موقف سے کم آگاہی اور ذہنی بے راہ روی کی کھلی علامت ہے، معجزہ کا ذکر قرآنِ پاک میں ہے جو کرامت سے افضل ہے، اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا، کیا یہ کہنے والا اپنے وہمی

دعنت کو معجزات ثابت کر سکتا ہے، اگر وہ معجزات کا بھی منکر ہے تو وہ نہ لائق تخاطب ہے،
اور نہ اس کا قول لائق اعتنا ہے، ہذیان سے زیادہ اس کے قول کی وقعت نہیں،

کرامت عطیۂ خداوندی اور اعمالِ صالحہ کا ثمرہ ہے، سلوک کے لئے منازل و مراتب
متعین ہیں، بقول حضرت محبوب الٰہیؒ ان کی تعداد یک صد ہے، سترہویں منزل سے کرامات
کا ظہور ہونے لگتا ہے، سالکین کو یہ ہدایت ہے کہ جب تک سو کی سو منزلیں طے نہ کرلیں
اظہارِ کرامات کی طرف متوجہ نہ ہوں، (فوائد الفواد ص ۱۱۰) البتہ جب سو سے آگے نکل
جائیں تو وہ مختار ہیں (فوائد السالکین ص ۲۰) اکابر صوفیہ نے کرامت سے خاطر خواہ کام لیا ہے؟
بالارادہ لیا ہے، یہ کہنا کہ کرامت کو اہلِ صوفیہ نے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی،
مذاقِ تصوف سے کم آگاہی کی علامت ہے، اکابرِ صوفیہ نے کبھی عطیۂ خداوندی کو تحقیر کی
نظر سے نہیں دیکھا ہے یہ ان پر تہمت ہے، کرامات کا ظہور اکابر صحابہؓ سے بھی ہوا ہے اور
بقول خواجہ گیسو دراز بندہ نواز "جس قدر کرامتیں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے
منقول ہیں اتنی کسی اور صحابیؓ سے منقول نہیں ہیں، (جوامع الکلم ملفوظ ۹، رمضان ۸۰۳ھ)

رود نیل کے واقعہ کو شہرت عام حاصل ہے، دریائے نیل (مصر) میں ہر سال طغیانی آتی اور
جب تک انسانی جان بھینٹ نہ کی جاتی طوفانی کیفیت برقرار رہتی، جب مصر پر مسلمانوں کا
تسلط ہوا تو حاکم مصر نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے استصواب کیا، آپ نے
دریائے نیل کے نام خط لکھا، اور بھیج دیا اور فرمایا اسے دریائے نیل میں ڈال دیا جائے،
وہ ڈال دیا گیا، پھر نہ طغیانی آئی اور نہ اس نے بھینٹ لی۔

شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے ایام حیات
میں دریائے دجلہ (بغداد) میں سخت طغیانی آئی، بہتیرے بے در بے گھر ہو گئے، جب یہ واقعہ

شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے علم میں آیا تو آپؒ نے اپنے خادم سے کہا کہ یہ کوزا لے جاؤ دریا کو مارو اور اس سے کہو، جا اپنی جگہ چلا جا، اس نے حکم کی تعمیل کی، دریا وہ کوزا کھاتے ہی اور حکم کے سنتے ہی سمٹ گیا، اور بدستور اپنی جگہ بہنے لگا، جب یہ واقعہ امام ابواللیث سمرقندی کے علم میں آیا تو انھوں نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو خط لکھا کہ دیں، اللہ نے تو اخفائے کرامت کو لازم گردانا ہے، آپؒ نے یہ کیا کیا؟ حضرت شیخ شہاب الدینؒ سہروردیؒ نے خط کو پڑھا، اور پھینک دیا، اور فرمایا یہ امی، جاہل کیا جانے۔

(جوامع الکلم ملفوظ ۲، رمضان المبارک ۸۰۳ھ)۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ امام ابواللیث سمرقندیؒ بلند پایہ فقیہ اور عالم تھی مگر راہ سلوک کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں تھے، تصوف کا جتنا کچھ تعلق علم سے ہے اس سے کہیں زیادہ عمل سے ہے، حقائق تصوف سے آگاہی ہوتی ہے عمل پیرا ہونے سے، محض تصوف کی کتابیں پڑھ لینے سے کوئی صوفی نہیں بنتا تا وقتیکہ عمل پیرا نہ ہو، حقائق اس پر منکشف نہیں ہوتے، بلکہ الٹا گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بلا شبہ راہ سلوک کی تکمیل سے پہلے اظہار کرامت سے محترز رہنے کی ہدایت ہے، مگر تکمیل کے بعد با اختیار رہتا ہے، اور وہ کرامت سے برمحل کام لے سکتا ہے، اسرار الٰہی کے اظہار کی ممانعت ہر حال میں ہے، مگر جو اذہان اسرار و کرامت میں امتیاز نہیں کر سکتے، وہ کرامت کو بھی اسرار کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں، اور یہ غلط ہے، اس باب میں اتنا ہی کافی ہے، العاقل تکفیہ الاشارۃ،

اہم ترین روایتیں | ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں ان بیانات کے جو صوفی بزرگ اخلاق فاضلہ

اور اعمالِ صالحہ اور منازلِ سلوک کی رہنمائی کے لئے طالبوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں، ان میں سامعین کی استعدادِ عمل کا اور ان کے امراضِ قلبیہ کے دفیعہ کا اور روحانی ترقی کا پورا سروسامان ہوتا ہے،

کامل صوفی بہت بڑا ماہرِ نفسیات ہوتا ہے، اس کی نظر قلوب کی تہہ پر اور طالبوں کی افتادِ طبع پر ہوتی ہے، وہ ان رازہائے سربستہ سے آگاہ ہوتا ہے جو دلوں کی تہہ میں چھپے ہوتے ہیں، جن کو وہ بھی ان سے آگاہ نہیں ہوتا جس کے دل میں وہ تہہ نشیں ہوتے ہیں، مگر کامل صوفی نفس کی ان چوریوں کو پکڑ لیتا ہے، اور اس خوبی سے ان کا تدارک کرتا ہے کہ طالب کو خبر تک نہیں ہوتی، بقول حضرت بابا صاحبؒ پیر مشاطۂ مرید باشد،

کتبِ ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ بظاہر کتبِ ملفوظات میں نمایاں امتیاز نہیں، لیکن نظرِ تعمق بتاتی ہے کہ عام مجموعۂ ملفوظات میں اور ان مجموعۂ ملفوظات میں قدرے فرق ہے، جن کے سامعین میں کوئی ایسی شخصیت شریک ہوتی ہے جسے مخلوق کی رہنمائی کی اور جانشینی کی ذمہ داری سنبھالنی ہوتی ہے، ان مجموعۂ ملفوظات میں وہ اہم روایتیں بھی ہوتی ہیں، جن کی تفہیم سے وہ قاصر رہتے ہیں، جو ذوقِ تصوف سے لذت آشنا نہیں ہوتے ہیں، ایسی ہی کچھ روایتیں فوائد السالکین میں ہیں، ان میں سے بعض کو نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے، اور ان نکات کی موشگافی کی کوشش کی جاتی ہے جو تفہیم میں قدرے حائل ہوتے ہیں، اور جو تل اوجھل پہاڑ کی مصداق ہیں۔

بزمِ صوفیہ

امام یوسف بن یحیی بویطی

از

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

امام شافعی کے نامور مصری تلامذہ میں امام یوسف بن یحیی بویطی مصری تھے، جن کے متعلق اصحاب طبقات وتراجم کے متفقہ الفاظ ہیں کہ وہ اکبر اصحاب الشافعیین المصریین یعنی مصری اصحاب شافعی میں سب سے بڑھ کر ہیں[1]۔ امام سبکی کے الفاظ میں وہ دین اور علوم دینیہ میں ایک کوہ سربلند کی طرح عظیم اور نمایاں ہیں[2]۔

امام بویطی کا اسم گرامی یوسف بن یحیی ہے، ابو یعقوب کنیت ہے، بویطی کی نسبت سے مشہور ہیں اور یہ نسبت بویطا سے متعلق ہے، جو مصر میں بوصیر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی بستی ہے، اسی نام کا ایک گاؤں اسیوط (امام سیوطی والا) کے بھی قریب ہے۔ یاقوت حموی نے ان دونوں بستیوں کا ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے یہ تعیین نہ کی کہ امام بویطی کا تعلق کس بویطا سے ہے، انھوں نے صرف اتنا ذکر کیا ہے کہ

ينسب يوسف بن يحيى البويطي الى احدهما۔

---

[1] دیکھئے، طبقات کبری ابسبکی، شیرازی، ابن ہدایہ اور وفیات الاعیان ابن خلکان، تاریخ بغداد خطیب بغدادی وغیرہ

[2] طبقات کبری ابسبکی ج ۱، ص ۲۷۵

یہ حضرت یحییٰ بویطی ان دونوں بستیوں میں سے ایک سے نسبت رکھتے ہیں[1]، تاریخ پیدائش کے بارہ میں مورخین خاموش ہیں، اس وجہ کے اکثر دوسرے علماء کی طرح امام بویطی کے خاندان، نشو ونما اور تعلیم و تربیت کے باب میں بھی کوئی تفصیلی یا جزوی اطلاع نہیں ملتی، لیکن امام شافعی کے دامن علم سے وابستہ ہونے سے قبل وہ جلیل القدر محدث و فقیہ امام عبداللہ بن وہب کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے، امام ابن وہب، امام مالک اور امام لیث بن سعد کی طرح صف اول کے محدث و فقیہ تھے، یہ ابن وہب وہی ہیں جن کے بارے میں ابن فرحون نے امام مالک کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ان کے علاوہ، امام مالک نے کسی کو فقیہ تسلیم نہ کیا[2]۔

مصر میں اس وقت علم حدیث سے اشتغال اور محدثانہ طرز فکر کا دور دورہ تھا، یہی وجہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ دوسرے قریبی علاقوں مثلاً عراق، شام اور یمن وغیرہ میں فقہ حنفی اور فقہ شافعی قبولیت اور رواج عام کی منزلوں میں تھی، مصر ان دونوں مسلکوں سے سرد مہری برت رہا تھا۔ امام ابن وہب، عام محدثین کے برخلاف علم فقہ میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، یقینی بات ہے کہ علم حدیث و فقہ کی جامعیت نے ان کی شخصیت کو ممتاز اور دوسروں کے لئے باعث کشش بنا دیا تھا، چنانچہ امام مزنی اور امام ربیع مرادی کی طرح امام بویطی کا ابن وہب کے سرچشمۂ علم سے سیراب ہونا محض اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ علم کلام سے بیزاری، علم حدیث سے گرویدگی اور علم فقہ کی دلکشی نے ابتداء سے ہی ان تینوں حضرات کو ایک مرکز پر جمع کر دیا[3]۔

---

[1] معجم البلدان، یاقوت حموی، ج ۱، ص ۳۱۲؛ انساب: سمعانی؛ ج ۱ ص ۹۶ - سمعانی نے ابو عبداللہ فقیہ بویطی کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن وہ بویط کے رہنے والے نہ تھے، بلکہ حموی کے خیال کے مطابق چونکہ وہ امام بویطی کی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے، اس لئے بویطی کی نسبت سے معروف ہوئے، معجم حوالہ مذکور۔

[2] حسن المحاضرہ: سیوطی، ص ۱۲۱ -

[3] طبقات کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۳۸، ۲۵۹، ۲۷۵

امام سبکی کا بیان ہے کہ امام بویطی نے ابن وہب کے علاوہ دوسرے محدثین سے بھی کسب فیض کیا[1]
روایت حدیث بھی کی، انھوں نے ان محدثین کے نام بیان نہیں کئے، لیکن اس وقت مصر کی فضا میں
امام مالک رح، امام لیث بن سعد، بشر بن بکر، عبداللہ بن یوسف تنیسی، شعیب بن لیث اور اسد بن
موسیٰ اور بہت سے دوسرے محدثین کی موجودگی سے رشک آسمان بنی ہوئی تھی[2]، امام بویطی کا ان محدثین
سے اکتساب علم، قرین قیاس ہے۔

عین اسی زمانہ میں یعنی ۹۹ - ۱۹۸ھ میں امام شافعی عراق سے مصر تشریف لائے، اجمال
بتفصیل الٰہی کے ان کی کامیابی اور ان کی اجل مقدر ہو چکی تھی[3]، اس وقت امام شافعی کی شہرت
کا آفتاب نصف النہار پر تھا، مصر کا علمی ماحول، ان کے طرز استدلال و طریقۂ اجتہاد کے لئے نہایت
سازگار تھا، حسب توقع مصر نے ان کی پذیرائی ان کے شایانِ شان کی، اور جہاں ان کی خدمت میں
ذہین، مخلص اور صالح نوجوانوں کا نذرانہ پیش کیا، وہیں اس اسم با مسمّٰی یوسف علم کی متاعِ بے بہا بھی
انھیں سونپ دی۔

عبداللہ بن وہب سے وابستگی کے بعد حدیث و فقہ کی ہم آہنگی نے جس شعور کی ساخت پرداخت
کی تھی، اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس کو جلا و نمو، امام شافعی کے فیض اثر سے ملے۔

مصر میں امام شافعی کے قیام کی مدت چار برس رہی، اس عرصہ میں امام بویطی، امام شافعی کی
خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہے، امام سبکی کے بقول اختص بصحبتہ[4] امام شافعی کی صحبت کے

---

[1] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱، ص ۲۷۵
[2] حسن المحاضرۃ، سیوطی، ج ۱، ص ۱۲۵
[3] وفیات الاعیان، ابن خلکان، ج ۲، ص ۲۱۶
[4] طبقات کبریٰ، سبکی، ج ۱، ص ۲۷۵

ہوکر رہ گئے، اور اپنے استاد عالی مقام کی تعلیم و تربیت سے اس طرح فیضیاب ہوئے کہ جب امام شافعی کے سامنے ان کی جانشینی کا سوال سامنے آیا، تو امام مزنی امام ربیع مرادی اور ابن عبدالحکم کے سے نامور اور باصلاحیت شاگردوں کی موجودگی میں نظر انتخاب امام بویطی پر پڑی، اور جب اُن کا وقت وصال قریب آیا تو انھوں نے وصیت کی کہ ان کے حلقہ کی مسند نشینی اور قائم مقامی امام بویطی کریں گے[1]

پہلے بھی ایک بار امام شافعی نے اپنی مجلس میں فرمایا تھا کہ میری جانشینی کا حقدار یوسف بن یحییٰ سے زیادہ اور کوئی نہیں[2]۔ عملاً بھی امام شافعی اپنی حیات ہی میں اُن کو اپنا جانشین مقرر کر چکے تھے، اور وہ اس طرح کہ مسائل و استفسار کے جواب دینے میں امام بویطی پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے ان سے فرماتے تھے کہ ان کے جوابات تم دو، اکثر مسائل وہ امام بویطی کی جانب منتقل کر دیتے اور ان کے جوابات سے مطمئن ہو کر ان کی تصویب بھی فرما دیتے[3]۔ اس طرح ایک بہترین معلم و مربی کی طرح امام شافعی کی جوہر شناسی، امام بویطی میں کسی قسم کی کمی نہ رکھنا چاہتی تھی، کبھی کبھی امام بویطی کی اصابتِ رائے، معاملہ فہمی اور حسن استدلال سے متاثر ہو کر امام شافعی فرماتے کہ ابو یعقوب لسانی ابو یعقوب (بویطی) میری زبان ہیں[4]، امام بویطی کے تقویٰ و تقشف اور حلم و وقار کی وجہ سے بھی امام شافعی کی نگاہوں میں اُن کا مقام بہت بلند تھا، امام ربیع جو امام بویطی کے ہم عصر و ہم درس ہیں لکھتے ہیں کہ کان ابویعقوب من الشافعی بمکان مکین[5] ابو یعقوب بویطی کا امام شافعی کے نزدیک اونچا درجہ و مرتبہ تھا۔

امام شافعی کا انتقال ہوا تو اُن کی مسندِ علم کی جانشینی، امام بویطی کے نصیب میں آئی، تو لاً و فعلاً وہ ان کو جانشین مقرر کر چکے تھے، مگر ان کے انتقال کے بعد ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا، جو

---

[1] تہذیب الاسماء: نووی، ج ۲، ص ۲۶۴ [2] مرأۃ الجنان: یافعی، ج ۲، ص ۱۰۲
[3] وفیات: ابن خلکان، ج ۳، ص ۱۵ [4] ایضاً ص ۱۶ [5] تاریخ بغداد: خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۳۰۰

خلافت تو قع دتھا ابوبکر بن خزیمہ کے حوالے سے یہ واقعہ منقول ہے کہ جانشینی کے سوال پر امام بویطی اور ابن عبدالحکم کے درمیان کشمکش پیدا ہوگئی، ابن عبدالحکم مصر کے سربرآوردہ اور نامور مالکی عالم تھے، امام شافعی مصر تشریف لائے تو یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علوم فقہیہ کی تحصیل کی، امام شافعی کے انتقال کے بعد انھوں نے جانشینی کے استحقاق کا دعویٰ کیا جواب میں امام بویطی نے اپنے حق کا اعادہ کیا حسن اتفاق سے اُس وقت مصر میں امام شافعی کے قدیم کی شاگرد و محدث امام حمیدی موجود تھے، انھوں نے فیصلہ امام بویطی کے حق میں دیا، امام حمیدی نے فرمایا کہ خود مجھ سے امام شافعی نے فرمایا تھا کہ میری مجلس کا حقدار امام بویطی سے بڑھ کر کوئی نہیں اور نہ میرے ساتھیوں میں کوئی ان سے زیادہ صاحب علم ہے ابن عبدالحکم نے یہ سن کر امام حمیدی سے کہا، آپ نے غلط بات کہی، اس پر امام حمیدی نے کہا کذبت انت وابوك وامك غلط بات تو تم نے، تمھارے والدین نے کہی، اس سخت جواب سے ابن عبدالحکم بہت ناراض ہوئے، حتی کہ اپنے شافعی مسلک کو خیرباد کہہ کر اپنے سابقہ فقہی مسلک کی ترویج و اشاعت میں لگ گئے[1]

ایک روایت کے مطابق یہ تنازعہ امام شافعی کی زندگی میں بھی پیش آیا اور جب امام شافعی کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے فرمایا الحلقة للبويطي مجلس بویطی ہی کی ہے[2]، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابن عبدالحکم، امام شافعی کی وفات سے دو ماہ پیشتر ہی مالکی مسلک اختیار کر چکے تھے، ابن ہدایہ نے تو صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ چونکہ امام شافعی نے امام بویطی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا، اس سے ناراض ہو کر ابن عبدالحکم نے اپنے والد کے مسلک یعنی مسلکِ مالکی کو دوبارہ اختیار کر لیا تھا[3]

---

[1] تاریخ بغداد: خطیب بغدادی، ج ۱۴، ص ۳۰۱ [2] طبقات کبریٰ، ج ۱، ص ۲۷۵

[3] طبقات: ابن ہدایہ، ص ۸ ۔

امام شافعی اپنے شاگردوں سے جس شفقت و محبت، دل داری و دل نوازی اور اخلاص والفت سے پیش آتے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے شاگرد ہمیشہ ان کے بارہ میں محبت و عقیدت کے جذبات سے سرشار رہتے، اور یہ نشہ ایسا چھایا رہتا کہ تا عمر نہ اترتا، امام بویطی بھی محبوب مربی استاد کی یادوں کو فراموش نہ کرسکے، ان کی خلوت و جلوت میں امام شافعی کا ذکر بار بار ہوتا وہ اکثر کہا کرتے کہ میں نے بہتوں کو دیکھا لیکن بخدا کسی بھی صنفِ علم میں امام شافعی کے ہم پلہ کجا کمتر بھی کسی کو نہ پایا، جتنے لوگ بھی ورع و تقویٰ میں حیثیت رکھتے ہیں، ان سے کہیں بڑھ کر متقی میں نے امام شافعی کو پایا[1]۔

وہ فرماتے کہ ہم نے امام شافعی کی صحیح قدر تو اُس وقت جانی جب اہلِ عراق کو دیکھا کہ وہ امام صاحب کی خوبیوں کا ذکر اس کثرت اور عقیدت سے کرتے ہیں کہ ہم اس کا نصف بھی نہیں کہتے، اہلِ عراق (حنفی مراد ہیں) اہلِ حدیث اور زباں داں بیک زبان کہتے تھے کہ انھوں نے امام شافعی کا سا کسی کو نہیں دیکھا[2]۔

امام ربیع بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام بویطی کو اکثر اس بات پر اظہار افسوس کرتے دیکھا کہ وہ امام شافعی سے کماحقہ استفادہ نہ کرسکے، میں نے ایک بار عرض کیا کہ امام شافعی آپ سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے، اپنے تمام ہم نشینوں پر ترجیح اور اولیت دیتے تھے، پھر کون سا امر مانع تھا کہ آپ اپنی خواہش کے مطابق استفادہ نہ کرسکے؟ امام بویطی نے جواب دیا، یقیناً میرے ساتھ ان کا معاملہ شفقت و لینت کا تھا لیکن ان کی نرم گفتاری اور علمی انکسار کے باوجود میرا یہ عالم تھا کہ ان کے جلالِ علم سے ہمیشہ لرزاں رہتا اور یہ کیفیت مجھ سے ہی خاص نہ تھی، میں نے امام شافعی کی بارگاہ میں ہر مر

---

[1] تہذیب الاسماء: نووی، ج ۱، ص ۵۸
[2] ایضاً

یا جبروت امراء کو حتی کہ سلاطین کو دیکھ کر ان پر امام شافعی کی ہیبتِ علمی چھائی رہتی تھی[1]۔

امام بویطی کا یہ انکسار اور کما حقہ سیرابی نہ ہونے پر اظہار افسوس ان کے فرطِ ادب اور
طرزِ عمل کی نشانی ہے، ورنہ وہ علم و فضل اور تقویٰ و تقشف میں بجا طور پر امام شافعی کے خلیفہ اور جانشین
امام احمد بن حنبل بھی امام بویطی کی صحیح جانشینی کے معترف تھے، ایک صاحب نے علم حدیث
خاصی واقفیت بہم کر لینے کے بعد جب امام اوزاعی، امام ثوری اور امام مالک کے فقہی مسلکوں
تحصیل کا ارادہ ظاہر کیا تو امام احمد بن حنبل نے انھیں فقہ شافعی کے حاصل کرنے کا مشورہ دیا
اس کے لئے امام بویطی کی خدمت میں حاضر ہونے اور سماعت کرنے کی رائے دی[2]۔

امام بویطی اپنی علمی صلاحیت اور فقہی مہارت کے علاوہ خیر کے امور اور اعمالِ حسنہ میں کا
رشک اور لائقِ تقلید تھے وھو متبوع فی صنائع المعروف[3]۔

دن میں ان کے اوقات کا بیشتر حصہ اذکار، تعلیم و تعلم کی مشغولیتوں میں گذرتا اور رات
اکثر حصہ تلاوت قرآن مجید اور نوافل کی ادائیگی سے معمور رہتا، تلاوت پر خصوصی توجہ تھی، اس
سے تلاوت کرتے کہ دن رات گذرنے بھی نہ پاتے اور وہ قرآن مجید ختم کر لیتے[4]

تلاوت کی کثرت سے جذبات میں رقت، دل میں گداز اور لہجہ میں سوز پیدا ہو گیا تھا
سبکی کہتے ہیں کہ وہ بے حد رقیق القلب تھے، اس لئے اکثر آنسو رواں رہتے، کان سر
الدمعۃ[5]۔

---

[1] تہذیب الاسماء: نووی، ص ۵۹
[2] الانتقاء: ابن عبد البر، ص ۷۶
[3] طبقات کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶
[4] تاریخ بغداد: بغدادی، ج ۱۴، ص ۳۰۲
[5] طبقات الشافعیہ: سبکی ج ۱ ص ۲۷۶

ابوالولید بن ابی الجارود کا بیان ہے کہ امام بویطی میرے پڑوسی تھے، رات میں جب جب میری آنکھ کھلتی، میں انھیں تلاوت یا نماز میں مشغول پاتا۔[1]

امام مرادی کا قول ہے کہ امام بویطی کے لب ہمیشہ خدا کے ذکر سے برابر متحرک رہتے۔

ابن ندیم کے الفاظ میں، امام شافعی کے ساتھیوں میں امام مزنی سے زیادہ فقیہ اور امام بویطی سے زیادہ صالح کوئی نہ تھا۔[2] یاقوت حموی کے الفاظ میں وہ امام ربانی تھے۔[3] احکام شریعت اور تقلید سنت میں بڑے سخت تھے، خطیب بغدادی نے نمایاں انداز میں ان کے تقشف کا ذکر کیا ہے۔[4] امام ربیع فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سے ہر نوعی حجت لینے میں، امام بویطی سے زیادہ استحضار میں نے کسی میں نہ دیکھا۔[5]

جامع عمرو بن العاص میں جہاں امام شافعی درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشتے تھے، امام بویطی کا فیضانِ علم اسی رونق سے جاری رہا، دور دراز سے شائقینِ علم آتے اور امام بویطی کے ہاتھوں امام شافعی کی میراث کی دولت اپنے اپنے علاقوں میں لے جا کر عام کرتے، علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ امام بویطی شخصی طور سے سبک روح اور نرم خو تھے، پردیسیوں سے ان کا برتاؤ قربت و مواسنت کا رہتا، وہ بڑی خوبی سے ان کے سامنے امام شافعی اور ان کی کتابوں کی فضیلت و کمال کو واضح کرتے، ان کا یہ اسلوب اس قدر دلکش اور موثر ہوتا کہ طالبین و شائقین کی ایک کثیر جماعت ان کی خدمت میں حاضر رہتی۔[6]

---

[1] طبقات، شیرازی، ص ۸۰
[2] فہرست، ابن ندیم ص ۲۹۵
[3] معجم البلدان، یاقوت حموی، ج ۱، ص ۳۱۲
[4] تاریخ بغداد، بغدادی، ج ۱۴، ص ۳۰۲
[5] طبقات، شیرازی، ص ۸۰
[6] الانتقاء، ابن عبد البر ص ۱۰۹، ۱۱۰

امام بویطی سالہاسال، امام شافعیؒ کی مسندِ افتاء وتدریس کی رونق بڑھاتے رہے، یہاں تک ۲۲۷ھ میں وہ فتنۂ خلقِ قرآن میں شدائد ومصائب کا نشانہ بنے اور اس طرح انھوں نے دنیا والوں کے سامنے ہمت وعزیمت کا درس اعلیٰ بھی پیش کیا۔[۱]

اسلام کی تاریخِ عزیمت میں فتنۂ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کے بعد امام بویطی کی شخصیت ہے جو صبر وثبات، اثبات علی الحق اور قید وبند میں بھی حریتِ فکر وعقیدہ کے اظہار میں سرخروئی اور کامیابی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

واثق باللہ[۲] معتصم کے انتقال کے بعد ۲۲۷ھ میں تخت نشین ہوا، اور اسی کے دور میں امام بویطی کو پابند زنجیر وسلاسل کیا گیا، یہاں تک کہ چار برس کے بعد اسی قفس آہنی سے ان کا طائر روح پرواز کر گیا۔[۳]

فتنۂ خلقِ قرآن میں امام بویطی کی آزمائش کے اولین اسباب ومحرکات کیا ہیں؟ جبکہ وہ اس فتنہ کے خاص مرکز دار الخلافہ بغداد سے دور مصر میں تھے، مصر کے دوسرے علماء جن میں کثرت سے شوافع بھی تھے، اس فتنہ سے دامن کش، خاموش اور بظاہر بے تعلق سے تھے، حالانکہ بغداد میں امام احمد بن حنبل اور ان کے متبعین، اس فتنۂ ضالہ کے ازالہ اور کلمۂ حق کے اعلان اور اس کی پاداش میں اذیت وتعذیب کا شکار رہتے تھے، اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہی جا سکتی ہے کہ امام بویطی کی علمی جلالتِ شان، ان کا تفقہ، اور اس سے

---

[۱] تہذیب الاسماء: نووی، ص ۵۸

[۲] یہ وہی واثق باللہ ہے، جس نے بہت سے محدثین اور علماء حق کو قید وبند اور قتل کی سزائیں دیں، مشہور صاحبِ عزیمت بزرگ احمد بن نصر خزاعی کو تختۂ دار پر چڑھایا، امام احمد کو جلاوطن کیا، امام احمد بن حنبل اس کے زمانۂ خلافت میں روپوش رہے، جمعہ وجماعت کے لئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۱۰ ص ۳۰۵

[۳] تہذیب الاسماء نووی، ص ۵۸۔

ان کا تقویٰ وتقشف جو دین کے امور میں کسی مداہنت کو برداشت نہ کر سکتا تھا، علم کلام اور کلام سے ان کی بیزاری جو انھیں امام شافعی سے ورثہ میں ملی تھی[1]، اور خود امام احمد بن حنبل سے تعلق، ایسی باتیں ہیں، جن کی وجہ سے وہ اپنے بعض ہم عصر و ہم درس رفقاء کے برخلاف ضمیر کی آواز کو دبا نہ سکے اور انجام کار مصائب ومحن کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ مرجعیت وقبولیت کی نعمتہائے فراواں کے حصول کے بعد شخصیتیں محسود ہو جاتی ہیں، غلط طینت، بے صلاحیت اور زمانہ ساز ذہنوں میں ایسی شخصیتوں کے بارے میں طبعی طور پر رشک وحسد کے جذباتِ سفلی در آتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ بویطی کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا ہو، جیسا کہ امام سبکی نے لکھا ہے کہ معاندوں نے زور شور سے حاسدوں نے مکر وفریب کیا، اور واثق باللہ کے وزیر اور مشہور قائل خلق قرآن قاضی احمد بن ابی دواد کے پاس امام بویطی کی شکایات لکھ کر بھیجیں، قاضی ابن ابی دواد نے والیِ مصر کے پاس خط لکھ کر حکم دیا کہ امام بویطی سے پرسش کی جائے، حسن اتفاق سے والیٔ مصر، امام بویطی کے بارہ میں خود اچھی رائے رکھتا تھا، اس نے امام بویطی سے کچھ گفتگو کے بعد اپنے اطمینان کا اظہار کیا، لیکن بات یہیں آئی گئی نہ ہوئی، اور آخر کار حاسدوں کو اپنی مہم میں اس وقت کامیابی نصیب ہوئی، جب امام بویطی کو پابجولاں چالیس رطل فولادی بیڑیوں میں جکڑ کر بغداد بھیجا گیا[2]۔

---

[1] امام شافعیؒ علم کلام اور متکلمین کے بارہ میں بہت سخت تھے، ان کا قول تھا کہ اہلِ کلام کو زد وکوب کیا جائے، اور اونٹوں پر بٹھا کر بستیوں اور قبیلوں میں ان کو رسوا کیا جائے اور پکار کر کہا جائے کہ یہ سزا کتاب وسنت کے ترک کی پاداش میں ہے۔ معجم المصنفین ص ۲۷۶

[2] تاریخ بغداد: خطیب بغدادی، ج ۱۴، ص ۳۰۳۔

یہ حاسدین کون تھے؟ اس کا بالتعیین جواب مشکل ہے، اور یقیناً پردۂ خفا میں ہے
ابن ہدایہ جو مصنف کے لقب سے معروف اور اپنی کتاب طبقات کی وجہ سے مشہور
ہیں اور گیارہویں صدی ہجری کے ایک نامور شافعی عالم گذرے ہیں[1] لکھتے ہیں کہ قاضی
ابن ابی اللیث حنفی، امام بویطی سے حسد رکھتے تھے، انھوں نے ہی امام بویطی کو والی مصر کے
سامنے حاضر کرایا کہ ان سے خلقِ قرآن کے اثبات میں بیان لیا جائے، لیکن امام بویطی
کے انکار کے بعد انھیں ایک جماعت کے ساتھ جس میں دوسرے شافعی علماء بھی شامل تھے روانہ کردیا گیا۔

علامہ ابن عبدالبر قرطبی جو پانچویں صدی ہجری میں گذرے ہیں، ان کا قول بھی اسی
قسم کا ہے، ان کے مطابق قاضی ابن ابی اللیث حنفی نے حسد میں امام بویطی کو اس آزمائش
میں ڈالا، جبکہ دوسرے شافعی ائمہ بھی تھے، مگر ان سے تعرض نہ کیا، لیکن ابن عبدالبر
کا یہ بیان خود ان کی کتاب الانتقاء میں موجود نہیں ہے، ابن خلکان نے اس بیان کو نقل کیا ہے[2]۔

ایک اور معتبر راوی ابوعمر کندی متوفی ۳۵۰ھ ہیں، وہ اتنا اشارہ ضرور کرتے ہیں کہ
معتصم نے ہارون بن عبداللہ قاضی مصر سے خلق قرآن کے مخالفین کی فہرست مانگی، لیکن
وہ دامن بچا گئے، اس کے بعد قاضی ابن ابی دواد نے قاضی محمد بن ابی اللیث سے یہ فہرست
مانگی، انھوں نے سربرآوردہ مخالفین کے نام انھیں دے دئے، ان ناموں میں امام
بویطی کے علاوہ، نعیم بن حماد اور خشنام محدث بھی شامل تھے[3]۔
مگر خطیب بغدادی م ۴۶۳ھ اور ابواسحٰق شیرازی م ۴۷۶ھ جو زمانی لحاظ سے دوسرے

---

[1] طبقات: ابن ہدایہ، ص ۲
[2] وفیات: ابن خلکان، ج ۲، ص ۴۱۵، ۴۱۶
[3] کتاب الولاۃ والقضاۃ، ابوعمر کندی

مؤلفین و مصنفین کی بہ نسبت زیادہ قدیم ہیں، اس باب میں خاموش ہیں، اور سب سے حیرت کی بات تو یہ ہے کہ امام سبکی م ۷۷۱ھ جن کی طبقات کبریٰ، تقریباً طبقات شافعیہ میں سب سے مکمل و مفصل کتاب ہے اور جس میں بیشتر وہ تفصیلات ملتی ہیں جو طبقات کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں، قاضی ابن ابی اللیث حنفی کے اس حسد و انتقام کے افسانہ کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں اور ایک انتہائی ناقابل یقین روایت کو جس کے ضعف کی جانب وہ خود بھی اشارہ کرتے ہیں، بیان کرتے ہیں کہ امام بویطی کے خلاف سازش میں ان کے ہم درس اور ان ہی کی طرح ممتاز ترین فقیہ امام مزنی، امام حرملہ اور خود امام شافعی کے صاحبزادہ بھی شامل تھے، امام سبکی کے الفاظ یہ ہیں :-

"وقیل کان المزنی وحرملة	کہا جاتا ہے کہ مزنی و حرملہ اور ابن شافعی
وابن الشافعی ممن سعیٰ	ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے
بالبویطی[1]"	امام بویطی کے خلاف چغل خوری کی۔

ابوجعفر ترمذی کا بیان ہے کہ مجھ سے ایک ثقہ شخصیت نے امام بویطی کے اس قول کو نقل کیا کہ میرے خون سے سارے لوگ بری ہیں، سوائے تین اشخاص کے، اور وہ ہیں حرملہ، مزنی اور ایک صاحب اور، امام سبکی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر یہ حکایت و روایت درست ہے تو تیسرے شخص کو مجہول و مبہم رکھنے میں شاید یہ نکتہ ہے کہ امام بویطی نے اپنے استاذ امام شافعی کی رعایت سے ان کے صاحبزادہ کا نام صراحت سے نہیں لیا، اس روایت کے ناقابل قبول ہونے میں یقیناً

---

[1] طبقات کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶

کسی تامل کی گنجائش نہیں کہ امام مزنی، امام حرملہ اور صاحبزادہ شافعی کے دینی و علمی مقام سے یہ فروتر ہے، خصوصاً امام مزنی تو صاحبانِ ہمت و عزیمت کے مدّاح تھے اور اسی فتنۂ خلقِ قرآن میں حکومت وقت کے سب سے بڑے نشانہ بننے والے امام احمد بن حنبل کے بارہ میں ان کا یہ قول بہت مشہور ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ مرتدین کے بارہ میں فیصلہ کے دن، حضرت عمرؓ سقیفہ کے دن، حضرت عثمانؓ شہادت کے دن، حضرت علیؓ جنگِ صفین کے دن اور احمد بن حنبل فتنۂ خلقِ قرآن کے سبب آزمائش کے دن سرخرو ہوئے[1]

اب بات قاضی ابن ابی اللیث کی رہ جاتی ہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ قاضی ابن ابی اللیث حنفی پر عائد کردہ یہ جرم، بعد کے حضرات کی اپنی اپج ہے، تاہم چھٹی صدی سے گیارہویں صدی تک، مختلف فقہی گروہوں کے درمیان سخت تعصب اور تحزب کی جو فضا قائم تھی، اس میں اس قسم کی گھڑی ہوئی روایتوں کا چل نکلنا بعید از قیاس نہیں، جنھیں اس دور کے مولفین نے نادانستہ مستند سمجھ کر اپنی کتابوں میں جگہ دیدی، [illegible] حال کا علم تو صرف علام الغیوب کو ہے۔

بہرحال امام بویطی نے اپنی زندگی کے آخری چار برس قید خانے میں گذارے، لیکن وہاں بھی ان کی زبان اعلاءِ کلمۂ حق کے لئے آزاد رہی، امام ربیع ان سے ملنے قید خانہ گئے، وہاں انھیں اس حال میں دیکھا کہ وہ خچر پر سوار ہیں، گردن میں بھاری بوجھ لٹکا ہوا ہے، دونوں پیروں میں بیڑیاں ہیں، اور خچر اور پیروں کے درمیان آہنی زنجیریں ہیں[2]، اس عالم میں جب امام ربیع سے گفتگو ہوئی، تو نہ حکومت کا شکوہ زبان پر آیا، نہ ان بیڑیوں اور زنجیروں کا گلہ، بلکہ

---

[1] طبقاتِ کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۰۰۔

[2] ایضاً، ص ۲۷۶

اس وقت بھی وہ اپنی دلیل پر قائم رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو لفظ کُن سے پیدا فرمایا، اگر یہ لفظِ کن بھی مخلوق ہوتا تو دوسری مخلوقات کے ساتھ ہی پیدا ہوتا، کیا ان نئے فلسفیوں اور متکلموں کی موشگافیوں سے میں یہ مان لوں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے مخلوق کو پیدا کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فنارِ خلق کے بعد فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی بادشاہی ہے، اس وقت نہ کوئی مجیب ہوتا ہے نہ داعی، چنانچہ پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ بادشاہی صرف خدائے یکتا و قہار کے لئے زیبا ہے، تو اگر یہ کلامِ خدا مخلوق ہوتا تو دوسری مخلوقات کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا[1]۔

وہ اس باب میں اس درجہ متشدد تھے کہ فرماتے جو کلام اللہ کو مخلوق کہے وہ کافر ہے وہ فرماتے کہ اگر میں خلیفہ واثق باللہ کے روبرو پیش کیا جاؤں تو اپنی اسی بات پر قائم رہوں گا اور بہ بانگِ دہل اسی عقیدہ کا اعلان و اقرار کروں گا[2]۔ وہ جذبۂ حق سے ایسے سرشار تھے کہ رجزیہ فرماتے، میں انہی زنجیروں میں مرکر رہوں گا، حتیٰ کہ لوگ آئیں گے، اور تب جانیں گے کہ بویطی نے اس شان سے اپنی جان دی کہ گویا ایک قوم تھی جو بیڑیوں میں جکڑی تھی اور اسی عالم میں وہ آزاد ہوئی[3]۔

بہرحال خلقِ قرآن کا یہ خالص علمی مسئلہ جو موشگافیوں اور فلسفۂ وکلام کے غیر ضروری مباحث ومسائل میں الجھنے کا شاخسانہ اور چند جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی تگ و دو کی آماجگاہ تھا جس طرح ایک سیاسی فتنہ بنا، اور جس طرح اس فتنہ میں صدہا علمائے حق

---

[1] طبقاتِ کبریٰ: سبکی ج ۱، ص ۲۷۶
[2] تاریخ بغداد: بغدادی، ج ۱۴، ص ۳۰۲
[3] طبقاتِ کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶

کی ابتلا و آزمائش ہوئی، وہ اپنی مثال آپ ہے، امام احمد بن حنبل اور امام بویطی نے
جس صبر و ثابت قدمی کی مثال پیش کی، وہ بھی اپنی نظیر خود ہی ہے۔

امام سبکی فرماتے ہیں کہ امام بویطی پر اللہ تعالیٰ رحمتوں کی بارش کرے یقیناً وہ
مقامِ صدیقیت پر فائز تھے[1]

امام ساجی فرماتے ہیں کہ امام بویطی بیڑیوں ہی میں ہر جمعہ کو غسل فرماتے، خوشبو
لگاتے، اپنے کپڑوں کو دھوتے، اور جب اذان کی آواز سنتے تو پا بجولاں، بابِ زنداں
تک بے قرار ہو کر آتے، لیکن جیل کے نگراں انھیں واپس کر دیتے، اور عین اُس
وقت امام بویطی درد و شوق سے کہتے کہ اے اللہ! تو سن، گواہ رہ کہ تیرے پکارنے
والے کی میں نے آواز سنی، اس پہ لبیک کہا، مگر یہ لوگ مجھے تیرے حضور نہیں
آنے دیتے[2]

ابو عمرو مستملی کا بیان ہے کہ ایک بار محمد بن یحییٰ ذہلی کی مجلس میں امام بویطی کا
ایک زنداں نامہ پڑھا گیا، جس میں انھوں نے امام ذہلی سے مخاطب ہو کر لکھا تھا
کہ میرے حال سے میرے بھائیوں کو باخبر کر دیجیے، کہ شاید ان کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ
مجھے رہائی عطا کرے، اور رہائی کی تمنا صرف اس لیے ہے کہ میں بیڑیوں میں ہوں اور
طہارت و نماز جیسے فرائض کی ادائیگی سے عاجز ہوں، مجلس کے حاضرین اس خط کو
سن کر بے اختیار رو پڑے[3]۔

---

[1] طبقاتِ کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶
[2] تاریخ بغداد: خطیب، ص ۳۰۳
[3] طبقاتِ کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶

امام ربیعؒ کے نام ایک خط میں لکھا کہ اب تو یہ حال ہے کہ اکثر یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ میرے جسم پر زنجیروں اور بیڑیوں کا بوجھ ہے[1]۔ ایسے ہی ایک خط میں لکھا کہ پردیسیوں اور اجنبیوں کے ساتھ صبر و ضبط کا معاملہ کرنا، اپنے حلقہ کے لوگوں کے لئے حسنِ اخلاق کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرنا، کیونکہ میں نے امام شافعی کو اکثر یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا[2]۔

اھین لھم نفسی لکی یکرمونھا ولن تکرم النفس التی لا تھینھا

لوگوں کے لئے میں اپنے نفس کو حقیر رکھتا ہوں، تاکہ لوگ اس کی عزت کریں، جس نفس کو تم متواضع نہ بناؤ گے، وہ کبھی معزز نہ ہوگا۔

آخر کار مسلسل چار برس قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے، اسی عالم میں وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، جمعہ کے روز، نماز سے قبل ماہ رجب ۲۳۱ھ میں قیدِ بغداد میں ان کا وقتِ وصال آن پہنچا[3]۔ ابنِ ہدایہ نے سالِ وفات ۲۳۲ھ اور ابن قوم نے انتقال کا دن سہ شنبہ لکھا ہے[4] لیکن صحیح روایت اول الذکر ہے، کیونکہ امام سبکی ابن خلکان، امام یافعی، علامہ سیوطی، خطیب بغدادی اور ابن ندیم نے اسی کی تائید کی، خطیب بغدادی نے اس رائے کو موسیٰ بن ہارون کے حوالہ سے نقل کرتے کے لکھا کہ یہ اس لئے اور بھی معتبر ہے کہ موسیٰ بن ہارون خود جنازہ میں شریک تھے[5]۔

---

[1] وفیات: ابن خلکان، ج ۳، ص ۴۱۶۔
[2] تاریخ بغداد وطبقات کبریٰ۔
[3] ایضاً
[4] طبقات: ابن ہدایہ، ص ۲ حسن المحاضرہ: سیوطی، ص ۳۰۱۔
[5] تاریخ بغداد: خطیب، ج ۱۴، ص ۳۰۴۔

کی [illegible] آزمائش ہوئی، وہ اپنی مثال آپ ہے، امام احمد بن حنبل اور امام بویطی نے
جس صبر و ثابت قدمی کی مثال پیش کی، وہ بھی اپنی نظیر خود ہی ہے۔

امام سبکی فرماتے ہیں کہ امام بویطی پر اللہ تعالیٰ رحمتوں کی بارش کرے یقیناً وہ
مقامِ صدیقیت پر فائز تھے[1]۔

امام ساجی فرماتے ہیں کہ امام بویطی بیڑیوں ہی میں ہر جمعہ کو غسل فرماتے، خوشبو
لگاتے، اپنے کپڑوں کو دھوتے، اور جب اذان کی آواز سنتے تو پا بجولاں، بابِ زنداں
تک بے قرار ہو کر آتے، لیکن جیل کے نگراں انھیں واپس کر دیتے، اور عین اُس
وقت امام بویطی درد و شوق سے کہتے کہ اے اللہ! تو سن، گواہ رہ کہ تیرے پکارنے
والے کی میں نے آواز سنی، اس پہ لبیک کہا، مگر یہ لوگ مجھے تیرے حضور نہیں
آنے دیتے[2]۔

ابو عمرو مستملی کا بیان ہے کہ ایک بار محمد بن یحییٰ ذہلی کی مجلس میں امام بویطی کا
ایک زنداں نامہ پڑھا گیا، جس میں انھوں نے امام ذہلی سے مخاطب ہو کر لکھا تھا
کہ میرے حال سے میرے بھائیوں کو باخبر کر دیجیے کہ شاید ان کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ
مجھے رہائی عطا کرے، اور رہائی کی تمنا مسرت اس لیے ہے کہ میں بیڑیوں میں ہوں اور
طہارت و نماز جیسے فرائض کی ادائیگی سے عاجز ہوں، مجلس کے حاضرین اس خط کو
سن کر بے اختیار رو پڑے[3]۔

---

[1] طبقاتِ کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶
[2] تاریخ بغداد: خطیب، ص ۳۰۳
[3] طبقاتِ کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۶

امام ربیع کے نام ایک خط میں لکھا کہ اب تو یہ حال ہے کہ اکثر یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ میرے جسم پر زنجیروں اور بیڑیوں کا بوجھ ہے[1]۔ ایسے ہی ایک خط میں لکھا کہ پردیسیوں اور اجنبیوں کے ساتھ صبر و ضبط کا معاملہ کرنا، اپنے حلقہ کے لوگوں کے لئے حسنِ اخلاق کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرنا، کیونکہ میں نے امام شافعی کو اکثر یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا[2]

اھین لھم نفسی لکی یکرمونھا   ولن تکرم النفس التی لا تھینھا

لوگوں کے لئے میں اپنے نفس کو حقیر رکھتا ہوں، تاکہ لوگ اس کی عزت کریں، جس نفس کو تم متواضع نہ بناؤ گے، وہ کبھی معزز نہ ہوگا۔

آخر کار مسلسل چار برس قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے، اسی عالم میں وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، جمعہ کے روز، نماز سے قبل ماہ رجب ۲۳۱ھ میں قید خانہ بغداد میں ان کا وقتِ وصال آن پہنچا[3]۔ ابنِ ہدایہ نے سالِ وفات ۲۳۲ھ اور ابن فرات نے انتقال کا دن سہ شنبہ لکھا ہے[4] لیکن صحیح روایت اول الذکر ہے، کیونکہ امام سبکی، ابن خلکان، امام یافعی، علامہ سیوطی، خطیب بغدادی اور ابن ندیم نے اسی کی تائید کی، خطیب بغدادی نے اس رائے کو موسیٰ بن ہارون کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد لکھا کہ یہ اس لئے اور بھی معتبر ہے کہ موسیٰ بن ہارون خود جنازہ میں شریک تھے[5]

---

[1] وفیات: ابن خلکان، ج ۳، ص ۲۱۶۔
[2] تاریخ بغداد و طبقاتِ کبریٰ۔
[3] ایضاً
[4] طبقات: ابن ہدایہ، ص ۴، حسن المحاضرہ: سیوطی، ص ۱۰۰۔
[5] تاریخ بغداد: خطیب، ج ۱۴، ص ۳۰۴۔

اس طرح گویا ابو یعقوب یوسف بن یحییٰ کے نام اور مصر کی نسبت سے انھوں نے سنت یوسفی کا ایک بار پھر احیار کیا اور امام شافعی کی اس پیشین گوئی کے حرف بحرف مصداق ہوئے جس میں برسوں پہلے امام شافعی نے فرمایا تھا اور شاید علم کلام کی روزافزوں گرم بازاری اور امام بویطی کی حق پسند اور تقشفانہ رجحان طبع کے پیش نظر امام شافعی کی مومنانہ فراست نے کہلایا تھا کہ

"اما انت یا ابا یعقوب فتموت فی حدیدک[1]۔ اور تم اے بویطی، اپنی بیڑیوں میں جان دو گے۔

ان کے ورثہ میں کسی اولادِ حقیقی کا ذکر نہیں ملتا لیکن ان کی اولاد معنوی کی فہرست میں کئی نام بہت مشہور ہیں، ابراہیم بن اسحاق حربی، محمد بن اسماعیل ترمذی، ابوحاتم احمد بن ابراہیم، قاسم بن ہاشم، قاسم بن منیرہ، احمد بن منصور رمادی، موسیٰ بن ابی الجارود اور امام الائمہ ابن خزیمہ کے سے نامور محدثین وفقہا، ان کے شاگرد ہیں[2]۔ موسیٰ بن ابی الجارود، ابراہیم بن اسحاق حربی، ابوحاتم اور ابن خزیمہ کا شمار تو ائمہ کبار میں ہوتا ہے ان کے علاوہ ان کے رفیق درس اور امام شافعی کے سب سے بڑے راوی امام ربیع مرادی ان سے بھی روایت کرتے ہیں۔

ان شاگردوں کے علاوہ کتاب کی صورت میں ان کی علمی یادگار مختصر البویطی ہے مختصر المزنی کی طرح امام بویطی کی المختصر بھی مشہور و متداول ہوئی[3] یہ دراصل امام شافعی

---

[1] مرآۃ الجنان، ج ۲، ص ۱۰۲

[2] طبقات کبریٰ، ج ۱، ص ۲۷۵ - طبقات، ج ۴ - ابن ہدایہ - تاریخ بغداد، ج ۱۴، ص ۳۰۱

[3] تاریخ التشریع الاسلامی محمد خضری، ص ۳۶ -

کے کلام کا منتخب خلاصہ ہے، اور کتاب المبسوط کے ابواب پر غایت درجہ عمدہ کتاب ہے[1]،
امام سبکی کے زمانہ تک یہ کتاب دستیاب تھی، چنانچہ وہ فرماتے کہ میں اس کتاب سے واقف
ہوں، علماء و فقہاء کے یہاں اس کی شہرت ہے[2]۔

اسی کتاب کے بارہ میں مشہور شافعی عالم ابوالعباس اصم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے
والد کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں، امام بویطی کی کتاب ہمیشہ اپنے پاس رکھو، یہ ساری
کتابوں میں زیادہ سے زیادہ صحیح کتاب ہے[3]۔

اس کتاب کے علاوہ ابن ندیم نے دو اور کتابوں کے نام گنائے ہیں (۱) کتاب
المختصر الکبیر اور (۲) کتاب الفرائض، لیکن یہ دونوں کتابیں اب کہیں موجود نہیں شاید یہی وجہ ہے
کہ صاحب کشف الظنون نے مختصر البویطی کا تو ذکر کیا لیکن اس کے بارے میں کسی قسم کا
تشریحی نوٹ نہیں لکھا[4]۔ کتاب الفرائض کے بارہ میں بھی علامہ چلپی خاموش ہیں،
حالانکہ انھوں نے ابوثور کرابیسی اور امام ربیع کی کتاب الفرائض کا ذکر کیا ہے[5]۔

امام شافعی کی شہرہ آفاق کتاب، کتاب الام کے جامع درحقیقت امام بویطی ہیں
لیکن بحیثیت جامع ان کے نام کا ذکر نہیں، کتاب الام کی تبویب امام ربیع مرادی نے کی تھی،
چنانچہ وہ ان ہی سے منسوب ہوئی، لیکن امام غزالی کا قول یہی ہے کہ اس کتاب کے اصل مرتب

---

[1] طبقات کبریٰ: سبکی ج ۱، ص ۲۷۶

[2] ایضاً

[3] وفیات: ابن خلکان، ج ۳، ص ۱۵۴

[4] کشف الظنون: چلپی، ج ۲، ص ۱۶۲۵

[5] ایضاً، ص ۱۲۴۵

امام بویطی ہیں، گو انھوں نے اپنے نام کا کہیں ذکر نہ کیا اور نہ خود سے منسوب کیا، علامہ عسقلانی کا بھی یہی خیال ہے[1]. لیکن زمانۂ حال کے ایک محقق کا یہ تبصرہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الام میں امام شافعی کے اقوال کو اولاً امام بویطی نے جمع کرنا شروع کیا تھا لیکن اس کی تکمیل امام ربیع کے ہاتھوں ہوئی[2] اس سلسلہ میں امام ربیع کے ذکر میں قدرے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے[3]۔

امام سبکی نے امام بویطی سے منقول بعض دقیق وغریب مسائل کا استخراج کیا ہے، اسی طرح امام نووی نے بھی مختصر البویطی کی کتاب العتق، کتاب الولاء، کتاب الطلاق، کتاب البینۃ کے بعض دقیق مسائل کا استخراج کیا ہے، جن سے امام بویطی کی صلاحیت، استقراء اور اخذ و استدلال میں دقیقہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ان مسائل کو شرح و بسط کے ساتھ ان اوراق پر پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا، لیکن امام بویطی سے منقول امام شافعی کے چند دلچسپ اقوال قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں :-

امام بویطی نے امام شافعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ شرافت و نجابت میں سے یہ بات نہیں کہ آدمی اپنی عمر بیان کرتا پھرے، امام بویطی کا بیان ہے کہ امام شافعی سے دریافت کیا گیا کہ احکام یا علم فقہ کے اصول کتنے ہیں؟ فرمایا پانسو، امام مالک کے پاس ان میں پینتیس اصول کم ہیں جبکہ سفیان بن عیینہ کے نزدیک صرف پانچ اصول کم ہیں۔ ایک اور دلچسپ قول امام بویطی یہ نقل کرتے ہیں کہ ثرید کو پلیٹ کے درمیان سے

---

۱ معجم المصنفین: ٹونکی، ج ۲، ص ۲۳۹ تا ۳۰۷

۲ اختلاف الفقہاء للطحاوی: معصومی ص ۱۲

۳ معارف ج ۱۲۴ عدد ۵

۴

مانا، دو پھلوں کو ایک ساتھ کھانا، اور رات کے وقت پردیس سے گھر آنا حرام ہے،
مسئلہ بھی وہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات بار دھویا
ے گا اور پہلی و آخری مرتبہ اسے مٹی سے دھویا جائے گا، ورنہ وہ پاک نہ ہوگا،
زیر کو وہ اسی پر قیاس کرتے ہیں۔ وہ یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ اہل حدیث کی
یت و اقوال کو اختیار کرو کہ دوسروں کے بہ نسبت یہ زیادہ قریب صواب ہوتے ہیں[1]
بہرحال امام بویطی کی اس جلالت شان و مرتبت علمی کے باوصف، علامہ ابن حجر
سقلانی نے ان دس ائمۂ کبار میں جن سے کہ مسلک شافعی کی ترویج و اشاعت ہوئی،
ام بویطی کا ذکر نہیں کیا، اور اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ امام بویطی کی زندگی کا وہ حصہ
امام شافعی کے بعد ان کی فقہ کی اشاعت میں زیادہ مفید و معاون ہوتا، امام بویطی
ے فتنۂ خلق قرآن کی ابتلا و آزمائش کی وجہ سے، افادۂ عام کے نقطۂ نظر سے زیادہ
سرگرم عمل نہ رہ سکا، ورنہ کبار اصحاب شافعی میں ان کا شمار چند اولین ناموں میں ہوتا ہے،
بلکہ خود امام عسقلانی نے انھیں ایک جگہ، امام مشہور اور مرتبت کے لحاظ سے سب سے
ائق کے الفاظ سے یاد کیا ہے[2]۔ اور علامہ سیوطی نے تو انھیں مصر کے علمار مجتہدین میں
مار کیا ہے[3]۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام بویطی کا ذکر ان کے کارناموں کے شایان شان
ل تفصیل سے نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے، خطیب بغدادی کا احساس بھی یہی تھا
ہ و قد کتب عنہ شئ یسیر[4] ان کے بارے میں بہت تھوڑا لکھا گیا ہے۔

---

[1] طبقات کبریٰ: سبکی، ج ۱، ص ۲۷۷، ۲۷۸ [2] معجم المصنفین، ص ۲۶۱۔ [3] حسن المحاضرۃ، ج ۱، ص ۱۲۳ [4] تاریخ بغداد: خطیب، ج ۱۴، ص ۳۰۲۔

کشمیر میں اسلام کی اشاعت

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سری نگر (کشمیر)

کشمیر میں اسلام کی اشاعت عصرِ حاضر کے کچھ محققین کا دلچسپ موضوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں داخلۂ اسلام کی تاریخ متعین نہیں ہے، اس کی قدیم کتب تاریخ اس بارے میں صاف اور واضح معلومات فراہم نہیں کرتی ہیں۔ یہاں اسلام کی تاریخ عام طور پر چھ سو سال پرانی بتائی جاتی ہے مگر اس کے بعض علاقے بنو امیہ کے عہد حکومت (۴۱ھ تا ۱۳۲ھ) میں ہی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور یہ بات مستبعد ہے کہ اسلام کی ابتدائی سات سو سالہ مدت میں یہ خطہ اسلام اور مسلمانوں سے بالکل ناآشنا رہا ہوگا۔ اس کے متاخر مؤرخین کے نزدیک میر سید علی ہمدانی (م ۱۳۸۴ء) پہلے صوفی مبلغ تھے، جن کی وجہ سے یہاں انقلاب آیا، اگرچہ ان سے نصف صدی پیشتر سید شرف الدین عبدالرحمان (بلبل شاہ) یہاں تشریف لائے تھے، مگر ان کی تبلیغی کامیابی زیادہ موثر نہیں ہوئی۔ عصر حاضر کے چند محققین نے کچھ نئی باتیں دریافت کی ہیں، اور اب وہ اس پر متفق ہوئے ہیں کہ کشمیر میں بہت قدیم زمانے میں اسلام داخل ہوا تھا، اور مسلمان حملہ آوروں، تاجروں اور مبلغوں نے شیخ ہمدانی جیسے کامیاب مبلغوں کے لئے بڑی حد تک میدان ہموار کیا تھا۔ ڈاکٹر سٹائن (STEIN) نے راج ترنگنی کے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں لکھا ہے :-

کشمیر میں اسلام نے کسی جنگ کے زور سے راہ نہیں پائی ہے، بلکہ اسلام یہاں تدریجی تبدیلی سے پھیلا جس کے لئے جنوب اور وسط ایشیا سے آئے ہوئے بیرونی مہم جو اور قسمت آزمائی کرنے والوں نے میدان ہموار کیا تھا[1]

ان محققین کی اس تحقیقی کاوش کے باوجود موضوع ابھی ہر لحاظ سے تحقیق و تفحص کا محتاج ہے۔

کشمیر کے اسلامی عہد کے قدیم مورخین اور تذکرہ نگار | کشمیر کے قدیم مسلمان مورخین اور اشاعتِ اسلام

یہاں داخلۂ اسلام کے بارے میں عموماً یہ رائے رکھتے ہیں کہ حضرت سید شرف الدین عبدالرحمان معروف بہ بلبل شاہ (م ۷۲۷ھ) پہلے مسلمان تھے جو یہاں وارد ہوئے، اور یہاں کے معاصر حکمراں کو، جو بدھ مت کا پیرو تھا، مسلمان بنانے میں کامیاب ہوئے، ہمارے ان مورخوں کا کہنا ہے کہ شیخ شرف الدین سے پہلے یہاں کوئی بھی مسلمان موجود نہ تھا، شیخ شرف الدین معجزانہ طور پر یہاں وارد ہوئے تھے۔ مشہور تذکرہ نگار شیخ داود مشکوتی (م ۱۰۹۷ھ) لکھتے ہیں :-

"دریں زماں از اہالی کشمیر ہیچ احدے بشرفِ اسلام مشرف نشدہ کہ از وے التماس اعراض اسلام می کرد"[2]	اس زمانے میں کشمیر کے باشندوں میں کوئی بھی شخص شرفِ اسلام سے مشرف نہ ہوا تھا جس سے حاکم وقت اسلام کے بارے میں کچھ دریافت کرتا۔

ماضی قریب کے ایک نامور کشمیری مؤرخ مولوی غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں :-

" تا عہد راجگانِ ہنود در کشمیر مذہب	ہندو راجاؤں کے عہد تک اسلام

---

[1] Stien's Introduction to English translation of Kalhana's Rajtarangni vol I

[2] اسرار الابرار (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری سری نگر۔

محری بالکل شائع نہ بود[1]"   بالکل شائع نہیں ہوا تھا ۔

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ شرف الدین کے ورودِ کشمیر سے پہلے یہاں کوئی مسلمان نہ تھا، اس وقت کا حکمرانِ کشمیر چاہتا تھا کہ وہ کسی اچھے مذہب کو اختیار کرے، اگر کشمیر میں کوئی مسلمان نہ تھا جو اس کے سامنے اسلام پیش کرتا ۔ مگر بالآخر شیخ شرف الدین یہاں تشریف لائے، اور اپنے روحانی تصرف سے بادشاہ کا دل مسخر کرتے میں کامیاب ہوئے ۔

مگر ان بیانات کے بالکل برعکس ایک اور نامعلوم کشمیری مؤرخ (جو مذکورہ دونوں مؤرخوں سے قدیم ہے) صاف لکھتا ہے کہ یہاں بدھ حکمراں کے زمانے میں مسلمان موجود تھے ۔

"دراں زماں اہالی کشمیر اندک   اس زمانے میں کشمیر کے باشندوں میں
جماعت مشرف باسلام بودند[2]"   ایک جماعت اسلام لا چکی تھی ۔

اور جب بادشاہ کو کوئی اچھا مذہب اختیار کرنے کی طرف دلچسپی پیدا ہوئی تو اس نے جہاں دیگر مذاہب کے نمایندوں کی طرف رجوع کیا، وہاں مسلمانوں سے بھی کچھ باتیں دریافت کیں، مگر یہ سب نمایندے بادشاہ کی پیاس بجھانے میں کامیاب نہیں ہوئے ۔ مؤرخ مذکور لکھتا ہے :-

"سلطان از اہل اسلام ہم قواعد   سلطان نے مسلمانوں سے بھی اسلام کے
وآداب اسلام مسألت نمود، ایشاں ہم   احکام وقواعد دریافت کیے، انھوں نے
تلقین احکام وارکان ایمان واسلام می کنند   بادشاہ کو ان احکام وارکان کی تلقین بھی
وبواسطۂ اختلاف مذاہب طرف   کی، مگر مسلمانوں کے اختلافات سے اسے
فریقین اطمینان خاطر واقرار دل او را   اطمینانِ خاطر اور سکونِ قلب

---

[1] تاریخ حسن ج ۱ ص ۲۲۴، محکمہ تحقیقات ونشریات سری نگر ۱۹۵۴ء ۔

[2] بہارستان شاہی (قلمی نسخہ) ریسرچ لائبریری سری نگر ۔

حاصل نہ ہوا۔ حاصل نہیں شدہ

یہ تینوں تاریخیں اسلامی عہد کی تاریخیں ہیں، اسلام سے پہلے جو کتابیں یہاں لکھی جاتی تھیں، ان کی زبان سنسکرت تھی۔ ان سنسکرت کتابوں میں کلہن پنڈت کی راج ترنگنی سب سے زیادہ مشہور رہی مگر تعجب یہ ہے کہ ان تاریخی کتابوں میں اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا کہ کشمیر میں اسلام کب داخل ہوا، اور مسلمان یہاں کس زمانہ سے وارد ہونے شروع ہوئے تھے، کلہن کی راج ترنگنی میں ضرور ترکشا اور ملیچھ یا جون راج کی تاریخ میں ویانا جیسے نام ملتے ہیں، جن کے بارے میں عصر حاضر کے محققین اس پر متفق الرائے ہیں کہ یہ نام راسخ العقیدہ ہندوؤں نے مسلمانوں ہی کے لئے استعمال کئے ہیں، مگر ان مختصر اشاروں اور مجمل کنایوں کے باوجود یہ تاریخیں زیر بحث موضوع سے متعلق ٹھوس معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔

ہندو مورخین کا سکوت اور اس کے اسباب | اہل علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس طرح اہل فارس نے عربوں کی سیاسی بالادستی کبھی دل سے قبول نہیں کی، اسی طرح بہت سے کشمیری ہندوؤں کے لئے اسلام کی اطاعت بڑی مصیبت کا مترادف تھی، اس کا اعتراف پروفیسر سری کنٹھ کول نے اگر صاف لفظوں میں نہ سہی مگر الجھی ہوئی عبارت میں ضرور کیا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے:-

"ہندوؤں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اگر قبول کیا تو مغلوبیت کی بنا پر کیا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اس مذہب میں اتنی لچک ہے کہ دوسرے مذاہب کو اپنے اندر سما سکتا ہے[1]۔"

---

[1] بہارستان شاہی (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری سری نگر

Prof. Koul's Introduction to Jonaraja's Rajtarangni P. 104

اسلام پھیلنے سے پہلے کشمیر ہندو مذہب اور ہندو و بدھ تہذیب و ثقافت کا گہوارہ تھا، یہی وجہ ہے
کہ یہاں اسلامی مبلغوں کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں بھی اس زمانے میں، جب عالمِ اسلام
عباسی خلفاء کے عہد میں علوم، فنون اور ثقافت میں معراجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا، علم، فن اور ادب کا
بازار گرم تھا، مذہبی اور طبقاتی تعصب یہاں کے لوگوں کی رگ رگ میں رچا ہوا تھا، یہاں جگہ جگہ مندر اور مٹھ
تھے، جو یہاں کی مذہبیت کا روشن ثبوت تھے، ان حالات میں ایک نئے مذہب کا داخلہ، جو ہندو
مذہب کے تمام رسوم و رواج کا قاطع ہو، بڑا مشکل تھا۔ مگر بالآخر جب یہ نیا مذہب مختلف اسباب
کی بنا پر یہاں داخل ہوا اور سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا تو یہاں کے ٹھیٹھ مذہبی طبقے کو بڑا دکھ ہوا، چنانچہ
جب وہ اسلام کے غلبے سے حالات کو دوبارہ موافق نہ بنا سکے تو انھوں نے تاریخ کے اوراق پر اپنے
غم و غصے کا اظہار کیا اور حالات کو بڑی مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیا، انہوں نے مسلمانوں کے لئے
کبھی مہذب اور شائستہ نام لینا بھی گوارا نہ کیا، بلکہ ان کے لئے ترکشا، ملیچھ اور دیانا نام استعمال کئے ۔
جون راج مؤرخ کی مبالغہ آمیزی کی ایک مثال درج کی جاتی ہے :۔

" جس طرح ہوا درختوں کو اکھاڑتی ہے اور ٹڈیاں دھان کی فصل برباد کرتی ہیں،

اسی طرح دیاناؤں نے کشمیر کی ہیئت و حالت تباہ و برباد کر کے رکھ دی[1] "

چنانچہ ان ہی جذبات کے زیر اثر یہ متعصب مورخین، جو بلاشبہ اپنے وقت کے بلند پایہ صاحب
علم و فن تھے، صحیح حالات و واقعات نہیں لکھ سکے، پروفیسر سری کنٹھ کول نے بھی جون راج کی راج ترنگنی

---

[1] Buddhism in Kashmir and Ladakh, J. N. Ganhar, P. 145

پنے فاضلانہ مقدمہ میں مورخ کے اس طرزِ عمل اور ذہن و فکر پر روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے
ئے کی تائید کی ہے، مثلاً پروفیسر موصوف لکھتے ہیں :-

"منگولوں نے کشمیر پر کئی بار حملے کئے مگر مؤرخ نے ان کی طرف کوئی اشارہ تک
نہیں کیا ہے۔ میر سید علی ہمدانی نے مؤرخ کے عہد ہی میں یہاں کے ہزاروں باشندوں
کو مسلمان بنایا، مگر اس نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ شیخ
ہمدانی کے ورودِ کشمیر کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے"۔ اسی طرح اس زمانے کی مشہور عارفہ
اور شاعرہ للہ کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے[1]"

پروفیسر کول نے اس شعوری سکوت کی وجہ مورخ کا ذات پات کا معتقد ہونا قرار دیا ہے۔
رت تذکروں میں ایک خامی اس لئے بھی پیدا ہوئی ہے کہ یہاں کی عام بول چال اور علمی و ادبی
سنسکرت تھی، یہاں کے اہل علم نے سنسکرت کی خدمت کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے
طرح انجام دی ہے، اس کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی مرکزِ علم مشکل سے کرسکتا ہے، سنسکرت
ت کے اس عروج اور پھیلاؤ نے ان بہت سے صوفیوں اور سیاحوں کے نام نسیاً منسیاً کر دئے
ید شرف الدین یا میر سید علی ہمدانی سے قبل کشمیر وارد ہوئے تھے، مسلمانوں کے اسلامی نام سنسکرت
نے والوں پر ضرور بارِ گراں گذرے ہوں گے۔ شیخ نورالدین ریشیؒ (م ۱۴۴۰ء) کے اشعار میں
ریشیوں کے جو نام بگڑی ہوئی صورت میں ملتے ہیں ان کے بارے میں پروفیسر محی الدین حاجنی
ہیں کہ میر سید علی ہمدانی کے ورود سے پہلے یہ بزرگ کشمیر میں اسلام کی شمع روشن کرچکے تھے[2]
فیسر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان قدیم مبلغینِ اسلام نے ماحول سے مجبور ہو کر ریشیت اختیار کی

---

[1] پروفیسر کول : ص ۴۲ - ۴۴ (ملخصاً)

[2] مجلہ شیخ نورالدین نورانیؒ : ص ۴۳، کشمیر کلچرل آرگنائزیشن، سری نگر۔

کیونکہ کشمیر میں بدھ مت اور ہندو مذہب کا دور دورہ تھا۔ بدھ اور برہمن رہبانیت اور غار نشینی کے زبردست قائل تھے۔ چنانچہ ان مبلغین اسلام نے بھی کشمیر کے لوگوں کا دینی مزاج سمجھتے ہوئے، ریشیت اپنائی ہوگی اور اس طرح کھل کر ماحول کی مخالفت کئے بغیر ہی صوفیانہ انداز اور خاموش طریقے سے اشاعتِ دین کا کام انجام دیا ہوگا۔[1]

کشمیر پر بیرونی اسلامی ممالک کا اثر | سنسکرت کی موجودہ کتابیں قابل قدر ہونے کے باوجود اس قابل نہیں ہیں کہ زیر بحث موضوع میں ان پر مکمل اعتبار اور انحصار کیا جائے، اس لئے ہمیں ان تاریخوں سے اخذ و افادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے ذرائع کی تلاش کرنا بھی ضروری ہے، بالخصوص کشمیر کے قدیم ملحقہ ممالک اور مضافات کی تاریخوں پر نگاہ ڈالنا ناگزیر ہے، تاکہ دیکھا جائے کہ ان ممالک کا کشمیر پر کوئی اثر تو نہیں پڑا ہے؟

سندھ | سندھ کے بارے میں یہ مسلّم ہے کہ یہاں اسلام محمد بن قاسم کے حملے سے بہت قبل پہنچا تھا اور یہاں مسلمانوں نے مسجدیں بھی بہت پہلے بنائی تھیں، سندھ اور کشمیر محمد بن قاسم کے عہد میں ایک دوسرے سے بالکل قریب تھے، دونوں ملکوں کے درمیان روابط تھے، بلکہ جغرافیائی اعتبار سے بھی دونوں ملک اتنے قریب تھے کہ کشمیر کے نشیبی اضلاع سندھ میں شامل تھے[2] اور شاید اسی قربت کی بنا پر مؤرخ ابوالحسن علی المسعودی (م ۳۴۶ھ) نے کشمیر کو سندھ اور ہند میں داخل سمجھا ہے[3] جو از روئے تاریخ درست نہیں ہے۔

عہد بنی امیہ میں اسلام کو جو ترویج و اشاعت ہوئی اس کے بارے میں مورخ علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:-

---

[1] مجلہ شیخ نورالدین نورانی ج ۲ ص ۳۰۴، کشمیر کلچرل آرگنائزیشن، سری نگر۔

[2] تاریخ سندھ: پروفیسر ابو ظفر ندوی، دار المصنفین، ص ۸۶

[3] مروج الذہب و معادن الجوہر ابوالحسن علی المسعودی، مطبوعہ مصر ۱۳۴۶ھ ج ۱ صفحہ ۱۰۳

كانت سوق الجهاد قائمة في بني امية ليس لهم شغل الا ذالك قد علت كلمة الاسلام في مشارق الارض ومغاربها وبرها وبحرها[1]۔

عہد بنی امیہ میں جہاد کے بازار گرم تھے، امویوں کا یہ خاص شغل تھا۔ ان کے دور میں شرق و غرب اور بحر و بر میں اسلام سربلند ہوا۔

اموی دور میں محمد بن قاسم ثقفی کا حملہ سندھ وجود میں آیا، جس سے کشمیر کا سیاسی اور مذہبی ماحول بھی متاثر ہوا۔ چچ نامہ میں ہے:۔

فتح ہندوستان بر دست محمد بن قاسم و امرائے عرب و شام در ایام اسلام ظاہر گشت و از دریائے محیط تا حد کشمیر و کنوج مساجد و منابر بنا شد[2]

ہندوستان میں جو محمد بن قاسم اور عرب و شام کے امراء کے ہاتھوں فتح ہوا اسی زمانے میں اسلام بھی داخل ہوا تھا اور دریائے محیط سے لیکر کنوج اور کشمیر کے حدود تک مسجدوں اور منبروں کی تعمیر عمل میں آئی۔

محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی اور وہ ۱۰ رمضان ۹۳ھ (جون ۷۱۲ء) میں قتل ہوا، اس کے بعد داہر کا بیٹا جیسیا عربوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑھا، مگر بالآخر اس کو بھی ہزیمت اٹھانی پڑی، داہر اور جیسیا کی فوج میں عرب سپاہی بھی تھے جنھوں نے میدان، صحرا، دریا اور جنگل طے کرکے کشمیر میں آکر پناہ لی، جیسیا کے مسلمان رفقاء میں ایک شامی عرب مسلمان جہم بن سامہ بھی تھا، کشمیر کے راجہ نے اس کی خوب قدر و منزلت کی اور اس کے قیام کے لئے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ابوالفداء اسماعیل بن کثیر (م ۷۷۴ھ) ج ۹ ص ۸۷۔

[2] چچ نامہ: تصحیح و تحقیق: عمر بن محمد داؤد پوتہ، مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء ص ۹

ایک اچھی جگہ فراہم کی، جو چچ نامہ میں شاکلہار کے نام سے موسوم ہے[1]۔ اس مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے جنرل کننگھم نے لکھا ہے کہ ممکن ہے یہ وہی جگہ ہو جو آج کلر کاہر کے نام سے موسوم ہے، اور کوہستان نمک میں واقع ہے، یہ جگہ اس زمانے میں کشمیر کے حدود میں داخل تھی[2]۔ کچھ عرصہ بعد جیسیا[3] مرگیا اور اس کی جگہ اس کا شامی رفیق جہم بن سالمہ اقامت پذیر ہوا۔ آگے چچ نامہ میں یہ عبارت مذکور ہے:

"وجہم بن سامہ بجائے او نشست	جہم بن سامہ جیسیا کی جگہ پر بیٹھا، جہم کی
ونسلِ او تا ایں غایت برقرار است	نسل آج تک یہاں برقرار ہے اور مسجدیں
ومساجد بنا کرد وقدر ومنزلت بکمال	بنائی ہیں، اس کی اولاد نے بڑی عزت
یافت وملک کشمیر اورا محترم داشتی"	پائی اور کشمیر کا راجہ بھی ان کی عزت کرتا ہے۔

ان اشاروں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے زمانے میں ہی کشمیر کی سرزمین میں اسلام پہنچ گیا تھا، گو مسلمانوں نے یہاں (شاید ہندو مذہب کے زبردست اثر و رسوخ کی وجہ سے) قدم جمانے میں کامیابی حاصل نہیں کی، پھر بھی چند لوگ یہاں کے حدود و اطراف میں آ بسے تھے، جن سے غیر مسلموں کا متاثر اور متعارف ہونا بعید از عقل نہیں ہے۔ علامہ ابن کثیر[4] نے اموی افواج وعساکر کی تاریخی خصوصیت بیان کی ہے، جن میں محمد بن قاسم کی فوج بھی شامل ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"وکان فی عساکرھم و	امویوں کے افواج وعساکر میں جنگ کے
جیوشھم فی الغزو الصالحون	دوران اولیاء، صلحاء اور علماء ہوتے تھے،

---

[1] چچ نامہ، تصحیح وتحقیق عمر بن محمد داؤد پوتہ، مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد سنہ ۱۹۳۹ء ص ۹۔

[2] بحوالہ تاریخ سندھ، پروفیسر ابو ظفر ندوی، ص ۸۷۔ [3] معارف:

عربی مورخین نے اس کا نام حلیشہ لکھا ہے، اس سے راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ مراد ہے۔

والاولیاء والعلماء من کبار	جو کبار تابعین میں سے تھے، ان کی فوجوں
التابعین فی کل جیش منهم	میں ایک بڑی جماعت ایسی تھی،
شرذمة عظيمة ينصر الله	جس کی کوششوں سے اللہ اسلام
بهم دينه[1]»	کی مدد کرتا تھا۔

ملتان | ملتان میں مسلمانوں کی آمد پہلی صدی ہجری ہی میں شروع ہو گئی تھی، مسلمان حملہ آوروں سے پہلے عرب تاجر یہاں پہونچ گئے تھے جو یہاں مقدسی کے عہد میں کثیر تعداد میں موجود تھے[2]۔ یہ قیاس لگانا غلط نہ ہوگا کہ ان تاجروں میں بعض کشمیر میں بھی وارد ہوتے رہتے ہوں گے، کشمیر کی تاریخوں میں کسی عرب یا کسی دوسرے ملک کے مسلمان تاجر اور سیاح کا نام اور تذکرہ نہیں ملتا، مگر اس عدم ذکر سے عدم وجود لازم نہیں آسکتا، عرب سیاح یہاں وارد ہوا کرتے تھے، جیسا کہ ہم آگے ذکر کریں گے، نیز تمام مورخین نے ملتان کے ایک عظیم الشان مندر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی زیارت کے لئے ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے لوگ آیا کرتے تھے[3]۔ ناممکن ہے کہ ان زائرین میں کشمیر کے راسخ العقیدہ ہندو اور بدھ مت کے پیرو کار یہاں نہ آتے جاتے ہوں گے، یہ مندر بھی اہل ملتان اور اہل کشمیر کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا ذریعہ بن گیا ہوگا، ملتان اور کشمیر کے باہمی تعلقات پر یہ تاریخی حقیقت بھی روشنی ڈالتی ہے کہ جب ملتان کے حاکم کنداطرے کو محمد بن قاسم کے ہاتھوں شکست ہوئی، تو وہ ملتان سے بھاگا اور اس نے کشمیر کے بادشاہ کے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ج ۹ ص ۸۷

[2] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، مکتبۃ المثنی بغداد ۱۹۰۶ء، ص ۴۸۰

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے Journal of Indian History میں ڈاکٹر سید مقبول احمد صاحب کا مقالہ Multan as described by Arab-Travellers.

ہاں پناہ لی[1]۔

عُسیفان | مؤرخ البلاذری لکھتا ہے کہ معتصم باللہ عباسی (۸۳۲ء تا ۸۴۱ء) کے عہدِ خلافت میں عُسیفان نام جگہ کا حکمراں اسلام کی طرف مائل ہوا، اس نے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا، پھر اس نے مسلمان تاجروں کو اپنے پاس بلایا، انھوں نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ متاثر ہوکر دائرۂ اسلام میں داخل ہوا۔ البلاذری مقام عسیفان کی تعیین کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ جگہ ملتان، کشمیر اور کابل کے درمیان واقع ہے[2]۔ پروفیسر ابو ظفر ندوی لکھتے ہیں کہ غالباً اس راجہ کا حکمراں پوشیدہ رہا ہو اور پڑوس کی اسلامی سلطنتوں نے نہ تو اس کی مدد کی ہو اور نہ وہاں کے لوگ اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے ہوں، ورنہ کیا تعجب تھا کہ محمود غزنوی تک یہ ریاست موجود رہتی[3]۔

اس سے اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا اثر قرونِ اولیٰ ہی میں وادی کشمیر کے بہت قریب آپہنچا تھا۔

تبت | تبت اور چین کے ساتھ بھی کشمیر کے گہرے تجارتی اور مذہبی تعلقات رہے، تبت، چین اور کشمیر بدھ مذہب کے مشہور ترین مرکز تھے اس بنا پر یہ روابط ہزاروں سال سے قائم تھے۔ ڈاکٹر برنیر (م ۱۶۸۸ء) نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ بیس برس سے پہلے کشمیر سے چین کو ہر سال کارواں جایا کرتے تھے[4] اور یہ تجارتی قافلے چین سے مشک، چوب چینی، ریوند اور مامیران

---

[1] تاریخ نامہ، ص ۳۲۸

[2] فتوح البلدان، ابوالحسن البلاذری، مطبعۃ المصریۃ الازہر، ۱۹۳۲ء، ص ۴۳۔

[3] تاریخ سندھ، ص ۱۸۵

[4] سفرنامہ ڈاکٹر برنیر (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، ص ۲۴۹

تعلقات :- اسی طرح تبت کے ساتھ بھی کشمیر کے صدیوں پرانے تعلقات ہیں۔ چین میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں اسلام داخل ہوا تھا۔ پھر قتیبہ بن مسلم الباہلی نے بہت جلد کاشغر پر اسلامی جھنڈا لہرایا۔ کاشغر اور کشمیر کے درمیان براہِ راست تجارتی تعلقات رہے اور بقول برنیر ان دونوں ممالک (کاشغر اور کشمیر) میں سیدھا اور نزدیک کا راستہ بڑی تبت ہے[2]۔ تبت کے بارے میں بھی ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں اسلام کب پہنچا، تاہم یہ بات یقینی ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے نصف اول میں یہاں مسلمان موجود تھے، مشہور عرب سیاح مسعر بن مہلہل ینبوعی (م ۳۳۱ھ) نے، جو تبت وارد ہوا ہے، یہاں کے لوگوں کے عادات اور مذاہب و عقائد کے بارے میں لکھا ہے:-

"ثم سرنا الی قبیلۃ تعرف	پھر ہم ایک قوم کی طرف چلے جو تبت سے
بتبت فسرنا فیھم اربعین یوما	معروف ہے، ہم یہاں چالیس دن تک
فی امن وسعۃ یتغذون بالبر	امن و اطمینان سے گھومے، یہاں کے
والشعیر و الباقلی وسائر اللحوم	لوگ جو، گندم، باقلی، گوشت کے
والسموک والبقول والاعناب و	جملہ اقسام مچھلیاں، سبزیاں، انگور اور
الفواکہ ویلبسون جمیع اللباس ...	میوے وغیرہ کھاتے ہیں، نیز یہ لوگ ہر قسم
وبھا قوم من المسلمین والیھود و	کے کپڑے پہنتے ہیں، یہاں مسلمان، یہود،
النصاری والمجوس والھند[3]"	نصاریٰ، مجوس، ہنود (بشمول بدھ) بستے ہیں،

---

[1] سفرنامہ ڈاکٹر برنیر (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، ص ۲۵۰

[2] ایضاً

[3] معجم البلدان، یاقوت الحموی الرومی، مطبعۃ السعادۃ، مصر ج ۵ ص ۱۰۴

پنجاب سندھ اور ملتان کے ذریعہ اسلام پنجاب میں ساتویں صدی ہجری ہی میں داخل ہوگیا تھا، نویں صدی ہجری میں یہاں کے حکمراں نے ایک حادثہ سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرلیا جو البلاذری کے مطابق سنہ ۲۱۲ھ اور سنہ ۲۲۷ھ کے درمیان پیش آیا تھا[1]۔ کشمیر اور پنجاب کے درمیان بھی گہرے تعلقات رہے ہیں، مسٹر آر سی۔ رائے نے لکھا ہے کہ البلاذری کے کشمیر سے مراد غالباً پنجاب میں شمالی ملتان ہے جو اس زمانے میں کشمیر کے کرکوٹا راجاؤں کے قبضہ میں تھا[2]۔ بزرگ بن شہریار کا بیان ہے کہ کشمیر بالا اور کشمیر زیریں[3] کے ایک علاقے کے راجہ مہروک نے منصورہ کے حاکم عبداللہ ابن عمر کو اسلام سمجھنے کے لئے رہبری حاصل کی، انھوں نے ایک عراقی نوجوان کو راجہ کے پاس بھیجا اور اسی نوجوان نے راجہ کو اسلام اور اسلامی عبادات و عقائد سمجھائے[4]۔

کشمیر پر مسلمان سلاطین کے حملے کشمیر عربوں یا دوسری اسلامی سلطنتوں کے زیر نگیں تو نہیں ہوا، مگر اس کی کوششیں کئی بار عمل میں آئیں، کوششوں کا سلسلہ خود محمد بن قاسم ہی سے شروع ہوتا ہے۔

محمد بن قاسم محمد بن قاسم ثقفی نے جب پنجاب زیریں اور سندھ کو ۱۱۷ھ اور ۱۱۳ھ کے درمیان اپنے قبضے میں لایا تو وہ ملتان کی طرف بڑھا اور کشمیر کے حدود تک اپنی فوج بھیج دی عربوں کی اسی چڑھائی کے خوف سے کشمیر کے راجہ کندرا پیڈا (یا چندرا پیڈ) نے چین کے

---

[1] عہد اسلامی کا ہندوستان؛ سید ریاست علی ندوی، ادارۃ المصنفین پٹنہ، ص ۳۶۔

[2] Dynastic History of northern India

[3] چند قدیم مؤرخین نے کشمیر بالا اور کشمیر زیریں یا داخلی اور خارجی کشمیر جیسے جو نام اپنی تاریخوں میں ذکر کئے ہیں، ان سے ازمنہ وسطیٰ میں کشمیر کے جغرافیائی حدود پر روشنی پڑتی ہے، ان ناموں کی مختصر تعیین ڈاکٹر سید مقبول احمد نے الادریسی کی نزہۃ المشتاق (حصہ متعلقہ ہند) میں اپنے انگریزی ترجمہ اور فاضلانہ مقدمہ میں کی ہے، ملاحظہ ہو ص ۹۹ تا ۱۰۰ و ۱۴۲، مطبوعہ لیڈن سنہ ۱۹۶۰ء

[4] مخدوم جہانیاں جہاں گشت، محمد ایوب قادری، ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی، ص ۹۔

حکمرانوں سے مدد کی درخواست کی چین کے حکمراں کی طرف سے راجہ کو کوئی مدد نہ ملی، اسی دوران سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا، اس نے محمد بن قاسم کو دمشق بلا لیا، اسی کے ساتھ یہ حملہ بھی کشمیر سے ٹل گیا۔

خلیفہ ہشام | محمد بن قاسم کے بعد عربوں کی طرف سے ہشام بن عبدالملک کے عہد (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) میں کشمیر پر حملے ہوئے۔ اس زمانے میں للتادتیہ (۷۲۴ء تا ۷۶۰ء) کشمیر کا پر وقار اور با جبروت حکمراں تھا، وہ ایک طرف گجرات، سراندیپ، مالوہ اور دوسری طرف تاشقند، کاشغر اور ختن کو مسخر کر کے اپنے قبضۂ اقتدار میں لے آیا تھا۔ خلیفہ ہشام کے زمانے میں سندھ کی حکومت پر جُنَید بن عبدالرحمان کا تقرر ہوا۔ جُنَید نے یہاں چار سال (۱۰۷ھ تا ۱۱۱ھ) حکومت کی، ۱۱۱ھ میں اسے خراسان کی حکومت سنبھالنے کے لئے بھیجا گیا، جنید نے سندھ کی حکومت کے دوران کشمیر پر چڑھائی کی، لیکن للتادتیہ نے اسے شکست دی، عربوں نے اس کے بعد بھی کشمیر پر حملہ کیا، جس کو روکنے کے لئے للتادتیہ نے چین کے بادشاہ سے مدد طلب کی جو اسے نہ ملی، مگر اس کے باوجود للتادتیہ اور اس کی فوج نے عربوں کو آگے بڑھنے نہ دیا۔

منصور عباسی | اس کے باوجود عرب کشمیر سے غافل نہیں رہے، عباسی دور میں جب منصور تختِ خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے سندھ کے لئے ہشام بن عَمرو التغلبی کو بحیثیت گورنر منتخب کیا، اس نے کشمیر پر قسمت آزمائی کی، مگر اس مرتبہ بھی عرب وادی میں قدم نہ رکھ سکے، البتہ ہشام نے کشمیر کے حدود بالخصوص کوہِ ہمالیہ کے ڈھلوانوں تک اپنی فوج پہنچا دی، مورخ البلاذری نے اس واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے:

"ولیّ امیر المومنین — امیر المومنین منصور نے ہشام بن عمرو التغلبی

Kashmir under the Sultans, Prof. Muhibul Hasan. P. 27

المنصور رحمہ اللہ هشام بن عمرالتغلبی السند ففتح ما استغلق ووجہ عمرو بن جمل فی بوارج الی نارند ووجہ الی ناحیۃ الهند فافتتح قشمیرا[1]

کو سندھ کا گورنر بنایا، اس نے بہت علاقے فتح کئے، جو ابھی تک زیرنگیں نہیں آئے تھے اور اس نے جنگی جہازوں کا بیڑا عمرو بن جمل کی سرکردگی میں نارند (گجرات کا مغربی ساحل) کی طرف بھیجا، اور خود ہند کے دوسرے علاقوں کی طرف متوجہ ہوا، اور کشمیر کا علاقہ فتح کیا۔

منصور کے عہد میں بھی عرب فوجوں نے کشمیر کو اپنی وسیع وعریض قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کی اور شاید یہ عرب حملہ آوروں کی آخری یورش تھی، ان چند حملوں کے دوران اگر عربوں کو وادی میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے کشمیر کے بہت سے نشیبی علاقوں میں اپنے جھنڈے نصب کئے تھے جس کی بنا پر کشمیر کے حکمرانوں کو حفظِ ماتقدم کے طور پر کئی مرتبہ تیاری کرنی پڑی، سرحدی علاقوں پر سخت نگرانی رکھی، بلکہ کئی مرتبہ مقابلہ آرائی کی نوبت بھی آئی، شاید اس ہلچل کے دوران کشمیر کے اندر نہ مسلمان آگئے ہوں، کیونکہ ہر مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ مبلغین اسلام کی جماعتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ (باقی)

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۱۔

مطبوعات جدیدہ

جمال الدین اسنوی مرتبہ ڈاکٹر حافظ عبد العلیم خاں، تقطیع کلاں کاغذ بہتر،
اور ان کی طبقات الشافعیہ طباعت ٹائپ، صفحات ۱۰۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ شعبہ
دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

امام شافعیؒ اور ان کے متبعین کے حالات میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن قاضی شہبہ (م ۸۵۱ھ) کی طبقات الشافعیہ بھی ہے، ڈاکٹر عبد العلیم خاں لکچرر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی نے اس پر مقالہ لکھ کر مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی مقالہ کی ترتیب و تالیف کے سلسلہ میں ان کو جن غیر مطبوعہ طبقات شوافع کا مطالعہ کرنا پڑا ان میں آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز عالم جمال الدین اسنوی کی طبقات الشافعیہ بھی تھی، انھوں نے اصل مقالہ مکمل کرنے کے بعد اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور ماہنامہ برہان میں اس پر ایک طویل مضمون لکھا، اب اسی کو ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا ہے، یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اسنوی کے حالات تلاش و محنت سے لکھے گئے ہیں، اس میں ان کے خاندان، وطن تعلیم، تدریس، اساتذہ، طلبا، تصنیفات کا ذکر ہے، اور آخر میں طبقات الشافعیہ کا مفصل تعارف کرایا ہے دوسرے حصہ میں اسنوی کی کتاب میں جن اشخاص کا تذکرہ ہے، ان کی فہرست دی ہے اس میں ہر شخص کا شجرۂ نسب تاریخ ولادت و وفات بھی درج ہے، یہ فہرست خدا بخش خاں لائبریری

پٹنہ کے مخطوطہ سے مرتب کی گئی ہے، ہر شخص کے تذکرہ میں اس کے صفحات کا حوالہ بھی دیدیا ہے اور حواشی میں طبقات کے علاوہ دوسری کتابوں کی مدد سے اسماء و اعلام، اماکن اور نسبتوں کے متعلق مزید معلومات بھی تحریر کئے گئے ہیں، اسنوی کی طبقات الشافعیہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اگر اس کا مکمل متن تصحیح و مقابلہ کے بعد شائع کیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا تاہم اس فہرست سے بھی علمی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی،

علامہ حمید الدین فراہیؒ مرتبہ مولوی محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات ۱۶۰ مع خوب صورت ٹائٹل، قیمت تحریر نہیں، پتہ مکتبۂ اصلاح سرائے میر اعظم گڈھ۔

زیر نظر کتاب میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کی علمی عظمت تفسیر قرآنیات میں بلند پایگی اور مجتہدانہ بصیرت کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں بعض اہل علم کے تاثرات کے علاوہ قدیم مفسرین کے تفسیری اقوال سے مولانا کے تفسیری خیالات کا موازنہ کرکے ان کی انفرادیت و جدت دکھائی گئی ہے، اور ان کے بعض تفسیری اصول خصوصیات اور قرآن کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کی جامعیت و دقت نظر پر گفتگو کی گئی ہے، مصنف نے مولانا کی علوم اسلامیہ کو عجمی اثرات سے پاک کرنے اور ان کو قرآن کی روشنی میں از سرِ نو مدوّن کرنے کی کوششوں کا ذکر کرکے ان کو ایک علمی مجدد ثابت کیا ہے، ابھی تک مولانا کے علمی افکار پر بہت کم لکھا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ کوشش لائق تحسین ہے، ابتدا میں مولانا کے مختصر حالات بھی درج ہیں، سر سید احمد خاں مرحوم، پروفیسر آرنلڈ اور سر اکبر حیدری اور مولانا ابو الکلام آزاد کے تعلق سے مولانا کے جو واقعات نقل کئے گئے ہیں، وہ بلا حوالہ ہیں اس لئے ان کی صحت مشکوک ہو گئی ہے،

ایک جگہ لکھتے ہیں "ایک ایسے ترقی یافتہ دور میں علامہ فراہی کے جانشینوں کی معذوریاں دیکھو کہ ابھی علامہ کی اصل کتابیں تک شائع کرنے کا ہوش نہیں ہے"، یہ انداز شایستگی کے منافی ہے۔

تذکرۂ نسخۂ دلکشا۔ تصحیح و ترتیب جناب رئیس انور رحمن صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۱۴ مجلد مع گرد پوش قیمت بیس روپے، پتہ: نشاط ایک اسٹورس ۳۲ فیرس لین کلکتہ۔

گذشتہ صدی عیسوی کے بنگالی ہندؤں میں جنم جئے مترا رماں اردو کے صاحب کمال ادیب و شاعر تھے، دیوان کے علاوہ چند اردو تصانیف بھی ان سے یادگار رہیں، ان میں منتخب التذکرہ اور نسخۂ دلکشا اردو شعراء کے تذکرے ہیں، اول الذکر اردو کے مشہور بنگالی خدمت گذار جناب شانتی رنجن بھٹاچاریا کی کوششوں سے چھپ چکا ہے، اور موخر الذکر ۱۸۸۰ء میں ادھورا شائع ہوا تھا، جو اب کمیاب تھا، اور غیر شائع شدہ حصہ ہندوستان میں بالکل ہی نایاب تھا، دس گیارہ برس پہلے مالک رام صاحب نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے اس کا عکس لیکر اپنے سہ ماہی رسالہ تحریر میں اس کی تلخیص شائع کی تھی، اب کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایک ہونہار ریسرچ اسکالر جناب رئیس انور رحمن نے ۱۸۸۰ء کے مطبوعہ حصہ کے ساتھ یہ تلخیص بھی تصحیح کے بعد شائع کی ہے، اس طرح ارمان کا یہ تذکرہ ایک حد تک مکمل صورت میں پہلی دفعہ شائع ہوا ہے، رئیس انور رحمن صاحب پروفیسر ڈاکٹر عبیب الرحمن کے لائق فرزند اور تلاش و تحقیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، زیر نظر تذکرہ کے شروع میں ان کے قلم سے ایک مفید مقدمہ بھی ہے جس میں ارمان کے اب تک دستیاب حالات اور زیر نظر تذکرہ کے متعلق ضروری

معلومات سلیقہ سے تحریر کی گئی ہیں، اس میں تذکرہ کی خوبیوں اور خامیوں کے علاوہ ارمان کا ادبی و شاعری حیثیت سے درجہ بھی واضح کیا ہے، ارمان کا یہ تذکرہ بہت مختصر ہے، انھوں نے بعض شاعروں کا صرف تخلص لکھ کر نمونۂ کلام دیدیا ہے، اور بعض کا حال چند فقروں اور جملوں میں لکھا، لیکن بعض کے کلام کے متعلق اپنی معتدل رائے بھی تحریر کی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنگال اور دوسرے علاقوں اور خاص طور پر بنگال کے ایسے شعرا کا ذکر ہے، جن سے متداول تذکرے خالی ہیں، اس لئے اس کی اشاعت پر مرتب تحسین کے مستحق ہیں، امید ہے کہ ان کی تلاش و محنت کی قدر کی جائے گی۔ (ض)

فارم ۷۱

دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :۔	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	۔ ۔ ۔
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	۔ ۔ ۔

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں
سید اقبال احمد

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

اپریل ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

.....٭.....

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۵ ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ہجری سنہ کے چودہ سو برس ہو گئے، اس کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس طویل عرصہ میں مسلمانوں نے دنیا کے لوگوں کو کیا دیا، اور اُن سے خود کیا لیا،

وہ ایک ایسی ملت ہے کہ جس کے متعلق قرآن حکیم نے کہا کہ اس کا کام توحید اور رسالت کے جلووں کا قائم کرنا، محتاج اور کس مپرس انسانوں کو اپنے مال کا شریک بنانا، سچائی اور راست بازی کا حکم دینا، ہر طرح کی برائیوں اور ظلم و فساد کو روکنا، خدا کی راہ میں جان و مال برباد کر کے انسانیت کے چہرے کو آب و رنگ دینا ہے، انھوں نے اپنے ہاتھوں میں تلواریں ضرور لیں، مگر یہ تلواریں سررشتہ حیات کو کاٹنے کیلئے نہیں، بلکہ انسانی عظمت کی پاسبانی اور دنیاوی بہبود کی پشتیبانی کے لئے اٹھائی گئیں، اور اگر ذہن صاف ہو تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسلام ابر کرم کا چھینٹا ہے، نسیم سحر کی موج حیات ہے، بوئے گل کا قافلہ ہے، ہاتھوں میں تلواریں لے کر اس بڑھنے والی قوم نے علم و فن کی بزم کس طرح سجائی، وہ انسانی تاریخ کے زریں کارنامے ہیں، انہی کی بدولت بغداد رشک ارم بن گیا، ایران کے مٹے ہوئے نقش و نگار ابھر آئے، قرطبہ اور غرناطہ علمی آرزوؤں اور تمدنی تمناؤں کے عشرت کدے اور گلکدے بن گئے، یونان کی برہم شدہ مجلس علم پھر گرم ہو گئی، صقلیہ کی اسلامی حکومت کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی، ہندوستان جنت نشان بن گیا،

یونان اور روم مر چکے تھے، یورپ میں ذہنی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، ایران میں فکری طوائف الملوکی تھی، ہندوستان جاگ کر پھر سو رہا تھا، تو بغداد منصور سے معتضد باللہ کے عہد تک بیت الحکمت بنکر علوم کے انوار سے منور ہو رہا تھا، گیلن، سقراط، افلاطون، ارسطو، اقلیدس، بطلیموس اور ہرقل کو عرب حکما نے اپنی زبان عربی میں جس طرح سمجھایا، اسی کے سہارے یورپ کے فلسفیوں نے ان کو جانا

یہ اور بات ہے کہ ان فلسفیوں نے اپنے ماہرانہ انداز میں ان کو اپنے رنگ میں ایسا رنگ لیا کہ عرب حکماء کی ساری موشگافیاں دب کر رہ گئیں،

بغداد کی طرح قرطبہ، غرناطہ اور قاہرہ بھی علمی مرکز بنے، اہل یورپ یہاں کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے، پوپ سیلوسٹر ثانی نے اپنی تعلیم قرطبہ کی اسلامی درسگاہ میں پائی، مصر کے فاطمی حکمران کے زمانہ میں قاہرہ کی علمی شہرت سے بحراوقیانوس اور بحر منجمد کے ممالک متاثر تھے، یورپ اس عہد میں بڑے مشکل دور سے گذر رہا تھا، کانسٹنٹائن اور اس کے جانشینوں نے اپنی راسخ العقیدگی میں تمام کتب خانوں میں قفل لگا رکھا تھا، علم کو جادو سمجھا جاتا تھا، اس کے حصول کو غداری قرار دیا جاتا تھا، فلسفہ و سائنس در بدر کرد ہ گو تھی، اصلی عبادت کی ماں عدم واقفیت تھی، پوپ گریگوری اعظم نے روم میں سائنس کی تعلیم کی ممانعت کر دی تھی، آگسٹس نے جو عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا، وہ جلا دیا گیا تھا، یونان اور روم کے فلسفے نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، آزادی فکر پر ہر قسم کی پابندی تھی،

اسی زمانہ میں بغداد میں ایک ایسا مکتب فکر ابھرا، جو ہر چیز کی علت و معلول کی تفتیش میں لگا ہوا تھا، آج یورپ کو اپنے طریق استخراج و استنباط پر ناز ہے لیکن اس کی ابتدا عرب حکماء ہی کی طرف سے ہوئی تھی، ان علوم میں جن میں تجربے کے ذریعے سے نتائج کی تصدیق ہو سکتی ہے، عرب بہت آگے بڑھ گئے، ابن رشد کو ارسطو کا شارح خیال کیا جاتا ہے، مگر بہت سے مسائل میں اس کی رائے ارسطو سے بہتر سمجھی گئی، اس کا فلسفہ پیرس و شمالی اٹلی کے تمام شہروں میں مقبول رہا، فرانسسکن فرقہ کے عیسائی تو اس کے پیرو ہو گئے تھے، وینس کے طبقہ اعلیٰ پر اس کا اثر اتنا بڑھا، کہ کلیسا نے اس کے عقائد کو قابل نفرین قرار دیا، بو علی سینا کو تو یورپ والے مشرق کا ارسطو تسلیم کرتے ہیں،

ابن ہیثم طبیعیات کا بڑا ماہر تھا، اس کی کتاب المناظر کے ترجمے لاطینی اور اطالوی زبانوں میں ہوئے کپلر نے

اس سے بڑا استفادہ کیا ہے، اس کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے جو سب یورپ نے چرا لی تھیں۔ ابو موسیٰ جابر علم کیمیا کا موجد تھا، اسی کی تصانیف سے شورے کے تیزاب، ماء الملوک، نوسادر، چاندی کے شورے، زیبق سلیمانی، راسب الاحمر وغیرہ جیسی چیزیں یورپ والوں کو معلوم ہوئیں،

جبر و مقابلہ بھی عربوں کی خاص چیز ہے، وہی اس علم کے موجد ہیں، انھوں نے علم مثلث کے حسابات میں جیب اور قطر کے بجائے محاسبہ کا استعمال کرنا سکھایا، اقلیدس میں جبر و مقابلہ سے کام لیا، مکعب مساوات کا حل کرنا بتایا، علم مثلث کروی میں مثلثات حل کرنے کی چند ایسی شکلیں بنا دیں، جن سے یہ علم بالکل بدل گیا، یہ شکلیں اب تک مستعمل ہیں، جرمنی کے جان ملر نے اس سے بڑا استفادہ کیا،

نجوم و ہیئت کے علوم میں ماشاء اللہ، احمد بن محمد نہاوندی، سند بن علی، یحییٰ ابن ابی منصور، خالد بن عبد الملک، ابو معشر، ابو الحسن، النایریزی، محمد بن عیسیٰ، ابو عبد اللہ جیسے فضلاء یورپ میں پیدا نہ ہو سکے، عربوں میں محمد ابن جبر البتانی کی وہی حیثیت تھی جو یونانیوں میں بطلیموس کی تھی، اس کی زیج کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا، جس سے یورپ کے ہیئت داں صدیوں تک استفادہ کرتے رہے، ریاضیات میں اس کی بعض اصطلاحات ابھی تک وہاں مروج ہیں، چاند کی حرکت کا ماہر ابن باجور تھا، جس کی فضیلت ہر جگہ تسلیم کی گئی، اس نے یہ معلوم کیا تھا کہ چاند کا فاصلہ آفتاب سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، جو بطلیموس کی رائے کے بالکل خلاف تھا، آل بویہ کے زمانہ میں عبد الرحمن صوفی نے ستاروں کی روشنی کے معلومات کے علم میں بڑا اضافہ کیا، خراسان میں ابو الوفا نے اختلافِ حرکتِ قمر سے متعلق جو انکشافات کئے، ان سے چھ سو برس بعد ٹائکو براہے نے بڑا فائدہ اٹھایا، اور ابو الوفا کی ساری تحقیقات اس کی طرف منسوب کر دی گئیں، گھڑی کے پنڈولم کا موجد ابن یونس تھا، اس نے زیج الاکبر الحاکمی لکھی تو بطلیموس کے کارنامے ماند پڑ گئے، یہ یونان اور چین میں بہت مقبول ہوئی، ہیئت کی کتابوں میں اب بھی یہ درج کی جاتی ہے،

یورپ میں جو پہلی درسگاہ بنی، اس کی تعمیر کرنے والا جابر بن عفیہ تھا، عمر خیام اور عبد الرحمن الخزینی

نے جو زیج تیار کی وہ گریگوری کلینڈر سے چھ سو برس پہلے تھی کپلر جدید ہیئت کا بانی سمجھا جاتا ہے مگر اس سے ڈیڑھ سو برس پہلے الغ بیگ نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی، سیاروں کے افلاک یعنی دوائر حرکت کا بیضاوی ہونا اور زمین کا آفتاب کے گرد حرکت کرنا ان دونوں مسئلوں کو عربوں نے کیپلر اور کاپرنیکس سے پہلے معلوم کر لیا تھا، الفانس دہم کی زیج الفنسیہ عربوں کی تحقیقات سے ماخوذ ہے، ابو الحسن مراکشی نے آلات رصد پر ایک کتاب ابتدا روانتہا لکھی جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا، عربوں ہی نے اجرام سماوی کی حرکات کی زیج تیار کی، منطقۃ البروج، اور اس کے زاویے کے بتدریج کم ہونے کی صحیح تحقیقات کی، چاند کے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف دریافت کیا۔

عرب جغرافیہ دانوں نے بطلیوس کی بہت سی غلطیاں نکال کر دکھائیں، اور یہی نے جغرافیہ کا علم یورپ میں پھیلایا، اس کی تصانیف کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے، ابو الفداء سے پہلے ساٹھ جغرافیہ داں ایسے ہوئے جن کی جغرافیائی معلومات ہر گوشہ میں کارآمد سمجھی گئیں، بیرونی طول البلد اور عرض البلد معلوم کرنے میں بڑا ماہر تھا، مسلمانوں اور خصوصاً عربوں نے دنیا کے مختلف گوشوں میں سفر کئے، اور ایسی جگہوں کے سفرنامے لکھے جن سے یورپ بالکل واقف نہ تھا، وہ بحری سفر کے عادی رہے، اسلئے انھوں نے کمپاس کی بھی ایجاد کی تھی جس سے یورپ آج پورا فائدہ اٹھا رہا ہے، اسی کے ذریعہ سے مسلمان افریقہ، ہندوستان، ملایا، اور چین تک پہنچے، پھر کولمبس سے پہلے امریکہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے، اور جب یورپ کو یقین تھا کہ زمین چپٹی ہے تو مسلمان جغرافیہ دان جغرافیہ میں درس گلوب کے ذریعہ سے دیتے تھے۔

علم طب میں ابن زکریا رازی، علی ابن عباس، بو علی سینا، ابو القاسم خلف ابن عباس ابو مروان ابن عبد الملک ابن زہر، البتاسس، ابو ولید، محمد ابن رشد، اور عبد اللہ ابن علی بیطار کی طبی مہارت سے پورا یورپ حیرت زدہ رہا، الرازی کی اکثر تصانیف کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے، اس کی کتابیں یورپ کی اکثر درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں، بو علی سینا کی تصانیف کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں

میں ہوئے، جو پندرہ صدیوں تک مطب کا [illegible] رہا، عربوں میں سب سے بڑا جراح قرطبہ کا ابوالقاسم تھا جس نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کئے، پندرہویں صدی عیسوی میں اس نے یورپ میں بڑی شہرت حاصل کی جراحی کا دارومدار اسی کی تصانیف پر تھا، اشبیلیہ کے ابن زہیر کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے جراحی، معالجات اور خواص الادویہ کو یکجا کر دیا، سمیات اور حمیات پر ابن رشد کی تصانیف وقتاً میں برابر چھپتی رہیں، شفاخانوں کے قیام، حفظان صحت کے اصول، امراض کی تشخیص کے طریقے، اور قرابادین وغیرہ کے فن کو اہل یورپ نے عربوں سے بہت کچھ سیکھا، یونانیوں کی اناٹومی اور فارمیسی کے علوم کو عربوں نے بہت آگے بڑھایا،

عربوں نے علم نباتات میں جو ترقی کی وہ اس کے یوروپی ماہرین سے بہت آگے تھی یعنی علم الحیوانات کا ماہر ہے، مگر سات سو برس پہلے اس علم کی ابتداء الدمیری نے کی، بوعلی سینا کی کتاب الاحجار میں پہاڑوں سے متعلق جو کچھ درج ہے، وہ علم طبقات الارض کا قیمتی ماخذ ہے، اس سے یورپ والے آج بھی فوائد حاصل کر رہے ہیں،

بارود بھی عربوں کی ایجاد ہے چینیوں کے یہاں بارود کے ابتدائی اجزاء آتش بازی میں استعمال ہوتے تھے لیکن بارود کی قوت نفوذیہ کا استعمال عربوں ہی نے کیا، انھوں نے بندوق اور توپ کی ایجاد اسی سے کی، جو ساتویں صدی ہجری یعنی تیرہویں صدی عیسوی سے برابر استعمال کرتے رہے، کاغذ کی بھی ایجاد عربوں ہی کی ہے، انھوں نے چیتھڑوں، سن، اور روئی سے کاغذ تیار کرنے میں بے انتہا کمال حاصل کیا، انھوں نے اس کے بڑے بڑے کارخانے قائم کئے اور آج دنیا کے سارے علوم و فنون کاغذ کے صفحات پر محفوظ کر دیئے گئے ہیں، کاغذ کی ایجاد ایسی بڑی خدمت ہے جس سے ساری دنیا مسلمانوں کی مرہون منت ہے،

مسلمان اسپین پہونچے تو فراخ دل یوروپی مصنفین نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اس کو

کی وسعت المشرقی کے مقاصد سے ایسا بدل دیا کہ یہ یورپ کا سرتاج بن گیا، انھوں نے عیسائیوں کو دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا، مفتوحوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا، اور قول پر قائم رہنا یونانی کے عیسائیوں کو سکھایا، نہروں کا جال بچھا کر وہاں کے بنجر علاقوں کو سرسبز اور شاداب باغات میں بدل دیا، پارچہ بافی کو ایسی ترقی دی کہ یورپ میں یہیں کے کپڑے مقبول تھے، شکر، روئی، لوہے کے اسباب اور کاغذ کے کارخانے کھول کر تجارت اتنی بڑھا دی کہ ان کے تجارتی بیڑے بحرِ اسود اور بحرِ قلزم سے افریقہ اور مڈغاسکر تک پہنچا کرتے تھے، اور جب یورپ میں تجارت پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی تو ابوالقاسم نے اس فن پر کئی رسالے لکھے،

یورپ کے عیسائی مسلمانوں کی عداوت میں دو صدی تک صلیبی جنگ لڑتے رہے، آخر میں صلاح الدین ایوبی سے شکست کھا گئے، مگر وہ ان لڑائیوں کے درمیان مسلمانوں کی شان و شوکت دیکھ کر ان کے مرعوب بھی ہوتے رہے، جس کے بعد بقول موسیو لیبان اسلحہ، لباس اور مکانات کے مشرقی تکلفات یورپ میں رائج ہوئے، ریشمی کپڑوں کا بننا، اور ان کو عمدگی سے رنگنا جو مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ پر تھا، یورپ میں پھیل گیا، مشرق کی معماری اور صیقل گری سے بھی یورپ والوں نے استفادہ کیا، یورپ کا طرزِ عمارت بھی بدلنے لگا،

عقلیت پسندی بھی مغرب میں مسلمانوں کے ذریعہ سے پہنچی، کلیسا آزادی کا مخالف رہا، مگر ڈیکارٹ، ہابس اور لاک نے جو کچھ لکھا ہے اس کی آواز بازگشت ابن رشد اور ابن باجہ کے یہاں سنی جا سکتی ہے، فارابی سے راجر بیکن اور البرٹس میگنس نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، بہاؤ الدین کا خیالات چونکا دینے والے ہوتے ہیں، مگر اس کو اسلام کے روشن مستقبل پر یقین رہا، مورخین لکھتے ہیں کہ اگر عرب فرانس کی تسخیر کر لیتے یا قسطنطنیہ کو اپنی پہلی ہی کوشش میں سر کر لیتے تو یورپ کی تاریخ کچھ اور ہوتی، مگر اب بھی اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سلارنیو، بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ، ملاگا، اور صقلیہ سے جو روشنی پھیلی اس سے یورپ کی نشاۃ الثانیہ میں بڑی مدد ملی،

مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ آگے ہم کیا ہیں، جب یورپ نے کائنات کے عناصر اربعہ میں سے زمین، آگ،

چونکہ ہم یورپ سے بے حد متاثر ہو کر رہ گئے ہیں، ہم یورپ سے متاثر ہوئے ہیں، ہم کو یورپ سے متاثر کر کے
پہلے ہم یورپ کو سب کچھ دیتے رہے مگر اب ہماری ذہنی افلاس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ طامس کارلائل یا سورو بقراط سمجھو،
اور منٹگمری واٹ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ تعریف کر دیتے ہیں تو ہم آپ کی عظمت اور تقدس کے
قائل اسی کے سہارے ہوتے ہیں، ہم اپنے اسلامی قوانین کو شاخت کی کتاب کے حوالے سے جاننا چاہتے ہیں، ہم اپنے
سیاسی اور تمدنی کارناموں کی اہمیت کو لیبان، خان ہمرا اور ہٹی کے ذریعہ سے جاننے کی فکر میں رہتے ہیں، ہم
اپنے نظام حکومت کو اسٹوارٹ مل، ہابس، گرین، لاک، اور یہاں تک کہ کارل مارکس کے
نقطۂ نظر سے پرکھ کر اس کو اچھا اور برا قرار دیتے ہیں، ہم اپنے ادبی ورثہ کو نکلسن، براؤن، بروکلمن
اور گارساں دتاسی کے ذریعہ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے ذہن پر سگمنڈ فرائڈ اور کارل
مارکس کچھ اس طرح چھا گئے ہیں کہ جیسے ہم کو اپنی وراثت میں کوئی نظری، فکری، عمرانی، اور
نفسیاتی چیز ہی نہیں ملی، ہم یورپ کی ریس اور تقلید میں اپنے چہرے مہرے کو بنانے، ان کے وضع قطع، لباس
اور معاشرت اختیار کرنے حتی کہ باتھ روم کے آداب برتنے ہی میں اپنی تمدنی معراج سمجھتے ہیں، کیا اللہ کے آخری
پیام کی نگہبانی، نبوت کی آخری ارمغانی اور ایشیا کی پاسبانی اسی یورپ زدگی سے ہو سکتی ہے،

ہم یورپ سے متاثر ہو کر جس ذہنی ارتداد اور فکری انارکی میں مبتلا ہو کر اپنی مذہبی اور روحانی قدروں پر
تیشہ زنی کر رہے ہیں، اس کے خطرات کو محسوس کر کے اقبال بہت پہلے یہ تنبیہ کر گئے ہیں

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ — معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!

از خواب گراں خیز

مگر ان کی یہ آواز محض صدا بصحرا بن کر رہ گئی ہے،

مقالات

سیرت نبویؐ کی ایک اہم کتاب الشفا پر ایک نظر

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

شکوک و شبہات کا جواب: کتاب الشفا کے وہ مباحث زیادہ اہم ہیں جن میں شبہات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اس کی بعض مثالیں نقل کی جاتی ہیں، ایک جگہ معجزۂ شق القمر کے بارہ میں ایک شبہہ اور اعتراض کا ذکر کرکے اس کا یہ جواب دیا ہے،

"یہ اعتراض لائق التفات نہیں کہ اگر واقعی چاند کے ٹکڑے ہوئے ہوتے تو روئے زمین پر بسنے والے سارے لوگوں سے یہ بات مخفی نہ رہتی، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ سارے لوگ اس رات میں آسمان کو دیکھتے رہے ہوں، اور اس کے بعد بھی انھوں نے چاند کا ٹکڑے ہونا نہیں دیکھا، اور اگر بالفرض یہ بات اتنے سارے لوگوں سے منقول ہوتی جن کا جھوٹ پر مجتمع ہونا محال ہے، تب بھی چاند کے ٹکڑے ہونے میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں، کیونکہ چاند کا مدار ایک ہی نہیں ہے، وہ کہیں پہلے طلوع ہوتا ہے، اور کہیں بعد میں طلوع ہوتا ہے، کبھی ایک ملک میں چاند دکھائی دیتا ہے، اور دوسرے ملک میں نہیں دکھائی دیتا، بعض ملکوں میں پہاڑ اور بادل چاند کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں، اسی لئے بعض خطوں میں چاند گہن ہوتا ہے، اور بعض میں نہیں، اور بعض میں پورا گہن لگتا ہے، اور بعض میں

بجو دکھتا ہے، جن علاقوں میں چاندگہن نہیں لگتا وہاں کے عام لوگوں کو اسی روز دوسرے علاقے میں جب چاند گہن کا پتہ بھی نہیں چلتا، صرف ماہرین فلکیات کو اس کا علم ہوتا ہے۔

ذَالِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ   یہ (خدائے) غالب و علیم کا مقرر
الْعَلِيمِ (یٰس)   کیا ہوا اندازہ ہے،

اس حیثیت سے بھی غور کیجئے کہ اس معجزہ کا وقوع رات میں ہوا تھا، اور رات کے وقت لوگ گھروں کے دروازے بند کرکے آرام کرتے اور سوتے ہیں، اور دنیا کا سارا کاروبار بند رہتا ہے، ایسی صورت میں آسمان پر ہونے والی باتوں سے وہی شخص واقف ہوسکتا ہے جو واقعی اس کی فکر و جستجو میں لگا ہوا ہو، یہی وجہ ہے کہ آسمان پر ہونے والے بہت سارے عجائب اور بعض بڑے بڑے ستاروں کے طلوع نیز چاندگرہن وغیرہ سے عام لوگ اس وقت تک بے خبر رہتے ہیں، جب تک کہ ان کا مشاہدہ کرنے والے ان کو آگاہ اور مطلع نہیں کر دیتے ہیں (ج ۲ ص ۹ تا ۱۰)

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"قرآن و احادیث اور اجماعِ امت سے یہ بات پوری طرح ثابت و مسلّم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاءؑ میں افضل و برتر تھے، مگر ایسی صورت میں ان حدیثوں کے بارہ میں شبہہ ہوتا ہے، جن میں آپؐ نے اپنے کو دوسرے انبیاءؑ پر فضیلت دینے سے منع کیا ہے، چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

مَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ اَنْ يَقُولَ   کسی شخص کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ
اَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى   میں (محمدؐ) حضرت یونسؑ سے بہتر ہوں

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے کہا کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو تمام

دلوں میں تعجب اور افضل قرار دیا ہے، اس پر انصار کے ایک شخص نے اسے تھپڑ مارا اور کہا کہ رسول اللہ کے ہوتے ہوئے تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو، جب آپ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: لا تخیروا بین الانبیاء (انبیاء کے درمیان ترجیح و مقابلہ نہ کرو) دوسری روایت میں ہے، لا تخیرونی علی موسیٰ (مجھے حضرت موسیٰؑ سے بہتر نہ قرار دو) حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ایک روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا، جس نے یہ کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، اس نے غلط کہا، ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونسؑ سے بہتر ہوں ان سے یہ بھی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا یاخیرالبریہ (اے تمام مخلوقات میں سب سے افضل) ارشاد ہوا کہ خیرالبریہ (سب سے افضل) حضرت ابراہیمؑ تھے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس سے اس وقت منع کیا تھا جب آپؐ کو اس کا علم نہ تھا کہ آپؐ اولادِ آدمؑ کے سردار ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے ازراہِ تواضع و انکسار اپنے کو دوسرے انبیاءؑ سے افضل قرار دینے سے منع کیا ہے، تیسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ آپؐ کی ممانعت کا تعلق اس امر سے ہے کہ انبیاءؑ کے درمیان اس طرح کی تفضیل سے بچنا چاہئے، جو ان میں سے کسی کی تنقیص و تحقیر کا باعث ہو، حضرت یونسؑ کا آپؐ نے خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کہ قرآن مجید میں ان کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس سے ایک عام اور ناواقف شخص کے دل میں ان کے عظیم درجہ و مرتبہ کے بارہ میں نقص کا خیال گذر سکتا ہے، ایک اور جواب یہ ہے کہ ممانعت اس بنا پر کی گئی ہے کہ نفس نبوت و رسالت کے اعتبار سے تمام انبیاءؑ یکساں اور ایک ہی درجہ و مرتبہ پر فائز ہیں، اس لئے اس حیثیت سے ایک نبی کو دوسرے نبی پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت ان کے حالات، خصوصیات

کمالات، مراتب اور الطاف کی کمی یا زیادتی وغیرہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ نفسِ نبوت میں ان کے درمیان کوئی تفضیل نہیں، فضیلت کا سارا تعلق ان چیزوں سے ہے جو نبوت کے علاوہ ہیں، دیکھئے رسولوں میں سے بعض کو صرف رسل کہا گیا ہے، اور بعض کو اولوالعزم من الرسل کہا گیا ہے، بعض کے متعلق فرمایا کہ ان کو مکانِ علی و بلند و بالا مرتبہ عطا کیا، اور بعض کے بارہ میں کہا کہ ان کو بچپن ہی میں حکم سے سرفراز کیا، بعض کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو زبور دی، بعض کے لئے کہا کہ ان کو بینات دیئے، بعض نبیوں کے متعلق ہے کہ اللہ نے ان سے کلام کیا، اور بعض کے درجات بلند کئے، ارشاد ہے،

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلٰى بَعْضٍ (اسرا)

اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت بخشی۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ)

ان پیغمبروں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اسی طرح بعض حدیثوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، کتاب الشفا میں ان کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر طوالت کے خوف سے اس کی مثالیں قلم انداز کی جاتی ہیں۔

مصنف کے نزدیک خالص دنیوی امور و معاملات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات عمداً یا سہواً نہیں کہی ہے جو خلافِ واقعہ ہو، یہاں تک کہ غیظ و غضب، رنج و بیماری کی حالت اور مذاق کی صورت میں بھی آپؐ کی عصمت برقرار رہتی ہے، اس پر امت کے اسلاف کا اتفاق و اجماع ہے، اور حضراتِ صحابۂ کرام کا بھی یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر حال میں آپؐ کی باتوں پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے، اور ان کی تعمیل میں عجلت کرتے تھے۔

مگر اس سلسلہ میں بعض اشکالات اور شبہات پیدا ہوتے ہیں، ہم صرف ایک اشکال کا ذکر کرتے ہیں، جو اس حدیث پر وارد ہوتا ہے جس میں آپ کے نماز کے اندر سہو کا ذکر ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز آپنے عصر کی نماز ادا کی، اور دوسری رکعت کے بعد سلام پھیر دیا، یہ دیکھ کر ایک شخص ذوالیدینؓ کھڑے ہو گئے، اور انھوں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا نماز میں تخفیف کر دی گئی ہے، یا آپ سے نسیان ہو گیا ہے؟ ارشاد ہوا، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی ہے، یعنی نہ تو نماز کی رکعتوں کی تعداد میں کمی کی گئی ہے، اور نہ مجھ سے بھول ہوئی ہے،

اس حدیث کے متعلق یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں باتوں کی نفی کرنا خلافِ واقعہ امر تھا، کیونکہ قصر و نسیان دونوں میں سے ایک بات تو ضرور ہی ہوئی تھی اسی لئے حضرت ذوالیدینؓ نے آپؐ کے جواب کے بعد بھی یہ کہا تھا کہ ان میں سے کوئی بات تو ضرور ہوئی ہے،

مصنف اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"علماء نے اس کے جواب میں متعدد باتیں کہی ہیں، ان میں بعض تو قرین صواب ہیں، لیکن بعض تکلف بارد معلوم ہوتی ہیں، جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے لئے ان اقوال میں وہم و غلط کو روا اور جائز قرار دیتے ہیں، جن کا تعلق وحی و بلاغ سے نہیں ہے، انکے نزدیک آپؐ کی ان دونوں باتوں پر سرے سے کوئی اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ان دونوں چیزوں کا آپؐ کے قول کے بجائے عمل سے تعلق ہے، البتہ جو لوگ افعال میں آپؐ سے سہو و نسیان کا وقوع ممنوع سمجھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی صورتوں میں آپؐ کا نسیان قصداً ہوتا تھا، تاکہ لوگوں کو آپؐ کی سنت کا علم ہو جائے

اس جواب سے روے آپؐ اپنی خبر میں سچے تھے کیونکہ آپؐ سے نسیان ہوا تھا اور نماز میں تخفیف ہوئی تھی بلکہ آپؐ نے ایسا قصداً کیا تھا تاکہ اس طریقے سے آپؐ امت کے لئے اپنی سنت مبارکہ کو واضح کر دیں جن کو ایسی صورتیں نماز میں پیش آجائیں، مگر یہ جواب متروک اور حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے،

البتہ جو لوگ اقوال میں آپؐ کے سہو کو ممتنع خیال کرتے ہیں، اور غیر اقوال میں وہ آپؐ کے سہو کے قائل ہیں، انھوں نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں، ایک جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعتقاد و خیال کے مطابق یہ بات کہی تھی، قصر اور نماز کی تخفیف سے آپؐ کا انکار ظاہراً و باطناً دونوں کا اعتبار سے بالکل سچ اور درست تھا، البتہ نسیان سے آپؐ انکار آپؐ کے ظن و اعتقاد کی بنا پر تھا، کیونکہ آپؐ کو اپنے ظن و گمان کے مطابق نسیان نہیں ہوا تھا، پس گو آپؐ نے اپنے ظن و اعتقاد کا لفظاً ذکر نہیں کیا مگر آپ کا مقصد یہی تھا، اور یہ بات بھی بالکل صحیح اور درست تھی،

دوسری صورت یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے بارہ میں نسیان کی جو نفی کی ہے، اس کا تعلق نماز کے سلام سے ہے، یعنی آپؐ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ میں نے سلام تو قصداً کیا ہے، البتہ نماز کی رکعتوں کی تعداد کے بارہ میں مجھے ضرور سہو ہو گیا ہے، اس تاویل کا احتمال ہو سکتا ہے، مگر یہ بھی بعید از حقیقت ہے، تیسری صورت اس سے بھی زیادہ بعید از حقیقت ہے، گو لفظاً اس کا بھی احتمال ہے، یعنی آپؐ نے جو نفی کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت یہ دونوں باتیں نہیں ہوئیں بلکہ ان میں سے ایک بات ہوئی، لیکن یہ بات لفظوں کے ظاہر کے خلاف ہے، کیونکہ بعض روایتوں میں آپؐ سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں،

ما قصرت الصلوٰۃ وما نسیتُ — نہ نماز میں کمی ہوئی ہے اور نہ میں بھولا ہوں،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دونوں باتوں کی نہایت وضاحت کے ساتھ نفی کی ہے،
یہ تو الکشاف کے اقوال تھے، جن میں سے ہر ایک کا احتمال ہے، گو بعض اقوال اصل واقعہ
سے بالکل ہی بعید معلوم ہوتے ہیں، میرے نزدیک اقرب الی الصواب یہ صورت ہے کہ
آپؐ کا اپنی ذات سے انکار در اصل "لم انس" صیغہ متکلم سے متعلق ہے، یعنی آپؐ اپنے بارہ میں
اس کی تردید فرما رہے ہیں کہ "میں بھولا ہوں" دوسروں کے لئے بھی آپؐ نے اس لفظ کی نفی کی ہے، چنانچہ
ارشاد ہے "تم میں سے کسی کا یہ کہنا بہت خراب ہے کہ نسیت آیۃ کذا یعنی میں فلاں آیت بھول گیا
بلکہ اس کو نُسِّیَ کہنا چاہیئے تھا، یعنی مجہول کا صیغہ لانا چاہیئے تھا کہ اس کو بھلا دیا گیا، چنانچہ بعض
روایات و احادیث میں ہے کہ لست انسیٰ و لکن انسیٰ یعنی میں نہیں بھولا بلکہ مجھے بھلا دیا گیا،
پس جب آپؐ سے سوال کرنے والے نے کہا کہ کیا نماز میں کمی کر دی گئی ہے، یا آپ کو نسیان ہوا ہے تو
جس طرح آپؐ نے قصر کا انکار فرمایا اسی طرح نسیان کا بھی انکار کیا، اور آپؐ کا مقصد یہ بتانا
تھا کہ اگر ایسا ہوا ہے تو آپ بھلا دیئے گئے، تاکہ اس کے بارہ میں دوسرا شخص استفسار کرے،
اس تقریر کا ماحصل یہ نکلا کہ آپؐ کو اس لئے بھلوا دیا گیا تھا کہ اس طرح سب لوگوں کو
آپؐ کی سنت کا علم ہو جائے اور وہ جان لیں کہ سہو کی صورت میں کیا احکام ہیں،
ایک اور جواب بعض صوفیہ اور مشائخ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
سہو تو ہوتا تھا، مگر آپؐ سے نسیان نہیں ہوتا تھا، اس لئے آپؐ نے نسیان کی نفی فرمائی، کیونکہ یہ غفلت
اور آفت ہے، اور سہو آدمی کے خیال کا ایک شغل ہے، یہی وجہ ہے کہ آپؐ سے نماز میں سہو ہو جاتا تھا
مگر آپؐ اس کی جانب سے غافل نہیں ہوتے تھے، اس صورت میں آپؐ کے ارشاد میں کوئی چیز خلاف
واقعہ نہیں ہے[1] بعض لوگوں نے نسیان کے معنی ترک لئے ہیں، جو نسیان ہی کی ایک صورت ہے،

[1] کتاب الشفاء ج ۲ ص ۱۳۳ تا ۱۴۴،

معلومات کی کثرت کتاب الشفا کے متنوع مباحث کے ضمن میں مختلف انواع معلومات بیان کئے گئے ہیں ان سے مصنف کی وسعت علم ونظر اور گوناگوں چیزوں سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے ثبوت میں چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں،

۱۔ مصنف کو عربوں کے علوم ومعارف، ان کی قدیم تاریخ، خاص خاص عادات ومالوفات اور اہلِ کتاب کے صحف وروایات سے پوری واقفیت تھی، اس سلسلہ کی متعدد بحثیں کتاب الشفا میں درج ہیں، مثلاً ایک جگہ وہ عربوں کے علوم ومعارف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) انساب (۲) اشعار (۳) گذشتہ خبروں خصوصاً جنگ کے واقعات کا علم[1]، دوسری جگہ لکھتے ہیں، عربوں کے تمام علوم ومعارف چار چیزوں میں منحصر ہیں (۱) بلاغت (۲) شاعری (۳) کہانت (۴) اخبار و واقعات سے واقفیت[2]، ایک جگہ قرآن کی بلاغت کے ضمن میں عربوں کی بلاغت اور زبان دانی کا حال اس طرح لکھا ہے:۔

"اہلِ عرب زبان کے ماہر اور بلاغت میں یکتا تھے، حکمت ان کا خاص وصف و امتیاز تھا، اس میں اور زبان دانی میں کوئی قوم ان کے ہم پایہ نہ تھی، وحیرت انگیز قوت اور فصلِ خطاب کے مالک تھے، یہ ساری چیزیں خدا نے ان کی سرشت میں ڈال دی تھیں اس لئے نہایت برجستہ، فصیح اور اچھوتا کلام ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا، وہ مجلسوں اور اجتماعات میں فی البدیہہ تقریریں کرتے اور برجستہ اشعار کہتے اور پڑھتے، جس کی مدح کرتے اس کی شان نہایت اعلیٰ و ارفع ہو جاتی وہ ممدوح سے اپنا مقصد ومدعا حاصل کر لیتے، اور جس کی مذمت کرنے پر آتے

---

[1] کتاب الشفا ج ۲ ص ۲، [2] ایضاً ص ۳۲۱۔

اس کو اپنے زورِ بیان اور بلاغت کلام سے نہایت ذلیل، حقیر اور گھٹیا ثابت کر دیتے، ان کا کلام صحیح معنوں میں سحر حلال تھا، اپنے انوکھے طرزِ ادا اور بلیغ کلام کے ذریعہ وہ اپنے ممدوح کو ایسا ہار پہنا دیتے جو موتیوں سے جڑے ہوئے ہار سے بھی زیادہ قیمتی اور خوب صورت معلوم ہوتا تھا، ان کی اس خوبی کو دیکھ کر عقل دنگ اور نگاہ ششدر رہ جاتی ہے، ان کی فصاحت و بلاغت سے مشکلات فوراً آسان اور حل ہو جاتی تھیں، اور دلوں کا بغض و کینہ دور ہو جاتا تھا، کندذہنوں اور مٹی ہوئی یادگاروں میں ہیجان پیدا ہو جاتا تھا، اور بزدل جری بن جاتا تھا، بند ہاتھ کشادہ ہو جاتے تھے، یعنی بخیل سخی ہو جاتا تھا، ناقص کامل بن جاتا تھا، اور مشہور گمنام ہو جاتا تھا، عرب کے بدویوں اور حضریوں دونوں کا کلام بہت بلیغ و موثر اور نہایت واضح ہوتا تھا، جو تیر کی طرح نشانے پر لگتا تھا، اور ٹھیک اقتضائے حال کے مطابق ہوتا تھا، بلاغت ان کی مطیع اور فرماں بردار لونڈی تھی، وہ اس کے سارے فنون پر حاوی تھے، نظم و نثر دونوں میں ان کو غیر معمولی درک و مہارت تھی، (کتاب الشفا ج ۱ ص ۱۱۵ تا ۱۵۱)

مصنف کو عربوں کی قدیم تاریخ و روایات اور ان کے اہم واقعات و حالات سے بھی بڑی واقفیت تھی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے دلائل بیان کرتے ہوئے بعثتِ نبوی سے پہلے کے متعدد عربوں کے واقعات اور ان کے متعدد اشعار کا ذکر کرتے ہیں، جیسے اوس بن حارثہ، کعب بن لوی، سفیان بن مجاشع، قس بن ساعدہ، سیف بن ذی یزن، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل اور عثکلان حمیری وغیرہ۔

اسی طرح ان کو اہلِ کتاب کی روایات و واقعات ان کی تاریخ، ان کے صحف و کتب کے متعلق بھی معلومات حاصل تھے، ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں جو پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں اور ان کے صحیفوں میں آپ کے جن ناموں کا ذکر ہے، ان کا تذکرہ کیا ہے، نیز اسرائیلیات اور

...سار مسعودی غلط دو اہی روایات کی تردید و تکذیب بھی کی ہے۔
یہی نہیں وہ قدیم زمانہ کے حکمار کے خیالات اور قدیم قوموں کے عادات و اطوار بھی کہیں کہیں
بیان کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستان اور اس کی قوموں اور اشیار سے واقفیت: اس کتاب میں کئی جگہ ہندوستان
ہندوستانی اقوام و مذاہب اور دریاؤں کی بعض اشیار وغیرہ کا ذکر آیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ مصنف کو ہندوستان کے بارہ میں بھی یک گونہ واقفیت تھی، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض امور غیب سے واقفیت کے ثبوت میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے

انہ زویت لہ الارض فاری	آپؐ کے لئے زمین سمیٹ دی گئی پس آپؐ کو
مشارقہا و مغاربہا وسیبلغ	اس کے مشارق و مغارب دکھائے گئے، اور
ملک امتہ ما زوی لہ منہا	آپؐ کی امت کا ملک و اقتدار ان سب جگہوں
	تک پہونچ جائیگا جو آپؐ کے لئے سمیٹ دی گئی تھیں

اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:۔

"مسلمانوں کی حکومت مشرق و مغرب میں سرزمین ہند اور مشرق اقصیٰ سے بحر طنجہ (مراکش) تک پھیل گئی،
اس کی وسعت کا یہی حال شمال و جنوب میں بھی ہے، اور یہ اس امت کی ایسی خصوصیت ہے، جو دنیا
کی کسی قوم کو نصیب نہیں (الشفاج ۲ ص ۱۷۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طب و حکمت میں معرفت و واقفیت کے ذکر میں امام ترمذی کی جامع سے
ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں عود ہندی کے متعلق آپؐ نے فرمایا ہے کہ اس کے اندر شفا کی سات چیزیں ہیں (ج ۲ ص ۲۶۱)
ایک موقع پر امام بیہقی کی کتاب سے ایک روایت نقل کی ہے، اس میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ
کے جنوں کے دیکھنے، ان کی باتیں سننے اور ان کو زط کے آدمیوں سے تشبیہ دینے کا ذکر ہے، زط

دراصل جاٹ کی تعریب ہے، جو ہندوستان کی ایک مشہور قوم کا نام ہے، بعض مورخین کے حوالہ سے انھوں نے ہندوستان کے ایک ایسے درخت کا ذکر کیا ہے، جس کی پتی پر لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔[1] (ج ۲ ص ۱۴۲)

اسی طرح انھوں نے تناسخ (آواگون) کو اہل ہند کا مذہب بتایا ہے، اور شمس و قمر نجوم و کواکب اور آگ پوجنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ لوگ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں، یہاں کے برہمنوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ موحد ہونے کے باوجود نبوت کے منکر تھے۔ (ج ۲ ص ۴۴۳ تا ۴۴۵)

۳۔ اسلامی فرقوں اور دوسرے مذاہب و ادیان سے واقفیت | مصنف کی وسعت علم و نظر اور کثرت معلومات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مختلف فقہی و اعتقادی فرقوں کے علاوہ دوسرے مذاہب و ملل اور ان کے مختلف فرقوں سے واقفیت رکھتے تھے، اور ان کے اصول و عقائد، طریقۂ استنباط اور طرز استدلال وغیرہ سے باخبر تھے، پہلے مسلمانوں کے اعتقادی مذاہب اور کلامی فرقوں کے ناموں کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

اہل سنت والجماعت، شیعہ، خوارج، اشاعرہ، متکلمین و فلاسفہ، معتزلہ، قدریہ، کرامیہ، نواصب اور مبتدعین وغیرہ۔

فرقۂ شیعہ کے مندرجہ ذیل گروہوں کے نام بھی بیان کئے ہیں:۔

روافض، قرامطہ، باطنیہ[2]، طیاریہ، جناحیہ، بیانیہ، غرابیہ۔

---

[1] مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی پٹن کے علاقہ میں ایک ایسے درخت کا ذکر کیا ہے، جس سے خزاں کے موسم میں ایک ایسا پتہ گرتا تھا، جس پر کلمہ لکھا ہوتا تھا، (عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۹۳)

[2] مصنف نے لکھا ہے کہ اس فرقہ کے بعض غالی لوگ ائمہ کو انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں [3] ان کو اسماعیلیہ بھی کہا جاتا ہے، یہ لوگ موسیٰ کاظم کے بعد اسماعیل بن جعفر صادق کو امام مانتے ہیں۔

[illegible] ہیں

دہریہ، [illegible]، جناحیہ، [illegible]، [illegible]، مشرکیہ

تناسخیہ، [illegible]، معطلہ، فلاسفہ، مجوس، [illegible]۔

منکرین رسالت میں ان فرقوں کا ذکر کیا ہے۔

براہمہ، اور [illegible]، عنزیہ۔

مدعیان نبوت میں حسب ذیل فرقوں کے نام ملتے ہیں۔

[illegible]، جرمیہ، کیلینہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸ یہ بھی اسماعیلیہ ہی کی طرح کا فرقہ ہے، ان کے خیال میں قرآن اور علوم شرعیہ ایک ظاہری معنی و مفہوم ہوتا ہے، اور دوسرا باطنی جس کا علم صرف ائمہ کو ہوتا ہے، ان لوگوں نزدیک فرائض سے وہ اشخاص مراد ہیں، جن کی ولایت و امارت کا حکم دیا گیا ہے، اور خبائث محرمات سے وہ لوگ مراد ہیں، جن سے بری رہنے کا حکم دیا گیا ہو، ؎ روافض کا ایک غالی فرقہ جو عبد ابن معاویہ بن جعفر طیار کی طرف منسوب ہے، حضرت جعفر طیارؓ کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی غزو میں شہید ہو گئے تھے، رسول اللہؐ کو جب ان کے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی خبر ملی تو آپؐ نے فر کہ اللہ ان ہاتھوں کے بدلے ان کو جنت میں دو پر چڑیوں کی طرح عطا کرے گا، جن سے وہ اڑیں اس فرقہ کے خیال میں اللہ کی روح انبیا میں حلول کرتی رہی ہے، اور آنحضرتؐ کے بعد حضرت علیؓ اندر اور پھر ان کی اولاد کے اندر حلول کرتی رہی ہے، ؎ یہ فرقہ بیان بن سمعان یمنی کی جانب منسوب ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کی روح حضرت علیؓ میں حلول کر گئی تھی، ان کے بعد ان کے بیٹے محمد حنفیہ اور ان کے بعد ان کے بیٹے ہاشم میں اور پھر بیان میں حلول کر گئی، ؎ ان لوگوں کا خیال حضرت جبرئیل خدا کی رسالت لے کر حضرت علیؓ کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

...اور گروہوں کو بھی انھوں نے فرق فاسدہ اور باطل مذاہب کے ضمن میں ذکر کیا ہے
...باجیہ[11] اور غالی متصوفین[12] ۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۵) سے اسی طرح مشابہ ہیں، جس طرح کوا کوے سے مشابہ ہوتا ہے، اس لئے حضرت جبریلؑ کو اشتباہ ہوگیا ۔ (تواریخ ۲۶۶)

[1] یہ لوگ خیر و شر الگ الگ دو معبودوں کے قائل ہیں ۔ [2] دیصان ایک مجوسی کا نام تھا جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، اس فرقہ کے نزدیک بھی خیر و شر دو نور و ظلمت کے الگ الگ خالق ہیں، [3] مانی ایرانی بادشاہ شاپور بن اردشیر کے زمانہ میں ایک حکیم گذرا ہے، اس کے عقائد بھی ثنویہ اور دیصانیہ ہی کی طرح کے ہیں، [4] یعنی آتش پرست، جو یزدان کو خیر کا اور اہرمن کو شر کا خالق مانتے ہیں، [5] صابی کے لفظی معنی اس شخص کے ہیں جو ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے، مگر اصطلاحاً ملائکہ اور کواکب کو پوجنے والے مراد ہیں، [6] یہ نصاریٰ کے ایک فرقہ کا نام ہے، [7] اس سے تبید عنبری ایک شخص عبد اللہ بن حسن عنبری کے متبعین مراد ہیں، [8] یہ یہودیوں کا ایک فرقہ ہے جو عیسیٰ بن اسحاق اصبہانی یہودی کی طرف منسوب ہے، اس شخص نے خود نبوت کا دعویٰ کیا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اس کا خیال تھا کہ آپ صرف عربوں کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، [9] ان لوگوں کے نزدیک نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ۔ [10] یہ فرقہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ساری امت کی تکفیر کا قائل ہے، یہ امت کو اس لئے کافر سمجھتا ہے کہ اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد حضرت علیؓ کو پہلا خلیفہ نہیں بنایا اور حضرت علیؓ اس لئے کافر ہیں کہ وہ پہلے خلیفہ نہیں بنے، اور انھوں نے حضرت ابو بکرؓ سے اپنا حق طلب نہیں کیا،

[illegible]دین میں ان [illegible]وں اور فرقوں کا ذکر ہے۔

دہریہ، [illegible]نویہ، دیصانیہ، مانویہ، مجوس، صابئین، یہود، نصاریٰ، مشرکین، حلولیہ

تناسخیہ، [illegible]مائلین، معطلہ، فلاسفہ، منجمین، طبیعیین۔

منکرین رسالت میں ان فرقوں کا ذکر کیا ہے۔

براہمہ، اروشیہ، عنبریہ۔

مدعیان نبوت میں حسب ذیل فرقوں کے نام لئے ہیں۔

عیشویہ، جرمیہ، کیلیہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۵ یہ بھی اسماعیلیہ ہی کی طرح کا فرقہ ہے، ان کے خیال میں قرآن اور علوم شرعیہ کا ایک ظاہری معنیٰ و مفہوم ہوتا ہے، اور دوسرا باطنی جس کا علم صرف ائمہ کو ہوتا ہے، ان لوگوں کے نزدیک فرائض سے وہ اشخاص مراد ہیں، جن کی ولایت و امارت کا حکم دیا گیا ہے، اور خبائث و محرمات سے وہ لوگ مراد ہیں، جن سے بری رہنے کا حکم دیا گیا ہو، ؎ روافض کا ایک غالی فرقہ جو عبداللہ ابن معاویہ بن جعفر طیار کی طرف منسوب ہے، حضرت جعفر طیارؓ کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی غزوۂ موتہ میں شہید ہو گئے تھے، رسول اللہؐ کو جب ان کے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ ان ہاتھوں کے بدلے ان کو جنت میں دو پر چڑیوں کی طرح عطا کرے گا، جن سے وہ اڑیں گے، اس فرقہ کے خیال میں اللہ کی روح انبیا میں حلول کرتی رہی ہے، اور آنحضرتؐ کے بعد حضرت علیؓ کے اندر، اور پھر ان کی اولاد کے اندر حلول کرتی رہی ہے، ؎ یہ فرقہ بیان بن سمعان یمنی کی جانب منسوب ہے۔ اس کے نزدیک اللہ کی روح حضرت علیؓ میں حلول کر گئی تھی، ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بن حنفیہ اور ان کے بعد ان کے بیٹے ہاشم میں اور پھر بیان میں حلول کر گئی، ؎ ان لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت جبرئیل خدا کی رسالت لے کر حضرت علیؓ کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

دو دوسرے گروہوں کو بھی انھوں نے فرق ضالہ اور باطل مذاہب کے ضمن میں ذکر کیا ہے
اباحیینؔ اور غالی متصوفین۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۵) سے اسی طرح مشابہ ہیں، جس طرح کوا کوے سے مشابہ ہوتا ہے، اس لئے حضرت جبرئیلؑ کو اشتباہ ہوگیا۔ (ص ۲۵۶)

لہ یہ لوگ خیر و شر الگ الگ دو معبودوں کے قائل ہیں تہ دیصان ایک مجوسی کا نام ہے جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، اس فرقہ کے نزدیک بھی خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خالق ہیں، ؎ مانی ایرانی بادشاہ شاپور بن اردشیر کے زمانہ میں ایک حکیم و فلسفی گذرا اس کے عقائد بھی ثنویہ اور دیصانیہ ہی کی طرح کے ہیں، ؎ یعنی آتش پرست جو یزداں کو خیر کا اور اہرمن کو شر کا خالق مانتے ہیں، ؎ صابی کے لفظی معنی اس شخص کے ہیں جو ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے، مگر اصطلاحاً ملائکہ اور کواکب کو پوجنے والے مراد ہیں، ؎ یہ نصاریٰ کے ایک فرقہ کا نام ہے ؎ اس سے قبیلہ عنبر کے ایک شخص عبد اللہ بن حسن عنبری کے متبعین مراد ہیں، ؎ یہ یہودیوں کا ایک فرقہ ہے جو عیسیٰ ابن اسحاق اصبہانی یہودی کی طرف منسوب ہے، اس شخص نے خود نبوت کا دعویٰ کیا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اس کا خیال تھا کہ آپؐ صرف عربوں کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، ؎ ان لوگوں کے نزدیک نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ؎ یہ فرقہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ساری امت کی تکفیر کا قائل ہے، یہ امت کو اس لئے کافر سمجھتا ہے کہ اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد حضرت علیؓ کو پہلا خلیفہ نہیں بنایا اور حضرت علیؓ اس لئے کافر ہیں کہ وہ پہلے خلیفہ نہیں بنے، اور انھوں نے حضرت ابو بکرؓ سے اپنا حق طلب نہیں کیا،

یہ تو مسلمانوں کے اعتقادی مذاہب، کلامی فرقوں اور غیر اسلامی جماعتوں کا ذکر تھا، کتاب

الشفا میں فقہا، محدثین کے اجتہادی مذاہب و مسالک کا ذکر بھی ہے، اور اس سلسلہ

میں چاروں مشہور فقہی مذاہب کے علاوہ ان مجتہدین اور فقہائے امصار کے اقوال

بھی دئے گئے ہیں، جن کے مذاہب اب معدوم ہو چکے ہیں،

۴۔ مصنف کی وسعتِ نظر اور کثرتِ علم کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے

کتاب الشفا کی ترتیب و تالیف میں متعدد کتابوں سے استفادہ کیا تھا، اس سلسلہ میں

انھوں نے مختلف طبقوں کے جن مصنفین کے نام تحریر کئے ہیں، اگر ان کی فہرست نقل

کی جائے تو معارف کے کئی صفحوں میں آئے گی، اس میں مختلف طبقوں کے مشاہیر اور ائمہ

فضل و کمال شامل ہیں، جیسے مفسرین و قراء، محدثین و شارحین حدیث، ائمہ رجال

اور جرح و تعدیل کے ماہرین، فقہا و اصولیین، اہلِ سیر و مورخین، علمائے انساب و

(حاشیہ صفحہ ۲۷۵) ۱؎ یعنی اباحیت پسند لوگ، جو حلال و حرام کی قید اور شریعت کی ذمہ داریوں

سے اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں، ۲؎ مصنف صوفیہ اور مشائخ کی عظمت کے قائل ہیں، اور جا بجا

ان کے خیالات بھی نقل کئے ہیں، مگر یہاں جن صوفیوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے، ان کے

بارے میں تحریر فرماتے ہیں "یہ لوگ نبوت کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود کہتے ہیں کہ ان کی جانب

وحی کی جاتی ہے، اور وہ آسمان پر پہونچ کر جنت کی سیر کرتے ہیں، اس کے درختوں کا

پھل کھاتے ہیں، اور حوروں سے معانقہ کرتے ہیں، ان میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو اپنے

کو تکلیفاتِ شرعیہ سے بالاتر سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ محرمات کے ارتکاب اور شرائع کو

ترک کرنے پر اللہ ان سے مواخذہ نہیں کرے گا، کیونکہ عبادت، مجاہدہ اور ریاضت کی

کثرت کی وجہ سے ان سے فرائض ساقط ہو گئے ہیں، غالی صوفیوں کے سلسلہ میں انھوں نے

...رافیہ، ت وعربیت کے ائمہ، نحو و بلاغت اور معانی و بیان کے ماہرین اور مشائخ صوفیہ

...ض مسامحات | ...نسان کا کوئی کام مسامحات اور خامیوں سے بالکل ہی خالی نہیں ہوتا، اس

...اب کی خوبیوں اور خصوصیات کا مفصل ذکر کیا جا چکا ہے، ذیل میں اس کے بعض مسامحات کی

...نب اشارہ کیا جاتا ہے،

۱۔ مصنف نے کئی جگہ اس کی صراحت کی ہے کہ انھوں نے مشہور و معتبر حدیثیں نقل کرنے

...اہتمام کیا ہے، مگر صحت کے اس دعویٰ کے باوجود ان کی کتاب میں ضعیف روایتیں بھی شامل

...یں، بلکہ بعض موضوع حدیثیں بھی آگئی ہیں، تفسیری روایات کے متعلق عام طور پر مشہور

...ہے کہ وہ عموماً بے بنیاد ہوتی ہیں، خود مصنف نے بھی امام احمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تفسیر،

...مغازی اور ملاحم کی احادیث و روایات کی کوئی اصل نہیں ہوتی، اس کے باوجود انھوں نے

بلا نقد و تبصرہ ضعیف تفسیری روایتیں نقل کر دی ہیں، اس کی متعدد مثالیں ہیں، ناظرین

اگر حروف مقطعات (کہیعص، طٰہٰ، یٰسین، ق وغیرہ) اور بعض آیات مثلاً ولقد اخذ اللہ

المیثاق میثاق قوم منکم (؟) کے متعلق مصنف کی بحث ملاحظہ کریں تو اس کا اندازہ ہوگا۔

۲۔ بے اصل تفسیری اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور کہیں کہیں مرجح اقوال کو نظرانداز

...کر کے مرجوح اقوال بیان کئے ہیں، چنانچہ مندرجۂ ذیل آیت :۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرَاهِيْمَ (صافات) اور ان کے پیروؤں میں ابراہیم تھے،

...کے متعلق لکھتے ہیں کہ ابو اللیث سمرقندی نے مشہور ماہر انساب محمد بن سائب کلبی کا یہ قول

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸ حسین بن منصور حلاج کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بظاہر شریعت کا پابند تھا، مگر اس زمانہ کے تمام فقہائے

بغداد اور قاضی القضاۃ ابو عمر مالکی نے اس کے قتل اور پھانسی دیئے جانے کا فتویٰ اس وجہ

سے دیا تھا کہ اس نے انا الحق کہہ کر ربوبیت کا دعویٰ کیا تھا۔

ٹھیک کہا ہے کہ شیعۃ میں ضمیر کا مرجع آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، اور شیعہ کے معنی منہج

اور دین کے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

دین اور منہج پر تھے، حالانکہ اس آیت کے سیاق و سباق میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ مفہوم قرآنی تصریحات کے بھی خلاف

ہے، کیونکہ قرآن نے آنحضرتؐ اور آپ کی امت کو ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرنے کی دعوت

وتلقین کی ہے، اس لیے ضمیر کا مرجع حضرت نوحؑ ہیں، جن کا زیر بحث آیت سے قبل

کی آیتوں میں ذکر ہوا ہے، اور شیعۃ کے معنی دین ومنہاج کے بجائے نسل خاندان اور پیرو

ہیں، مگر اس صحیح قول کو مصنف نے قیل کہہ کر نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ

ان کے نزدیک یہ قول ضعیف و مرجوح ہے،

ایک اور ضعیف تفسیری قول ملاحظہ ہو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اسرائیلی روایتوں پر اعتماد کر لیا ہے،

”حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی جدائی اور مفارقت کی آزمائش اس لئے جھیلنی پڑی کہ نماز میں بھی حضرت یعقوبؑ کی توجہ والتفات حضرت یوسفؑ کی جانب مرکوز رہتی تھی، اور فرطِ محبت کی بنا پر وہ ان کو نماز کے وقت بھی اپنے پاس سلائے رہتے تھے، ایک دوسرا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ دونوں باپ بیٹے ایک روز اپنے گھر میں بھنا ہوا گوشت کھا رہے تھے، اور خوب ہنس رہے تھے، ان کے پڑوس میں ایک یتیم بچے نے بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سونگھی تو اس کو بھی کھانے کی اشتہا ہوئی اور وہ رونے لگا، اس کے رونے کی وجہ سے اس کی بوڑھی دادی بھی رونے لگی، حضرت یعقوبؑ اور یتیم کے گھر کے درمیان دیوار حائل تھی، اس لئے حضرت یعقوبؑ

حضرت یوسفؑ کو چیم کا علم نہ تھا، اس بنا پر حضرت یعقوبؑ کو اپنے عزیز ترین فرزند حضرت یوسفؑ کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، اور وہ اتنا روئے کہ ان کی آنکھوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کو بھی شدید ابتلاء سے دوچار ہونا پڑا، جس کی حکایت قرآن مجید نے بیان کی ہے،

ایک اور ضعیف تفسیری قول ملاحظہ ہو:۔

"عبس و تولیٰ" کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ مشہور و مرجح بلکہ تقریباً متفق علیہ قول ہے، اس میں اور اس کی بعد کی آیتوں میں اس لئے آپؐ پر عتاب کیا گیا کہ آپؐ کفار کے ایمان لانے کے زیادہ حریص رہتے تھے، اس لئے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے اتنے زیادہ فکر مند ہو جاتے تھے کہ مومنین کی تربیت کی جانب توجہ نہ ہو پاتی تھی، مومنین کی جانب سے اس عدم التفات اور کفار کی جانب شدت اعتنا کی بنا پر آپؐ کو تنبیہ کی گئی، مگر مصنف نے عتاب و تنبیہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان کے منافی خیال کر کے عبسَ و تولیٰ کا فاعل اس کافر کو بتایا ہے جس کی جانب غیر معمولی التفات پاکر آپ اعمٰی (ابن ام مکتومؓ) کی جانب سے بے توجہ ہو گئے تھے، اور وہ جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ کو آزردگی ہو گئی، لطف یہ ہے کہ ایسے مرجوح قول کو کسی مشہور و معتبر مفسر کے بجائے صاحب حماسہ ابو تمام کے حوالہ سے نقل کیا ہے،

۳۔ مفسرین اور علماء تاویل کا اتفاق ہے کہ مشہور و متواتر قرأتوں کے مقابلہ میں شاذ اور غیر معروف قرأت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، لیکن شفا میں کہیں کہیں شاذ اور غیر معروف قرأتوں کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، جیسے لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ میں انفس کی مشہور و متواتر قرآت بضم الفا ہے، گو مصنف نے اس کا بھی ذکر کیا ہے

مگر شاذ قرأت میں ان کو بھی نقل کیا ہے، اور اس کی عمدہ توجیہ کی ہے، اسی طرح وَمَا انزلَ علی الملکین الخ میں ملکین میں لام مفتوح ہے، مگر مصنف نے دوسری شاذ قرأتیں بھی نقل کی ہیں،

۴۔ کہیں کہیں تکرار بھی ہے، جیسے عصمتِ انبیاء کی بحث میں حضرت داؤد، یوسفؑ، یونسؑ، اور آدمؑ کے زلّات کا مکرر ذکر ہے، اسی طرح بعض مباحث میں طول بیان سے بھی کام لیا ہے۔

بعض امور و مسائل میں اہلِ علم سے بکثرت اقوال منقول ہیں، مصنف نے بلا ترجیح و محاکمہ سب اقوال تحریر کر دیئے ہیں، اس سے عام قاری کے لئے رطب و یابس میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اور وہ اقوال کی کثرت و تعدد میں الجھ کر رہ جاتا ہے،

اس تحریر کا مقصد تمام خامیوں کی نشاندہی نہیں ہے، دراصل ان مسامحات اور فروگذاشتوں کے باوجود کتاب الشفا بہت مفید اور عظیم الشان کتاب ہے اس کو لکھ کر مصنف نے اللہ کے رسول سے اپنے تعلق و محبت کا حق ادا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو رسول اللہؐ کی سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ

کے

مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی صاحب

(۲)

روایت نمبر۱ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے بیان فرمایا:

"ایک دفعہ میں، اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ ہم دونوں دریا کی طرف مسافر تھے،[۱] بھوک کے غلبے سے متاثر ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے، جنگل بیابان ہو کا مکان، دریا کا کنارا، خور و نوش کا سامان کہاں، دم بھر بعد ہی ایک بکری نمودار ہوئی، جو دو روٹیاں جو کی منھ میں لئے ہوئے تھی، آئی اور وہ روٹیاں ہمارے آگے رکھ کر چلی گئی، ہم نے کہا یہ بکری نہ تھی، مردانِ غیب میں سے کوئی تھا، ہم نے وہ روٹیاں اٹھالیں، اور کھالیں، اور کہا غیب سے ہمیں یہ آذوقہ ملا ہے"،

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بچھوا اونٹ کا اونٹ بہت بڑا دریا کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے دریا کے کنارے پہنچتے ہی دریا میں اتر گیا، اور پار جانے لگا، ہمیں حیرت ہوئی، اور ہم نے

---

[۱] مسافر بودیم، ہم مسافر تھے' میں' بودیم صیغہ جمع متکلم ہے، اس کو صیغہ واحد غائب بتانا علم صرف سے کمال کم آگاہی کی دلیل ہے،

کہا اس میں بھی کوئی بھید ہے آؤ چلو دیکھیں، مگر دریا میں کشتی کہاں جو پار جاتے ناچار بارگاہِ ایزدی میں التجا کی "الٰہ العالمین! اگر ہم نے اوصافِ درویشی کی تکمیل کر لی ہے، تو دریا ہمیں راستہ دیدے تاکہ ہم بھی دیکھ لیں کہ یہ بھید کیا ہے"

خدا کی قدرت دریا شق ہوگیا، خشکی نکل آئی، آگے آگے بچھو پیچھے پیچھے ہم دریا پار پہونچ گئے، وہاں کیا دیکھتے ہیں، کہ ایک شخص درخت کے نیچے سویا پڑا ہے، اُس کو ڈسنے کے لئے سانپ درخت سے اتر آیا ہے، سانپ بھی کیا ہے اژدھا کا اژدھا ہے، ہوگا کوئی ہزار من کا، بچھو سانپ کے پاس پہنچا ڈنک مارا، اور غائب ہوگیا، سانپ مرکے ڈھیر ہوگیا، ہم سمجھے کہ یہ کوئی بزرگ بندۂ خدا ہے، جب ہی تو اللہ پاک نے یہ کرم فرمایا، اور اس کی جان بچائی ہے، یہ جاگے تو ہم اس سے ملیں، اس ارادے سے ہم اس کے پاس پہونچے، دیکھتے کیا ہیں، وہ تو شرابی ہے، شراب پیتے پیتے مدہوش پڑا سو رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی، اور ندامت بھی ہوئی، ہم نے کہا کاش ہم نہ آئے ہوتے، اور یہ مکروہ منظر نہ دیکھتے، ہم اسی پس وپیش میں تھے کہ ندائے غیبی سنائی دی،

اے ہمارے پیارو! اگر ہم نیکوں ہی کی رکھوالی کریں تو بدوں کی کون کرے گا،

جب وہ شرابی جاگا، اور مرے ہوئے سانپ کو اپنے پاس پڑے دیکھا، تو دہشت زدہ حیران رہ گیا، ہم نے سارا ماجرا اسے سنایا، وہ بہت شرمندہ ہوا، اور اس نے توبہ کی حتیٰ کہ وہ نکوکار بندگانِ خدا میں سے ہوگیا، کہتے ہیں کہ اس نے ننگے پیر دن اور پاپیادہ ستر حج کئے،

اختتام پر قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا-

جب وقت آ جاتا ہے اور نسیمِ لطف وکرم چلنے لگتی ہے، تو ہزارہا مبتلائے فسق وفجور

اور آلودۂ معصیت و گناہ کو توفیقِ توبہ نصیب ہوتی ہے، اور پھر نسیمِ لطف کا کرم انھیں میکدۂ
تذلیل تعیش سے اٹھاتی اور سجادہ نشینی کی بلند ترین اور باعظمت مسند پر لے جا بٹھا دیتی ہے،
اور وہ بخش دیئے جاتے ہیں، اور جب کہیں قہر و غضب کی باد تند چلنے لگتی ہے، تو یہی ہوا
کہ ہزار ہا سجادہ نشینانِ مسندِ عظمت و کرامت کو اٹھاتی ہے اور میکدۂ تذلیل تعیش
کے قعرِ مذلت میں لے جا ڈالتی ہے (پناہ بخدا) (فوائدالسالکین فارسی ص ۹-۱۰)

یہ روایت تمام تر عجائباتِ قدرت کا مرقع ہے، اور عجب سبق آموز، صدیاں گزر گئیں تاثیر کا یہ
عالم ہے کہ آج بھی کوئی اہلِ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، دل کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے
اور خدائے قدوس کی قدرت کاملہ کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے،

اس میں حیرت و عبرت کا وہ سر و سامان ہے، جو اُن عجائباتِ قدرت میں بھی نہیں ہے، جن کا
ذکر عہدِ قدیم کے سفرناموں میں ہے، یہ روایت اوصافِ درویشی کی جامع اور ادب و انشا کا شاہکار
ہے، اور کتنی سبق آموز ہے، وہ ندائے غیبی جو کہتی ہے کہ انسانیت کی دنیا میں مساوات ہے، اور انسان
دوستی ہے، من و تو کا امتیاز یہاں نہیں چلتا، بندگانِ خدا نیک و بد سب اسی کے ہیں، لاچار و معذور
کوئی بھی ہو، امتیاز نیک و بد سے دور رہ کے اس کی دستگیری کرنی چاہئے، یہی وہ نقطۂ عروج ہے
جو اکابر صوفیہ کے اعمال و خدمات کا محور ہے، اور نیچ نیچ چھوت چھات اور نیک و بد کے امتیاز کا
گزر کہاں؟ اسی امتیاز کو ذہن سے نکال پھینکنا تھا کہ کوئی بزرگ ہے جس کی شخصیت جاذبِ
رحمت ہے، ذہن نشین کرانا یہ تھا کہ مقناطیسِ عصیاں بھی جاذبِ رحمت ہے، رحمت والا قادرِ
مطلق ہے، اور بے چارہ گانِ عالم کا وہی دستگیر اور خبر گیر ہے، اس کی قدرتِ کاملہ میں کسی کو
دخل نہیں، لاریب وہ قادرِ مطلق اور وحدہٗ لاشریک ہے، یہی عین ایقان ہے یہی دلنشین
رہنا چاہئے،

روزمرہ محاورہ میں مبالغہ کی آمیزش بھی ہوتی ہے جو ان کی تاثیر کو دوبالا کر دیتی ہے، اس وصف سے کوئی زبان مستثنیٰ نہیں، سب ہی سمجھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے، اسے مبالغہ آمیز بیان سے تعبیر نہیں کیا جاتا، تشبیہ و استعارہ سے مفہوم کی برمحل جو وضاحت ہوتی ہے، اور جو روشنی ملتی ہے، دفتر کے دفتر اس کے بالمقابل بے مصرف رہتے ہیں، نثر ۔ اسلوب کی سحر سامانی پناہ بخدا، کژدم بقیاس شتر بزرگ اور مار بقیاس ہزار منے بود، محاورہ نہیں تو اور کیا ہے جنھوں نے وحوش وطیور کے عجائب گھروں کی سیر کی ہے، یا اُن کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو عجائب المخلوقات کے موضوع پر ہیں، اور جو زبان داں ہیں، اور اسلوب کی ہمہ گیری اور کارفرمائی سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہیئت وجسمانیت کی ممیز حالت اور وزن کی فراوانی کے نمایاں اظہار کے سوا اور کیا ہے،

فارسی داں طبقہ ہجنیں گوبند کے صرف محل سے آگاہ اور واقف ہے، کہ یہ جزو جملہ شہرتِ عامہ اور افواہ کا ترجمان ہے، اخبار مصدقہ کا مخبر نہیں، بات کا بتنگڑ بنا دینا، عوام کے مزاج کی خاصیت ہے، سات کو ستر کہنے لگنا، ان سے بعید نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ اُن کی یہ روش اُن کی پسند و ناپسند کی آئینہ دار ہے، ہجنیں گوبند کا بیان بتاتا ہے، کہ وہ شخص عوام میں مقبول ہو چکا تھا، عوام کہنے لگے تھے کہ اس نے سترّ حج کرلئے ہیں، نہ گنتی گن کر یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ واقعہ کا عدد وقوع کیا متعین ہوتا ہے، اور نہ کسی افواہ پر یقین کیا جاسکتا ہے، جو عوام کی نفسیات سے آگاہ ہیں، اُن کے لئے یہ بیان محل اعتراض نہیں،

اکابر صوفیہ کا اعتماد علی اللہ، سفر میں بے سروسامانی اور رزاقِ مطلق کی رزاقیت کی شان دعائے مستجاب کی تاثیر سالکانِ راہِ طریقت کے لئے مشعلِ راہ ہے، یہ روایت ہر اعتبار سے جامع، پُرتاثیر اور ادبِ صوفیہ میں بے نظیر ہے، ان ہی اوصاف سے متاثر ہو کر امیر خورد کرمانیؒ نے اسے انتخاب کیا، اور سیر الاولیاء کے اوراق کو اس سے زینت بخشی ہے، جو ادب صوفیہ میں بے مثل اور ضمانت

درجہ مستند مانی جاتی ہے، اس واقعہ سے جو اثر قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی
قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مبارک قلب پر ہوا سے آپنے نہایت موثر الفاظ میں اس روایت کے
آخر میں بیان فرمایا ہے، جو تمام تر قادر مطلق کی قدرت کاملہ کا اعتراف ہؤا اور اس روایت کے موثر و
مستند ہونے کی دلیل ہے آج بھی اس کا یہ اثر ہے کہ پڑھنے والا بیرون اس کے اثر سے متاثر رہتا ہے
اور حجابات مترفع ہونے لگتے ہیں،

روایت نمبر ۲ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:

ایک مرتبہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ، ہم دونوں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے،
ایک بزرگ تھے، انھیں بھی شیخ عثمان کہتے تھے، جو بندگان خواجہ ابوبکر شبلیؒ میں سے تھے،
اور نہایت بزرگ تھے، ہم نے انھیں طواف میں دیکھا، اور ہم اُن کے پیچھے پیچھے اور قدم بہ
قدم چلنے لگے، وہ بزرگ روشن ضمیر تھے، وہ ہماری اس اتباع سے آگاہ ہوگئے، منھ
پیچھے کیا، اور فرمایا، ظاہری متابعت کیا کرتے ہو، وہ کرو جو میں کرتا ہوں، ہم دونوں
نے دریافت کیا کہ آپ کیا کرتے ہیں، فرمایا کہ میں روزانہ ہزار بار ختم قرآن کیا کرتا ہوں[1]
ہم دونوں اُن کی یہ بات سُن کر حیران ہوگئے، ہم نے سوچا ہر سورت کی ابتدا سے کچھ تلاوت
کر لیتے ہوں گے، یہ خیال ہمارے دل میں آیا ہی تھا کہ انھوں نے منھ اوپر کیا اور
باواز بلند کہا کہ نہیں حرف حرف پڑھتا ہوں۔" (فوائد السالکین فارسی ص ۱۳)

ہر علم و فن کے عہد عروج میں کچھ ایسی شخصیتیں منصۂ شہود پر آتی ہیں، جن کے کارناموں سے
صدیوں اہل علم انگشت بدنداں رہتے ہیں، یہ روحانیت و تصوف کا عہد عروج تھا جو گزر گیا،

---

[1] من ہر روز ہزار قرآن ختم می کنم کا ترجمہ ہشت بہشت میں بیس ہزار اور ان بزرگوں کا نام برہان الدین لکھا
ہے، جو غلط ہے،

اور اپنی یا دچھوڑ گئی ایک بندے اس کی یادہی سے ہدایت و رشد کی شمع روشن رکھتے ہیں لیکن اس قوم کے ذہنی علم افراد کے اذہان جو آمادۂ زوال ہوتی ہے، یا ہو چکی ہوتی ہے، اپنے واقعات سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہوتے ہیں، وہ انھیں مبالغہ آرائی یا مبالغہ آمیزی سے تعبیر کرتے اور انکار کی راہ اختیار کرتے ہیں، ایسے اشخاص کا وجود قوم کے لئے فال نیک نہیں، بلکہ قوم کی پستی و ذلت کی علامت ہے،

جب ہمارا ماضی تابناک تھا، تو ایسے محیرالعقول واقعات سے انکار نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اگر بعینہٖ وہ نہیں تو اُن جیسے متعدد واقعات سے فضا معمور تھی، ایک بزرگ تھے جو آغاز صبح صادق سے طلوعِ آفتاب تک قرآن پاک ختم فرمایا کرتے تھے، (فوائدالفواد ص ۶) امیر خورد کرمانی نے لکھا ہے کہ خواجہ ابو یوسف چشتی رح روزانہ پانچ قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے، پھر دیگر اعمد کی طرف متوجہ ہوتے تھے، (سیرالاولیاء ص ۴۲)

فوائدالسالکین کی اس روایت کو بالفاظ دیگر حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے بھی نقل فرمایا ہے، جو فوائدالفواد ص، کی زینت ہے، فرق اتنا ہی ہے جتنا مختلف اشخاص کے بیان میں ہوتا، اور ہو سکتا ہے، ختم قرآن کی تعداد سات سو بیان فرمائی ہے، ہزار بھی محیرالعقول ہے، اور سات سو بھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس روایت کو نہ تو مبالغہ آرائی سے تعبیر فرمایا، اور نہ چشتی بزرگوں کے عقائد و تعلیمات کے خلاف قرار دیا، بلکہ جب حاضرین مجلس میں سے آپکے مخلص مرید اعزالدین علی شاہ نے دریافت کیا کہ یہ شاید کرامت ہے تو آپنے فرمایا:-

آرے کرامت باشد ہر معاملہ کہ بعقل ‏ ‏ ہاں کرامت ہی ہے جو بات بعید از عقل ہوتی ہے
باز خوانداں دیگرست و آنچہ در عقل ‏ ‏ وہ کچھ اور ہے، اور جو عقل میں نہ سمائے وہ
گنجائی نہ باشد آں کرامت باشد (فوائدالفواد ص ۷) ‏ ‏ کرامت ہے،

مولانا علاء الدین کرمانیؒ بھی اس نقطۂ نظر سے متفق ہیں، ان کا ارشاد فوائد السالکین کی روایت کے ساتھ یہ ہے،

"جو بات سمجھ سے باہر ہے وہی کرامت ہے، وہ عقل میں سماتی نہیں ہے، یقیناً ان بزرگ کا ہزار قرآن مجید روزمرہ ختم کرلینا کرامت خاص ہے،

"قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز آبدیدہ ہوئے، اور فرمایا جسے جو کچھ ملا ہے حسن عمل کی بدولت ملا ہے، اور اگرچہ فضل ایزدی سب ہی کے شریک حال ہے، مگر جد وجہد لازم ہے، (فوائد السالکین فارسی ص ۱۳)

کیا حضرت محبوب الٰہیؒ سے زیادہ راہ آشنا اور عالم و عارف آج ہے کوئی، ؟ لہٰذا یہ ماننا ہوگا کہ یہ روایت بلا شبہ چشتی بزرگوں کے عقائد اور تعلیمات کے عین مطابق ہے، اور کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے،

اس روایت میں از بندگان خواجہ ابوبکر شبلیؒ ہے، خواجہ ابوبکر شبلیؒ کا سنہ وفات ۳۳۴ھ بتایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اُن کے اور قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز (متوفی ۶۳۳ھ) کے زمانے میں ڈھائی سو سال کا فصل ہے قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطبؒ الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ایام حیات میں خواجہ ابوبکر شبلیؒ کے کسی غلام کا بقید حیات ہونا ممکن نہیں[۵]، مگر یہ شبہہ لاحق ہوسکتا ہے، بندہ اور بندگان کی معنویت وحقیقت اور صرف محل سے ناواقف ہونے کی بنا پر، بندہ اسم مذکر ہے بستن مصدر سے ہے جس کے معنی ہیں، کسی سے وابستہ ہونا متعلق ہونا، اور اس تعلق میں نہ قرب مزاحم ہے نہ بعد، وہ بھی بندہ ہے جو کسی کے عہد حیات میں اس سے وابستہ ہے، اور وہ بھی ہے جو مدت مدید کے بعد بلکہ بعد وفات وابستگی رکھتا ہے، خواجۂ بزرگ

---

[۵] نوادر الفرید ص ۲۰ (مطبوعہ پاکستان)

خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے :-

نیکے از کمترین بندگان محمد رسول اللہ ام صلی اللہ علیہ وسلم (فوائد السالکین ص ۴۳)

عہد حاضر کے ایک فاضل اہل قلم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے حکیم سنائی کے متعلق لکھا ہے :-

" وہ دونوں اماموں کے بندے تھے، (ماہنامہ معارف اعظم گڈھ نومبر ۱۹۷۹ء ص ۳۴۳)

ڈاکٹر صاحب موصوف کی دونوں اماموں سے مراد امام اعظم ابو حنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ) اور امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ حکیم سنائیؒ (متوفی ۵۲۵ھ) کے ہمعصر نہیں تھے، تین تین سو سال سے زیادہ کا فصل ہے، مگر پھر بھی وہ دونوں ہی اماموں کے بندے تھے، اہل کمال کی روش یہی ہے، جو الفاظ کی سیرت وحقیقت سے آگاہ ہیں، وہ صرف محل سے ناواقف نہیں، لہذا اس واہمہ کی بنیاد کہ کسی کا صدیوں بعد از بندگان فلاں ہونا ممکن نہیں، عدم واقفیت کی علامت ہے، ہمعصر بھی از بندگان سے ہوسکتا ہے اور صدیوں بعد بھی، اس روایت کو نہ تاریخ رد کرتی ہے، نہ چشتی بزرگوں کے مسلک کے خلاف ہے۔ البتہ علمی کم مائیگی سدِ راہ ہوسکتی ہے،

روایت نمبر ۳ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا :-

" میں اجمیر شریف میں خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا، راجہ پتھورا زندہ تھا، اور وہ یہ کہا کرتا تھا کہ یہ درویش اگر یہاں سے چلا جائے، تو کیا ہی اچھا ہو، خواجہ بزرگؒ نے یہ بات سُنی، اس وقت کچھ اور درویش بھی حاضر خدمت تھے، اور حالت سکر میں بیٹھے تھے، خواجۂ بزرگ مراقب ہوئے، اور مراقبے ہی میں آپ نے فرمایا، پتھورا را زندہ بسلمانان دادیم (ہم نے

پتھورا کو زندہ ہی مسلمانوں کے حوالے کر دیا، کچھ دنوں بعد ہی سلطان شمس الدین محمد شاہ
پہنچا اور اُس نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر لیا، شہر کو برباد کر ڈالا۔"

(فوائد السالکین فارسی ص ۱۵)

اجمیر کو سلطان محمد غوری نے ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں فتح کیا تھا، محمد غوری کا نام معز الدین محمد بن سام تھا، بعض تاریخوں میں شہاب الدین محمد غوری لکھا ہوا اور بعض میں محمد شاہ غوری لکھا ہے، اس بیان میں شمس الدین کتابت کی غلطی ہے اسمائی ایسی غلطیاں تاریخی کتابوں میں بھی ملتی ہیں، کاتب کے سہو سے نہ تو کسی روایت کو غیر مستند کہا جا سکتا ہے، اور نہ کسی کتاب کو جعلی قرار دیا جا سکتا ہے، فوائد السالکین جب کبھی صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر شائع ہو گی تو سطحی غلطیاں رفع ہو جائیں گی، یہ روایت بذاتہٖ معتبر و مستند ہے، یہ روایت سیر الاولیاء ص ۴۶ - ۴۷ میں بھی ہے۔

روایت نمبر ۴ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:-

"ایک دن خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہٗ العزیز اور شیخ اوحد الدین کرمانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی اور دعاگو ایک جگہ بیٹھے تھے، اولیائے ماضی کا ذکر خیر ہو رہا تھا، سلطان شمس الدین انار اللہ برہانہ ہاتھ میں پیالہ لئے سامنے سے گزرا، سب نے اسے دیکھا، خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ جب تک یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا، مرے گا نہیں۔"

(فوائد السالکین فارسی ص ۱۶)

خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی اس پیشین گوئی سے اولیاء اللہ کی بصیرت باطنی کی تائید ہوتی ہے، ایسے واقعات اکثر بزرگوں سے ظہور میں آتے رہتے ہیں،

اتباعِ شریعت وسُنت اور مجاہدات کی بدولت اولیاء اللہ ایسے اوصاف سے متصف ہوتے ہیں انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے متعلق متعدد ایسے واقعات نقل کئے ہیں، (سیر الاولیاء ص ۱۴۱ - ۱۴۹)

رہی یہ بات کہ سلطان شمس الدین کے نام کے ساتھ انار اللہ برہانہ ہے تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں، اسے اصطلاح اموات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، غلط ہے، اعزازی کلمات کے وہ جگہ جو بزرگوں کے ناموں کے ساتھ لکھے ملتے ہیں، اُن کا مُدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ان ہی کے ناموں کے ساتھ ہوسکتے ہیں، جو وفات پاچکے ہیں، بلکہ اُن کے ناموں کے ساتھ بھی ہوسکتے ہیں جو بقید حیات ہیں، ان اعزازی کلمات کی اصل یہ آیہ کریمہ ہے،

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ — راضی ہوا اللہ اُن سے اور وہ راضی ہوئے اللہ سے، ( )

یہ آیت کریمہ قرآن پاک میں کئی جگہ ہے، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ارشاد ہے کہ اس آیت کا نزول السابقونَ الاولون من المہاجرین والانصار سے متعلق ہے، جو بقید حیات بھی تھے، شہید بھی ہوچکے تھے، اور وفات بھی پاچکے تھے، گویا کہ یہ مطلق ہے، وفات یافتہ حضرات کے ساتھ مقید نہیں ہے، یہی حال دیگر اعزازی کلمات کے جگوں کا ہے، خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ کا ارشاد ہے:-

"صلوٰۃ اللہ علیہ ورحمۃ اللہ علیہ وقدس سرہٗ ورضی اللہ عنہ ورضوان اللہ علیہم اگرچہ مختلف الفاظ ہیں، مگر ان کا مفہوم ایک ہی ہے، اور وہ ہے الصَّلوٰۃ من اللہ والرَّحمۃ" (جوامع الکلم ملفوظ ۱۶ شعبان ۸۰۲ھ)

متقدمین نے بلا امتیاز ان اعزازی کلمات کو اُن کے لئے بھی استعمال کیا ہے، جو

قید حیات تھے، اور ان کے لئے بھی جو وفات پاچکے تھے، وفات یافتہ حضرت کے ناموں کے ساتھ
ن کا استعمال عام ہے، مگر فی زمانا ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ کم استعمال ہے، یا بالکل نہیں ہے
د بقید حیات ہیں، مگر عہد قدیم میں رواج تھا، اس نقطۂ نظر کی تائید میں صرف تین معتبر مثلہ
ش کرتا ہوں،

(۱) حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد ہے کہ حضرت بابا صاحب نے فرمایا کہ تو و بدر الدین
اسحاق علیہ الرحمۃ بروید" (فوائد الفواد ص ۵۹)

(۲) اجودھن (پاکپتن) کے قاضی ابو الفضل عبد اللہ نے حضرت بابا صاحبؒ کی
حیاتِ طیبہ میں حضرت بابا صاحب کا ذکر کیا تو کہا شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز
(فوائد الفواد ص ۹۶)

(۳) حضرت بابا صاحبؒ کے بزرگ خلیفہ علامہ انوری مولانا فخر الدین زرادیؒ نے حضرت
والا کی حیاتِ مبارکہ ہی میں رسالہ اصول السماع تصنیف فرمایا تھا، حضرت کا نام
نامی اس میں اس طرح لکھا ہے، کما قال شیخنا نظام الملۃ والدین قدس اللہ
سرہ العزیز، (رسالہ اصول السماع قلمی ص ۱۶)

یہ مسئلہ بھی صاف ہوگیا، غلط فہمی اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی، اب بے تکلف یہ تسلیم کیا جائیگا
کہ یہ روایت اولیاء اللہ کے احوال کی اور اُن کی بصیرتِ باطنی کی آئینہ دار اور سبق آموز ہے،

روایت نمبر۵ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز
نے فرمایا:-

"ایک دن میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ دونوں شیخ علی سنجری قدس اللہ سرہ العزیز
کی خانقاہ میں تھے، محفل سماع تھی، گانے والوں نے جب یہ شعر گایا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ اس شعر سے بہت ہی متکیف ہوئے،
لہذا تین رات دن اس شعر سے ہم متحیر و مدہوش رہے ۔ پھر اپنے گھر چلے آئے۔ (در
گانے والوں سے یہی شعر گواتے رہے) تین رات دن اور بھی لگاتار اس شعر سے متحیر
رہے کہ ہمیں اپنی بھی خبر نہ تھی، البتہ نماز بروقت پڑھ لیا کرتے تھے، اور پھر
سماع میں محو و مشغول ہو جاتے تھے ۔ اس طرح سات شبانہ روز محو حیرت رہے، گانے
والے جب یہ شعر گاتے تو ایسی حالت دحیرت رونما ہوتی کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔
(فوائد السالکین فارسی ص ۱۸)

اسی کے مماثل ایک روایت حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی بیان فرمائی ہے، جس میں قطب الاقطاب
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی وفات حسرت آیات کا ذکر ہے،
اور وہ یہ ہے :-

"حضرت محبوب الٰہی نے بیان فرمایا کہ شیخ علی سنجریؒ کی خانقاہ میں محفلِ سماع تھی،
اور شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز
اس محفل سماع میں شریک تھے، گانے والے نے جب یہ شعر گایا[۱]

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین نور اللہ مرقدہ اس شعر سے بہت ہی
متکیف ہوئے، جب وہاں سے گھر آئے تو متحیر و مدہوش تھے اور فرماتے تھے یہی گائے جاؤ۔

---

[۱] یہ کلام خواجہ احمد جام زندہ پیلؒ کا ہے، اس کا مطلع ہے :-

منزلِ عشق از مکانے دیگر است مرد ایں رہ را نشانے دیگر است

گانے والے یہی شعر گاتے رہے، اور آپ اسی طرح متحیر و مدہوش رہے، البتہ نماز بروقت پڑھ لیا کرتے تھے، پھر یہی شعر پڑھواتے عجب کیفیت ہوتی، چار شبانہ روز یہی کیفیت رہی، پانچویں رات کو آپنے وصال فرمایا، (فوائد الفواد ص ۴۴)

یہ دو مختلف روایتیں ہیں، جو کیفیات کے اعتبار سے مماثل بھی ہیں، اور ان میں باہم مطابقت بھی ہے، مگر یہ بدگمانی صحیح نہیں، کہ کسی نے عمل تحریف سے فوائد الفواد ہی کی روایت کو فوائد السالکین میں شامل کر دیا ہے، کیونکہ یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے، یا تو علم مجلسی سے عدم واقفیت سے، یا ذہن کے صلاحیتِ مطابقت سے عاری ہونے سے، یا افترا پردازی کے جذبے کی بدولت، ورنہ صورتِ حال روزمرہ کے حالات کے مطابق ہے،

جن صاحبوں کو مجالس سماع میں شریک ہوتے رہنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ کی مختلف مجالس میں بارہا ایک ہی غزل سننے میں آتی ہے، جو سامعین کے ذوق کے مطابق اور پُرکیف ہوتی ہے، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ماننا ہوگا کہ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی مبارک طبیعت کو مذکورہ شعر سے خصوصی مناسبت تھی، دو مجلسوں کا حال ہمارے علم میں ہے، بعض اور مجالس میں بھی اس شعر پر ایسی ہی کیفیت ہوئی ہوگی، لہذا یہ قرین قیاس ہے کہ جب خانقاہ شیخ علی سنجری کی مجلس میں پہلی بار یہ شعر سنا تو سات شبانہ روز عالم تحیر میں رہے، اور متواتر سنتے رہے اور جب دوبارہ وہیں کی مجلس میں یہ شعر سنا تو چار شبانہ روز عالم تحیر میں رہے، اور پانچویں شب کو واصل بحق ہوئے، اس روایت میں سبق آموز نکتہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس درجہ عامل بشریعت اور نماز کے پابند تھے، کہ عالم کیف و تحیر بھی عمل سے مانع نہ ہوتا تھا، وقت آتے ہی طبیعت خود بخود نماز کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی، گویا کہ یہ وصف عینِ طبیعت بن گیا تھا، اسی کی برکت سے تھا، جو کچھ تھا آج اس کا تصور بھی مشکل ہے،

تھے تو آباء وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو   ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

عمل شریعت سے بیگانگی کا یہ خمیازہ ہے، جو آج ہم بھگت رہے ہیں، آؤ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی مبارک زندگی سے سبق لیں، اسلام کی قدروں کو اپنائیں، اور عامل شریعت بن جائیں، تاکہ ہماری زندگی بھی نور ایمان سے تابناک ہو جائے، اور بے عملی کی نحوست سے چھٹکارا پالیں، پھر تو سب ہی کچھ اپنا ہے،

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

دونوں روایتوں کا اپنا اپنا موقف ہی اسی طرح انھیں سمجھنا چاہئے جس طرح علم مجلسی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے،

روایت نمبر | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:-

"یہ دعا گو خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا، اور بھی درویش حاضر خدمت تھے، اولیاء اللہ کا ذکر خیر ہو رہا تھا اتنے میں ایک شخص آیا، قدمبوس ہوا، اور خواجۂ بزرگ سے بیعت ہونے کے لئے درخواست کی، آپ نے اُسے بٹھایا، اور فرمایا کہ جو میں کہوں وہ تم کرو گے، تو میں تمھیں مرید کرلوں گا، اُس نے کہا بیشک حکم کی تعمیل کروں گا، آپ نے فرمایا تم کلمہ اس طرح پڑھتے ہو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ایک بار اس طرح پڑھو، لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ اس نے حکم کی تعمیل کی، اور کلمہ اسی طرح پڑھ لیا جس طرح آپ نے بتایا تھا، خواجۂ بزرگ نے اُسے بیعت کرلیا، اور نعمت و خلعت سے نوازا، اور فرمایا، میں نے تمھاری عقیدت کا امتحان لینے کے لئے اس طرح کلمہ پڑھوایا تھا، ورنہ کلمہ وہی ہے، جو تم پڑھتے ہو لا الٰہ

الا اللہ چشتی رسول اللہ میں تو خود کمترین بندگان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
میں سے ایک ہوں، یعنی از کمترین بندگان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فرمایا
کہ مرید کو اپنے پیر کی خدمت میں صادق اور راسخ العقیدہ ہی ہونا چاہئے،
(فوائد السالکین فارسی ص ۲۳)

یہ روایت بادی النظر میں عجوبہ سی لگتی ہے، اور ذہن فوری طور پر قبول کر لینے کو آمادہ نہیں ہوتا، مگر یہ روایت خواجہ ابوبکر شبلیؒ متوفی ۳۳۴ھ سے منسوب فوائد الفواد (ص ۲۳) اور سیر الاولیا، (ص ۳۳۸) جیسی نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل کتب تصوف میں ملتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا ہی واقعہ خواجہ بزرگؒ کی خدمت میں پیش آیا ہو، اور انھوں نے خواجہ ابوبکر شبلیؒ کی اتباع میں یہ روش اختیار کی ہو، اور اس کی افتاد طبع کے مطابق اصلاح کے لئے یہی مناسب ہو، ع کار پاکاں را قیاس از خود مگیر،

جن کا علم محدود ہے، وہ کچھ بھی کہیں، وہ قابل قبول نہیں، خواجہ ابوبکر شبلیؒ کو اب ایک ہزار سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے، ان علماء نے جو علم وافر رکھتے ہیں، اور رموز تصوف سے آگاہ ہیں، اور لفظ رسول کے لغوی معنی سے اور اس کے صرف محل سے واقف ہیں، اور صرف محل سے متعلق اشارات ان کے ذہن میں مستحضر ہیں، اس پر نہ تو کلام کیا ہے، اور نہ کرتے ہیں، یہ روایت دراصل اتباع شیخ کی ترجمان ہے، اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے،

روایت نمبر ۱ حضرت بابا صاحب فرید الملۃ والدین مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز بیان فرماتے ہیں:۔

"خانہ کعبہ کے مسافروں کا ذکر ہو رہا تھا، قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا، اللہ کے خاص بندے اپنے خانہ خراب ہی

میں ہوتے ہیں، تو کعبۃ اللہ کو حکم ہوتا ہے، کہ اُن کے گرد طواف کرے، آپ یہ فرما
ہی رہے تھے، تو آپ اور حاضرین مجلس سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور عالم تحیر و شوق میں
مستغرق ہو گئے، اور ایسے مستغرق ہوئے، کہ اپنی بھی خبر نہ رہی، دعا گو بھی عالم ذوق
و شوق میں کھو گیا، پھر سب ہی اس طرح تکبیریں کہنے لگے جس طرح طواف کے دوران
کہتے ہیں، ہر ایک کے بدن سے تازہ تازہ خون بہنے لگا جو قطرۂ خون زمین پر گرتا نقش تکبیر
بن جاتا، جب عالم ہوش میں آئے، تو خانہ کو اپنے روبرو دیکھا، ہم نے اس کا وہی
ادب کیا، جو کیا جاتا ہے، چار بار اس کا طواف کیا، اور ندائے غیبی سنی کہ اے عزیزو!
ہم نے تمھارے حج کو تمھارے طواف کو اور تمھاری نماز کو قبول کیا، بلکہ ان کے بھی حج کو
طواف کو اور نماز کو قبول کیا، جو تمھارے نقش قدم پر چلتے ہیں، اور چلیں گے،

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز
نے پھر فرمایا، کہ شیخ الاسلام خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز ہر سال اجمیر
سے زیارتِ خانہ کعبہ کو جایا کرتے تھے، جب ان کا کام کمالیت کو پہنچ گیا، تو جو حاجی
حج کو جاتے، وہ بتاتے تھے، کہ ہم نے خواجۂ بزرگ کو طواف کرتے دیکھا تھا حالانکہ
وہ معتکف ہوتے تھے،

پھر فرمایا کہ خواجۂ بزرگ ہر شب کو خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے جاتے تھے، رات
بھر وہیں رہتے، اور صبح ہونے سے پہلے ہی آجاتے تھے، اور اپنے جماعت خانہ میں نماز
پڑھتے تھے،

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ حکایت خواجۂ بزرگ کی زبانی سنی ہے، اور
انھوں نے حضرت شیخ عثمان ہارونی قدس اللہ سرہ العزیز سے سنی تھی، کہ جب حضرت

"خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو زیارت خانہ کعبہ کا اشتیاق دامنگیر ہوتا تو فرشتوں کو حکم ہوتا کہ وہ خانہ کعبہ کو چشت لے جائیں، اور خواجہ مودود چشتیؒ کے روبرو کر دیں، فرشتے حکم کی تعمیل کرتے، خواجہ موصوف اسے دیکھتے تو طواف کعبہ کرتے اور نماز پڑھتے جب فارغ ہو جاتے تو وہ فرشتے اسے لیجاتے۔"

(فوائد السالکین فارسی ص ۲۵-۲۶)

یہ جملہ بیانات اوصاف مشاہدہ اور رموز طریقت کے جامع ہیں، تا وقتیکہ قلب و دماغ اعمال صالحہ کی صیقل سے متجلی نہ ہو گئے ہوں، اُن کے انعکاس کے متحمل نہیں ہو سکتے، یہ روحانیت کے اُن اعلیٰ و ارفع کیفیات کی لمعہ افگنی ہے کہ آلودہ مادیت و معصیت اذہان اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے، ایسی ہی تجلیات کی پر توافگنی سے فوائد السالکین کا پایۂ اعتبار ادب صوفیہ میں بلند سے بلند تر ہے، ان میں سے بعض کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:-

خواجہ معین الدین الحق.... می فرمود	خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدینؒ
مدتے گرد خانۂ کعبہ طواف کردم اکنون	.. .. .. فرماتے تھے، میں نے مدتوں
ایں زماں خانۂ کعبہ گرد من طواف	خانۂ کعبہ کا طواف کیا ہے، اب خانۂ
می کند۔ (سیر الاولیاء ص ۴۶)	کعبہ میرے گرد طواف کرتا ہے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے وہ حکایت بھی نقل کی ہے، جو حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ سے متعلق فوائد السالکین میں ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہو کر فوائد السالکین اس باب میں سیر الاولیا کا ماخذ ہے، لکھتے ہیں،

ہر وقت کہ خواجہ مودود چشتیؒ را	جب بھی خواجہ مودود چشتیؒ کو
اشتیاق زیارت خانۂ کعبہ غالب	خانۂ کعبہ کا اشتیاق ہوتا، اور بہت

شدے فرشتگان را حکم شدے
تا خانہ کعبہ را می آوردند و در نظر
خواجہ می داشتند طواف کردے، و نماز
کہ آمدہ است، بگزاردے بعدہ
باز خانہ کعبہ را می بردند"
(سیر الاولیاء ص ۳۴۲)

زیادہ ہوتا، تو فرشتوں کو حکم ہوتا
وہ خانہ کعبہ کو لے آتے اور خواجہ
مودود چشتیؒ کے سامنے لاکر رکھتے تھے،
خواجہ موصوف طواف کرتے، اور
نماز پڑھتے، جو کعبہ میں پڑھی جاتی
ہے، اس کے بعد وہ خانہ کعبہ کو لے جاتے"

امیر خورد کرمانیؒ کے بیانات کی روشنی میں کسی کو فوائد السالکین کے موقر بیانات سے انحراف کی گنجائش نہیں رہتی، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے متعلق یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے، ،،

عزیزے حکایت کرد کہ از قصبہ
خود بقصد زیارت سلطان المشائخ
روان گردیدم گزر من میان قصبہ
بوندی افتاد، در دل گذشت کہ ہمیں
جا درویشے است کہ او را شیخ موہن
گویند با او ملاقات کنم بر در رفتم پرسید
کجا خواہی رفت گفتم بخدمت سلطان
المشائخ گفت، سلطان المشائخ را
سلام من برسانی، و بگوئی کہ ہر شب
جمعہ در کعبہ ملاقات می کنم چون من

ایک عزیز نے بیان کیا کہ میں اپنے
قصبے سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے نیاز
حاصل کرنے چلا تو جب قصبہ بوندی
پہنچا تو مجھے یاد آیا کہ یہاں بھی ایک
درویش ہیں، جن کا نام شیخ موہن ہے،
اُن سے بھی ملتا چلوں جب اُن کی
خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے
دریافت کیا کہ تم کہاں جاؤ گے،
میں نے عرض کیا حضرت محبوب الٰہیؒ
کی خدمت میں حاضر ہوں گا انھوں نے

بخدمت سلطان المشائخ بودیم عرض داشت کردم در قصبہ بوندی درویشے است سلام رسانیدہ است واین سخن گفتہ شیخ منغض شدہ فرمود او درویشے عزیز است ولیکن زبان خود برخود ندارد،

(سیر الاولیاء ، ص ۱۴۵، ۱۴۶)

کہا، ان سے میرا سلام کہنا، اور کہنا کہ میں ہر شب جمعہ کو کعبہ میں آپ سے نیاز حاصل کرتا ہوں جب میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ قصبۂ بوندی میں ایک درویش ہیں، انھوں نے سلام کہا ہے، اور یہ بھی کہا ہے شیخ رنجیدہ ہوئے اور فرمایا کہ درویش تو اچھا ہے مگر زبان قابو میں نہیں ہے،

اس بیان سے یہ واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ بھی خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی طرح زیارت خانۂ کعبہ سے مشرف ہوتے رہتے تھے، ایسے ہی واقعات اور بھی ہیں جن سے واضح ہے کہ سیر الاولیاء، کا ماخذ فوائد السالکین ہے، فوائد السالکین کی روایات کو مبالغہ آمیز یا جعلی نہیں کہا جا سکتا، طیر و سیر اولیائے کاملین کا اختصاصی وصف ہے، اس کے باب میں مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے یہ کلیہ بیان فرما دیا ہے،

چوں روح کامل می شود اورا قوت طیران حاصل می شود، چہ در عالم علوی اچہ در عالم سفلی وجوارح نیز چوں متابع قلب شدہ

جب روح کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اسے پرواز کی قوت حاصل ہوجاتی ہے، خواہ عالم سفلی میں پرواز کرے خواہ عالم علوی میں، اعضا قلب کے

قلب تابع روح پس ہر جا کہ روح	تابع ہوتے ہیں اور قلب روح کے
طیران نماید، قلب و جوارح طیران نماید	تابع ہوتا ہے، لہٰذا جہاں جہاں روح
(خیر المجالس ص ۶۲)	پرواز کرتی ہے تو قلب اور اعضا
	بھی وہیں پرواز کرتے ہیں،

یہ فوائد السالکین کی وہ روایتیں ہیں جنھیں کچھ نقادوں نے مبالغہ آمیز خلاف فطرت اور چشتی بزرگوں کے عقائد و تعلیمات کے خلاف بتا کر فوائد السالکین کو جعلی بتایا ہے، مگر تقابلی مطالعہ نے بتایا کہ یہ روایتیں اور ان کی مثل روایتیں فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیاء میں بھی ہیں جنھیں وہ نہایت درجہ معتبر و مستند ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں، لہٰذا یہ روایتیں فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا سبب قرار نہیں پاسکتیں، اور جو شبہات وارد کئے ہیں، وہ بھی تمامتر بے اصل ہیں اور اگر بالفرض محال یہی روایتیں فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا سبب ہیں، تو ان بے مثل، نہایت درجہ مستند و معتبر کتابوں کے جعلی ہونے کا سبب کیوں نہیں ہیں جن کے اوراق کی زینت یہ روایتیں بھی ہیں،

اسلوب بیان حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز نے فوائد السالکین کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ اسرار الٰہی اور انوار لامتناہی جو قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے بیان فرمائے، اور میں نے سنے، وہ میں نے اس مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین میں اپنی زبان میں لکھے ہیں، گویا کہ فوائد السالکین میں جو مضامین و خیالات ہیں وہ تو قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کے بیان فرمودہ ہیں، اور فوائد السالکین میں جو اسلوب بیان ہے، وہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوب بیان ہے،

فوائدالسالکین کا اسلوب بیان سادہ سلیس، شستہ و رفتہ اور عام فہم ہے، بلکہ سنجیدگی اور متانت سے مالامال ہے، سلوک و روحانیت کے عمیق و نازک خیالات کو ضبط تحریر میں لانا سہل نہیں ہے، بہت مشکل ہے، کیونکہ دقائق کا بیان گنجلک بھی ہوسکتا ہے اور تفصیلی طوالت سے بے لطف بھی ہوسکتا ہے، مگر حضرت بابا صاحبؒ نے کمال انشاپردازی کی بدولت ہر کہیں اسے سنبھالے رکھا ہے، پھر ایسے نازک اور عمیق خیالات کو عام فہم زبان میں بیساختگی کے ساتھ بیان کرنا بھی کمال فن ہی سے متعلق ہے، جس سے ہر کس و ناکس عہدہ برآ نہیں ہوسکتا،

فارسی ایک وسیع اور نہایت وسیع ملک کی زبان ہے، مقامی اور طبقاتی امتیازات کی حامل بھی ہے، مگر فوائدالسالکین کے اسلوب کا یہ اہم وصف ہے، کہ وہ ان امتیازات سے بالاتر ہے کوئی جملہ یا کوئی لفظ ایسا نہیں، جو عام فہم نہ ہو اور ہر کہیں مروج نہ ہو، یا وہ طبقاتی و مقامی خصوصیت کا حامل ہو، جس کی فہمید میں کسی کو تامل ہوسکے، ہر فارسی داں خواہ وہ کسی طبقے سے متعلق ہو، یا کسی مقام سے یکساں طور پر بآسانی سمجھ لیتا ہے، اور لطف اندوز ہوتا ہے، یہ زبان دانی کا ایسا وصف ہے، جو آپ اپنی مثال ہے، مگر تراجم سے استفادہ کرنے والے اس اہم وصف سے واقف نہیں ہوسکتے، اور تراجم سے اصل اسلوب پر تنقید و رائے زنی کرنا کمال کم آگاہی کی علامت ہے،

بیان میں کیف و جاذبیت اس قدر ہے کہ مطالعہ کرنے والا عالم سرور و کیف میں کھو جاتا ہے اور اسی عالم میں رہنا چاہتا ہے، قلب کی حالت عجیب ہوتی ہے، جو بیان نہیں کی جاسکتی ہے، دل میں اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اور دنیا سے دل اچاٹ ہوجاتا ہے، یہ وصف آج بھی ہے جب ہمارا ماحول اور ہمارا معاشرہ روحانیت سے بیگانہ ہے، اور مادیت کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے، پھر بھی دل میں ہوک اٹھتی ہے، اور طلب پیدا ہوتی ہے، کہ ان بندشوں کو توڑ پھینکا جائے، اور اللہ کا ہوکر رہا جائے، اسی میں کامرانی ہے، اور اسی میں سکون قلب ہے، فوائدالسالکین کا یہی وہ وصف ہے جس سے

مادہ پرست دہشت زدہ ہیں اور بیا بدت تنقید بنانے کے درپے ہیں کل است ہے کہ یہ نادرہ روزگار صحیفہ روحانیت عقیدتمندوں کی بے اعتنائی کی بدولت گنج خمول کی زینت ہے جو عقیدتمندی کے چہرے کا نہایت بدنما داغ ہے ،

اسرار و انوار کی آمیزش نے اسلوب کی جاذبیت اور عظمت و اہمیت کو دو بالا کر دیا ہے ،

فوائد السالکین اپنے اسلوب و مضامین کے اعتبار سے عظیم ادبی اور روحانی شاہکار ہے جس کی بدولت ہم اپنی عظمت رفتہ سے اور اپنے آبائی ورثے سے دوبارہ مستفید ہو سکتے ہیں یہ گراں قدر صحیفہ جو ہمارا روحانی ورثہ ہے جس کی قدر و منزلت ہمارا اخلاقی فریضہ ہے ، حضرت باباصاحبؒ کے اسلوب کی شائستگی زندۂ جاوید ہے ، اہل کمال آج بھی اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مجبور ہیں ، اس سے زیادہ کسی اسلوب بیان کی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے ، ،

دل کی نگاہ فکر کی بینائی چاہیئے ، جلوے ہیں عام ظرف تماشائی چاہیئے

نفس مضمون | فوائد السالکین کی یہ امتیازی خوبی ہے ، کہ حال قال پر چھایا ہوا ہے ، کیفیات کو گرفت میں لانا کاری وارد ہے ، خیالات اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں ، اور نازک دقیق بھی ہیں کیسے [illegible] کیا جائے اور کیسے نہیں ، مرزا غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا ، مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میری خام کاری اور کم مائیگی کہیں مجھے رسوا نہ کر دے ،

. حال تو کلت علی اللہ خیالات کے بعض جگوں کو تبرکاً نذر ناظرین کرنے کی جسارت کرتا ہوں ، اور مغفرت کا تمنائی ہوتا ہوں ،

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے اور سالکین کے لئے ہدایت خاص ہے ، اور وہ یہ ہے ، :-

" شیخ میں قوت قلبی اس قدر ہونی چاہیئے کہ جب کوئی بیعت کا طالب ہو تو وہ

بیک نظر اس کے قلب کو دنیاوی آلودگی سے پاک کر دے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لے، خدا تک پہونچا دے"،

یہی وہ وصف ہے جس سے صوفیائے کرام نے عہد ماضی میں کام لیا، اور جم غفیر کو راہِ راست پر لگایا جس سے اللہ کی یاد کا ولولہ موجزن تھا،

"کم خوردن و کم خفتن اور کم گفتن، و کم آمیختن کی تلقین فرمائی ہے"

دانشورانِ عالم آج بھی اس کے قائل ہیں کہ کم کھانے سے کم سونے سے اور کم بولنے سے اور کم آمیزی سے اطمینانِ قلب اور جودتِ طبع کی دولت نصیب ہوتی ہے ورنہ سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیا کمانے میں اس وصف سے متعدی بھی بروئے کار آتی ہے،

"درویشی میں بہت راحت ہے، اور وہ پناہ گاہ ہے دنیا کی آفتوں سے محفوظ رہنے کیلئے"

ہر خانوادۂ سلوک میں درجاتِ سلوک متعین ہیں بعض مشائخ کے نزدیک پندرہ درجے ہیں اور پانچواں درجہ کشف و کرامت کا درجہ ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ سلوک کے سو درجے ہیں، سترہواں درجہ کشف و کرامت کا درجہ ہے' (فوائد الفواد ص ۱۱) جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو کشف و کرامت کے وصف سے متصف ہو جاتا ہے تاہم سالکینِ راہ طریقت کو یہ ہدایت ہے تاوقتیکہ کہ کل درجات طے نہ کرلیں اظہارِ کرامت سے مجتنب رہیں، ارشاد فرمایا :-

جب کوئی مرتبۂ کرامت کو پہونچے تو اظہارِ کرامت سے مجتنب رہے، ورنہ دیگر مراتب سلوک طے نہ کر سکے گا، اور کشف و کرامت ہی میں الجھ کر رہ جائے گا البتہ جب پورے درجات طے کرلے بلکہ ان سے بھی سو درجے آگے نکل جائے، تو اظہارِ کرامت میں مضائقہ نہیں، مردِ کامل وہی ہے جو تا وقتیکہ تمام مراتب طے نہ کرلے اظہارِ کرامت کرے

یہ بھی فرمایا :-

عالمِ تحیر میں پہنچ جانے کے بعد اظہارِ کرامت میں کچھ مضائقہ نہیں۔

اس مقام پر فائز ہونے کے بعد کرامت کا ظہور بلا ارادہ بھی ہوتا ہے،

یک چشم دید، حیرت انگیز و سبق آموز واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اس کے تاثرات کو قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے اعتراف کے اسلوب میں کچھ ایسے والہانہ انداز میں بیان فرمایا ہے کہ دل کی دنیا آج بھی زیر و زبر ہوئے بغیر نہیں رہتی، ارشاد ہے:

"جب وقت آ ہی جاتا ہے، اور نسیم لطف و کرم چلنے لگتی ہے تو ہزارہا مبتلائے فسق و فجور اور آلودۂ معصیت و گناہ کو توفیق توبہ نصیب ہوتی ہے، پھر نسیم لطف و کرم انھیں میکدۂ تذلیل و تعیش سے اٹھاتی ہے، اور سجادہ نشینی کی بلند و باعظمت مسند پر لے جا بٹھاتی ہے، اور وہ بخش دیئے جاتے ہیں، اور جب کبھی قہر و غضب کی باد تند چلنے لگتی ہے، تو پھر یہی ہوتا ہے کہ ہزارہا سجادہ نشینانِ مسندِ عظمت و کرامت کو اٹھاتی ہے اور میکدۂ تعیش و تذلیل کے قعرِ مذلت میں لیجا ڈالتی ہے، (پناہ بخدا)

ارشاد ہے:

"اسرارِ الٰہی کا اظہار قربِ الٰہی میں مانع ہو، کامل الحال وہی ہے جو کسی حال میں بھی راز دنیا زادہ اسرارِ الٰہی کا اظہار ہونے نہیں دیتا اسی لئے وہ گنجینۂ اسرارِ الٰہی بنتا ہے"

الکرامت اور اسرارِ الٰہی میں بین فرق ہے، جو امتیاز کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ کرامت کو بھی اسرار کے حکم میں جانتے ہیں، اور یہ غلط ہے،

"مردانِ خدا ایسے بھی ہیں جنھوں نے مدارج سلوک طے کرلئے ہیں، اور بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن کیا مجال جو اسرارِ الٰہی کی بھاپ بھی منھ سے نکل جائے، دراصل وہی گنجینۂ اسرارِ الٰہی ہیں،"

حسن عمل کی ترغیب و تحریص کے باب میں ارشاد ہے،

فضل ایزدی تو بہر حال شامل حال، اور بہ وقت نازل ہے تاہم جسے جو ملا

جد وجہد اور حسن عمل کی برکت سے ملا ہے، اس لئے جد و کوشش لازم ہے، اس

سے کسی حال میں غفلت مناسب نہیں،

ارشاد ہے :-

جس کسی نے راہ محبت الٰہی اختیار کی، اور مصیبت و بلا سے گھبرایا جان لو کہ وہ

محب صادق نہیں ہے،

بتانا مقصود یہ ہے کہ راہ سلوک میں استقامت و استمالت مقدم و درکار ہے،

مرشد کی ارادت ہمیشہ ہی مناسب ہے، مرید کو لازم ہے کہ شیخ کی روش پر

قائم و دائم رہے، اس سے سر مو انحراف نہ کرے،

میری یہ تمنا ہے کہ میری یہ کوشش بھی ارادتمندوں کی نسبت سے متصف رہے آمین

فرمایا :-

شیخ کی حیات میں جتنا ادب و احترام ملحوظ رہتا ہے اتنا ہی ان کی وفات کے بعد بھی ملحوظ رہنا چاہئے،

اس لئے کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہی مگر ہم اوجھل نہیں ہیں، اس لئے ہمارا

عمل وہی رہنا چاہئے تھا جو تھا،

فرمایا :-

نسبت کی تقویت کے لیے تجدید بیعت بیحد مفید ہے، اگر شیخ موجود نہ ہو یا بقید حیات

نہ ہو، تو اس کی کسی چیز سے تجدید بیعت کی جا سکتی ہے، فرمایا خواجہ ......

بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ اسی پر عمل پیرا تھے، اور میں بھی ہوں

حضرت بابا صاحبؒ بھی اس پر عمل پیرا تھے، فرمایا ہے۔

صحبتِ بد سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں صحبتِ بد بلاے بے درماں ہے صحبت کا اثر لازم ہے، الصحبۃ تاثیر صحبتِ بد سے بچے رہنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے مولانا رومؒ نے فرمایا ہے :- ~

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالع ترا طالع کند

ایسے ہی انمول موتی جا بجا بکھرے ملتے ہیں،

ایسے ہی انمول موتی فوائد السالکین میں جا بجا بکھرے ملتے ہیں، اگر دل زندہ پہلو میں ہو اور نگاہ پاک و باریک بیں ہے، تو فوائد السالکین صحیفۂ رشد و ہدایت ہے، اس کا ہر صفحہ مرقع ہے عجائبات قدرت کا، ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے توفیقِ الٰہی جس کو سازگار ہوتی ہے واللہ یہدی من یشاء،

وقت کا تقاضا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ فوائد السالکین کو صحت و مقابلہ سے آراستہ کرکے شائع کیا جائے، یہ کام دیر طلب بھی ہو اور زر طلب بھی ہے، مگر ہے کرنے کے لائق، اگر اخلاص سے اور لگن سے کیا جائے گا، تو مشکلات بھی سدِ راہ نہ رہیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ؛

عہد حاضر میں فوائد السالکین کے فارسی مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں، البتہ غلط تراجم دستیاب ہو جاتے ہیں، جو ہرگز لائق اعتنا نہیں، وقت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہند و پاک کی صوبائی زبانوں میں اس کے بہترین تراجم شائع کئے جائیں، ان ہی مقاصد کے پیش نظر میں نے ہندوستان کے مشہور کتب خانوں (لائبریریوں) سے فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخوں کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ پیش کرتا ہوں، ممکن ہے خدائے پاک کسی کو توفیق عنایت فرمائے، میرے لائق جو

خدمت ہو گی، اس سے مجھے اجتناب نہ ہو گا، انشاء اللہ

فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخے (۱) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں دو نسخے ہیں، ایک ۱۱۰۰ھ کا مکتوبہ ہے، اور دوسرا بارہویں صدی ہجری کا ہے یعنی یا بارہویں صدی کا،

(۲) اندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد میں دو نسخے ہیں ایک ۱۰۹۶ھ کا لکھا ہے، اور دوسرا ۱۲۳۰ھ کا،

(۳) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں ایک نسخہ ہے، جو ۱۲۰۰ھ کا مکتوبہ ہے،

(۴) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ایک نسخہ ہے، جو ۱۳۵۰ھ کا مکتوبہ ہے،

(۵) رضا لائبریری رامپور میں تین نسخے ہیں جن میں سنہ کتابت نہیں ہے،

(۶) عربی فارسی انسٹی ٹیوٹ ٹونک (راجستان) میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے،

(۷) مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے،

(۸) دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے،

اگر کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ ان سے بھی قدیم بعض نسخوں کا پتہ نشان مل جائے، بعض قدیم قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی لاہور، پاکستان میں بھی ہیں، ابھی مجھے ان کے متعلق تفصیل معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں، میری یہ بھی درخواست ہے، کہ اگر کسی صاحب کے علم میں یا تحویل میں فوائد السالکین کا کوئی قلمی نسخہ ہے تو مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں، میں ان کا شکر گزار رہوں گا،

......خ......

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سرینگر (کشمیر)

(۲)

محمود غزنوی | کشمیر پر عربوں کے حملوں کا سلسلہ ۱۴۲ھ میں ختم ہوا، تو اس کی طرف وسط ایشیا کے مسلمانوں کی آنکھیں اٹھیں، ان میں مشہور و ممتاز فاتح سلطان محمود غزنوی کا نام سرِ فہرست ہے،

سلطان محمود نے دو یا تین بار کشمیر میں قسمت آزمائی کی، کشمیر کی تاریخیں محمود کے حملوں سے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہونچاتی ہیں، سنسکرت تواریخ تو معمولی اشاروں پر اکتفا کرتی ہیں، جبکہ فارسی تذکرے جو کشمیری مصنفوں نے لکھے ہیں، مبالغہ آمیزی اور غلط واقعات سے پر ہیں، جس کی بنا پر وہ موضوعِ زیرِ بحث کے لئے ناقابلِ اعتماد ہیں،

مولوی غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے بیجبارہ (متصل اسلام آباد) کے ایک مندر کے اسباب زر و طلا بھی ضبط کئے، بلکہ کشمیر کے راجہ سنگرام نے سلطان محمود کو تحائف پیش کئے، مورخِ مذکور ملا احمد علامہ کے حوالہ سے لکھتا ہے،

سنگرام راج تابِ تقابل در خود ندیدہ با تحائف و نفائسِ بسیار خود را بملازمت

رضا نیند، سلطان فرمود چرا خود را زبون کردی، راجہ در جواب گفت کہ اہل کرام
خدمت و تواضع مہمان موجب افتخار و ترقی عقبایہ خود میدانند[1]

یعنی سنگرام راجہ نے جب اپنے اندر سلطان محمود کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ پائی تو وہ
تحفے اور قیمتی چیزیں لے کر بادشاہ کے پاس آیا، سلطان محمود نے کہا: یہ تکلیف کیوں کی؟ تو راجہ
نے اس کے جواب میں کہا کہ باعزت لوگ مہمان کی خدمت اور تواضع کرنا اپنے لیے موجب فخر و
ترقی خیال کرتے ہیں ... سلطان محمود راجہ کی اس بات سے خوش ہوا اور وہ کشمیر سے واپس چلا گیا وغیرہ
وغیرہ مگر ان باتوں میں افسانوی رنگ پیدا ہو گیا ہے،

محمود کی ایسی ہی ایک مہم کا ذکر مشہور فارسی شاعر فرخی سیستانی کے اشعار میں بھی پایا
جاتا ہے، یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں!

مجلس بلب جوئے برائے تمنۂ خوبان	کز گل چو بنا گوش تو گشتہ است لب جوئے
از مجلس ما دم در روے بر دکن	پیش آدمی سرخ و فرو کن گل دو روئے
تا روز بشادی بگذاریم کہ فردا	وقت رہ غزو آمد و ہنگام تکاپوئے
گاہ است کہ یکبار بکشمیر خرامیم	از دست بتان بینہ کنیم از سر تگ و پوئے
بس شہر کہ مردانش با ما چنید ند	کامروز نہ بینند درا و جز زن بے شوئے

سلطان محمود کو کشمیر کے اندرونی حالات سے باخبر کرنے اور دیگر معلومات بہم پہونچانے والا ایک
واقف کار شخص دربار میں موجود تھا، اس کا نام تلک تھا، تلک ایک حجام زادہ تھا، مگر علمی

---

[1] تاریخ حسن: مولوی غلام حسن کھویہامی ج ۲ ص ۱۱۵ محکمہ تحقیقات و نشریات سرینگر

[2] تاریخ دیالمہ و غزنویان: عباس پرویز، مطبوعاتی علی اکبر علمی، ایران، ص ۲۵۵۔

تربیت کشمیر میں حاصل کی تھی، ابوالفضل دبیرہیقی جس نے تلک کے اوصاف بیان کرنے میں

کئی صفحات سیاہ کئے ہیں، لکھتے ہیں :۔

این تلک پسر حجامے بود ولیکن لقائی	یہ تلک ایک حجام کا بیٹا تھا، لیکن
ومشاہدتی وزبان فصیح داشت	خوب صورت اور فصیح البیان تھا،
وخطی نیکو بہ ہندی وفارسی، مدتی	ہندی اور فارسی میں اس کا خط
ورا زبکشمیر رفتہ بود وشاگردی کرد	عمدہ تھا، کافی وقت کشمیر میں گزارا
..... واز آنجا قاضی شیراز ابوالحسن	اور یہیں تعلیم بھی حاصل کی، پھر یہاں
آمد دیگر ویلہ ۔	سے شیراز کے قاضی ابوالحسن کے پاس آیا اور اسی کا ہوکر رہا

تلک نے ضرور محمود کو کشمیر کے اندرونی حالات و واقعات سے باخبر کیا ہوگا تاریخ بیہقی کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تلک محمود غزنوی کا خاص آدمی تھا، سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء

میں وئے ہند کے راجہ جے پال کو شکست دی، جے پال نے اپنے آپ کو زندہ جلایا، اس کے بعد اس

کا بیٹا انند پال تخت نشین ہوا، انند پال نے کچھ وقت تک محمود کے ساتھ تعلقات ٹھیک رکھنے

کو ترجیح دی، جس کی وجہ سے ہندوستان کے دوسرے راجہ انند پال سے بدظن ہوئے لیکن

جب انند پال کو محمود کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے مطلع صاف نظر آیا تو نہ صرف خود

میدان میں کود پڑا بلکہ دوسرے راجاؤں سے بھی مدد کی درخواست کی، ان راجاؤں نے اپنی

سابقہ رنجشیں ایک طرف رکھتے ہوئے اور ہندوستان کی روح قومیت کی بقا کے لئے انند پال

کے ہاتھ مضبوط کئے، اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے حکمرانوں نے اپنے عظیم الشان

فوجی دستے بھیج دیئے، جو پنجاب میں اکھٹے ہوئے، مگر بالآخر یہ متحدہ کوشش بھی ناکام رہی، اور

۱۰۰۸ء میں انند پال نے محمود کے ہاتھوں شکست فاش کھائی، انند پال بھاگ

لہ تاریخ بیہقی: ابوالفضل بن حسین، دبیر بیہقی؛ تصحیح دکتر غنی ودکتر فیاض چاپخانہ ملی طہران

اور کشمیر کے پہاڑوں میں جاچھپا۔[1]

انند پال کی اس شکست کے چند سال بعد اس کا بیٹا ترلوچن پال اپنی بچی کھچی سلطنت کا مالک ووالی بنا، وہ ست ہونے کی بنا پر محمود سے ٹکر نہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا، اس لئے اس کے بیٹے بھیم پال نے امورِ مملکت اپنے ہاتھوں میں لئے، بھیم پال نے محمود کا مقابلہ کرنے کے لئے کشمیر کے معاصر راجہ "سنگرام راجہ" (عہدِ حکومت ۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۸ء) سے مدد کی درخواست کی[2] م راجہ نے یہ درخواست منظور کرلی، اور بھیم پال کی مدد کے لئے فوج کی ایک بڑی تعداد تنگ کی کمانداری میں روانہ کی، محمود کو پہلے بھیم پال کی فوج کے ساتھ ایک وادی میں جو جہلم کے راستے سے کشمیر سے ملتی تھی، مقابلہ کرنا پڑا، کشمیری کمانڈر تنگ نے پہلے پہلے محمود کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا مگر [illegible] نے اپنی کامیابی سے دھوکا کھا کر مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی، اب محمود بذاتِ خود اپنی فوج کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھا، بھیم پال نے تنگ کو ایک چٹان کے نیچے چھپنے کا مشورہ دیا مگر وہ اس کا مشورہ درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے محمود کا مقابلہ کرنے کے لئے اور آگے بڑھا، محمود نے اسے شکست دی اور فرار ہونے پر مجبور کیا، بھیم پال نے حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کی، مگر محمود نے اسے بھی شکست دی اور آگے کشمیر کی طرف بڑھا، کشمیر کی طرف رخ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہاں کے اطراف ومضافات پر بھی قابض ہو گیا، ابوسعید گردیزی کے یہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں، ان سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی پڑتی ہے،

وامیر محمود فرمان داد تا آں قلعہا کہ	سلطان محمود نے حکم دیا کہ درۂ کشمیر کے
اندراں درۂ کشمیر بود بگرفتند وغارت	تمام قلعے برباد کر دیئے جائیں جو قبضے میں
کردند، ولشکر ازاں قلعہا بسیار	لائے گئے ہیں، فوج نے ان قلعوں سے

---

[1] الکامل فی التاریخ: عز الدین ابن اثیر ج ۹ ص ۱۸۶، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۶ء [2] پروفیسر محمد حبیب: ص ۲۷۔

غنائم بردہ یافت، وبسیار کافراں باسلام آمدند، و اندریں سال فرمود تا ہرجائیکہ کشادہ بود از دیار کفار مسجد ہائے جامع ساختند و استاداں را فرمود تا بہرجائے بفرستادند تا مر ہندواں را شرائط اسلام بیاموختند و خود باظفر و فیروزی سوئے غزنین آمد و ایں فتح تنذنہ اندر سنہ خمس واربع مایۃ بود[1]

کافی مال غنیمت حاصل کیا، اور بہت غیر مسلموں کو مسلمان بنایا، اسی سال سلطان نے یہ بھی کہا کہ جو جگہ غیر مسلموں سے خالی ہو جائے، وہاں مسجدیں تعمیر کی جائیں اور علماء و مبلغین کو حکم دیا کہ وہ ہر جگہ جائیں اور غیر مسلموں کو اسلامی شرائط وحدود سکھائیں خود سلطان کامیابی کے ساتھ غزنین لوٹا، تنذنہ کی یہ فتح ۴۰۵ھ میں واقع ہوئی۔

محمود نے ترلوچن سمیت بھیم پال کو شکست دی، اور اس کے بعد اس دشمن کی طرف رخ کیا جس نے ان کو محمود کے خلاف کمک پہونچائی تھی، یہ دشمن کشمیر کا بادشاہ تھا، بلکہ کشمیر اور کشمیر کے حکمران ان مفرور حکمرانوں کے لئے ملجا اور ماوی بنے ہوئے تھے، جو سلطان محمود کے دشمن اور حریف مقابل تھے، کشمیر کو محمود بہت شروع سے اپنے تصرف اور قبضے میں لانے کا آرزو مند تھا، مگر اب کشمیری حکمرانوں کی دشمنی نے محمود کو کشمیر کی طرف بڑھنے کے لئے معقول وجہ فراہم کی، سنگرام راجہ اس وقت کشمیر کا فرمانروا تھا، محمود ۱۰۱۵ء میں کشمیر کی طرف بڑھا، اس نے توسہ میدان کی راہ سے قلب وادی میں داخل ہونے کی کوشش کی، مگر یہاں اس کا راستہ ایک مضبوط اور مستحکم قلعہ کی وجہ سے رک گیا، اور محمود نے قلعہ پار کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کی، پھر بھی ناکام ہوا، اس نے ایک مہینے تک قلعے کا محاصرہ کیا، اسی دوران

---

[1] زین الاخبار: ابو سعید عبدالحیٔ بن الضحاک گردیزی، ترتیب و تعلیق: عبدالحیٔ حبیبی، انتشارات بنیاد فرہنگ، ایران: ص ۱۸۱۔

موسم بھی بدل گیا، برف باری اور جاڑے کی شدت سے محمود اور اس کی فوج کو سخت پریشانی اٹھانی پڑی، مورخ ابوسعید گردیزی لکھتا ہے:۔

سرمائے سخت اندر آمد و برف آمد	سخت سردی شروع ہوئی، برف باری سے
گرفت وجہاں یخ بستہ شد واز راہِ	دنیا یخ بستہ ہوئی، اہل کشمیر کی طرف سے
کوہسائے کشمیر مر آں اہلِ حصار	پہاڑوں کی جانب سے قلعہ بند لوگوں کو کمک
مدد رسید از کشمیر قوت یافتند، چوں	اور دیگر قسم کی مدد ملتی تھی جب سلطان
امیر محمود رحمۃ اللہ بر آں حملہ بدید	محمود نے یہ سب کچھ دیکھا تو اسے اندیشہ
اندیشہ کرد کہ نباید کہ بہ سپاہ وے	ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی فوج کوئی غلط
حیلتی رود وازاں قلعہ بازگشت	حرکت کرنے پر آمادہ ہوجائے، اس لئے
وبصحرا بیروں آمد از اں کوہ درہا	وہ فوراً قلعہ سے واپس اور پہاڑوں اور
چوں وقت بہار آمد بغزنین باز آمد[1]	دروں سے نکل کر میدان کی طرف آیا،
	جب موسم بدل گیا تو غزنین کی طرف مراجعت کی،

اس طرح محمود کو محاصرہ سے دست بردار ہونا پڑا، ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ واپسی محمود کی فوج راستے میں کھو گئی، بہت سے فوجی ہلاک ہوئے، کہتے ہیں کہ محمود کو ساری ہندوستانی مہموں میں جس مہم سے سب سے زیادہ شدائد وحوادث پیش آئے وہ یہی کشمیر کی مہم تھی[2]، اس مہم کے پورے پانچ سال بعد محمود نے ۱۰۲۱ء میں ستمبر اور اکتوبر کے وسط میں کشمیر کی طرف پھر رخ کیا، مگر اس مرتبہ بھی اس کا مقصد پورا نہ ہوا، ایک مہینے تک قلعے کا محاصرہ کیا، موسم سرما پھر شروع ہوا، برف باری ہونے لگی، اور محمود محاصرہ اٹھا کر غزنین لوٹنے پر مجبور ہوا، ان حملوں کے دوران محمود کو وادی

---

[1] زین الاخبار: ص ۱۸۱، ۱۸۲ [2] تاریخ فرشتہ (اردو حیدرآباد ۱۹۲۶ء): ج ۱ ص ۸۰ ۔

میں داخل ہونے کا کوئی موقع نہیں ملا، مسٹر رائے (H.C. Ray) نے محمود کے حملۂ کشمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمود اگرچہ وادی میں داخل ہونے میں ناکام ہوا، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جنوب کی طرف کشمیر کے بلند پہاڑوں کا ایک حصہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ پروفیسر رائے نے اپنی رائے کی تائید میں ایک معاصر مؤرخ عتبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ۱۰۱۸ء میں محمود نے قنوج پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو کشمیر کے ایک درہ کے حاکم نے اس کی ہمرکابی اور رہنمائی کی[1]، اس حکمران کا نام جلی بن شاہی تھا، علامہ ابن خلدون نے بھی "فتح کشمیر و قنوج" کی سرخی کے تحت یہی بات لکھی ہے۔

ثم اعتزم علی غزو الهند سنة	پھر سلطان محمود کو ۴۰۹ھ میں ہند پر حملہ
تسع واربع مائة وقد كان	کرنے کا شوق لاحق ہوا، جبکہ اس نے
ه فتح بلادها كلها ولم يبق عليه	ہند کے تمام ممالک کو روند ڈالا تھا اور
الا كشمير ومن دونها الفيافی	اب کشمیر کے علاوہ کوئی ملک باقی نہ رہا تھا
والمصاعب فاستنفر الناس	کشمیر کے درمیان جنگلات اور دشوار گذار
من جميع الجهات من المرتزقة	راستے حائل تھے، اس نے تمام علاقوں کے
والمتطوعة وبث عساكرهم فی	لوگوں سے کمک حاصل کی، محمود نے وادیوں
اودية لا يعبر عن شدة	میں فوج بھیجا دی [illegible]
جريها وبعد اعماقها	کی وجہ سے ناقابل عبور تھیں [illegible] گیا
وانتهى الى كشمير و	اس [illegible] میں یہاں آ کر حکمران محمود کی خدمت میں
كان ملوك الهند ف	اطاعت نامہ بھیجے تھے، کشمیر کا راجہ

---

[1] Dynastic History of Northern India P.137

فلک الممالک تبعث الیہ بالخدمۃ	جنکی بن شاہی (یا ہی) بھی آیا، اس نے
والطاعۃ وجاءہ صاحب درب	بھی اطاعت قبول کی، مزید برآں اس نے
کشمیر وھو جنکی بن شاھی (ای	سلطان اور اس کی فوج کی رہنمائی کا کام
سھی) فاقر بالطاعۃ وضمن	بھی اپنے ذمہ لے لیا، انھیں محفوظ قلعے
دلالۃ الطریق وسار امام	کی جانب پہونچایا، اس طرح اس نے
العسکر الی حصن الماموں	سلطان کے لشکر کی پیشوائی کی، یہ بیس
لعشرین من رجب[1]	رجب کا واقعہ ہے۔

مؤرخ عتبی اور علامہ ابن خلدون دونوں نے درۂ کشمیر کے راجہ کا نام خلکی بن شاہی دیا ساہی) لکھا ہے، جبکہ رینالڈ نے عتبی کے ترجمہ میں سبلی بن شاہی بن بھی اور پروفیسر محمد حبیب نے سالی لکھا ہے[2]، غرض اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ کشمیر میں اسلام کو متعارف کرنے میں محمود غزنوی کا بھی حصہ رہا ہے، اس کے حملوں کے نتیجے میں آس پاس کے بہتیرے علاقے اسلام سے متاثر ہوئے، عباس پرویز لکھتے ہیں کہ کشمیر کی آس پاس کی گھاٹیوں اور وادیوں کے حکمرانوں اور رؤسا نے سلطان محمود کی بڑی آؤ بھگت کی تھی، سلطان کی خدمت میں تحفے اور نذرانے پیش کئے تھے اور بندگی و فرمانبرداری کا اظہار کیا تھا[3]۔

محمود غزنوی کے اخلاف محمود کے بعد اس کے حکمران ورثا نے بھی کشمیر پر کئی بار قسمت آزمائی کی، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے

---

[1] کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر: علامہ ابن خلدون، قسم اول، مجلد چہارم: ص ۹۷،
دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۹ء - [2] "Mahmood of Gaznin": P 136

[3] تاریخ دیالمہ و غزنویاں: ص ۲۵۶ -

فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی وفات کے تین سال بعد ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر پر ایک مرتبہ اور حملہ کیا، اور اہلِ شہر قلعہ بند ہو گئے[1]، عباس پرویز بھی یہی بات لکھتے ہیں:-

سلطان مسعود در سال ۴۲۴ھ باسپاہیانِ عظیم بکشمیر رفت وقلعۂ سرستی را تسخیر کرد وغنائمِ بسیار بدست آورد و بغزنین مراجعت کرد[2]	سلطان مسعود نے ۴۲۴ھ میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ کشمیر کی طرف رخ کیا، اور قلعۂ سرستی پر قبضہ جمایا، وافر مالِ غنیمت حاصل کرکے اس نے غزنین کی طرف مراجعت کی'

سلطان مسعود کے بعد سلطان مودود نے بھی کشمیر کی طرف رخ کیا، اس نے ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں اپنے بیٹے ابوالقاسم محمود کو لاہور کا حاکم اور ابوعلی کو ہند کا سپہ سالار بنا کر بھیجا جس نے پشاور، کشمیر اور ملتان کی بغاوتیں فرو کیں[3]۔

غزنوی سلاطین کے بعد جب سلطان محمد شہاب الدّین غوری نے تسخیرِ ہند کا ارادہ کیا تو اس نے کشمیر کی جانب کوئی توجہ نہ کی، اس کے بعد آنے والے دوسرے سلاطین کا بھی یہی حال رہا انھوں نے دور و دراز تک ہندوستان کے اطراف تہ و بالا کئے، مگر کشمیر کی طرف نہیں بڑھے، شاید اس کی وجہ وہ پرخطر رکاوٹیں تھیں، جو پہاڑ، قلعے اور دریاؤں اور ویرانوں کی صورت میں جگہ جگہ حائل تھیں، اور جن کی وجہ سے بڑے بڑے مہم جو سلاطین کو بھی ناامیدی کی حالت میں واپس ہونا پڑا تھا، سلطان علاؤ الدینؒ خلجیؒ (۱۲۹۳ء تا ۱۳۱۶ء) کی فوج ایک طرف جنوبی ہند کی انتہا تک پہونچی، اور دوسری طرف حدودِ کشمیر سے لے کر میسور تک اس کی سلطنت کے

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات: علامہ سید سلیمان ندویؒ: ص ۴۰۱، الٰہ آباد ہندوستانی اکیڈمی سنہ ۱۹۳۰ء

[2] تاریخِ دیالمہ و غزنویانؒ ص ۳۳۵ [3] عہدِ اسلامی کا ہندوستان ص ۹۳ -

مدد بھیجی، مگر باین جلال و جبروت اس نے بھی کشمیر کی طرف بڑھنے سے گریز ہی کیا،

مغلوں نے کئی بار کشمیر پر حملے کئے، سب سے پہلے چنگیز نے اپنے جنرل سوبے تائے بہادر (Subatai Bahadur) کو حکم دیا کہ وہ گیارہ قبائل پر حملہ کرے، ان میں ایک کشمیر بھی تھا، اوگتائی خاں نے اپنے کمانڈر کو کشمیر کی سرحدوں کی طرف بھیجا تھا، منگو خاں اور زنگو دار خاں دونوں نے اپنے کمانڈروں کو تیسیر کشمیر کے لئے روانہ کیا تھا،[1] مگر ان حملوں میں سب سے زیادہ کامیاب حملہ ذوالجو کا حملہ تھا،[2] حملہ آوروں نے یہاں وہی کیا، جو وسط ایشیا میں ان کے اسلاف نے کیا تھا،

۷۲۴ھ میں ہلاکو خاں کی اولاد میں سے ایک شخص ذوالجو (یا ذوالقدر خاں) نے اپنی فوج کے ساتھ کشمیر کے دشت و جبل پار کر کے وادی میں قدم رکھا، اس زمانے میں کشمیر کا حکمراں سہ دیو تھا، اور یہ زمانہ کشمیر کے انحطاط کا تھا، سہ دیو اور اس کی فوج میں وہ طاقت و جرأت نہ تھی جو مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری تھی، اس لئے اس نے راہِ فرار اختیار کر کے کشتواڑ میں پناہ لی، پھر وحشی مغلوں کو جو کچھ کرنا تھا بلا کسی مزاحمت کے بغیر کیا، مولوی غلام حسن رقمطراز ہیں۔

ذوالقدر خاں صمصام خون آشام	ذوالقدر خاں نے اپنی خون آشام تلوار
از نیام برکشیدہ ساکنان اینجا را از خواص	نیام سے کھینچ لی، کوئی امتیاز برتنے کے بغیر یہاں
و عوام قتلِ عام نمود و نسواں	کے خواص و عوام کا قتل کیا، عورتوں اور
و طفلان در دستِ تاجرانِ	بچوں کو ترکستانی تاجروں کے ہاتھوں بیچ
ترکستان کہ ہمراہ خود آوردہ بود	دیا، وہ ان تاجروں کو اپنے ساتھ لے
بیع کردہ خزینہ باندوختہ	آیا تھا، اس نے یہاں خزینے اکٹھا کئے، یہاں

Prof. S. N. Koul's Introduction To Jonaraja's RajTarangini : P 44.

مال و متاع و دواب و حیوانات از هر کس بغارت برده، عمارات شهر را آتش کشیده با خاک یکساں ساخت[1]

کے مال و دولت، حیوانات، مویشی کو غارت کرکے لوٹا اور شہر کو نذر آتش کرکے مٹی میں ملا دیا۔

رشید الدین فضل اللہ (م ١٣١٩ء) تقریباً اسی دور میں گذرا ہے، اور مغل سلاطین کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رکھتا تھا، اس کو کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل تھے، وہ بھی کشمیر نہیں آیا، مگر اس کو باوثوق ذرائع سے معلومات حاصل ہوتے رہے،

وہ رام دیو کے عہد میں مغلوں کی یورش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے،

وبعھد رامہ دیو رکب جیش المغول بحکم قاآن العادل وقتاً مقدمھم اوکتو فحاصروا بلدۃ کشمیر وقتلوا اھلھا و نھبوا اموال التی کانت فیھا[2]

رامہ دیو کے عہد میں قاآن کے حکم سے مغل فوج نے کشمیر کی طرف رخ کیا، فوج نے کشمیر کا محاصرہ کرکے یہاں کے لوگوں کو قتل کیا، اور جو کچھ اموال و اسباب یہاں موجود تھا وہ لوٹ لیا، اوکتو خاں

اس غارت گری کے بعد جب مغل واپس لوٹے تو ابھی کچھ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ وہ پھر کشمیر پر حملہ آور ہوئے، اور اس مرتبہ بھی (بالفاظ رشید الدین فضل اللہ)

حاصروا کشمیر و ملوکھا وقتلوا الکبائر واستاسروا الصغار[3]

کشمیر کا محاصرہ کرکے اپنے قبضۂ تصرف میں لایا، یہاں کے بزرگوں کو قتل کیا

ہندو دور حکومت میں اسلامی اثرات

غرض مغل کشمیر کے در و دیوار پھاند کر وادی میں داخل ہو گئے، ان کے ساتھ مسلمانوں کی کثیر تعداد بھی ہوا کرتی تھی، مزید برآں اس سیلاب نے دوسرے ممالک کے صوفیوں، تاجروں اور سیاحوں کو کشمیر میں داخل ہونے کیلئے

---

[1] تاریخ حسن جلد ٢ ص ١٦٣، [2] تاریخ الہند مصنفہ رشید الدین فضل اللہ تذکرۂ کشمیر، [3] ایضاً،

اچھا موقع فراہم کیا،

ہمیں واضح طور پر اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ آس پاس کے اسلامی ممالک کے ساتھ کشمیر کے سفارتی تعلقات تھے یا نہیں، مگر اتنا تو بہر حال صحیح ہے کہ کشمیر کے حکمرانوں کے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے، گجرات کے ایک راجہ مول راج سولنکی (۹۴۲ تا ۹۷۹ء) کے ہاں ایک بار ایک تقریب ہوئی تو مہمانوں میں کشمیر کا بھی ایک سفیر موجود تھا جو کشمیر کے راجہ کی طرف سے مشک بطور تحفہ لایا تھا[1]، سلطان محمد تغلق دوسرے ممالک بالخصوص اسلامی مملکتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں مشہور تھا، اگرچہ اس کے اور کشمیر کے حکمرانوں کے ساتھ کسی قسم کے تعلق ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں ملتا ہے، تاہم یہ ثابت ہے کہ کشمیر کے داخلی حالات سے سلطان باخبر تھا، اس نے اپنے زمانے کے مشہور عالم شیخ شمس الدین یحییٰ کو کشمیر میں اسلام پھیلانے کے لئے حکم بھی دیا تھا، جو شیخ کے اچانک انتقال کی وجہ سے ممکن نہ ہوسکا، عرب ممالک اور کشمیر کے حکمرانوں کے تعلقات پر کہیں سے روشنی نہیں پڑتی ہے،

برامکہ اور کشمیر ہارون الرشید اور مامون کا عہد، خلافت عباسیہ کے عروج واقبال کا دور تھا، یاقوت الحموی برمکیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ خلافت بغداد کا مشہور معروف وزیر یحییٰ برمکی کا دادا کشمیر میں طویل عرصے تک قیام پذیر تھا، اور اس نے کشمیر ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، یاقوت لکھتا ہے،

برمك ابو خالد فان امه	برمک (جو خالد کا باپ تھا) کی ماں اپنے
هربت به وكان صغيرا الى	بیٹے برمک کو لیکر کشمیر کی طرف بھاگ گئی برمک

[1] تاریخ گجرات: پروفیسر ابوظفر ندوی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۸ء: ص ۱۴۹

بالکشمیر من بلاد الهند نشأ اس وقت چھوٹا تھا، اس نے کشمیر میں
هناك وتعلم علم الطب نشو ونما پائی، اور طب، نجوم اور فلسفہ
والنجوم وانواعا من الحکمة[۱] کے مختلف فنون کی یہاں تحصیل کی۔

برمک کی ماں فارس سے بھاگ کر کشمیر آئی، برمک کی اولاد بعد میں مسلمان ہوئی جن میں خالد نامور ہوا، خالد کا مشہور روزگار بیٹا یحییٰ تھا، جو ہارون الرشید کا وزیر اعظم تھا، عرب و ہند کے باہمی تعلقات میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے باعث بڑی حد تک برکی ثابت ہوئے، ان ہی کی تحریک سے سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستان سے اہل علم بلائے گئے اور بے شمار کتابیں مختلف زبانوں سے عربی میں منتقل ہوئیں[۲]، ہند سے طلب کئے جانے والے علماء میں کیا کوئی کشمیری عالم تھا؟ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ہے، البتہ اوپر کے اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ برمکیوں کے کشمیر کے ساتھ گہرے تعلقات تھے، برمک کی ماں کا فارس سے بھاگ کر آنا کسی معقول مصلحت ہی کی بنا پر رہا ہوگا۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برامکہ اصل میں بدھ تھے، نہ کہ مجوسی، برمک کی ماں کا کشمیر وارد ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ کشمیر بھی اس زمانے میں بدھ مت کا عظیم مرکز اور بدھ مت کے علوم کا گہوارہ تھا، غرض کشمیر کا انتخاب خواہ مخواہ اور بے وجہ نہیں بلکہ سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر کشمیر میں پناہ لی گئی تھی، بلکہ پروفیسر ندوی یہاں تک لکھتے ہیں کہ برمکی خاندان نسلاً کشمیری تھا[۳]۔

---

[۱] معجم البلدان: ج ۱۰، ص ۲۲۳ زیر عنوان "نوبہار" [۲] عہد اسلامی کا ہندوستان ص
[۳] تاریخ ہند ج ۵، ص ۱۰۰ (حاشیہ)

<u>مسلمان تجار و سیاح:</u> تجارت کے سلسلہ میں بیرونی ممالک کے باشندے کم یا زیادہ تعداد میں کشمیر وارد ہوا کرتے تھے، سوداگری اور پیشہ وری کے باوجود سیاح، تاجر اور اہل علم وادی میں آیا جایا کرتے تھے۔ کشمیر کے جغرافیہ، اس کی صنعت و حرفت اور اس کی خاص تہذیب و ثقافت غیر ملکی لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی تھی، آج سے ہزاروں سال پہلے بھی کشمیر اسی طرح مشہور تھا جس طرح آج ہے، ابن خردابہ (م ۳۰۰ھ) نے آج سے گیارہ سو سال پہلے لکھا ہے،

ومن مدن الہند المشہورۃ	ہندوستان کے مشہور شہروں میں
سابل وھودین و قندھار	سابل، ہودین، قندھار اور کشمیر
و قشمیر[1]	قابل ذکر ہیں۔

ان تاجروں میں یقیناً مسلمان تجار بھی ہوتے ہوں گے، پہلے بھی گذر چکا ہے کہ للتادت (معاصر محمد بن قاسم) کے جانشین وزرادت یا وجرادت کے بارے میں کشمیر کا قدیم مورخ کلہن لکھتا ہے کہ اس نے بہت سے کشمیریوں کو ملیچھوں کے ہاتھوں فروخت کیا[2]، اس کی تائید عرب تاریخوں سے بھی ہوتی ہے، یاقوت حموی لکھتا ہے،

وھم احسن خلق اللہ خلقۃ	کشمیر کے لوگ مخلوقات میں نہایت بہتر
ونسائھم المثل لھن تامات	ہیں، ان کی عورتیں اپنی خوبصورتی میں
تامۃ وصورۃ مستویۃ	ضرب المثل ہیں جو میانہ قد، سڈول

---

[1] المسالک والممالک: ابو القاسم عبید اللہ المعروف بہ ابن خردازبہ (متوفی فی حدود ۳۰۰ھ) مطبوعہ لیڈن ۱۸۸۹ء: ص ۶۸۔

[2] Kashmir under The Sultans P 234.

وشعورهن على غاية السباطة — یکساں صورت ہیں اور سر کے بال
والطول والغلمان تباع بالجملة — ہموار، کالے اور لمبے ہیں یہاں کی
منها الجارية بمائتى دينار واكثر[1] — لونڈیاں دو سو دینار (اشرفی) بلکہ اس
سے بھی زیادہ قیمت میں بیچی جاتی ہیں

قزوینی نے بھی اہلها اکثر الناس ملاحة وحسنا لکھا ہے[2]، اسی طرح کشمیری شال آج سے سیکڑوں سال پہلے بھی بہت سے ممالک میں شہرت رکھتی تھی بیرونی ممالک کے تاجر شال اور دیگر قسم کی چیزیں خریدنے کے لئے کشمیر آیا کرتے تھے، کچھ بعید نہیں کہ ان تاجروں کی بدولت بھی کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہو، اور اس سے مبلغین کے لئے راستہ ہموار ہوا ہو، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی وفات کے تین سال بعد ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا، اور اہل کشمیر قلعہ بند ہوئے، اس وقت یہاں مسلمان تاجر تھے، وہ بھی قلعہ بند ہو گئے[3]، اسی طرح سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں دہلی میں کشمیری شالیں پائی گئیں، خود سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک کشمیری شال تھی[4]، بعض اہل کشمیر کو اس پر احساس فخر ہے کہ نپولین کی محبوبہ کے پاس ایک کشمیری شال تھی، مگر حضرت سلطان المشائخ کے پاس کشمیری شال ہونا سب سے زیادہ اہم ہے۔

---

[1] معجم البلدان ج ۹ ص ۹۴، عنوان: کشمیر [2] آثار البلاد واخبار العباد: زکریا بن محمد بن محمود القزوینی، بیروت ۱۹۶۰ء: ص ۴۰۱ [3] عرب و ہند کے تعلقات: ص ۳۰۱ [4] Studies in Medieval Indian History and Culture. By Prof. Khaliq Ahmad Nizami: P. 4

مسلمان سیاح | کشمیر پہاڑوں اور جنگلوں سے محیط ہونے کے باوجود غیر ملکی سیاحوں، سیفروں، مسافروں، طالب علموں وغیرہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہے، عربی تاریخوں میں ایک عرب سیاح کا نام ملتا ہے، جو سید شرف الدین عبد الرحمٰن سے چار سو سال قبل کشمیر وارد ہوا تھا یہ مشہور عرب سیاح مسعر بن مُہَلْہِل ینبوعی تھا، جس کا انتقال ۳۳۱ھ میں ہوا ہے، اس نے نہ صرف کمیاب بلکہ نایاب سفرنامے میں کشمیر کے بارے میں جو مختصر معلومات درج کئے ہیں، ان کی تائید آج بھی ہوتی ہے، موصوف کے اس سفرنامے سے بہت سے عرب مورخوں نے استفادہ کیا ہے، ان میں صفی الدین عبد المومن[1]، زکریا قزوینی، یاقوت حموی اور ابن ندیم قابل ذکر ہیں، بلکہ ابن ندیم اس سے بالمشافہ ملا ہے، اور معلومات حاصل کئے ہیں۔

مسعر بن مُہَلْہِل | ابودلف مسعر بن مہلہل (م ۳۳۱ھ / ۹۴۲ء) ینبوع کا رہنے والا تھا، جو بحرِ احمر کے ساحل پر واقع ہے، مسعر عرب کا مشہور سیاح گذرا ہے، اس نے دنیا کے ایک بڑے حصے کی سیاحت کی ہے، خود فخر کے ساتھ کہتا ہے،

نحن الناس کل الناس فی البر و فی البحر
اخذنا جزیة الخلق من الصین الی مصر
الی طنجة بل فی علب ارض خیلنا تسری
اذا ضاق بنا قطر نزل عنه الی قطر
لنا الدنیا بما فیها من الاسلام والکفر
فنصطاف علی الثلج ونشتی بلد التمر

---

[1] مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنة والبقاع: صفی الدین عبد المومن البغدادی (م ۷۳۹ھ) احیاء الکتب العربیة، مصر ۱۹۵۵ء ج ۲ ص ۹۴۰ اعلام الاخطر

مسعر عربی شاعری کا بھی ذوق رکھتا تھا، مسعر نے خراسان کا سفر کیا اور وہاں اہل
ساسان کے ہاں تقرب حاصل کیا، اس نے اہلِ ساسان کی تعریف و توصیف میں ایک طویل
عربی قصیدہ بھی کہا ہے، جو القصیدۃ الساسانیۃ سے مشہور ہے، مندرجہ بالا اشعار
اسی قصیدے سے ماخوذ ہیں، ثعالبی نے یہ قصیدہ اپنی کتاب میں من و عن نقل کیا ہے
اور مسعر کے کچھ حالات بھی بیان کئے ہیں[1]، قصیدے کا مطلع یہ ہے،

جفون دمعها تجری　　　لطول الصد والهجر

مسعر خراسان سے چین وارد ہوا، اور چین سے تبت پہونچا، آگے تبت سے کشمیر میں
داخل ہوا، تبت سے کشمیر کا سفر پیدل طے کیا، اس نے اپنا سفرنامہ عجائب البلاد کے نام
سے لکھا ہے، اس کے نسخے نہایت کمیاب ہیں، جرمنی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے، کشمیر کے
بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا اقتباس یاقوت الحموی نے اپنی کتاب میں نقل کیا
ہم یہ اقتباس درج کرتے ہیں:

خرجنا من جاجلی الی مدینة	ہم جاجلی سے نکل کر ایک شہر کی طرف آئے
یقال لها قشمیر کبیرة عظیمة	جس کا نام کشمیر ہے، یہ بہت ہی بڑا ملک
لها سور وخنادق محکمات	ہے جس میں مضبوط شہرپناہ اور خندقیں ہیں
وملکها اکبر من ملک کلہ واتم	یہاں کا حکمراں پورے ملک کا سب سے
طاعة ولهم اعیاد فی رؤس	بڑا حکمراں ہے جس کی اطاعت مکمل
الاهلة	طور پر کی جاتی ہے یہاں کے لوگوں

[1] یتیمۃ الدہر فی محاسن اهل العصر، ابو منصور عبد الملک الثعالبی النیساپوری
(م ۴۲۹ھ) مطبع حجازی قاہرہ ج ۳ ص ۳۵۴

ولهم رصد كبير في بيت مولى
من الحديد الصيني لا يعمل فيه
الزمان ويعظمون الثريا
ولا يأكلون المليح من السمك
ولا يأكلون البيض ولا يذبحون
قال وسرت منها الى كابل[1]

کے تہوار ہلال ظاہر ہونے پر منائے
جاتے ہیں، یہاں ایک رصدگاہ بھی ہے
جو چینی لوہے سے بنی ہوئی ایک عمارت میں نصب ہے
گو عرصہ سے اس میں کام نہیں ہوتا، یہاں کے
باشندے ثریا تاروں کی تعظیم بھی کرتے ہیں،
مچھلیاں کھاتے ہیں مگر انڈے نہیں کھاتے
اور نہ جانوروں کو ذبح کرتے ہیں پھر
میں یہاں سے کابل کی جانب روانہ ہوا،

مسعر کا بیان بالکل صاف ہے، تاہم چند باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے،

اول مسعر جس راستے سے کشمیر میں داخل ہوا، اس نے اس کا نام جاجلی بیان کیا ہے اور یہ وہی پہاڑی راستہ ہے جو زوجیلا کے نام سے مشہور و معروف ہے، جغرافیۂ کشمیر میں یہ جگہ "Zojila" یا "Soji - La" اور بل تل کوٹال "Baltal - Kotal" یا اور اس گھاٹی کے مختلف ناموں سے موسوم ہے[2] قدیم زمانہ میں کشمیر میں داخل ہونے کے لئے یہ راستہ تین اہم ترین راستوں میں سے ایک تھا،

ثانیاً مسعر نے جس چینی لوہے کی بنی ہوئی رصدگاہ یا جن مضبوط دیواروں کا تذکرہ کیا ہے، ممکن ہے یہ وہی چیز ہو جس کا قدیم کشمیری مورخ کلہن نے بھی ذکر کیا ہے، یعنی

---

[1] معجم البلدان ج ۹ ص ۹۴ -

[2] Gazetteer of Kasmir and Ladakh Vivek Publishing House 1974 "Zojila"

پہرہ داری اور ناکہ بندی کے وہ مقامات جو کشمیر کی سرحدوں پر ہوتے تھے، وہیں غیر ملکی باشندوں کو روکا جاتا تھا، اور پوری تحقیق کے بعد بعض وادی میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی تھی، ہیون سانگ نے اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ آگے ہم المسعودی کا بیان بھی درج کرتے ہیں، اس سے بھی اس زمانے میں کشمیر کی سرحدی حفاظت اور کڑی نگرانی کی توثیق ہوتی ہے، سر آرل سٹائن نے اس موضوع پر مفصل اور دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں[1]۔ ثالثاً انڈوں اور گوشت سے اجتناب آج بھی کشمیر کے راسخ العقیدہ ہندؤں کا عقیدہ ہے، اور اس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

معجم البلدان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اور عرب سیاح بھی کشمیر میں داخل ہوا ہے، اس کا نام کتاب میں مذکور نہیں ہے، البتہ یاقوت نے صرف ایک شعر نقل کیا ہے جس میں وہ فخر کے ساتھ اپنی سیر و سیاحت کا ذکر کرتا ہے، مگر راقم کے نزدیک اس شعر سے مسعر بن مہلہل ہی کی بو آتی ہے۔

وجولت الهنود دارض بلخ　　　وقشميراً و ادتني الكميت[2]

علاوہ ازیں ہم کو ان بت سے سیاحوں سے صرف نظر کرنا چاہیئے، جو اگرچہ کشمیر کی وادی میں داخل نہیں ہوئے ہیں مگر اس کے حدود تک پہونچے ہیں، اور وہ کشمیر کے بارے میں اہم معلومات رکھتے تھے، ان میں المسعودی اور البیرونی کے نام خاص طور پر

---

[1] The Ancient Geography of Kashmir Sir. A. Stein. Published in JASB vol LXVIII Part I 168

[2] معجم البلدان ج ۹ ص ۹۳ -

لئے جا سکتے ہیں، صرف ابن بطوطہ نے کشمیر کے حالات بیان کرنے میں مکمل خاموشی اختیار کی ہے
البیرونی سلطان محمود غزنوی کی تسخیر کشمیر کی مہم میں موجود تھا، اس نے کشمیر میں اسلام اور
مسلمانوں کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے، اپنی کتاب "تحقیق ما للھند" میں کشمیر
کی صرف علمی حالت بیان کی اور بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ کشمیر اور وارانسی ہندوستان کے
دو بے مثال علمی مرکز ہیں، وہ لکھتا ہے کہ وید زمانہ قریب تک منتشر حالت میں تھے، اور ان
کی حفاظت کا دارومدار پنڈتوں کی قوت حافظہ پر تھا، مگر ایک کشمیری عالم ہی سب سے
پہلے اس کی جمع وتدوین کرکے ضبط تحریر میں لایا وغیرہ۔ اس کتاب میں کشمیر پر ایک مستقل
باب وقف ہے،

۲ المسعودیؒ | ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی (م ۳۴۶ھ) اپنے وقت کا بڑا
عالم اور جہاں دیدہ سیاح تھا، وہ مسعر بن مہلہل کا معاصر تھا، مگر وادی میں داخل نہ
ہو سکا بلکہ اس کے حدود سے گذرا تھا، اس نے کشمیر کے جغرافیہ کے بارے میں مختصر معلومات
درج کئے ہیں وہ لکھتا ہے کہ کشمیر کا بادشاہ رائے (راجہ) سے معروف ہے، یہ ملک بلند و
بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، لوگوں کے لئے ناممکن ہو کہ وہ ان پر چڑھ سکیں، اڑنے والے جانور
کو چھوڑ کر دوسرے انواع کے وحشی جانور بھی ان پہاڑوں کی بلندیوں تک نہیں پہونچ سکتے، جہاں
تک اندرون ملک و وادی کا تعلق ہو تو اس میں وادیاں، درخت، چشمے اور تیز رفتار نہریں
ہیں، یہ جگہ عجائب عالم میں سے ہے، یہاں بادشاہ کے حکم سے پہرہ لگا رہتا ہے،

لا سبیل لاحد من الناس الیٰ	غیر ملکیوں میں سے کسی کو اجازت نہیں ہو کہ
بلادکا الا من وجہ واحد وعلیٰ	وہ یہاں داخل ہوسکیں، صرف ایک راستہ
علی جمیع ماذکرنا ہ[1] ۔	اس کے لئے مخصوص ہو باقی دوسرے راستے بند ہیں۔ (باقی)

[1] مروج الذہب ومعادن الجوہر: المسعودی، مطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۴۶ھ : ج ا ص ۱۰۳

قاضی حمید الدین بلخی

اور

اُن کا صحیح نام

از

جناب رضیہ خاتون وحید منزل علی گڑھ

حمید الدین بلخی (م ۵۵۹) کی شخصیت فارسی ادب میں اہم ہے، ان کی مشہور کتاب مقاماتِ حمیدی[1] ہے جو چھٹی صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب سے دنیائے ادب میں مقامہ نویسی کے اعتبار سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ انوری نے اپنے ایک قطعہ[2] میں اس کی اس طرح تعریف کی ہے۔

---

[1] مقاماتِ حمیدی عربی کی دو کتابیں یعنی مقامات بدیع الزماں ہمدانی اور مقاماتِ حریری کی تقلید میں لکھی گئی ہے، اللہ خاتمہ میں اس کی تاریخ جمادی [illegible] ہے۔ [illegible] نظامی عروضی کے چہار مقالہ میں بھی ہے، لیکن فردوسی نے اس کتاب کا ذکر ان کتابوں میں کیا ہے جو اصحاب فضل کو پڑھنا چاہئے، اس سے ظاہر ہے کہ مقاماتِ حمیدی چہار مقالہ سے کچھ پہلے تالیف ہو چکی تھی، اس کتاب میں المستنجد کی خلافت کا ذکر ہے، جو ۵۵۵ھ میں شروع ہوئی ہے، اس سے واضح ہے کہ [illegible] حمید الدین نے اس میں بعد میں بھی اضافے کئے ہیں، عوفی کے علاوہ سعد الدین وراوینی نے مرزبان نامہ کے مقدمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ [2] دیوان انوری، طبع سعید نفیسی ص ۳۲۵۔

ہر سخن کاں نیست قرآن یا حدیث مصطفی | از مقامات حمید الدین شد اکنوں ترہات
اشک اعمیٰ داں مقامات حریری و بدیع | پیش آں دریائی مالا مال از آب حیات
شاد باش اے عنصر محمودیاں را ہم تو | رو کرد محمود عصری ما بتان سومنات
از مقامات تو گر فصلی بخوانم بر عدد | حالی از نا منطقی حذر اسم یابد نجات
عقل کل خطی تامل کرد از گفت اے عجب | علم اکسیر سخن داند مگر قاضی القضاۃ
دیباں ای رای و قدرت عالم تو حیدرا | آفتابی بی زوال و آسمانی با ثبات

قاضی حمید الدین اپنے زمانے میں بلخ کے قاضی القضاۃ تھے، فارسی کا مشہور شاعر انوری ان کا معاصر
کسی شاعر نے اپنی ایک نظم میں بلخ کی ہجو کی تھی، یہ ہجو بلخ، انوری کے حاسدوں میں سے کسی نے انوری
طرف منسوب کردی، جس سے اس کے خلاف وہاں بڑی شورش ہوئی، اس سلسلہ میں انوری نے جن لوگوں
سے مدد طلب کی ان میں سے ایک شخص مجد الدین ابوالحسن عمرانی تھے اور دوسرے قاضی حمید بلخی، ان کی
مدح میں انوری نے ایک مشہور قصیدہ کہا ہے، جس کے چند شعر قابل ذکر ہیں[2]۔

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری | وز نفاق تیر و قصد ماہ و کید مشتری

اس قصیدے میں اس نے اپنی برات کا اظہار کیا ہے[3]۔

بہ جہار شہر است خراسان را بہ چار طرف | کہ وسط شان بمسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد | نہ چنانست کہ آبستن دیو و دد نیست
بلخ را عیب اگر چند بد باش کنند | بر ہر چہ بہ بد نیست کہ صد بخرد نیست

---

[1] ابوالحسن عمرانی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کا مطلع ہے :۔

اکنوں کہ ماہ روزہ بنقصان در افتاد | آہ از حجاب حجرۂ دل بر در افتاد

ص ۸۰ دیوان انوری [2] دیوان انوری ص ۴۰۱ [3] دیوان انوری ص ۳۵۹

معمر جامع را چارہ نبود از پذیرفتن
معدن نعمتگر بی سبب بیم نیست

مردم شہر یست بترتیب ہمہ چیز درو
جد و ہزلش متساوی و ہمہ کار بجیست

حبذا شہر نشا بور کہ در ملک خدای
گر بہشت است ہمینست وگرنہ خود نیست

قاضی حمیدالدین کے نام کے سلسلے میں اختلاف ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ ان کا نام حمیدالدین ابوبکر بن عمر بن محمود تھا، محمود عوفی نے لباب الالباب میں یہی لکھا ہے، چنانچہ بعد کے مصنفین نے اسی کی پیروی کی ہے، یہی نام سعید نے تعلیقات دیباچہ دیوان انوری[1] میں لکھا ہے۔ مرحوم بہار نے سبک شناسی[2] میں بھی اسی کی تائید کی ہے۔ مجمع الفصحا طبع مصفا[3] میں اور رہنمائے ادبیات[4] فارسی میں ان کا نام قاضی حمیدالدین عمر بن محمود البلخی ہی ملتا ہے۔

سب سے پہلے علامہ محمود قزوینی نے اس نام کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا، تعلیقات چہار مقالہ[5] میں وہ لکھتے ہیں۔

"عمر اسم پدر او ابوبکر کنیت او بودہ و حاجی خلیفہ ہم فقط و کنیت اکتفا کردہ است و گویا حق با حاجی خلیفہ باشد۔"

لیکن علامہ محمود قزوینی کے اس واضح شک کے باوجود کسی نے ان کا صحیح نام معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، ورنہ بعد کے مصنفین کو ان کا نام عمر لکھنے میں تکلف ہوتا، علامہ محمود قزوینی کے نزدیک یہ ان کے باپ کا نام تھا۔

حال ہی میں ایک کتاب بنام فضائل بلخ[6] سامنے آئی ہے، اس کے مؤلف شیخ فصیح الدین ابوبکر

---

[1] دیوان انوری ص ۳۵۹ [2] سبک شناسی جلد ۲ ص ۳۲۹ [3] مجمع الفصحا، جلد ا ص ۳۲۹ [4] رہنمائے ادبیات فارسی ص ۲۶۶ [5] ص ۲۳ [6] فضائل بلخ۔ یہ کتاب استاد عبدالحی حبیبی کی تصحیح سے بنیاد فرہنگ کی طرف سے ۱۳۵۰ شمسی میں شائع ہو چکی ہے۔

واعظ بلخی ہیں، یہ بلخ کے علما کا تذکرہ ہے، اس کی تالیف ۶۱۰ھ میں ہوئی، یہ عربی میں تھی، لیکن عربی کتاب کے کسی نسخہ کا پتہ نہیں، البتہ اس کا ایک فارسی ترجمہ ۶۷۶ھ میں بلخ ہی میں عبداللہ محمد حسینی نے کیا تھا وہ مل گیا ہے[1] اس میں ان کا نام حمیدالدین محمود لکھا ہے اور ان کے والد کا نام بہاءالدین عمر درج کیا ہے۔ فضائل بلخ[2] سے معلوم ہوا کہ قاضی القضاۃ حسن محمودی کے تین بھائی تھے، محمود سب سے بڑے تھے، اس کے بعد قاضی القضاۃ حسن محمودی اور قاضی القضاۃ بہاءالدین عمر محمودی تھے، پہلے دو بھائیوں کی وفات ۵۰۶ھ میں ہوئی ہے اور تیسرے بھائی کی ۵۳۶ھ میں، یہ بلخ کے قاضیوں کا بڑا خاندان تھا، انہی تیسرے بھائی یعنی بہاءالدین عمر کے بیٹے صاحب مقامات تھے، فضائل بلخ کے الفاظ[3] یہ ہیں،

"اما برادر سوئم ایشاں، قاضی القضاۃ بہاء الملۃ والدین المسمیٰ عمر، در سنۃ ست وثلاثین وخمسایہ، قاضی بلخ را تقلد کرد و مرورا پسری عالم فاضل کامل حمیدالدین محمود بودہ است، او در کلام شہرتی تمام داشتہ است در اقلیم عالم و در نہایت عقل و کمال فضل بود، بانظم المعذب الحسن، والنثر الکامل، و کتاب مقامات و کتاب روضۃ الرضا، و رسایل متفرقہ او دلیل است بر فصاحت و بلاغت وے۔"

اس بیان سے واضح ہے کہ حمیدالدین محمود وہی ہیں، جن کی کتاب مقامات حمیدی ادب فارسی میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

قاضی حمیدالدین دراصل عربی کے بڑے عالم تھے، ان کی بیشتر کتابیں عربی میں ہیں، ان کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر فضائل بلخ میں ہے، عوفی[4] نے چند اور تصانیف کا ذکر کیا ہے، جو یقیناً عربی میں تھیں، لیکن اب ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں، قاضی صاحب کی تمام شہرت کا مدار ان کی یہی فارسی کتاب مقامات حمیدی ہے، فضائل سے

---

[1] فضائل بلخ ص ۳۴۴—۳۴۵ [2] ۳۴۳ [3] فضائل بلخ ص ۳۴۴ [4] عوفی لباب الالباب جلد ۱ ص ۱۹۹

مزید یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کا خاندان محمودی کہلاتا تھا جو ان کے اجداد کے نام سے منسوب ہے
ان کے محمودی ہونے کی تائید انوری کی بیت[1] سے بھی ہوتی ہے۔

شاد باش ای عنصر محمودیاں را سوخ تو — رو کہ تو محمود عصری اتبان سوختت

اس سے ظاہر ہے کہ ان کا نام حمید الدین ابوبکر محمود بن عمر بلخی ہے۔ ان کے نام کے سلسلے میں غلطی لباب الالباب میں محمد عوفی سے ہوئی تھی جس میں ان کا نام عمر بن محمود درج ہے، وہی بعد کے مصنفین کے یہاں نقل ہوتی رہی، لیکن حاجی خلیفہ[2] نے عوفی کی روایت کے خلاف ان کا نام اس طرح درج کیا ہے، حمید الدین ابوبکر عمر بن محمود، اور ابن اثیر کے یہاں بھی ان کا نام ابوبکر کی کنیت کے ساتھ درج ہوا ہے۔ لیکن فضائل بلخ کے واضح بیان کے بعد یہ صاف ہو جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین کا پورا نام قاضی حمید الدین ابوبکر محمود بن عمر تھا اور جب تک کوئی دوسری سند نہ ملے اس وقت تک اسی کو صحیح سمجھنا چاہیئے اور عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ ان کا نام عمر تھا غلط سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] دیوان انوری ص ۳۳۵ [2] کشف الظنون ص ۱۷۸۶

شعر العجم حصہ چہارم

اس حصہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن و معاشرت اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا اور کیا تغیرات پیدا کئے اور فارسی شاعری کی صنف مثنوی خصوصاً فردوسی کے شاہنامہ پر بسیط تبصرہ،

از :- مولانا شبلی نعمانی

قیمت :- ۱۲ روپے،

"منیجر"

تبصرے

مطبوعات جدید

مرقوماتِ امدادیہ — بڑی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت قدر بہتر، صفحات ۱۱۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ روپے، پتہ مکتبہ برہان اردو بازار دہلی۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا روحانی فیض پورے ہندوستان میں جاری ہے، ان کی ظاہری تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی، مگر باطنی کمالات میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ علمائے کبار بھی ان کے سامنے ناصیہ فرسا رہے، زیرِ نظر کتاب حاجی صاحب کے ۱۴۰ مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اکیاره خلفاء و مریدین کو تحریر کئے تھے، ان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حاجی عابد حسینؒ اور حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ جیسے اصحابِ کمال خلفاء شامل ہیں، اکثر خطوط کی زبان فارسی ہے، ان میں تصوف و سلوک کے حقائق و معارف بھی ہیں، اور بعض اشخاص کے نام اور واقعات کا ذکر بھی آگیا ہے، جن کو وضاحت کے بغیر سمجھنا مشکل تھا، اس لئے حضرت کے ایک مرید باصفا اور اس صدی کے جامع کمالات شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے صوفیانہ مباحث کی تفہیم کے لئے خود حواشی قلمبند کئے، اشخاص و واقعات کی توضیح مولانا سعید الدین رامپوری سے کرائی، اور مولانا عبد الحیٔ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ کرایا، یہ سب خطوط مع ترجمہ و تحشیہ پہلی دفعہ ۱۹۲۹ء میں چھپے تھے، مگر

اب یہ مجموعہ کمیاب تھا، اس لیے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے اس کو اپنے چالیس صفحوں کے مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے، مقدمہ محنت اور دلچسپی سے لکھا گیا ہے، اس میں حاجی صاحب کے مختصر حالات و باطنی کمالات کے علاوہ ان کی بیعت کے سلسلہ کے بعض غلط واقعات و روایات کی تصحیح بھی کی گئی ہے، مقدمہ نگار کے بقول "یہ مجموعہ متوسلین سلسلۂ چشتیہ صابریہ امدادیہ کے لیے خصوصاً اور تصوف اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے عموماً ایک نعمت غیر مترقبہ ہے" لیکن طباعت کا اہتمام اور مکاتیب کی ترتیب جس سلیقہ سے کی جانی چاہیے تھی نہیں کی گئی ہے، آخر میں کئی صفحے فہرستوں و رموز کے ہیں۔

تاریخِ ادب عربی — ترتیب و تلخیص ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی،
متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۴، قیمت تین روپیے، پتہ: ایوان کمپنی، نخاس کہنہ، الہ آباد۔

تاریخ الادب العربی مشہور مصری فاضل احمد حسن زیات کی مقبول کتاب ہے، جو اپنے مباحث و مشمولات کے علاوہ ترتیب و تالیف اور انداز بیان و طرز ادا وغیرہ کے اعتبار سے بھی اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ نہ زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر، عرصہ ہوا مولانا عبد الرحمٰن طاہر سورتی نے اس کا اردو ترجمہ پاکستان سے شائع کیا تھا، مگر وہ ہندوستان والوں کی دسترس سے باہر ہے اور آج کل طلبہ کے لیے وقت کی کمی اور دوسرے تعلیمی اشتغال کی بنا پر اس متوسط کتاب سے استفادہ کرنا آسان نہیں ہے، اس لیے اس کتاب کا متن اور پاکستانی ترجمہ دونوں کو پیش نظر رکھ کر یہ تلخیص شائع کی گئی ہے، اس میں کتاب کے تمام مباحث آگئے ہیں لیکن شوقی، حافظ اور زہاوی وغیرہ کے بعد کی ادبی تاریخ اور عربی ادیبوں کے ذکر سے یہ خالی ہے، کتاب کی جامعیت کے خیال سے اس جلد میں اس کا بھی مختصر خاکہ شامل کر دینا چاہیے تھا۔

فن کار سے فن تک از جناب ابوذر عثمانی صاحب متوسط تقطیع،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰۔۳ روپے۔

پتہ (۱) تاج بک ڈپو مین روڈ، رانچی، (۲) بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ،

جناب ابوذر عثمانی لکچرر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کے ادبی و تنقیدی مضامین مختلف رسالو میں چھپتے رہے ہیں، اب انھوں نے ان کا پہلا مجموعہ شائع کیا ہے جو چودہ ۱۴ مضامین پر مشتمل ہے، ان میں قابل ذکر یہ ہیں، (۱) غالب کی ناقدانہ بصیرت (۲) اکبر اور مسئلۂ زبان (۳) اختر اورنیوی کا اسلوب (۴) تدریس ادب کے جدید تقاضے اور اردو نصاب (۵) ادبی تنقید کی تدریس کا مسئلہ (۶) بہار میں اردو تنقید کے ابتدائی کارنامے (۷) جدید شاعری میں اظہار و بیان کا پہلو (۸) عملی تنقید کیا ہے؟ پہلے مضمون میں غالب کی سخن فہمی اور ناقدانہ بصیرت پر اچھے انداز سے بحث کی گئی ہے، دوسرے میں اکبر کی زبان اور رسم الخط کے مسائل اور جھگڑوں نیز ان کے حل کی ان صورتوں کا ذکر ہے جن کو اکبر نے اپنی شاعری میں اپنے خاص طرز و انداز میں بیان کیا ہے، اختر اورنیوی کے اسلوب کی خصوصیات کے ضمن میں ان کے وسیع علم و مشاہدہ، رنگین تخیل اور لطیف احساس وغیرہ کا بھی ذکر ہے، اردو ادب کے درس و تدریس، اس کے نصاب کی اصلاح اور اس کی نئی تشکیل کی ضرورت پر مفید اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ادبی تنقید کے سلسلہ میں اساتذہ و طلبہ کو زریں مشورے دیئے گئے ہیں اور ان دونوں موضوعات پر اچھی اور بہتر کتابوں کی ترتیب و تالیف کی ضرورت بھی واضح کی ہے، جدید شاعری سے متعلق مضمون میں اس کی روایات کو اردو شاعری کی وسعت کی دلیل بتایا گیا ہے، آخری مضمون میں عملی تنقید کا مفہوم، اس کے حدود، دائرۂ کار اور فائدے تحریر کئے ہیں اور اس پر اعتراضات کا جواب دیا ہے لیکن اس مضمون کے بعض خیالات میں ابہام ہے، اردو انشائیہ سے متعلق مضمون کے بعض خیالات بھی واضح نہیں ہیں، اختر اورنیوی کے اسلوب کا

ماثر صرف افسانوں کی حد تک مخصوص ہے اس میں تنقیدی او ادبی تحریروں کے اسلوب کی خص
نہیں دکھائی گئی ہے بحیثیت مجموعی یہ مضامین اردو زبان و ادب کے طلبہ کے مطالعہ میں آنے
لائق ہیں مگر قیمت بہت زیادہ ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ اسماعیل شہید مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی چھوٹی تقطیع، کاغذ
کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۶۴ قیمت درج نہیں، پتہ الفرقان بکڈپو ۳۱
نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ

یہ رسالہ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے حالات علمی، دینی اور اصلاحی خدمات کا مختصر مرقع
لائق مصنف نے شاہ صاحب کی مشہور و مقبول کتاب تقویۃ الایمان کے تعارف کے ضمن میں
پر بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور ان لوگوں کے خیال کی مدلل تردید کی ہے جن کو اس
شاہ صاحب کی تصنیف ہونے میں شک وشبہ ہے، مصنف کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ تقویۃ
پر اعتراضات سے اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ یہ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود مفید
لائق مطالعہ ہے،

انتخاب :- از جناب سکندر علی وجد صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت
نہایت عمدہ صفحات ۸ مجلد قیمت ۱۰ روپئے ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر نئی
جناب سکندر علی وجد اس دور کے بہت ممتاز شاعر ہیں، ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع
ہیں اور ان سب پر معارف میں مفصل تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے اب انجمن ترقی اردو نے ان کے کلا
انتخاب شائع کیا ہے جن لوگوں کو ان کے پہلے مجموعے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے انکے لئے یہ انتخ
نعمت غیر مترقبہ ہے، وجد صاحب کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت ہے اور انکے یہاں دونوں کے بہتر
موجود ہیں یہ انتخاب ان کے سے شکی کی مشہور و مقبول نظموں و غزلوں پر مشتمل ہے گویا اس میں پچھلے سب مجموعوں کا عطر

یہ کتاب مقبول ہوگا، اور وجد صاحب کے قدرداں اس کو شوق سے پڑھیں گے،

"ض"

•

مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات — مرتبہ نظر برنی، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت ۲۰ روپیے،

پتہ، ادبی سنگم، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

رئیس الاحرار مولانا محمد علی ہندوستانی سیاست کے ایک اہم ستون، ہندوستان کی تحریک آزادی کے بہت بڑے مجاہد، تحریک خلافت کی روح رواں، ترک موالات کے علمبردار، اور اسلام کے ایک عظیم سپاہی تھے، ان کی شخصیت میں بڑی رنگارنگی تھی، بڑے اچھے مقرر شاعر اور صحافی بھی تھے حصول آزادی کی خاطر انھوں نے دیار غیر میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی، لیکن آزادی کے بعد ان کو فراموش کردیا گیا تھا،

جولائی ۱۹۷۸ء میں ادبی سنگم کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی صدارت میں "مولانا محمد علی، شخصیت اور خدمات" کے عنوان سے ایک سمپوزیم منعقد ہوا تھا بعد میں ادبی سنگم کے منتظم نظر برنی صاحب نے اس سمپوزیم کے مقالات اور تقریروں کو شائع کرنا چاہا تو دوسرے اہل قلم کو بھی اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دی پھر کچھ پرانے مضامین کو بھی مختلف کتابوں سے جمع کئے اور اب ان سب کو کتابی صورت میں شائع کردیا ہے، اس طرح مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد حسین، عبد اللطیف بجنوری، قاضی عبد الحمید، بیری، ضیاء الدین برنی اور اسرار بصری کی تحریریں بھی اس میں آگئی ہیں، یہ سب تاثراتی مضامین ہیں، جن میں مولانا کی شخصیت، علم وفضل، ذہانت، شرافت، عظمت، سیاسی بصیرت، اور ملک وملت کی قیادت اور دوسری نمایاں خصوصیتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، خان نیازی کابلی نے مولانا کے کردار، انسانی

ہمدردی و دلسوزی، جذبۂ اخلاص اور وطن دوستی پر اپنے تاثرات اچھے انداز میں پیش کئے ہیں، محمد حسین [illegible] نے ایک وطن دوست کے عنوان سے مختصر مگر جامع مضمون تحریر کیا ہے، محمد الرحمن اور ابراہیم نکری نے مولانا کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، جس سے ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف ادوار سامنے آجاتے ہیں، سب سے طویل اور قیمتی مضمون سید حامد صاحب کا "مولانا محمد علی کی شخصیت ادبی و غیر ادبی" کے عنوان سے ہے، اس میں مولانا محمد علی کے نامور معاصرین کے مقابلہ میں ان کی عظمت و برتری دکھائی ہے، انڈین نیشنل کانگریس اور گول میز کانفرنس میں مولانا کی تقریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں، جن سے ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ ان کی قوت ایمانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، آخر میں ببلیوگرافی کے عنوان سے نظر برنی اور مرتبہ ملکہ صاحبہ نے مولانا پر لکھے گئے مضامین اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو بہت تشنہ ہے، مولانا عبد اللہ کا ایک عربی مرثیہ اردو ترجمہ کے ساتھ بھی درج ہے، کتاب میں کتابت و طباعت کی بعض خامیاں بھی ہیں، صفحہ ۱۶ پر کرۂ ارض سے محسوس کے بجائے محو ہونا چاہیے، صفحہ ۱۷۱ پر اسراف کا املا اصراف ہے عدم اعتدال کے بجائے بے اعتدالی لکھنا چاہیے، ازلی کا املا اذلی لکھا ہے، صفحہ ۱۹۲ پر آرایش و پیرایش کے بجائے آرائش و زیبائش ہونا چاہیے، صفحہ ۱۹۲ پر گویا کہ کے بجائے گو کہ لکھنا تھا، صفحہ ۱۹۹ پر شعری اور زیادہ رونق جیسے الفاظ سے مفہوم واضح نہیں ہوتا، صفحہ ۲۲۱ پر فائز المرام کو فائز المرام ہی لکھا ہے، ارادہ تقسیم کرنا نہیں ارادہ فسخ کرنا لکھنا چاہیے، اسی صفحہ پر مرثیہ عربی کے بجائے رثاء العربیہ ہونا تھا، صفحہ ۱۶۱ پر اسرار بصری نام درج ہے جب کہ یہ رمزی نام ہے، صحیح نام شورش کاشمیری لکھنا تھا، ان خامیوں کے باوجود یہ مجموعۂ مضامین مولانا کے فضل و کمال، دیانت، عبقریت، فراست و تدبر، ادبی، علمی، سیاسی اور دینی عظمت، متنوع و ہمہ گیر شخصیت کا ایک اچھا مرقع ہے۔

م ۔ ن

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

مئی سنہ ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت پندرہ روپیے ۱۵ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلس ادارت

دار المصنفین کی نئی کتاب

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۶۹ء تک غالب کی مدح و قدح میں جو کچھ لکھا گیا ہے
اس کا پوری دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں

حصہ اول

اس میں مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۸ء تک ان کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر تبصرہ کیا گیا ہے قیمت ۱۵ روپے

حصہ دوم

اس میں مرزا غالب کی حمایت و مخالفت میں سنہ ۱۹۲۹ء سے سنہ ۱۹۶۹ء تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر تبصرہ کیا گیا ہے قیمت ۱۵ روپے

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۲۵ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

شذرات

گذشتہ مارچ اور اپریل کا بڑا حصہ کلکتہ، لکھنؤ، علی گڑھ اور بمبئی کے علمی سیمنار کی شرکت میں گذرا جن میں پرانے اور نئے علم دوستوں کے طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔

۱۵ ر۱۶ ر مارچ کو ایران سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے عمر خیام کا نو سو سالہ جشن تھا، اس سوسائٹی کو ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم سابق استاد فارسی کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۹۴۴ء میں قائم کیا تھا، ان کی وفات کے بعد اس کے دو مخلص عہدیداروں جناب محمد عبد المجید جنرل سکریٹری اور خواجہ محمد یوسف خازن نے اس کو بہت متحرک جاندار اور باوقار بنا دیا ہے، اور اب جناب ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی بھی اس کے نائب صدر کی حیثیت سے اس کو آگے بڑھانے میں سرگرم ہیں، اس علمی ادارہ سے ہر فرقہ کے علم دوستوں کو بڑی دلچسپی ہے، اس کے عہدیداروں اور ممبروں میں رومی۔ بی۔ جمی، وی پولاڈی ان، مسز گورسا ہنی جے۔ این تعلقدار، جے۔ آر۔ مہتا، ایس۔ پی۔ رائے اور ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار جیسے اہل علم بھی ہیں عمر خیام کو ہندوستان فراموش کر رہا تھا، ایران سوسائٹی کی اس تقریب سے اس کی یادوں کی شمع یہاں روشن ہوگئی، اس کا افتتاح مغربی بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این سنگھ نے ایک جگمگاتے ہوئے پنڈال باوقار مجمع میں کیا، کلکتہ کے علمی جلسوں میں برابر شرکت کرنے کا موقع ملا، اس کاروباری اور ہنگامہ پرور شہر میں ایسی مجلسوں کے حاضرین کو ہر طرح متین اور مہذب پایا۔

اس کے سیمنار کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی مقالہ نگار یوپی، دہلی، حیدرآباد اور مدراس سے آئے ہوئے تھے بنگال کے ہندو مقالہ نگاروں اور ... میں پروفیسر ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار، پی۔ این۔ چوپڑا، ایس۔ پی۔ رائے، پولاڈی ای این، ڈاکٹر آر کے

وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر پرتاپ چندر سابق وزیر تعلیم حکومت ہند بھی تھے بعض مقالوں اور تقریروں سے اندازہ ہوا کہ خیام سے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ اب تک دور نہیں ہوئی ہیں، کلکتہ میں خیام بار کے ایک بورڈ پر بھی نظر پڑی، سمینار میں جتنے مقالات پڑھے گئے، وہ ایران سوسائٹی کے رسالہ انڈوایرانیکا میں شایع ہوگئے تو امید ہے کہ قارئین کے سامنے اصلی خیام کی تصویر آجائے گی، راقم نے اپنے مقالہ اور تقریر میں اس پر زور دیا کہ فٹزجیرالڈ کے ذریعہ ایک رندِ تسم کا جعلی خیام نمودار ہوا، اصلی خیام مسلمان تھا جو توحید، رسالت، حشر، جزا و سزا اور معاد کا قائل تھا، اس نے حج بھی کیا، وہ فلسفی حکیم کے بجائے صوفی حکیم تھا اور مشائیت آمیز فلسفیانہ اسلام کا پیرو رہا جس کا خاکہ فارابی کی فصوص اور بو علی سینا کی اشارات اور الٰہیات میں نظر آئے گا۔

اس موقع پر کلکتہ کے مشہور میوزیم میں خیام پر ایک نمائش بھی بہت سلیقہ سے سجائی گئی تھی، اس میں خیام کی رباعیوں کی اعلیٰ خطاطی کے نمونے بھی دکھائے گئے، ایک علٰحدہ مطبوعہ پمفلٹ میں خیام کی ان تصانیف اور رباعیات کے ان نسخوں کی بھی نشاندہی بڑی محنت سے کی گئی تھی جو اس وقت دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ایک نشست میں خیام کی رباعیاں بھی پڑھی اور گا کر سنائی گئیں، ان کو مجمع جس شوق سے سن رہا تھا اس کو دیکھ کر تعجب ہوا، اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں جناب ایم اے مجید اور جناب خواجہ محمد یوسف اپنے شرکائے کار جناب شبلی علقمہ، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی اور ڈاکٹر سید منال شاہ القادری کے ساتھ پوری مستعدی اور تن دہی سے کام لے رہے تھے، خواجہ محمد یوسف صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب سینیر ایڈوکیٹ ہیں، انھوں نے بیرونی مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ جس تعہد، سلیقہ اور محنت سے اس قسم کی تقریبوں میں سرگرم رہتے ہیں، اس سے ان کے نوجوان ساتھی درس لے سکتے ہیں۔

*

۲۶ مارچ کو مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی لکھنؤ میں مولانا ہی پر ایک سمینار تھا، پہلے اس کو یوپی حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی، اس کے گذشتہ دو سمیناروں کے دو مجموعے ابوالکلام آزاد، احوال و آثار" اور "نقوش ابوالکلام" کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، جنتا حکومت کے زمانہ میں اس کی سرکاری امداد بند ہوگئی، مگر اس کے باہمت سکریٹری

شذرات

گذشتہ مارچ اور اپریل کا بڑا حصہ کلکتہ، لکھنؤ، علی گڑھ اور بمبئی کے علمی سیمناروں کی شرکت میں گذرا جن میں پرانے اور نئے علم دوستوں کے طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔

۱۵ ر ۱۶ ر مارچ کو ایران سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے عمر خیام کا نو سو سالہ جشن تھا، اس سوسائٹی کو ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم سابق استاد فارسی کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۹۴۴ء میں قائم کیا تھا، ان کی وفات کے بعد اس کے دو مخلص عہدیدار جناب محمد عبد المجید جنرل سکریٹری اور خواجہ محمد یوسف خازن نے اس کو بہت متحرک، جاندار اور باوقار بنا دیا ہے، اور اب جناب ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی بھی اس کے نائب صدر کی حیثیت سے اس کو آگے بڑھانے میں سرگرم ہیں، اس علمی ادارہ سے ہر فرقہ کے علم دوستوں کو بڑی دلچسپی ہے، اس کے عہدیداروں اور ممبروں میں روسی۔ بی۔ جی، وی پولاڈی ان، مسز گورساہنی، جے۔ این تعلقدار، جے۔ آر۔ مہتا، ایس۔ پی۔ رائے اور ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار جیسے اہل علم بھی ہیں، عمر خیام کو ہندوستان فراموش کر رہا تھا، ایران سوسائٹی کی اس تقریب سے اس کی یادوں کی شمع یہاں پھر روشن ہو گئی، اس کا افتتاح مغربی بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این سنگھ نے ایک شمع جلاتے ہوئے پنڈال کے باوقار مجمع میں کیا، کلکتہ کے علمی جلسوں میں برابر شرکت کرنے کا موقع ملا، اس کاروباری اور ہنگامہ پرور شہر میں ایسی جلسوں کے حاضرین کو ہر طرح متین اور مہذب پایا۔

اس کے سیمنار کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی، مقالہ نگار یوپی، دہلی، حیدرآباد اور مدراس سے آئے ہوئے تھے، بنگال کے ہندو مقالہ نگاروں اور مقررو‍ں میں پروفیسر ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار، پی۔ این۔ چوپڑا، ایس۔ پی۔ بلیسہ، پولاڈی ای۔ این، ڈاکٹر آر کے پردا

وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر پرتاپ چندر سابق وزیر تعلیم حکومت ہند بھی تھے، بعض مقالوں اور تقریروں سے اندازہ ہوا کہ خیام سے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ اب تک دور نہیں ہوئی ہیں، کلکتہ میں خیام بار کے ایک بورڈ پر بھی نظر پڑی، سیمنار میں جتنے مقالات پڑھے گئے، وہ ایران سوسائٹی کے رسالہ انڈو ایرانیکا میں شایع ہوگئے تو ان کے قارئین کے سامنے اصلی خیام کی تصویر آجائے گی، راقم نے اپنے مقالہ اور تقریر میں اس پر زور دیا کہ فٹز جیرالڈ کے ذریعہ ایک رند تسم کا جعلی خیام نمودار ہوا، اصلی خیام مسلمان تھا جو توحید، رسالت، حشر، جزا و سزا اور معاد کا قائل تھا، اس نے حج بھی کیا، وہ فلسفی حکیم کے بجائے صوفی حکیم تھا اور مشائیت آمیز فلسفیانہ اسلام کا پیرو رہا جس کا خاکہ فارابی کی نصوص اور بوعلی سینا کی اشارات اور الہیات میں نظر آئے گا۔

*

اس موقع پر کلکتہ کے مشہور میوزیم میں خیام پر ایک نمائش بھی بہت سلیقہ سے سجائی گئی تھی، اس میں خیام کی رباعیوں کی اعلیٰ خطاطی کے نمونے بھی دکھائے گئے، ایک علحدہ مطبوعہ پمفلٹ میں خیام کی ان تصانیف اور رباعیات کے ان نسخوں کی بھی نشاندہی بڑی محنت سے کی گئی تھی جو اس وقت دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ایک نشست میں خیام کی رباعیاں بھی پڑھی اور گا کر سنائی گئیں، ان کو مجمع جس شوق سے سن رہا تھا اس کو دیکھ کر تعجب ہوا، اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں جناب ایم اے مجید اور جناب خواجہ محمد یوسف اپنے شرکائے کار جناب شبلی علقمہ، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی اور ڈاکٹر سید منال شاہ القادری کے ساتھ پوری مستعدی اور تن دہی سے کام لے رہے تھے، خواجہ محمد یوسف صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب سینیر ایڈووکیٹ ہیں، انھوں نے بیرونی مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ جس تعہد، سلیقہ اور محنت سے اس قسم کی تقریبوں میں سرگرم رہتے ہیں، اس سے ان کے نوجوان ساتھی درس لے سکتے ہیں۔

*

۲۶ مارچ کو مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی لکھنؤ میں مولانا ہی پر ایک سیمینار تھا، پہلے اس کو یوپی حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی اس کے گذشتہ دو سیمناروں کے دو مجموعے ابوالکلام آزاد، احوال و آثار" اور "نقوش ابوالکلام آزاد" کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، جنتا حکومت کے زمانہ میں اس کی سرکاری امداد بند ہوگئی، مگر اس کے باہمت سکریٹری

جناب عبدالمجید الہلالی اور دوسرے اولوالعزم عہدیداروں نے خود سرمایہ جمع کر کے سیمینار میں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے تقریباً بیس مقالہ نگاروں کو مدعو کیا، اس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کی خصوصی مہمان مصر کے وزیر اوقاف جناب عبدالمنعم النمر تھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ انھوں نے مصر میں مولانا آزاد پر ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے، ان کے ساتھ مصر کے مشہور قاری عبدالباسط بھی تھے جن کی سامعہ نواز، دل گداز اور ایمان افروز قرأت سے محظوظ ہونے کے لئے لکھنؤ کے لوگ گنگا پرشاد میموریل ہال میں ٹوٹے پڑتے تھے، اس لئے یہ سیمینار قرأت کی ایک دلآویز تقریب میں تبدیل ہو گیا جس کے بعد مقالہ نگاروں نے خود ہی مقالات پڑھ کر سامعین کو گرانبار کرنا پسند نہیں کیا البتہ خصوصی مہمان نے مولانا آزاد کی شخصیت پر ایک پر مغز تقریر کی، خیال تھا کہ مولانا آزاد پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے معزز مہمان کی زبان سے اردو میں بھی تقریر سننے میں آئے گی، مگر ان کی تقریر برابر عربی میں ہوتی رہی جس کا اردو ترجمہ ندوہ کے مولانا شمس الحق ندوی کرتے رہے، ان کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی اور جناب ضیاء الرحمٰن انصاری وزیر ریاست حکومت ہند کی تقریریں ہوئیں، پھر ایک پرتکلف عشائیہ کے بعد یہ تقریب ختم ہو گئی، امید کہ اکیڈمی کے عہدیدار مقالہ نگاروں کے مضامین پھر ایک کتابی صورت میں شایع کر کے ایک مفید خدمت انجام دیں گے، اس میں راقم نے "مولانا ابوالکلام آزاد کے جلووں کی رنگا رنگی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔

۲۸، ۲۹، ۳۰ مارچ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے یورپ پر اسلام کا اثر کے موضوع پر ایک سیمینار تھا، اس کے داعی ڈاکٹر امجد علی کی علالت کی وجہ سے اس کی کارروائی ڈاکٹر محمد اقبال صدر شعبۂ اسلامیات کی نگرانی میں انجام پائی جن کو ایسی تقریبوں کو بڑی خوش سلیقگی سے انجام دینے کی مہارت ہے، اس میں یو۔ پی کے علاوہ کلکتہ، حیدر آباد، مدراس، اندور اور دہلی کے اہل قلم مدعو تھے، اس کا افتتاح مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع نے کیا، اس موقع پر اتفاق سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ تاریخ کے لائق استاد اور مشہور اہل قلم محمد اسلم صاحب بھی موجود تھے، جنھوں نے اس موضوع پر ایک اچھی تقریر کی، اس کے پانچ اجلاس مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مسلم یونیورسٹی) ڈاکٹر امیر حسن عابدی (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر مشیر الحق (جامعہ ملیہ) جناب ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج) اور اس راقم کی صدارت میں ہوئے۔

اس اہم موضوع کے لحاظ سے امید تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے ہر شعبہ کے اساتذہ اس میں بڑے شوق سے حصہ لیں گے لیکن یونیورسٹی کے اکابر اور ممتاز اساتذہ کی عدم شرکت سے تعجب ہوا، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری کا خیال ہے کہ سیمنار اچھا وہی ہوتا ہے جس میں سامعین صرف مقالہ نگار ہی ہوں مگر اس طرح اس کی افادیت محدود ہو جاتی ہے، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری نے اپنی اختتامی تقریر میں یہ بھی کہا کہ مارچ کے مہینہ میں مقالہ نگاروں کو مختلف سیمناروں میں جانا ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنا مقالہ بہت عجلت میں لکھتے ہیں، یہ بات سیمنار کے مقالہ نگاروں کے لئے ضرور قابل غور ہے، مگر بعض مقالہ نگار محنت سے طویل مقالہ لکھ کر لاتے ہیں تو ان سے چند منٹوں میں اس کو ختم کرنے کی فرمائش ہوتی ہے جس سے ان کی محنت رائگاں ہوتی نظر آتی ہے، سیمنار میں زیادہ تر مختصر مقالے پسند کیے جاتے ہیں، اختصار نویسی ضرور ایک اہم آرٹ ہے، مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ تحقیقی مضامین کے لئے بھی یہ کارآمد ہو۔

*

بمبئی کے سیمنار میں جاتے ہوئے نئی دہلی میں دو روز برادرم سید شہاب الدین دسنوی کے ساتھ تغلق آباد میں ٹھہرا جو وہاں کے ہمدرد کیمپس کے اس وقت ایڈمنسٹریٹر ہیں، جناب حکیم عبد الحمید صاحب تغلق آباد کے کھنڈر کو جس طرح اپنے گوناگوں پلان سے علم و فن کا شہر آرزو بنا رہے ہیں، اس سے ان کی وہی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا اظہار ہوتا ہے جو اکبر اعظم نے فتح پور سیکری کے ویرانے کو آباد کرنے میں دکھایا تھا، اکبر کے یہاں تو شاہی خزانہ تھا مگر جناب حکیم عبد الحمید کے پاس صرف شاہانہ حوصلہ ہے، اس جگہ کی عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں کے ایک باہمت فرد نے ایسے شاندار کارنامے انجام دے کر ان کی سرخروئی کا سامان کر دیا ہے، یہاں جناب حکیم عبد الحمید صاحب، جناب اوصاف علی (ڈائرکٹر اسلامک انسٹیٹیوٹ لائبریری) اور جناب عبد الوحید صاحب سابق استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ساتھ بڑے خوشگوار لمحات گذرے۔

*

۲۶، ۲۷ اپریل کو بمبئی میں اخوان الصفا کے اسلامک انسٹیٹیوٹ کی طرف سے "اسلام اور دورِ جدید" پر ایک سیمنار تھا، اس کے داعی جناب اصغر علی انجینیر صاحب تھے جو فرقہ بوہرہ اور اسلام پر کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، بمبئی میں جناب سیٹھ عبد العزیز انصاری رکن مجلس انتظامیہ دار المصنفین کے یہاں حسب معمول ٹھہرا جو اپنی غیر معمولی محنت سے بڑی دولت پیدا کر کے صرف اس لئے زندہ رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کو اپنے مہمانوں کی پذیرائی میں صرف کرتے رہیں، ان کی میزبانی کی دریا دلی اور کرم گستری میں قرون اولیٰ کی مہمان نوازیوں کی عملی روایت تازہ ہو جاتی ہے، ان کے بڑے صاحبزادے اور صالح میاں اسم با مسمی ہونے کے علاوہ اپنے والد بزرگوار ہی کی خوبیوں کے حامل ہیں،

بمبئی کے قیام میں ان خاندان کے افراد کے اکرام کی وجہ سے دو آتشہ، بلکہ سہ آتشہ کی لذت ملتی رہتی ہے۔

بمبئی پہونچنے سے پہلے کانوں میں یہ بات پڑی تھی کہ یہ سیمنار ترقی پسندوں اور مارکسسٹوں کی طرف سے ہے، وہاں پہونچا تو جناب عبدالعزیز انصاری، ابو صالح سلفی، دارالمصنفین کے ایک لائف ممبر مولوی محمد مستقیم کی رائے ہوئی کہ اس میں ضرور شرکت کرے، دینی اچھا ہی اثر ہوگا، مولوی مستقیم اصلاحی بھی ندوی بھی اور دیوبندی بھی، بمبئی کے مذہبی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، ان ہی حضرات کے ساتھ سیمنار کے جلسہ گاہ صابو صدیق انسٹیٹیوٹ پہنچا، جہاں بمبئی کے مشہور اور ممتاز رہنما جناب معین الدین حارث صاحب پہلے سے موجود تھے، انھوں نے ملنے میں اپنی دیرینہ محبت کی گرم جوشی کا اظہار کیا، افتتاحی جلسہ کے بعد دوسرے دن اس کی صدارت کے لئے میرے نام کا اعلان میری اجازت کے بغیر ہوا، مدعوئین میں بمبئی کے علاوہ حیدرآباد اور علی گڑھ کے مقالہ نگار تھے۔

جلسہ کے حاضرین میں اسلام پسندوں کی اکثریت زیادہ نظر آئی، جن لوگوں نے مباحثے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ زیادہ تر اسلامی خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے، ٹائمس آف انڈیا میں جو روداد چھپتی رہی وہ ایسے ہی لوگوں کے مطالبے کے مطابق تھی، میرے مقالہ کا عنوان "اسلام کے تصور ریاست" تھا، اس کے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر کا حوالہ تھا جس میں انھوں نے صدائے ربانی بن کر کہا تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولیٹیکل پالیسی تیار کر لی لیکن اگر انھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال میں اسلام کی عملی روح پیدا نہ کی اور اپنے دین کی سلطنت کے ماتحت داخل نہ کیا تو ان کی تمام سیاسی ہنگامہ آرائیاں ایک دقیقہ اور ایک عشر دقیقہ تک کے لئے بھی کچھ نفع نہیں پہونچا سکیں گی۔

ایک نشست میں جناب اصغر علی انجینیر اور ان کے کچھ ساتھیوں نے بوہری فرقہ پر تفصیلی گفتگو کی، پھر اودے پور کمیشن اور تھانہ کمیشن کی رپورٹیں مطالعہ کیلئے دیں۔

جناب معین الدین حارث صاحب نے انجمن اسلام ریسرچ انسٹیٹیوٹ بھی گیا، وہاں وہ نہ ملے تو جناب نظام الدین گوریکر اور جناب ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے پیشوائی کی، یہاں جناب سید نجیب اشرف ندوی مرحوم اور عبدالرزاق قریشی مرحوم بہت یاد آئے جن کی وجہ سے اس انسٹیٹیوٹ کی علمی سرگرمیوں میں چار چاند لگے تھے، ڈاکٹر شیخ فرید اپنے صاف ستھرے علمی ذوق کی وجہ سے برابر نئے علماء و فضلاء پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں، ان کی کتاب "حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ" چھپ کر مقبول ہو چکی ہے، مولوی عبدالرحمن پرواز (مصنف "مخدوم علی مہائمی") اور مفتی صدرالدین آزردہ) اور ڈاکٹر خورشید احمد نعمانی (مصنف "دارالمصنفین کی ادبی خدمات") سے بھی برابر ملاقاتیں رہیں، جناب معین الدین حارث صاحب انسٹیٹیوٹ میں نہ ملے تو ان کی تلافی قیامگاہ پر آ کر کی، اور دیر تک دارالمصنفین کے مطبع سے متعلق مفید مشورے دیتے رہے، دارالمصنفین آنے کا وعدہ بھی کیا، ان دنوں لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری کا ایک آپریشن ہوا تھا، انھوں نے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو ان کی عیادت کیلئے گیا، اپنے بستر علالت ہی پر اپنی ایک نظم کربلا سنا کر تواضع کی،

مقالات

صلیبی جنگ اور اس کے اہم پہلو

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں 'امپیکٹ آف اسلام اون یورپ' (یورپ پر اسلام کے اثرات) کے عنوان سے ایک سیمینار ۲۸، ۲۹، ۳۰ اپریل ۱۹۸۰ء کو ہوا، یہ مقالہ اسی کے لئے لکھا گیا، اور وہاں اس کے کچھ حصے پڑھے گئے، ترمیم و اضافہ کے بعد اب یہ معارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔"

صلیبی جنگ مسلمانوں کی تاریخ کا المناک واقعہ بھی ہے، اور طرب ناک بھی، اس کی تفصیل دردانگیز بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی، اس کے ساتھ عبرت، بصیرت اور غیرت کی بھی داستان ہے، یہ یورپ اور ایشیا، مغرب اور مشرق، مسلمانوں اور عیسائیوں، صلیب اور ہلال کی جنگ ہے، مگر اسی کے ساتھ اس میں اصلی جذبہ یہ کارفرما تھا کہ یورپ کے استیلاء، اور غلبہ کا پرچم تو ایشیا بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں لہرائے، مگر یورپ کی سرزمین پر غیر یوروپین اور خصوصاً مسلمانوں کا قدم کسی لحاظ سے بھی جمنے نہ پائے، مگر مسلمان ان کی مرضی کے خلاف اپنی سپہگری اور نبردآزمائی سے یورپ پہونچے تو انھوں نے اسپین میں آٹھ سو برس تک حکومت کی، سسلی میں ان کی حکومت تقریباً دو سو برس تک رہی، دولت عثمانیہ کے حکمراں تو ساڑھے چھ سو برس تک یورپ کی سرزمین میں اپنا پرچم لہراتے رہے، مگر یورپ کے عیسائیوں کی نظروں میں یہ سلطنتیں خار کی طرح کھٹکتی رہیں، انھوں نے اس وقت دم لیا جب سسلی

اور اسپین سے مسلمانوں کو انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے در بدر کیا اور دولت عثمانیہ کی قوت پر ایک کاری ضرب لگا کر اس کو کمزور کر دیا، حالانکہ سسلی میں مسلمانوں نے دو سو برس تک حکومت کی تو ولیم ڈریپر کے قول کے مطابق جنوبی ایطالیہ اور سسلی میں ان کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو بڑی قوت پہونچی (معرکۂ مذہب وسائنس ص ۱۴۱) اسپین کو مالی اور علمی ترقی دے کر بقول موسیو لیبان مسلمانوں نے یورپ کا سرتاج بنا دیا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۵۰ - ۲۴۷) پھر دولت عثمانیہ کے عہد میں اس کے قلمرو کا تمدن یورپ کے کسی ملک سے کم نہیں رہا، سر ایڈون پیرس ڈیلی نیوز کے نامہ نگار کی حیثیت سے ترکی میں مدتوں رہ چکے تھے، انھوں نے اپنی کتاب "ترکی اور اس کے باشندے" میں لکھا کہ اس کا دعویٰ بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اناطولیہ کے ترکوں کو ایک پرہیزگار قوم بنا دیا ہے (بحوالہ دولت عثمانیہ ج ۲، ص ۴۴۹ مطبوعہ دار المصنفین) ایک اور انگریز لوسی گارنٹ نے لکھا کہ ترکی کے شہروں میں وہ اجڈپن اور وحشیانہ پن بہت کم ملتا ہے جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے (ایضاً ص ۴۵۱) مگر مسلمانوں کے ان تینوں متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کو یورپ کے عیسائیوں نے ختم کر کے دم لیا۔

یورپ کے عیسائیوں نے یورپ کی ان مسلم حکومتوں کو اس لئے برباد کیا کہ وہ یورپ میں ان کا اقتدار کسی طرح نہیں چاہتے تھے، اگر ان کا یہ جذبہ صحیح تھا تو پھر ان کو ایشیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کا کوئی حق نہ تھا، مگر وہ جوع الارض میں ہمیشہ مبتلا رہے، اس لئے ان کو جب کبھی موقع ملا، ایشیا اور افریقہ کی سرزمین کو اپنی سیاست کے چوگان کا میدان بنا لیا اور اس کے لئے ہر طرح کا جواز پیدا کر لیا،

<u>صلیبی جنگ کے اسباب</u> صلیبی جنگ میں ان کے یہی جذبات کارفرما رہے، وہ اپنی ازلی عداوت کی وجہ سے مسلمانوں کا اقتدار اور اثر ہر جگہ سے ختم کر کے اپنے جوع الارض کی سیری چاہتے تھے، اس کے لئے بہت سے حیلے بہانے تراشے۔ مگر فوری وجہ یہ تھی کہ جب گیارہویں صدی عیسوی میں مشرقی یورپ میں سلجوقیوں نے بڑھ کر یونانی علاقے اور ایشیائے کوچک پر اپنی حکومت قائم کر لی تو یورپ والوں کو پسند نہ آیا، تاریخ یورپ کے

مصنف اے۔ جی گرانٹ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یورپ کے مغربی اور مشرقی محاذوں پر مسلمانوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا، سخت ضرورت تھی کہ ان کو پیچھے ہٹا دیا جائے (تاریخ یورپ، اردو ترجمہ ص ۵۳ - ۴۵۲)

دی کروسیڈ کے مصنف ٹی۔ اے۔ ارچر اور سی۔ ایل کنگسفورڈ نے تو بڑی صفائی سے لکھا ہے کہ اس صلیبی جنگ کی ضرورت اس لئے پڑی کہ عیسائیت کی فلاح کے لئے ترکوں کو یورپ کی طرف بڑھنے سے روکا جائے، گیارہویں صدی میں وہ بہت تیزی کے ساتھ یورپ کی طرف بڑھ رہے تھے، پہلی صلیبی جنگ کی وجہ سے ان کا سیلاب پیچھے کی طرف مڑ گیا، جو قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن اس کے بعد دو صدیوں تک اسلام کی ضرورت سے زیادہ سرگرمیاں بروئے کار آگئیں ..... اگر محمد ثانی نے قسطنطنیہ کی جو تسخیر کی وہ وہ تین صدی پہلے بجائے لی جاتی تو پھر ترک، بلقان اور ڈنیوب کے زیریں علاقے ہی تک محدود نہ رہتے بلکہ یورپ کی طرف بڑھ کر دنیا کی تاریخ ہی بدل دیتے (ص ۵۰ - ۴۴۹)

یورپ کے جاگیردار اس جنگ میں اس امید کے ساتھ شریک ہوئے کہ اگر مشرق کے کسی علاقہ میں ان کی ریاستیں قائم ہو گئیں تو ان کو آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کرنے کا موقع ملے گا، ان کی یہ امید کسی حد تک پوری ہوئی جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

یورپ کے تاجروں نے بھی اس جنگ کو زیادہ ہوا دی۔ خصوصاً اٹلی کے تاجر مشرق میں اپنی تجارتی منڈی قائم کرنے کی خاطر ایسے مشرقی سواحل چاہتے تھے، جہاں ان کے تجارتی بیڑے پہونچ کر مشرق کے [illegible] پر چھا جائیں، اس غرض سے ان تاجروں نے اپنے اپنے جہاز دے کر صلیبیوں کی فوجی نقل و حرکت میں بڑی مدد پہونچائی، آگے کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ یورپ کے تاجروں کو ان لڑائیوں سے بڑے فوائد پہونچے (نیز دیکھو کروسیڈ از ارچر اینڈ کنگسفورڈ، ص ۳۰۱ - ۲۹۵، باب ۲۸)

یورپ کے کلیساؤں کی طرف سے اس جنگ کے لئے زیادہ جوش اور ہیجان پیدا کیا گیا، مگر اس میں بھی مذہبی جذبات کم، کلیسائی مفادات زیادہ مضمر تھے، اس زمانہ میں کلیسا کے اثرات بہت کم

ہوتے جا رہے تھے، پوپ اربن دوم نے لوگوں کے مذہبی جذبات اس لئے ابھارے کہ اس کا مذہبی اقتدار قائم ہو، اربن دوم کا اختلاف نہ صرف یونان کے امپائر بلکہ اس زمانہ کے انگلستان، جرمنی اور فرانس کے حکمرانوں سے بہت بڑھ گیا تھا، اس نے اپنے کھوئے ہوئے اثرات کو بحال کرنے کے لیے صلیبی جنگ کے نام پر ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا، کلیسا کو مسلمانوں سے فطری دشمنی ہے، اس لئے ان کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی، اس کو ہوا پیٹر نے دی جس کے نام کا جزو ہرمٹ ہو گیا تھا، بہانہ یہ تراشا گیا کہ سلجوقی حکومت بیت المقدس میں مسیحی زائرین کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے، یورپ والوں کا طریقہ کار شروع سے یہ رہا ہے کہ جب کسی کو وہ مورد الزام ٹھہرانا چاہتے ہیں تو پہلے اس کے مظالم اور بدعنوانیوں کی طرح طرح کی داستانیں مشتہر کرتے ہیں، پھر حق و انصاف کے نام پر جارحانہ کارروائی شروع کر دیتے ہیں، یہی تاریخ بیت المقدس میں دہرائی گئی، پوپ اربن دوم نے فرانس میں ایک کانفرنس منعقد کر کے یہ اعلان کیا کہ جو شخص اس وقت صلیب نہ اٹھائے گا وہ میرا پیرو نہیں، اے۔ جی گرانٹ نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یہ دیوانہ پن تھا کہ پوپ جو کچھ کہتا اس پر تمام یورپ آمنا و صدقنا کہتا (تاریخ یورپ اردو ترجمہ ص ۲۵۱)

پوپ نے ایک مجنونانہ جوش پیدا کر دیا تو اس کے حکم کو خدا کی مرضی سمجھ کر سرخ کپڑے کی صلیبیں اپنے سینوں پر لگا کر ہر طرف کے عیسائی ایک مقدس جہاد کے لئے تیار ہو گئے، مگر اس میں شرکت کرنے والوں کی نوعیت یورپ ہی کے مورخوں کے بیانات سے ظاہر ہو گی۔

صلیبی فوج کی نوعیت | ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ صلیبی سپاہیوں نے صلیب کا سہارا ضرور لیا، لیکن ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اس جنگ کے ذریعہ سے اپنی خواہشوں کی جنت آباد کرنے کے خواہاں تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان امراء کی دولت حاصل کر کے وہ بہت متمول ہو جائیں گے، ان کو اچھی سے اچھی شراب اور حسین سے حسین عورتیں ملیں گی، اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو جاگیرداری

اور کلیسائی نظام سے آزردہ تھے، وہ کسان بھی تھے جو اپنے زمینی آقاؤں کے مظالم سے نجات چاہتے تھے، اور اپنی پسند کا ایک علاقہ چاہتے تھے، وہ راہب بھی تھے جو کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ مقروض لوگ بھی تھے جو اپنے قرض خواہوں سے نجات چاہتے تھے، وہ مجرم بھی تھے جو اپنے جرائم کی سزا سے نجات چاہتے تھے (ہسٹری آف ڈکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر، ج ۶، ص ۱۲-۱۱۴)

فرانسیسی مورخ لیبان کا بیان ہے کہ اس میں وہی لوگ شریک ہوئے جو مفلوک الحال اور ممنوع الارث تھے، یا جنھیں جنگ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی، یا وہ راہب تھے جو خانقاہی زندگی کی سختیوں سے عاجز آگئے تھے (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۹۵)

ایچ۔ جی۔ ویلس نے صلیبی لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ میں جوش شعلہ زن ضرور ہوا، لیکن اس میں ادنیٰ درجے کے جذبات بھی تھے، لاطینی گرجا کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ بازنطینی گرجا کو اپنے زیرنگیں کرلے، اٹلی میں کچھ لٹیرے ایسے بھی تھے جو اٹلی کو لوٹ کر برباد کر رہے تھے، وہ اپنی لوٹ کے لئے کچھ اور متمول علاقے چاہتے تھے، غیر رواداد سلجوقیوں اور فاطمیوں نے وینس اور جینوا کے تاجروں کے راستے روک رکھے تھے جو بغداد اور مصر ہو کر یورپ میں تجارت کرتے تھے، وہ اپنی تجارت کے لئے قسطنطنیہ اور بحر اسود کے ذریعے راستے چاہتے تھے، پھر شہ ... اور بوہیمیا کے علاقوں میں وبا پھوٹ پڑی تھی، وہاں بڑا معاشرتی اختلال تھا اس لئے مشرق کی طرف لوگ اسی طرح چل کھڑے ہوئے جس طرح آج کل سونے کی کان کی دریافت پر ہر قسم کے لوگ وہاں ٹوٹ پڑتے ہیں (دی آؤٹ لائن آف ہسٹری، ص ۶۴۱ - ۶۴۰)

فلپ کے ہٹی نے بھی اس جنگ کے شرکا کا ذکر کرکے یہ لکھا ہے کہ صلیبی جنگ میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان سب میں خالص مذہبی جذبات نہ تھے، ان کے کچھ سردار اپنے لئے علاقے چاہتے تھے، وینس اور جنیوا کے تاجروں کو اپنی تجارت سے دلچسپی تھی، رومان پسند، مضطرب اور مہم جو لوگوں کو مجتمع ہونے کا موقع مل گیا، مجرموں نے سوچا کہ اس کے ذریعہ سے ان کی بخشائش ہو جائے گی، فرانس، لورین، اٹلی اور

کے عوام اپنے اقتصادی اور معاشرتی حالات سے بددل تھے، صلیب کو اٹھانے میں ان کو راحت محسوس ہوئی ان میں قربانی اور ایثار کا جذبہ نہ تھا (ہسٹری آف دی عربس، ص ۶۳۶)

ان صلیبی لڑائیوں کی معرکہ آرائیوں کی تفصیلات اور جزئیات کا مطالعہ کرنے کے بجائے یہ دیکھنا ہے کہ ان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا کردار کیسا رہا، اور یورپ میں ان کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی اور تجارتی اثرات کیا پڑے؟

مسلمانوں کا سیاسی انتشار پہلے کہا جا چکا ہے کہ سلجوقیوں کے حدود سلطنت میں اضافہ ہو رہا تھا تو یہ عیسائیوں کو گوارا نہیں تھا، کیونکہ یونانی خلافت بغداد کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود ایشیا میں اپنے اقتدار کے خواہاں ہو گئے تھے، دسویں صدی کے آخر تک بازنطینی حکومت کی سرحد جنوب میں ایطالیہ اور مشرق میں آرمینیا تک پہونچ گئی تھی، سلجوقی حکمراں طغرل نے اس توسیع پسندی کو روکا اور جب اس کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان اس کا جانشین ہوا تو جارجیا، آرمینیا اور آذربائجان کو واپس لیا، جس کے بعد یونانی حکمراں رومانس (ارمانوس) نے دو لاکھ فوج کے ساتھ الپ ارسلان سے ایک خوں ریز جنگ کی، مگر شکست کھا گیا اور گرفتار ہوا، اس نے زر فدیہ ادا کر کے اور اپنی دو لڑکیوں کی شادی الپ ارسلان کے لڑکوں سے کر کے رہائی حاصل کی، مگر یونانیوں نے خود اس کو تخت سے معزول کر دیا، الپ ارسلان نے ایشیائے کوچک کی حکومت اپنے چچا زاد بھائی سلیمان کو دے دی جس نے نائس کو اپنا دار السلطنت بنا کر مغرب میں اپنی سرحد بحر قلزم تک بڑھا دی، اور بازنطینی حکمرانوں سے خراج بھی وصول کیا، الپ ارسلان کا جانشین ملک شاہ ہوا، جو نہ صرف سلجوقیوں بلکہ مسلمانوں کا نہایت جلیل القدر حکمراں ہوا، اس کے وزیر نظام الملک کی وجہ سے اس کی حکومت کا وقار اور بھی بڑھا، مگر اس کی حکومت میں اسماعیلیوں یعنی حسن بن صباح کے فدائیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑا غلغلہ رہا، نظام الملک کا قتل ان ہی کے ہاتھوں ہوا، یونانی حکمراں الیکزینس تو اپنی لڑکی کو ملک شاہ کی زوجیت میں دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا، مگر شادی سے پہلے اس کی وفات ہو گئی، ملک شاہ کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین

لقب سے اس کا جانشین ہوا، مگر اس کا بھائی محمد بھی تخت کا دعویدار ہوا، جس کے بعد خوں ریز خانہ جنگی ہوئی، حسن بن صباح کے فدائیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر شمالی ایران عراق اور شام پر قبضہ کر لیا، اور سربرآوردہ مسلمانوں کو اپنے خنجروں سے یا تو ہلاک کیا یا ان کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، جس سے سلجوقیوں کی حکومت اور بھی کمزور ہوگئی، خلافت بغداد بھی اس وقت زیادہ جاندار نہ تھی، خلیفہ مقتدی کی وفات کے بعد مستظہر باللہ تخت نشین ہوا، تو اس وقت اس کی عمر کل ۱۶ سولہ سال کی تھی۔

پہلی صلیبی جنگ | ان ہی حالات میں صلیبی مجاہد ایشیا پر ٹوٹ پڑے، مگر اس مقدس جنگ میں وہ کس طرح آگے بڑھے اس کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ ان مقدس مجاہدوں میں کون کون شریک تھے پہلا جتھا والٹر گو تیر مفلس کی رہنمائی میں بڑھا، مگر یہ فوج جس علاقہ سے گذری مفت رسد حاصل کرنے کی خاطر لوٹ مار کرتی گئی، یہاں تک کہ بلغاریہ کے خود عیسائیوں نے ان کا قتل عام کیا، پیٹر دی ہرمٹ اپنی نگرانی میں چالیس ہزار کا دوسرا جتھا لے کر روانہ ہوا، راستہ میں اس نے بلغاریہ کے قتل عام کا پورا بدلہ لیا، جس سے ہنگری اور بلغاریہ کے علاقے ویران ہو گئے، وہ ایشیائے کوچک پہونچے تو انھوں نے دودھ پیتے بچوں کو قتل کیا اور ان کے جسم کے ٹکڑے ہوا میں بکھیرے، اس طرح وہ نائیس تک پہونچ گئے، تیسرے جتھے کی رہنمائی ایک جرمن راہب نے کی جس کے ساتھ بقول گبن وحشیوں کی ایک بھیڑ تھی، وہ شراب پیتے زنا کرتے اور لوٹتے مارتے آگے بڑھے تو ہنگری اور بلغراد والوں نے ان کا اتنا قتل عام کیا کہ میدانوں میں ان کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتیں، چوتھا جتھا انگلستان، فرانس اور لورین سے روانہ ہوا، اس میں بھی ویسے ہی قماش کے وحشی لوگ تھے، راستے میں ان کو مسلمان نہیں ملے تو یہودیوں کو قتل کرنا شروع کیا، کولون میں ہزاروں یہودی تہ تیغ کیے گئے، اسی طرح دریائے رائین کے ساحل پر بھی ان یہودیوں کا قتل عام ہوا، اس جتھے کی بھی سرزنش ہنگری کی فوج نے اچھی طرح کی،

اس کے دوسرے سال یورپ کے جاگیرداروں کا جتھا گوڈفری کی نگرانی میں روانہ ہوا، قسطنطنیہ اور

ن٘ۂ یہ فوج انطاکیہ پہونچا تو اس کا سات مہینے تک محاصرہ کیا، کھانے پینے کی کمی ہوئی تو انسانوں کا گوشت کھانے لگے، اور جب انطاکیہ پر ان کا تسلط ہوا تو مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا، دو ہزار ترکوں کے سر کاٹ کر فوجی کیمپ کے گرد نمائش کے لئے لٹکا دیئے گئے، وہاں کی قبریں کھود کر لاشوں کو باہر نکالا جاتا اور ان کے اعزہ کو دکھا کر ان کو رونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا، سلجوقی خاندان کے نوجوان ان کے والدین کے سامنے مارے جاتے، انسانیت سوز حرکتیں جتنی ہو سکتی تھیں وہ سب عمل میں آگئیں، عورتوں کی عصمت ریزی اور شراب نوشی کے ذلت آمیز فواحش سب دیکھنے میں آئے، ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ بابل کی وحشیانہ اور غیر انسانی حرکتیں ان مقدس مجاہدوں اور بیت المقدس کے نجات دہندوں کے ذریعہ سے عمل میں آئیں، ان لاطینی وحشیوں کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کو کہیں پناہ نہیں ملی، مسجدیں بے رحمانہ طریقے پر مسمار کی گئیں، ہر گھر مذبح خانہ بنا ہوا تھا، گلی کوچے میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، دس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے (یہ واقعات ایڈورڈ گبن کی ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر ص ۴۲۱ – ۴۱۶، اور موسیو لیبان کی تمدن عرب ص ۲۹۶ – ۲۹۵ سے لئے گئے ہیں)

انطاکیہ سے یہ فوج شمالی شام کی طرف بڑھ کر معرۃ النعمان پہونچی، جہاں تین دن تک قتل عام کرتی رہی، ۔۔ لاکھ مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کئے گئے، پھر یہ مقدس فوج بیت المقدس کی طرف بڑھی، اس جنگ کے آغاز میں بیت المقدس سلجوقیوں کے قبضہ میں تھا، مگر انطاکیہ پر صلیبیوں کا اقتدار قائم ہوا تو بیت المقدس مصر کی فاطمی حکومت نے اپنے ماتحت کر لیا، مگر جب صلیبی فوج نے اس کا محاصرہ کیا تو یہ حکومت بھی اس کو بچا نہ سکی جولائی ۱۰۹۹ء میں اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہو گیا۔

عیسائیوں کے مظالم | بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں نے ایسے اندھے تعصب کا ثبوت دیا جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی، گبن لکھتا ہے کہ صلیب کے علمبرداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی، جب اس سے بھی ان کو تشفی نہیں ہوئی تو یہودیوں کو

ان کو عبادت گاہ میں جلا یا گیا (ص ۴۵۹) لیبان کا بیان ہے کہ یہ فوج بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب کو قتل کرتی رہی، چاروں طرف لاشیں دکھائی دیتیں، اس قدر خون بہا کہ لاشیں تیرتی پھرتی تھیں، بیت المقدس کے مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور غیر مقلد عیسائیوں کا بھی قتل عام آٹھ روز تک ہوتا رہا، تقریباً ساٹھ ستر ہزار آدمی مارے گئے، لیبان یہ بھی لکھتا ہے کہ ان صلیبیوں کا برتاؤ اس مقدس شہر کے باشندوں کے ساتھ اس سے مختلف رہا جو حضرت عمرؓ نے کئی صدی پیشتر عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۹۸-۹۹)

لیبان یہاں تک لکھ گیا ہے کہ صلیبیوں کی تمام فوج کشیوں میں ان کے افعال بالکل رذیل ترین اور احمق ترین وحشیوں کے سے تھے ان کا برتاؤ ستر کائے جنگ کے ساتھ، دشمنوں کے ساتھ، بے قصور رعایا کے ساتھ، سپاہیوں کے ساتھ یکساں تھا، یعنی وہ سب کو بلا امتیاز لوٹتے اور قتل کرتے تھے، .. (تمدن عرب ص ۲۹۰) تاریخ یورپ کا مصنف اے ۔ جی گرانٹ بیت المقدس پر صلیبیوں کی فتح پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا، اسی لئے پوپ کو یہ تحریر بھیجی گئی کہ خدا ہمارے عجز و انکسار سے رام ہو گیا، اور ہمارے عجز و الحاح کے آٹھویں روز اس نے شہر کو دشمنوں سمیت ہمارے حوالہ کر دیا ..... اور اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو دشمن وہاں موجود تھے، ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا، تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا (تاریخ یورپ اردو ترجمہ ص ۲۵۷) فلپ ہٹی نے بھی اس کی تصدیق یہ لکھ کر کی ہے کہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر بوڑھوں اور عورتوں کا قتل عام ہوا، لاشوں کے سر، ہاتھ اور پاؤں گلی کوچوں میں دکھائی دیتے (ص ۶۳۹) صلیبیوں کے ان مظالم کی تفصیلات مل، ہیلم اور مچاڈ (میشو) کی تاریخوں میں بھی ملے گی، ان کے اقتباسات امیر علی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی سرسینز میں بکثرت دئے ہیں (ص ۳۲۰-۳۲۲)

اسی میں چارلڈ ٹیشو کی تاریخ سے یہ اقتباس دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا قتل عام شہر کوں اور ان کے گھروں میں ہوا، بیت المقدس ان کے لئے پناہ کی جگہ نہیں رہی، کچھ تو فصیلوں پر سے کود کر موت سے بچے، کچھ محلوں، برجوں اور مسجدوں میں جاکر پناہ گزین ہوئے، مگر عیسائیوں نے ان کو وہاں بھی پناہ نہیں لینے دیا، عمر فاروقؓ کی مسجد صلیبیوں کے قبضہ میں تھی، یہاں مسلمانوں نے پناہ لے کر اس کی مدافعت کی، لیکن صلیبیوں نے یہاں بھی افسوسناک مظالم ڈھائے جس سے اس فتح کو ذلت حاصل ہوئی، پیادے اور سوار فراریوں کو ڈھونڈتے پھرتے، اس خوفناک منظر میں موت کی چیخ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا، فاتحین لاشوں کو روندتے ہوئے فراریوں کا پیچھا کرتے، ریمنڈ نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کا بیان ہے کہ مسجد کے چھجے کے نیچے گھٹنوں تک خون بہہ رہا تھا اور گھوڑوں کی لگام اس سے آلودہ ہو رہی تھی (ج ۱ ص ۲۳۶)

عیسائی ریاستوں کے مظالم اور ان کی سفاکی

اس صلیبی جنگ کا اصلی مقصد اس سے بھی ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں کی تین ریاستیں اس علاقہ میں قائم ہوگئیں، بولون کا شہزادہ بالڈون الرہا کا حکمراں ہوا، انطاکیہ، بوہمند کے قبضہ میں آیا، بیت المقدس پر گوڈفری کی حکومت قائم ہوئی، اس کے جانشین اس کی سرحدیں اضافہ کرتے رہے (فلپ ہٹی ص ۳۹ - ۶۳۷) موسیو لیبان نے ژاک دی ویتری کے بطریق کی تاریخ بیت المقدس کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان صلیبی بادشاہوں کے جانشینوں میں سے شریر، بدوضع اور متبذل نسل کا سلسلہ چلا اور اس ارض مقدس میں سوا بداطوار، لامذہب، چور، زانی، باپ کے قاتل، دروغ حلفی کرنے والے، مسخروں، عیاش راہبوں اور بے حیا پادریوں کے سوا کوئی نہ تھا (تمدن عرب ص ۳۰۱)

بیت المقدس پر تصرف حاصل کرنے کے بعد چند سال کے اندر صلیبیوں نے فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ، طرابلس الشرق اور صیدا پر قبضہ کرلیا (صلاح الدین از لین پول اردو ترجمہ، ص ۲۰) مسلمانوں میں صلیبیوں کی خونریزی اور غارتگری سے بے چینی ضرور پیدا ہوئی، لیکن وہ یورپ کی

طرح کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کرسکے، اس وقت خلافت بغداد بے جان ہو رہی تھی، سلجوقی خانہ جنگی میں مبتلا تھے، اس سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے اپنی خوں ریزی اور سفاکی جاری رکھی، لین پول لکھتا ہے کہ صلیبیوں نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کردی، انھوں نے اپنے سرداروں کو اشتعال دیا کہ وہ مسلمانوں پر بلاوجہ اور بلاسبب لوٹ مار کے حملے اور دھاوے شروع کردیں، بارہویں صدی کے پہلے ربع کے حالات میں ایک مسلمان مورخ لکھتا ہے کہ افرنجیوں کی تاخت وتاراج اور رہزنی روز بروز ترقی پکڑتی گئی، انھوں نے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہونچایا جس کا بیان کرنا دشوار ہے، ان پر تباہی اور غارت گری انتہائی درجہ تک پہونچادی، ان کی لوٹ مار کے یہ حملے دیار بکر میں آمد کے شہر تک پہونچے، انھوں نے قتل وغارت میں شیعہ یا سنی کسی کا لحاظ نہیں کیا، سب کو تہ تیغ کیا، عراق پہونچے تو مسلمانوں کے پاس جس قدر چاندی یا قیمتی چیزیں تھیں، سب لوٹ لیں، حران اور رقہ پہونچ کر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ سخت بے حرمتی اور بے شرمی کے ظلم کئے، روزانہ انھیں موت کا جام پلاتے رہے، دمشق کو جس قدر راستے جاتے تھے، بند کردئے، اور صرف وہ راستہ کھلا رکھا جو رحبہ اور صحرا میں سے جاتا تھا، افرنجی جہاں رہتے تھے، وہاں کے آس پاس کے شہروں سے ناجائز رقمیں محصول کہہ کر وصول کرتے تھے (صلاح الدین از لین پول اردو ترجمہ ص ۲۹ - ۲۸)

مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب

صلیبیوں کو مسلمانوں پر فتح اس لئے حاصل ہوئی کہ مسلمانوں میں یکجہتی نہیں تھی، سلجوقی فرماں روا ملک شاہ کی وفات ہوئی تو پھر اس خاندان کو نظام الملک جیسا کوئی وزیر نہیں ملا جو ملک شاہ کے فرزندوں کے باہمی نزاع دور کرکے ان میں مصالحت کرادیتا، سلجوقی شہزادے اپنے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے تاج وتخت کو تلف کر رہے تھے، یہاں تک کہ جو بڑے بڑے سردار سلجوقی بادشاہوں کے ماتحت کام کرچکے تھے، خود مختار بننے کی فکر میں تھے، بقول لین پول ہر شخص ٹوٹے ہوئے تاج کے ٹکڑوں کے لئے دست وگریباں تھا، ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے رشک رکھتا تھا، کوئی

صاحبِ ہمت ان میں ایسا نہ تھا جو سب کا سردار اور ہادی بن کر دشمن سے لڑنے کو تیار ہو جاتا ...... یہ وقت تھا جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں، اگر اہلِ یورپ کا یہ حملہ ایک پشت پہلے ہوتا تو سلجوقی ایسے نہ تھے کہ کوئی گھونسہ دکھاتا اور وہ چپ بیٹھے رہتے، یورپ کی یہی فوج کشی اگر ایک پشت بعد پیش آتی تو عماد الدین اور نور الدین زنگی سلجوقیوں کے مقاماتِ حکومت پر ایسے مستولی ہو چکے تھے کہ وہ یورپ کے ان حملہ آوروں کو دھکے دے کر سمندر میں غرق کر دیتے (صلاح الدین ص ۲۱ اردو ترجمہ)

عماد الدین زنگی کے کارنامے

مسلمان صلیبیوں سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے رہے، مگر صلیبی اُن پر غالب رہے مگر ان کا حوصلہ صلیبیوں کے خلاف موصل کے اتابکی خاندان کے فرماں رواؤں عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی کے زمانہ میں بڑھا، بارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی سلطنت کا بڑا حصہ متفرق چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، تو ان ہی میں زنگی موصل کا فرماں روا ہو گیا، وہ ملک شاہ کے غلاموں میں سے ایک غلام کی اولاد میں سے تھا، شہزادوں کا اتالیق تھا، اس لئے اتابک (بمعنی اتالیق) اس کو خطاب ملا، اسی خاندان سے عماد الدین زنگی تھا، اس میں غیر معمولی قسم کی سیاسی ہوشمندی تھی، اس نے محسوس کیا کہ صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ متحد نہیں ہیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہیں جن سے بڑا نقصان پہونچ رہا ہے، وہ اپنی ریاست کو بچانے کی خاطر مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں سے مل بھی جاتے تھے، اس لئے وہ بوازیج، نصیبین، خابور اور حران جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے شام کی طرف بڑھا اور وہاں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں مثلاً بنج، حصن، بزاعہ، حلب، حماۃ اور حمص وغیرہ تھیں، ان کو بھی ختم کیا، پھر فوج لے کر عیسائیوں کے قلعہ اثارب پر زبردست حملہ کیا اور اس پر فتح پائی اور یہاں کے مسلمانوں کو ان کے مظالم سے نجات دلائی، مگر مسلمانوں کی بدقسمتی ساتھ دیتی رہی، موصل میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو عماد الدین دس سال تک اسی میں الجھا رہا، ۵۳۱ھ میں وہ پھر شام کی طرف متوجہ ہوا، لیکن حمص کا مسلمان فرمانروا عیسائیوں سے مل گیا تو

عمادالدین زنگی نے دوسری طرف رخ کر کے قلعہ بعرین پر حملہ آور ہوا، تمام فرنگی فرماں رواؤں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا، مگر ان کو شکست فاش ہوئی، لیکن پول لکھتا ہے کہ عمادالدین نے بعرین پر قبضہ کر کے اس کے فرماں روا کے ساتھ بڑا شریفانہ برتاؤ کیا اور اسے شاہی خلعت عطا کیا اور قلعہ میں جو افرنجی فوج تھی وہ نہایت خستہ اور پست ہمت ہو چکی تھی، اس کو بھی جنگی اعزاز والتزام کے ساتھ قلعہ سے باہر جانے دیا (صلاح الدین ص ۴۷) مگر قسطنطنیہ کے فرماں روا نے بعرین کے قلعہ کو واپس لینے کے لئے اس کے خلاف فوج کشی کی، دمشق کے مسلمان فرماں روا نے بھی اس کا ساتھ دیا، مگر جب عمادالدین زنگی کا مقابلہ ہوا تو شکست کھا گیا، ۱۱۳۰ء میں عمادالدین زنگی نے دمشق کا محاصرہ کیا، مگر اس کو چھوڑ کر بعلبک پر قابض ہوگیا جو والی دمشق مجیرالدین آبق کے کارپرداز سلطنت معین الدین آنر کی جاگیر میں تھا، وہ عمادالدین سے اتنا برہم ہوا کہ عیسائیوں سے مل گیا اور یروشلم کی حکومت کا باج گذار بن گیا تاکہ وہ شام کو عمادالدین سے آزاد کرائے، مگر عمادالدین زنگی کے حوصلے بلند رہے، اس نے بڑھ کر ۱۱۴۴ء میں عیسائیوں کے قلعہ الرہا پر قبضہ کر لیا جہاں مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے تھے، اس انتقامی جذبہ میں عمادالدین کی فوجوں نے عیسائیوں کا قتل عام کرنا شروع کیا، مگر جب عمادالدین خود شہر میں داخل ہوا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر متاثر ہوا، اس نے اپنی سپاہ کو غارتگری سے روکا اور حکم دیا کہ جن لوگوں کو انھوں نے گرفتار کیا ہے، انھیں رہا کر دیں، لڑکے لڑکیاں یا جس قدر زر و مال انھوں نے لوٹا ہے، ان سب پر سے اپنا قبضہ اٹھا لیں، باشندگان شہر میں جو زندہ بچے تھے انھیں آزاد کر کے ان کے گھروں میں ان کو آباد کیا، تاکہ شہر کی رونق اور خوشحالی میں کمی نہ ہو، شروع میں جو غارت گری ہوئی تھی اس کی تلافی میں محبت اور توجہ کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (صلاح الدین، ص ۵۴)

الرہا کی تسخیر فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا جو جاتا رہا، اس سے عیسائیوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، یورپ کی قومیں پھر متحد ہوئیں، اس کے بعد دوسری جنگ صلیبی کا سلسلہ شروع ہوا

مگر اس سے پہلے عماد الدین زنگی کو اس کے غلاموں نے ذاتی عناد کی وجہ سے قتل کر دیا، لین پول لکھتا ہے کہ عماد الدین بے شک مر چکا تھا لیکن وہ اپنی زندگی میں ایسے کام کر گیا تھا، جسے تمام نصرانی دنیا بھی مل کر نہ مٹا سکتی تھی (صلاح الدین ص ۴۸)

دوسری جنگ صلیبی اور نور الدین زنگی

عماد الدین زنگی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا نور الدین اپنی موت تک برابر صلیبیوں سے معرکہ آرائی کرتا رہا، الرہا پر عیسائیوں نے پھر قبضہ کر لیا تھا، مگر نور الدین نے ان سے لڑ کر پھر اس کو واپس لیا، اور ان کے فوجی رہنما کونٹی کے جوسلن کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا، اس کے بعد الرہا کے علاقے اور شمالی سرحدوں سے عیسائیوں کی قوت کا استیصال ہو گیا (صلاح الدین ص ۵۸)

مگر فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم اور جرمنی کے فرماں روا کانراڈ نے مل کر کئی لاکھ فوجیں پھر شام بھیجیں، اس مرتبہ معین الدین آنر نے صلیبیوں کا ساتھ نہیں دیا، پھر تو بقول لین پول یورپ کے بہادر سورما اپنے اپنے وطن واپس گئے (صلاح الدین ص ۵۰)

لیان ایک قسیس انیکی تل کی تاریخ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس دوسری جنگ صلیبی میں بہت کم صلیبی ایسے تھے جن کے خیالات خالص مذہبی ہوں، کسی قسم کا گناہ، ظلم، لوٹ اور افعال قبیحہ ایسے نہیں ہیں جو ان کی طرف منسوب نہ کئے جاتے ہوں، سینٹ برنارڈ اس جنگ کی ناکامیابی کو ان ہی کے مظالم اور بے اعتدالیوں کی طرف منسوب کرتا ہے (تمدن عرب ص ۳۰۲) نور الدین کا سر اونچا ہوا تو شام کے عیسائی جوسلن کا انتقام لینے کی خاطر نور الدین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، لوک کی جنگ میں ان کو شکست فاش ہوئی، اس کے بعد دمشق پر بھی نور الدین کا قبضہ ہو گیا، وہاں کے عیسائیوں کو اختیار دیا گیا کہ ان میں سے جس کا دل جہاں چاہئے جا سکتا ہے، شام میں نور الدین کی قوت بہت بڑھ گئی تو اس نے صلیبیوں کے خلاف انطاکیہ پر بھی یورش کی، جنھوں نے حارم کا نصف حصہ دے کر صلح کر لی۔

اس کے بعد صلیبیوں کی مدد کے لئے یورپ کی تازہ دم فوجیں پہونچیں، تو حمص وحماۃ وغیرہ کو تاراج کیا،

بانیاس کے فرماں روا ہمفری کی سرکردگی میں نورالدین سے ایک سخت جنگ کی، مگر ہمفری کو شکست ہوئی جس سے صلیبیوں کو بڑا صدمہ پہونچا، انطاکیہ، طرابلس اور لوسگنان کے عیسائی فرماں روا گرفتار ہوگئے اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں (صلاح الدین ص ۷۲)

اس اثناء میں بیت المقدس کے فرنگی فرماں روا کی فوجوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کو ناکامی ہوئی تو انھوں نے مصریوں سے ساز باز کرکے مصر کے حکمران اسدالدین کے خلاف فوج کشی کی مگر نورالدین اسدالدین کی مدد کو پہونچ گیا اور اس نے اسدالدین سے مل کر صلیبیوں کو شکست دی جس سے نہ صرف نورالدین کی فوج کا حوصلہ بڑھا، بلکہ اسدالدین کا اقتدار اسکندریہ تک بڑھ گیا، مگر جب مصری حکومت بے جان ہوئی تو اس نے صلیبیوں سے صلح کرلی جس کے بعد صلیبیوں نے مصر پر پورا قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اس پر قبضہ نہ کرسکے بلکہ مصری حکومت نورالدین کے ماتحت ہوگئی، نورالدین کے ممتاز فوجی سردار نجم الدین ایوب کا بیٹا صلاح الدین منصب وزارت پر مامور ہوا، پھر تو وہاں کا رنگ ہی بدل گیا۔

صلاح الدین کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور نورالدین کے روزافزوں اثرات سے فرنگیوں میں بڑی تشویش پیدا ہوئی، شام کے قسیسوں اور راہبوں نے اعلان کیا کہ بیت المقدس خطرہ میں ہے، شام کے صلیبیوں نے مصر کو اپنے اثر میں لینے کے خیال سے ۱۱۶۹ء میں دمیاط کا محاصرہ کرلیا، مگر صلاح الدین اور نورالدین کی ہوشمندی سے وہ ناکام واپس ہوئے، اس کے بعد مصری حکومت ختم ہوگئی تو اس پر صلاح الدین کا قبضہ ہوگیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ المیہ بھی رہا ہے کہ جب طاقتور حکمراں ایک زمانہ میں ہوتے ہیں تو مل کر اغیار سے لڑنے کے بجائے خود متصادم ہوجاتے ہیں، نورالدین اور صلاح الدین میں اختلاف پیدا ہونے ہی والا تھا کہ نورالدین کی وفات ہوگئی۔

نورالدین کی وفات کے بعد اتابکی خاندان کے دو ٹکڑے ہو گئے، موصل پر اس کے بھتیجے سیف الدین غازی نے قبضہ کر لیا، بیت المقدس ابھی تک صلیبیوں کے قبضہ میں تھا، شام میں ان کی کئی حکومتیں قائم تھیں، پورا یورپ ان کی مدد کر رہا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ مسلمان بھی متحد ہوتے مگر موصل کا فرماں روا صلاح الدین کے خلاف صلیبیوں سے مل گیا اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ نورالدین کا کمسن لڑکا الصالح اسمٰعیل اپنے امراء کے ہاتھوں میں کھلونا تھا، جو اپنی خود غرضی میں صلاح الدین کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے، اس لئے وہ اس سے دور دور رہے۔

صلاح الدین ایوبی صلیبیوں کا مقابلہ اب صرف صلاح الدین ایوبی ہی کر سکتا تھا، مگر اسلام کے اس سرفروش غازی اور مجاہد نہیں بلکہ اس کی ملت کی شومیٔ قسمت یہ تھی کہ خود اس کی ملت کے لوگ اس کے ساتھ یکجہتی پیدا کرنے کے بجائے اس کے مخالف رہے، موصل کا والی سیف الدین غازی اور دمشق کے امراء نے صلیبیوں سے مل کر اس کے خلاف سازش کی، لیکن اس کی ہوشمندی اور بیدار مغزی کام آئی، اس نے بڑھ کر دمشق، حمص، حماۃ، بعلبک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور سیف الدین کو شکست دے کر بزاعہ اور منبج وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا، صلاح الدین کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوفزدہ ہو کر سسلی کے عیسائیوں نے دو سو جنگی بیڑے شام کی طرف روانہ کیے، مگر جب اسکندریہ پہونچے تو صلاح الدین ایوبی کی مدد سے ہاں کے باشندوں نے ان سے لڑ کر ان کو واپس جانے پر مجبور کیا، صلاح الدین کو اس موقع پر ہر قسم کی مدد ملنی چاہیے تھی، مگر خود مصر میں اس کے خلاف سازش جاری تھی اور باطنیوں نے تو اس پر قاتلانہ حملے کیے، سیف الدین کے جانشین عزالدین اور اس کے چچا زاد بھائی عماد الدین نے اپنی مخالفت جاری رکھی، شام کے چھوٹے چھوٹے مسلم حکمراں بھی اس کے مخالف رہے، مگر صلاح الدین نے ان کا مقابلہ کامیابی سے کیا، اور سنجار اور حلب جیسے علاقے پر قابض ہو گیا۔

شام کے عیسائی فرماں روا ریجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر فوج کشی کر کے مدینہ طیبہ پر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک اور مکہ معظمہ میں خانہ کعبہ کو منہدم کرنا چاہا، مگر اس کو ناکامی ہوئی

(صلاح الدین ص ۱۵۲)

صلاح الدین نے اپنوں اور بیگانوں سے معرکہ آرائی کرتے ہوئے مسلمانوں میں سپہگری، پامردی، سر فروشی اور دینی حمیت کی ایسی روح پھونک دی کہ جب وہ مختلف جنگی کارروائیوں کے بعد ۱۱۸۷ء میں حطین میں صلیبیوں کے خلاف صف آرا ہوا تو اس نے اس جنگ میں فتح حاصل کر کے مسلمانوں کو ساری دنیا میں سرخرو کیا، صلیبیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے تمام بڑے بڑے امراء اور حکمراں گرفتار کر لیے گئے، اس جنگ کے بعد کچھ اور معرکے ہوتے رہے، اس طرح نوے سال کے بعد ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس صلیبیوں سے واپس لے لیا۔

صلاح الدین ایوبی کی رواداری

صلاح الدین جس فراخدلانہ اور روادارانہ انداز میں بیت المقدس کے اندر داخل ہوا، اس کی تعریف تمام یورپین مورخوں نے کی ہے، گبن لکھتا ہے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ترک فاتح کی رحم دلی کی تعریف کی جائے، اس نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیا، وہ ان سے بھاری رقمیں وصول کرسکتا تھا، لیکن تیس ہزار کی رقم لے کر اس نے سترہ ہزار قیدیوں کو آزاد کیا، دو تین ہزار کو تو اس نے رحم کھا کر یونہی چھوڑ دیا، اس طرح قیدیوں کی تعداد گھٹ کر گیارہ سے چودہ ہزار تک رہ گئی، جب یروشلم کی ملکہ اس کے سامنے آئی تو اس نے اس سے نہ صرف انتہائی مہربانی سے باتیں کیں بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کی، جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کیلئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں، وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا، مگر اس نے جس فیاضانہ رحمدلی کا ثبوت دیا، اس سے وہ نہ صرف تعریف و تحسین بلکہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے۔

(ج ۶، ص ۵۰۰ - ۴۹۹)

لین پول لکھتا ہے کہ صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر ثابت کیا جب کہ یروشلم مسلمانوں کے حوالے کیا جارہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز ذمہ دار افسروں نے شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم کررکھا تھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی زیادتی کو روکتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی عیسائی کو کوئی گزند نہیں پہونچا، شہر سے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا کہ زرفدیہ دینے والے شہر سے باہر کسی روک ٹوک کے بغیر چلے جائیں۔

لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض وقت ایسے غربا بھی آتے جو زر فدیہ ادا نہ کرسکتے تھے، مسلمان سپاہی اور تاجر جو بکثرت شہر میں آگئے تھے وہ عیسائیوں کا مال اور اسباب خریدتے تھے تاکہ عیسائیوں کے پاس اتنا سرمایہ ہوجائے کہ وہ اپنی آزادی خرید سکیں، مسلمان فوجی سردار بھی اسی طرح کے نیک کام کرتے رہے، اسی کے ساتھ لین پول نے عیسائی مذہبی طبقے کا حال اس طرح لکھا ہے کہ تقدس مآب بطریق یروشلم اخلاق اور ایمان دونوں سے عاری تھا، اس نے گرجاؤں کی دولت سمیٹی، سونے کے پیالے اور آب مطہر رکھنے کا سامان حتی کہ مہد مسیح پر جو طلائی ظروف رہتے تھے اپنے قبضہ میں کیے، اس کے ساتھ اپنا ذاتی اندوختہ بھی بہت تھا سب کو محفوظ کیا، یہ جمع کی ہوئی دولت اتنی تھی کہ اگر چاہتا تو بہت سے غریب عیسائیوں کا زرفدیہ دے کر آزاد کرادیتا۔ جب مسلمان امرا نے سلطان سے کہا کہ اس بے ایمان اور نالایق پادری کو لوٹ کا اتنا مال لے جانے سے روکا جائے تو سلطان صلاح الدین نے جواب دیا کہ جو قول دے چکا ہوں اس سے پھر نہیں سکتا، لین پول نے یہ بھی لکھا ہے کہ صلاح الدین کے بھائی العادل نے ایک ہزار غلام صلاح الدین سے مانگ کر آزاد کیے، پھر صلاح الدین نے خود شہر میں یہ منادی کرائی کہ تمام بوڑھے جن کے پاس زرفدیہ ادا کرنے کو نہیں آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ جن عیسائی عورتوں کے شوہر مر چکے تھے انھیں صلاح الدین نے بلاکر خزانہ

رما روپے دیے، جیسا کچھ ان کا مرتبہ اور درجہ تھا اس کے مطابق کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیا، اور وہ جہاں جہاں گئیں اس عزت اور فیاضی کا چرچا کیا۔

اس کے بعد لین پول لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین کے ان احسانات پر ہم غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں، جب گوڈ فرے اور ٹنکرڈ یروشلم کے کوچہ و بازار سے گذرے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بلب زخمی لوٹتے تھے، ان بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، ان کو زندہ جلایا تھا، جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا اور جہاں ان کے اسی قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا تھا، اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگا تھا، جہاں رحم اور محبت کا وعظ جناب مسیح نے سنایا تھا، اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے وہ لوگ ہیں جو رحم کرتے ہیں (ص ۲۰۵ - ۲۰۲) لین پول نے یہ بھی لکھا ہے کہ سالزبری کے اسقف ہیوبرٹ والٹر نے صلاح الدین سے درخواست کی کہ تربت مسیح، بیت اللحم اور ناصرہ کی دینی خدمت میں شامی عیسائیوں کے ساتھ دو دو رومن کیتھولک پادریوں کو بھی شرکت کی اجازت دی جائے، تو اس نے منظور کیا اور تینوں مقامات پر رومن کیتھولک پادری مقرر کیے گئے (ص ۳۱۴) لین پول نے ایک واقعہ یہ بھی لکھا ہے کہ جب صلاح الدین کرک کے محاصرہ میں تھا تو یروشلم کے فرماں روا کی سوتیلی بہن ازابیلا کی شادی کی تقریب میں وہاں جشن منایا جا رہا تھا، صلاح الدین نے اپنے اس دشمن کے پاس شادی کا کھانا بھیجا اور فوج کو حکم دیا کہ جس برج میں دولہا دلھن ہیں، ان پر تیر نہ پھینکے جائیں (ص ۲۰۵ - ۲۰۴)

تیسری صلیبی جنگ | صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تو یورپ میں غیظ و غضب کی لہر پھر اٹھی، جرمنی کا قیصر فریڈرک، انگلستان کا رچرڈ شیر دل فرانس کا فلپ دوم صقلیہ آسٹریا اور برگنڈی وغیرہ کے آہن پوش فوجی سردار شام کی طرف امنڈ پڑے، اور یہ تیسری صلیبی جنگ پانچ برس تک

صلاح الدین کے خلاف ہوتی رہی، مگر صلاح الدین ہی ان پر بھاری رہا جب صلح ہوئی تو بیت المقدس اور دوسرے شہر تو مسلمانوں کے قبضہ میں رہے، صرف ساحل عکہ پر ایک مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی۔ اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اے۔ جے گرانٹ نے لکھا ہے کہ تیسری جنگ میں شہنشاہ فریڈرک اور بربا شیر دل انگلستان اور فلپ دوم شاہ فرانس پوپ کے دباؤ سے اس جنگ میں ضرور شریک ہوئے، مگر ان میں نہ تو مذہب کا اثر تھا اور نہ مقاصد میں یکجہتی تھی، اسی لئے اس جنگ میں ان کو ناکامی ہوئی، شہنشاہ فریڈرک تو ایشیائے کوچک کی ایک ندی میں ڈوب گیا، شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اثنائے راہ میں لڑتے رہے اور جب وہ شام پہونچے تو وہاں بھی ان کی یہی حالت رہی، وہاں ان کو چند فتوحات ضرور حاصل ہوئیں، مگر فلپ فرانس واپس جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کو صلاح الدین کی طرف سے اتنا خطرہ نہ تھا جتنا کہ رچرڈ کی روز افزوں قوت سے تھا، رچرڈ کچھ دن اور رہا اور اپنی شجاعت اور کمال سپہ گری کا جوہر دکھایا، مگر انسانیت میں وہ صلاح الدین کے معیار سے بہت گرا ہوا تھا، عکہ میں اس نے اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا، برخلاف اس کے صلاح الدین نے یروشلم میں اسیران جنگ کو آزاد کر دیا۔
اتنا کچھ لکھنے کے بعد گرانٹ لکھتا ہے کہ رچرڈ کے حالاتِ زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیت کی تحریک محض لغو تھی، صلیبیوں پر مذہب کا اثر کم تھا، ان کے مذموم افعال سے کلیسا کی نیک نامی پر بھی حرف آتا تھا۔ (تاریخ یورپ ص ۶۰ - ۳۵۹)

گرانٹ رچرڈ شیر دل سے شاید اس لئے منحرف ہے کہ وہ صلاح الدین کے بھائی عادل سے اپنی بہن کی شادی کے لئے تیار ہو گیا تھا، گو یہ رشتہ قائم نہ ہو سکا (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر از ایڈورڈ گبن ج ۶، ص ۵۰۸)

آرچر اور کنگسفورڈ نے بھی لکھا ہے کہ تیسری جنگ صلیبی میں صلیبیوں کو شکست محض ان کی باہمی نااتفاقی کی وجہ سے ہوئی، فرانسیسی برابر اس فکر میں رہے کہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کا

ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، رچرڈ برابر سوچتا تھا کہ فلپ اگر فرانس واپس چلا جائے تو زیادہ اچھا ہے، اس جنگ کے بعد مغرب سے اتنی بڑی فوج اور اتنے بڑے بہادر فوجی سردار پھر کبھی نہیں آئے، لیکن باہمی اختلاف ورقابت اور ذاتی مفاد کی وجہ سے تیسری جنگ میں تباہی آئی، اور یہی چیزیں یروشلم کی لاطینی حکومت کے ساتھ برابر لگی رہیں (کریسیڈ ص ۳۴۸)

چوتھی صلیبی جنگ گرانٹ لکھتا ہے کہ دوسری اور تیسری صلیبی لڑائیوں سے کوئی اہم نتائج مترتب نہیں ہوئے، مگر چوتھی جنگ کو یورپ کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے، یہ اہمیت مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی، بلکہ اس جنگ سے یورپ کی صورت حال بدل گئی، پوپ انوسینٹ سوم نے یورپ کو پھر صلیبی جنگ کے لئے ابھارا تو اس میں زیادہ تر فرانس کے امراء شریک ہوئے، اور جب وہ یہ مقدس فوج لے کر ونیس پہونچے تاکہ وہاں کے جہازوں پر سوار ہو کر شام کے ساحل پر اتریں، تو ونیس کے تاجروں کو اس مقدس جنگ سے زیادہ اپنی تجارت کی فکر ہوئی، انھوں نے ان صلیبی لڑائیوں میں مشرق کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا تھا، اور قسطنطنیہ تک ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی، مگر اس تجارت میں ان کا رقیب زارا کا شہر تھا جو اڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع تھا، ونیس کے تاجروں نے صلیبیوں کو جہاز اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ زارا کو فتح کر کے ونیس کے ماتحت کر دیں، صلیبی اس کے لئے تیار ہو گئے، زارا فتح کر لیا گیا، گو پوپ کو دکھ ہوا کہ صلیبی خود ایک مسیحی شہر پر حملہ آور ہوئے، مگر صلیبیوں نے پوپ کی مرضی کے خلاف یہ اقدام کر ہی لیا، اور جب وہ شام کی طرف بڑھے تو قسطنطنیہ کے شہنشاہ کا بھتیجا الیگزلس اپنے چچا کے خلاف صلیبیوں سے فوجی امداد کا طلبگار ہوا، اس نے ونیس کے تاجروں کو ہر قسم کی مراعات دینے، صلیبیوں کو خاطر خواہ معاوضہ عطا کرنے اور مشرقی اور مغربی کلیساؤں کو متحد کر دینے کا سبز باغ دکھایا، گرانٹ لکھتا ہے کہ صلیبیوں کو مذہب کا پاس کب تھا، وہ سپاہی جنھوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا حلف اٹھایا تھا اور صلیب کا نشان لگائے ہوئے پھر ایک دوسرے مسیحی شہر پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہو گئے، اور اس شہر کو اس طرح لوٹا کہ جب سے دنیا

صلاح الدین کے خلاف ہوتی رہی، مگر صلاح الدین ہی ان پر بھاری رہا جب صلح ہوئی تو بیت المقدس اور دوسرے شہر تو مسلمانوں کے قبضہ میں رہے، صرف ساحل عکہ پر ایک مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی۔

اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اے۔ جے گرانٹ نے لکھا ہے کہ تیسری جنگ میں شہنشاہ فریڈرک باربروسا شیر دل انگلستان اور فلپ دوم شاہ فرانس پوپ کے دباؤ سے اس جنگ میں ضرور شریک ہوئے، مگر ان میں نہ تو مذہب کا اثر تھا اور نہ مقاصد میں یکجہتی تھی، اسی لئے اس جنگ میں ان کو ناکامی ہوئی، شہنشاہ فریڈرک تو ایشیائے کوچک کی ایک ندی میں ڈوب گیا، شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اثنائے راہ میں لڑتے رہے اور جب وہ شام پہونچے تو وہاں بھی ان کی یہی حالت رہی، وہاں ان کو چند فتوحات ضرور حاصل ہوئیں، مگر فلپ فرانس واپس جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کو صلاح الدین کی طرف سے اتنا خطرہ نہ تھا جتنا کہ رچرڈ کی روز افزوں قوت سے تھا، رچرڈ کچھ دن اور رہا اور اپنی شجاعت اور کمال سپہ گری کا جوہر دکھایا، مگر انسانیت میں وہ صلاح الدین کے معیار سے بہت گرا ہوا تھا، عکہ میں اس نے اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا، برخلاف اس کے صلاح الدین نے یروشلم میں اسیران جنگ کو آزاد کر دیا۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد گرانٹ لکھتا ہے کہ رچرڈ کے حالاتِ زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیت کی تحریک محض لغو تھی، صلیبیوں پر مذہب کا اثر کم تھا، ان کے مذموم افعال سے کلیسا کی نیک نامی پر بھی حرف آتا تھا۔ (تاریخ یورپ ص ۶۰ - ۳۵۹)

گرانٹ رچرڈ شیر دل سے شاید اس لئے خفا ہے کہ وہ صلاح الدین کے بھائی عادل سے اپنی بہن کی شادی کے لئے تیار ہو گیا تھا، گو یہ رشتہ قائم نہ ہو سکا (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر از ایڈورڈ گبن ج ۶، ص ۵۰۸)

آرچر اور کنگسفورڈ نے بھی لکھا ہے کہ تیسری جنگ صلیبی میں صلیبیوں کو شکست محض ان کی باہمی نااتفاقی کی وجہ سے ہوئی، فرانسیسی برابر اس فکر میں رہے کہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کو

ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، رچرڈ برابر سوچتا تھا کہ فلپ اگر فرانس واپس چلا جائے تو زیادہ اچھا ہے، اس جنگ کے بعد مغرب سے اتنی بڑی فوج اور اتنے بڑے بہادر فوجی سردار پھر کبھی نہیں آئے لیکن باہمی اختلاف و رقابت اور ذاتی مفاد کی وجہ سے تیسری جنگ میں تباہی آئی، اور یہی چیزیں یروشلم کی لاطینی حکومت کے ساتھ برابر لگی رہیں (کرسیڈ ص ۳۴۸)

چوتھی صلیبی جنگ گرانٹ لکھتا ہے کہ دوسری اور تیسری صلیبی لڑائیوں سے کوئی اہم نتائج مترتب نہیں ہوئے، مگر چوتھی جنگ کو یورپ کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے، یہ اہمیت مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی، بلکہ اس جنگ سے یورپ کی صورت حال بدل گئی، پوپ انوسینٹ سوم نے یورپ کو پھر صلیبی جنگ کے لئے ابھارا تو اس میں زیادہ تر فرانس کے امراء شریک ہوئے، اور جب وہ یہ مقدس فوج لے کر وینس پہونچے تاکہ وہاں کے جہازوں پر سوار ہو کر شام کے ساحل پر اتریں، تو وینس کے تاجروں کو اس مقدس جنگ سے زیادہ اپنی تجارت کی فکر ہوئی، انھوں نے ان صلیبی لڑائیوں میں مشرق کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا تھا، اور قسطنطنیہ تک ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی، مگر اس تجارت میں ان کا رقیب زارا کا شہر تھا جو ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع تھا، وینس کے تاجروں نے صلیبیوں کو جہاز اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ زارا کو فتح کر کے وینس کے ماتحت کر دیں، صلیبی اس کے لئے تیار ہو گئے، زارا فتح کر لیا گیا، گو پوپ کو دکھ ہوا کہ صلیبی خود ایک مسیحی شہر پر حملہ آور ہوئے، مگر صلیبیوں نے پوپ کی مرضی کے خلاف یہ اقدام کر ہی لیا، اور جب وہ شام کی طرف بڑھے تو قسطنطنیہ کے شہنشاہ کا بھتیجا الیگزلس اپنے چچا کے خلاف صلیبیوں سے فوجی امداد کا طلبگار ہوا، اس نے وینس کے تاجروں کو ہر قسم کی مراعات دینے، صلیبیوں کو خاطر خواہ معاوضہ عطا کرنے اور مشرقی اور مغربی کلیساؤں کو متحد کر دینے کا سبز باغ دکھایا، گرانٹ لکھتا ہے کہ صلیبیوں کو مذہب کا پاس کب تھا، وہ سپاہی جنھوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا حلف اٹھایا تھا اور صلیب کا نشان لگائے ہوئے پھر ایک دوسرے مسیحی شہر پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہو گئے، اور اس شہر کو اس طرح لوٹا کہ جب سے دنیا

وجود میں آئی ہے کوئی شہر اس بری طرح سے نہیں لٹا گیا صلیبیوں کی جماعت ہی میں سے فلانڈرس کا ڈیوک بالڈون یہاں کا شہنشاہ بنایا گیا، وینس کے تاجروں نے ہر قسم کی رعایتیں حاصل کیں گرانٹ لکھتا ہے کہ یہاں کی شہنشاہی اس طرح کمزور ہو گئی کہ ۱۴۵۳ء میں یہ ترکوں کے قبضہ میں ہو گیا (تاریخ یورپ ص ۶۲-۳۶۱)

صلیبیوں کی تھوڑی سی فوج فلسطین پہونچی، العادل سے برسرپیکار ہوئی تو اس نے تھوڑی رعایتیں دیں، انگریز فوجی سردار ڈی نالڈ انطاکیہ کے حکمراں بوہیمند سے مل کر نئی جنگ کرنے کی خاطر اس کی طرف روانہ ہوا، تو اس کی فوج غنیموں سے گھر کر بالکل تباہ ہو گئی۔ (کروسیڈ از ارچاینڈ کنگسفورڈ ص ۳۷۱)

گرانٹ لکھتا ہے کہ اس اندوہناک مہم کے بعد صلیبی لڑائیوں کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے اور چوتھی جنگ کے بعد ان جنگوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا بھی دشوار ہے، کیونکہ پاپایانِ روم نے یہ قبیح عادت اختیار کر لی تھی کہ جس جنگ سے انھیں سروکار ہوتا اسے وہ صلیبی قرار دیتے تھے، ان کے کہنے پر جو فوجی مہمیں روانہ کی گئیں وہ بڑے پیمانہ پر نہ تھیں، فرانسیسی مورخ لیبان اور انگریز مورخ گرانٹ نے بقیہ اور لڑائیوں کا حال مختصر طریقہ پر اس طرح لکھا ہے:

پانچویں صلیبی جنگ بیت المقدس پر چڑھائی کرنے کے عوض میں اکثر صلیبی لوٹ کی امید میں مصر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن زیادہ دور نہ جا سکے، شکست کھا کر پلٹ آئے (تمدن عرب ص ۳۰۴)

چھٹی صلیبی جنگ جرمنی اور نیپلز کا شہنشاہ فریڈرک دوم پوپ کے ایما سے ۱۲۲۹ء میں یروشلم گیا، چند روز کے بعد واپس گیا تو پوپ نے اسے کلیسا سے خارج کر دیا، لیکن وہ دوسری مرتبہ پھر بیت المقدس پہونچا، اس کے تعلقات مسلمانوں سے خوشگوار تھے، اس لئے اس نے مصر کے سلطان سے فلسطین میں مسیحی زائروں کے داخل ہونے کی اجازت حاصل کر لی اور ایک دفاعی معاہدہ بھی کر لیا، یہ اس کی بڑی کامیابی تھی، مگر پوپ اس سے خوش نہیں ہوا، اس کی ریاست نیپلز کو بھی کلیسا سے خارج کر دیا (تاریخ یورپ ص ۳۶۳)

سا تویں صلیبی جنگ | ۱۲۴۴ء میں سلطان مصر نے بیت المقدس پر اپنا مکمل قبضہ کر کے تمام مسیحی فوجوں کو شام سے نکال دیا، تو فرانس کا سینٹ لوئی پچاس ہزار فوج کے ساتھ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا، اس نے دمیاط فتح کر کے قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی، مگر منصورہ میں مسلمانوں نے اس کو بری طرح شکست دی، مسیحی فوج کی ایک قلیل تعداد بچ کر ساحل کی طرف روانہ ہوئی، مگر بیماری اور دشمن کے حملوں سے تنگ آکر سینٹ لوئی نے ہتھیار ڈال دئے اور قید ہو گیا، فدیہ دے کر رہا ہوا . . . .

(تمدن عرب ص ۳۰۵)

آٹھویں صلیبی جنگ | سینٹ لوئی ہمت نہ ہارا، سوا سال کے بعد اس نے ایک نئی جنگ صلیبی کا ارادہ کیا، جولائی ۱۲۷۰ء میں تیس ہزار پیدل اور چھ ہزار سوار لے کر ایک مارت سے روانہ ہوا، ٹیونس کی طرف اس امید موہوم کے ساتھ بڑھا کہ وہاں کے حاکم کو عیسائی بنائے، مگر اس شہر کے محاصرہ میں طاعون کے مرض سے مر گیا اور اس کی فوج بھی اس وبا کی نذر ہو گئی، اس کے بعد حقیقی صلیبی جنگ کا خاتمہ ہو گیا،

گرانٹ لکھتا ہے کہ اس کے بعد صلیبی جنگ کی متعدد تحریکیں ہوئیں مگر ان کا اطلاق صلیبی جنگ پر نہیں ہوتا، یورپ میں اس صدا پر کوئی لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوا، دنیاوی لڑائیوں کو جو حرص دنیا اور انتقام پر مبنی تھیں، مذہبی قرار دینے سے کلیسا کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا (تاریخ یورپ ص ۳۶۵)

ہم نے اوپر صلیبی لڑائیوں کی کہانی زیادہ تر یورپی مصنفوں کی زبانی بیان کی ہے، تاکہ ایک مسلمان اہل قلم کے جذبات میں جانبدارانہ رنگ نہ پیدا ہونے پائے، آیندہ اب ان لڑائیوں کے مختلف قسم کے اثرات کو بھی ان ہی یورپی مصنفوں کی تحریروں کی روشنی میں دکھانا ہے،

سیاسی اثرات | صلیبی لڑائیوں سے یورپ پر مختلف قسم کے سیاسی اثرات پڑے، فرانس تو براہ راست متاثر ہوا، وہاں کے بڑے بڑے جاگیردار ان لڑائیوں میں شریک ہوئے تو یا تو وہ

جہاں مارے گئے زیادہ وہیں چھوٹے چھوٹے علاقے آباد ہوگئے، وہ فرانس سے گئے تو جاگیروں
کے مالکانہ حقوق شہروں کے ہاتھ فروخت کر گئے، جن کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں
بن گئیں، مگر وہ بادشاہ کے ماتحت رہیں، پھر ان شہروں میں مجالس بلدیہ قائم ہوگئیں تو یہ شہر
ان جاگیرداروں کے دائرۂ اثر سے باہر ہوگئے، اور وہ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوگئے
جس سے بادشاہ کا تسلط روز بروز ان پر بڑھتا گیا، اور جاگیرداری نظام رفتہ رفتہ بالکل ختم
ہوگیا، یہی صورت حال اٹلی میں پیدا ہوئی، مگر انگلستان میں اس سے مختلف صورت پیدا ہوئی،
وہاں جاگیردار کم اور بادشاہ زیادہ صلیبی جنگ میں مشغول رہے، بادشاہ کی عدم موجودگی میں
انگلستان کے امراء نے اپنے اثرات زیادہ پیدا کر لئے، ان کے اثرات اتنے بڑھے کہ آئندہ
چل کر وہ بالکل محض دستوری حکمراں بنتے چلے گئے۔ (تمدن عرب اردو،
ص ۳۱۰ - ۳۰۹)

صلیبی مسلمانوں کی یکجائی کو درہم برہم کرنے پر تو تُلے گئے تھے، مگر خود بھی انتشار میں مبتلا ہوگئے،
ان لڑائیوں میں مختلف ملکوں کے لوگ شریک ہوئے تو راستے ہی میں علٰحدہ علٰحدہ بولنے والوں
کی ٹولیاں الگ ہونے لگیں، اس طرح فرانس اور جرمنی کے صلیبیوں میں اختلاف ہوا، جو
دوسری جنگ میں اتنا بڑھا کہ ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، تیسری جنگ میں انگریزوں
اور فرانسیسیوں میں اس اختلاف میں اتنا اضافہ ہوا کہ انگریز اور فرانسیسی ایک
دوسرے کی کامیابیوں کو برداشت نہیں کر سکے، فرانس کے بادشاہ کو وطن لوٹنا
پڑا، جس کے بعد انگلستان اور فرانس کی کشمکش اندر اندر بڑھتی گئی جو ایک صدی
تک جاری رہی۔

(کریسیڈ از ارچر کنگسفورڈ ص ۴۲)

۱، ۲، ۱، ۱

قرآن کریم
اور
اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد و ترقی[1]

از

ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے،

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ	ہم نے اس کو نازل کیا اور ہم اس کے
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر۔ ۹)	محافظ ہیں ۔

اور اللہ کا یہ قول حرف بحرف راست و درست ثابت ہوا، یہ کلام آج تک اس طرح محفوظ ہے کہ اس کتاب کے ایک نقطہ، شوشے یا حرکت میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا، قرآن عظیم کے لاکھوں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی یہ حیرت انگیز یکسانی ایک زندہ اعجاز ہے، واضح رہے کہ دنیا میں کسی کتاب کے اتنے قلمی نسخے نہیں ملتے جتنے قرآن کے ہیں اور یہ بات بدیہی ہے کہ قلمی نسخوں کی کثرت اصل متن کے محرف کی دلیل ہوتی ہے لیکن قرآن کے اس کلیے سے استثنائی صورت دنیائے علم کے لئے موجب حیرت اور بصیرت ہے متن کی یہی محیر العقول یکسانی قرآن عظیم کے دوام پر دلیل اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم المرسلین ہونے کی بین شہادت

[1] یہ مضمون شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی کے ایک جلسے میں پیش کیا گیا تھا،

قرآن قیامت تک کے لئے ہر قوم کے لئے شمع ہدایت ہے، یہ آج بھی اسی طرح قابلِ عمل ہے جیسا ہزار سال پہلے تھا اور ان شاء اللہ ہزاروں سال بعد بھی رہے گا، یہ کتاب اہل علم و دانش کے لئے غور و فکر کا نہایت وسیع سرمایہ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر اس میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، یہ دعوت کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں، اس دعوت میں ہر ایک دور کے اہل بصیرت کے لئے سرمایۂ فکر موجود ہے، اس سے صریح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمانے کے ہر دور میں اس کے مطالب پر غور و فکر کرنا واجب ہے، آج سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے اور بڑے سے بڑے سائنسداں کے لئے اس میں روشنی و ہدایت کا سامان موجود ہے، آنے والے ادوار میں کن کن علوم کا دور دورہ ہوگا کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ مستقبل کا انسان فطرت کے بہت سے سربستہ راز کھول چکا ہوگا، اس کو آسمان کے بعض حقائق کا علم ہو چکا ہوگا، تحت الثریٰ کے خزانے تک اس کی رسائی کا بخوبی امکان ہے، وہ نئی معلومات کی روشنی میں قرآن کی نئی تعبیر و توجیہ کرے گا اور اس سے اس کے ذوقِ علم کو تسکین و تشفی حاصل ہوگی لیکن یہ بات واضح ہے کہ ہماری ساری توضیحات اس کے لئے قابلِ قبول نہ ہونگی۔

بالفاظ دیگر قرآن پر غور و فکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا، علوم کی کثرت اور رموز کائنات کی پردہ کشائی کی بنا پر اس عظیم کتاب کے حقائق اور کھل کر سامنے آئیں گے، نئی تعبیر و توجیہ[1] سے ہراساں نہ ہونا چاہئے، قرآن علم کے بے پناہ وسائل

---

[1] قرآن اور عصری تحقیقات کے عنوان سے ایک مضمون پاکستان میں شائع ہوا ہے، اس کے یہ جملے کس قدر بلیغ اور حقائق پر مبنی ہیں۔

"قرآن خدا کا قول ہے اور کائنات خدا کا فعل، سائنس کائنات کے اصولوں کو مادی طور پر سمجھنے کی کوشش کا نام ہے، پس سائنس کی دریافت اور قرآن کی صحیح تفسیر میں تضاد

کی نشاندہی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جتنا علم بڑھتا جائے گا، قرآن کی عظمت کا احساس ویقین زیادہ ہوتا جائے گا، حال ہی میں ایک نوجوان سائنس داں ڈاکٹر راشد خلیفہ نے کمپیوٹر کی مدد سے قرآن کی بعض حیثیات کا مطالعہ کیا ہے، اس سے دلچسپ اور سودمند نتائج برآمد ہوئے ہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن ریاضی کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے، آپ میں بعض حضرات نے قاضی ارشد مسعود صاحب کا مضمون "قرآن کریم۔ ریاضی کا معجزہ" الجمعیت عید نمبر ۱۴ اگست ۱۹۷۹ء میں دیکھا ہوگا یہ مضمون دراصل خلیفہ ارشد مسعود کی کتاب: The Perpetual Miracle of Muhammad کے ایک خلاصہ "Al Quran. The ultimate Miracle" پر مبنی ہے،

اس آخری کتاب کے مرتب احمد دیدات ہیں، یہ ڈربن میں چھپی ہے اور مفت تقسیم ہوتی ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں استعمال شدہ الفاظ اور ان کے حروف اس نظم کے ساتھ مرتب ہیں کہ ان میں ذرہ برابر تبدیلی سے تنظیم و ترتیب کا یہ محیر العقول سلسلہ درہم برہم ہوجاتا ہے، یہ مطالعہ قرآن کے اعجاز پر دلیل قطعی ہے، ان مصنفین کا بیان ہے کہ قرآن میں ۱۹ کے ہندسے کی غیر معمولی کارفرمائی ہے، قرآن میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں اور یہ تعداد ۱۹ سے تقسیم ہوجاتی ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۱۴ بار آتا ہے، ۱۱۳ بار سورتوں میں اور ایک بار سورہ نمل میں ہے، ۱۱۴ میں ۱۹ پانچ بار شامل ہے، بسم اللہ الرحمن الرحیم میں شامل سارے الفاظ ۱۹ سے تقسیم پذیر ہیں، اس طرح پر کہ اسم = ۱۹ بار آیا ہے، اللہ = ۲۶۹۸ بار جس میں ۱۹، ۱۴۲ بار شامل ہے، الرحمن ۵۷ بار، الرحیم ۱۱۴ بار، حروف مقطعات ۱۴، ان میں حروف تہجی ۱۴ اور جن سورتوں میں حروف مقطعات آئے ہیں، ان کی تعداد ۲۹ میزان ۵۷ جو ۱۹ سے تقسیم پذیر ہے، الٓمٓ ۸ سورتوں میں آیا ہے، ان سب سورتوں میں الف، لام اور

بقیہ ص ۲۵۰ کا کوئی سوال نہیں اس لیے کہ خدا کے قول اور عمل میں تضاد نہیں ہوسکتا، تضاد اور غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ خود ہمارا علم ناقص ہو،

کی مجموعی تعداد ۵۷۷۶ ہے جو ۱۹ کو ۳۰۴ سے ضرب دینے سے حاصل ہوتی ہے، سورۂ قلم میں ن ۱۳۳ بار آیا ہے جو ۱۹ سے تقسیم ہو جاتا ہے، ق سورہ "ق" میں ۵۷ بار آیا ہے، اس کی تیرھویں آیت میں اخوان لوط ہے، اگر اس کی جگہ قوم لوط آتا تو ق کی تعداد ۵۸ ہو جاتی اور ۱۹ کی ترتیب بگڑ جاتی، حرف ص ایک بار مقطعات کی صورت میں تنہا اور دو بار سورۂ اعراف اور سورۂ مریم کے ابتدا کے دو حروف مقطعات یعنی المص، اور کہیعص میں آیا ہے ان تین سورتوں میں ص کی تعداد ۱۵۲ ہوتی ہے یہ تعداد ۱۹ سے تقسیم پذیر ہے، سورۂ اعراف کی ۶۹ ویں آیت میں بسطہ کو ص سے لکھا گیا ہے حالانکہ اصل املا س سے ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی ۲۴۷ ویں آیت میں ہے اگر بسطہ س سے لکھا جاتا تو ص کی تعداد ایک کم ہو جاتی یعنی ۹۷، اور اس طرح ص کی کل میزان جو ۱۵۲ ہوتی ہے ۱۵۱ رہ جاتی اور یہ عدد ۱۹ سے تقسیم نہیں ہوتا۔ سورہ اعراف میں حروف مقطعات میں الف۔ لام، میم۔ صاد حروف تہجی ہیں، ان کی تعداد اس طرح پر ہے۔

الف =	۲۵۷۲
لام =	۱۵۲۳
میم	۱۱۶۵
صاد	۹۸
میزان کل۔	۵۳۵۸

اس کو ۱۹ سے تقسیم دینے پر خارج قسمت ۲۸۲ آتا ہے۔ کہیعص، یہ حروف مقطعات سورہ مریم کے شروع میں آئے ہیں،

اس صورت میں ک کی تعداد =	۱۲۷
ھا	۱۶۸
یا	۲۴۵

ع : ۱۲۲

ص : ۲۶

میزان ۷۹۸

اس میں ۱۹، ۴۲ بار شامل ہے۔

ایک عجیب حقیقت کا انکشاف کمپیوٹر سے ہوا کہ ایسی کتاب جو اس طرح کے حیرت انگیز نظم و ترتیب سے مرتب ہو کسی انسانی کوشش سے مرتب نہیں ہو سکتی، اس میں امکانی پہلو ۶۲۶ کھرب کے مقابلے میں صرف ایک ہے

میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ آیندہ روبہ اس سے بڑے سائنسی تجربات قرآن کے اوپر کیے جائیں گے اور ان سے اس سے زیادہ حیرت خیز نتائج برآمد ہوں گے۔

قرآن ماضی کے بعض واقعات کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے، قوموں کے عروج و زوال سے انسانوں کو عبرت کی تعلیم دیتا ہے، کبھی قوموں کو ان کے غلط افعال کی وجہ سے ایسی سزا دیتا ہے کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں چھوڑتا کبھی کبھی کچھ نشان اہل ایمان کی بصیرت کے لیے باقی چھوڑ دیتا ہے، جو بستیاں منقلب کر دی گئی ہیں ان کو دیکھنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے، یہیں سے تاریخ کی عظمت اور علم باستان شناسی کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، حال ہی میں اطالوی باستان شناسوں کی ایک جماعت نے شام میں ایک شہر کا پتہ چلایا ہے جس میں ایک خوش حال قوم بستی تھی، یہ قوم سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے کئی سو سال تک اس خطے پر اپنا اقتدار قائم کیے ہوئے تھی، دو سال قبل اس نئی دریافت کے بارے میں ایک اطلاع معاصر جریدہ ہندوستان ٹائمز میں چھپی تھی، ۱۹ مارچ ۱۹۷۹ء کے جریدہ، ہندو، کے میگزین والے حصے میں نیویارک ٹائمز کے حوالے سے ایک تفصیلی یادداشت شائع ہوئی، اس کا ایک اقتباس بعض لحاظ

ے اہم ے،

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یعنی آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل شام کا شہر "ابلا" نہایت اہم تجارتی، سیاسی اور تہذیبی مرکز تھا، اس کا ثبوت شاہی محل کے آرکایوز سے حاصل کی ہوئی اطلاعات سے فراہم ہوتا ہے،

بادشاہ کا انتخاب ، سال کے لئے ہوتا، وہ ایک نمائندہ کاونسل کی مدد سے حکومت کرتا تھا شکد خوردہ شاہی امیدوار پنشن کا مستحق ہوتا تھا۔

ابلا میں بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوتی، شاہی محل کے آرکایوز میں بعض کانفرسوں کی روداد ملی

ابلا کے تعلیمی اداروں میں غیر ملکی استاد اور شاگرد موجود تھے،

مملکت کا مرکز ابلا تھا، اس کی آبادی تیس ہزار تھی، ان میں گیارہ ہزار سات سو سرکاری پوری مملکت کی آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی،

ابلا میں ایک اکاڈمی تھی جس میں ملکی اور غیر ملکی دانشور موجود تھے، ان کو خط میخی تعلیم دی جاتی تھی،

ابلا کی کھدائی ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۶ء تک روم یونیورسٹی کے باستان شناسی کے پرو Paolo Matthiaes کی نگرانی میں عمل میں آئی، کھدائی میں ۱۵ ہزار مٹی کی تختیاں ہوئیں، جن پر سمیری طرز کے خط میخی میں لکھی ہوئی تحریریں ملتی ہیں، محققین کا خیال ہے کہ زبان کی قدیم شکل ہے، یہ تحریریں ادبی متن سے لے کر سفیروں کے اخراجات کی تفصیل اور تجا سامان کی فہرست تک حاوی ہیں۔ ان میں متعدد فہرستیں ہیں جن میں پیغمبروں، بادشا اور دوسرے پیشہ وروں کے نام ملتے ہیں، ان میں ۔۔ ناموں کی صحیح قرأت ہو چکی ہے، ان ناموں کے علاوہ پودوں، معدنیات، چڑیوں، مچھلیوں وغیرہ کے نام ملتے ہیں، بعض

قواعد زبان کے مسائل سے متعلق ہیں، اُن میں تین ہزار الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے، جو قابل ذکر نام ان تختیوں میں پڑھے گئے ہیں وہ اس طرح پر ہیں۔

Mikiilu ((Esau) Esaum ((ابرام) Abraamu
Ishmael (David) Dauudum ((Michael)
(Israel) Ishrailu ((Ishmael) ilum

فہرست میں پانچ شہروں کے نام ملتے ہیں۔

Phaliga, Sarugi, Til_Jurakhi,
Nakhur, Haran,

یہ شہر حضرت ابراہیم کے رشتہ داروں کے نام سے جو کتاب مقدس میں مذکور ہیں مشابہ ہیں، وہ نام یہ ہیں۔

Peleg, Serug, Terah,
Nahor, Haran,

پانچ اور شہر جن کا نام ان تختیوں میں آیا ہے وہ کم و بیش وہی ہیں جو بائبل میں ملتے ہیں یعنی

Sodom, (۱)
Gomorrah (۲)
Admah, (۳)
Zeboiim, (۴)
Bela, (۵)

۱۷۴۷ء،

حضرت عیسٰی کی پیدائش سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یعنی آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل شام کا شہر "ابلا" نہایت اہم تجارتی، سیاسی اور تہذیبی مرکز تھا، اس کا ثبوت شاہی محل کے آرکائیوز سے حاصل کی ہوئی اطلاعات سے فراہم ہوتا ہے،

بادشاہ کا انتخاب ۷ سال کے لئے ہوتا، وہ ایک نمائندہ کاونسل کی مدد سے حکومت کرتا تھا، شکست خوردہ شاہی امیدوار پنشن کا مستحق ہوتا تھا۔

ابلا میں بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوتی، شاہی محل کے آرکائیوز میں بعض کانفرسوں کی روداد ملی ہے،

ابلا کے تعلیمی اداروں میں غیر ملکی استاد اور شاگرد موجود تھے،

مملکت کا مرکز ابلا تھا، اس کی آبادی تیس ہزار تھی، ان میں گیارہ ہزار سات سو سرکاری ملازم تھے

پوری مملکت کی آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی،

ابلا میں ایک اکاڈمی تھی جس میں ملکی اور غیر ملکی دانشور موجود تھے، ان کو خط میخی کی تعلیم دی جاتی تھی،

ابلا کی کھدائی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۶ء تک روم یونیورسٹی کے باستان شناسی کے پروفیسر Paolo Math ees کی نگرانی میں عمل میں آئی، کھدائی میں ۱۵ ہزار مٹی کی تختیاں برآمد ہوئیں، جن پر سمیری طرز کے خط میخی میں لکھی ہوئی تحریریں ملتی ہیں، محققین کا خیال ہے کہ یہ سامی زبان کی قدیمی شکل ہے، یہ تحریریں ادبی متن سے لے کر سفیروں کے اخراجات کی تفصیل اور تجارتی سامان کی فہرست تک کی حامل ہیں۔ ان میں متعدد فہرستیں ہیں جن میں پیغمبروں، بادشاہوں اور دوسرے پیشہ وروں کے نام ملتے ہیں، ان میں ۵۰۰ ناموں کی صحیح قرأت ہو چکی ہے، ان ناموں کے علاوہ پودوں، معدنیات، چڑیوں، مچھلیوں وغیرہ کے نام ملتے ہیں، بعض تختیاں

نو، مدزبان کے مسائل سے متعلق ہیں، اُن میں تین ہزار الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے، جو قابل ذکر
نام ان تختیوں میں پڑھے گئے ہیں وہ اس طرح پر ہیں۔

Mikiilu ،(Esau) Esaum ،(ابرام) Abraamu
Ishmail(David) Daudum ،(Michael)
(Israel) Ishraailu ،(Ishmael) ilum

فہرست میں پانچ شہروں کے نام ملتے ہیں۔

Phaliga, Sarugi, Til-Turakhi,
Nakhur, Haran,

یہ شہر حضرت ابراہیم کے رشتہ داروں کے نام سے جو کتاب مقدس میں مذکور ہیں
مشابہ ہیں، وہ نام یہ ہیں۔

Peleg, Serug, Terah,
Nahor, Haran,

پانچ اور شہر جن کا نام ان تختیوں میں آیا ہے وہ کم و بیش وہی ہیں جو
بائبل میں ملتے ہیں یعنی

Sodom, (۱)
Gomorrah (۲)
Admah, (۳)
Zeboiim, (۴)
Bela, (۵)

یہ آخری شہر زوادی بھی کہلاتا تھا،

ان تختیوں سے طوفانِ نوح کا پتا چلتا ہے جس میں دنیا تباہ و برباد ہو چکی تھی، یہ سارے کتبے ابھی پوری طرح پڑھے نہیں جا سکے ہیں، محققین کے زیر مطالعہ ہیں اور ان سے اہم نتائج برآمد ہونے کی قوی توقع ہے،

میں نے شام کے اس نو دریافت شہر کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس غرض سے کیا ہے کہ ہمارے محققین کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیا عجب یہ شہر ان شہروں میں سے کوئی ہو جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے sodom قوم لوط کا مسکن تھا اور اس کی تباہی کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، اس سے مزید یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ جوں جوں علم و تحقیق کا قدم آگے بڑھے گا، قرآن کے حقائق سامنے آتے رہیں گے، علم کی کثرت قرآن کی تفہیم میں موید و مددگار ثابت ہوگی، قرآن کے امور کی توضیح مختلف علوم میں دسترس، مختلف زبانوں کے علم، مختلف اقوام اور تہذیبوں کے دقیق مطالعہ، مختلف مذاہب کے باہمی مقابلے و مقایسے اور مختلف مذاہب کے علماء کے باہمی تعاون کے بغیر مشکل ہے،

اسلام کا دنیائے علم و تہذیب پر بڑا احسان ہے کہ اس کی وجہ سے متعدد علوم و فنون معرض وجود میں آئے جو دین رحمت سے قبل موجود نہ تھے، ان علوم میں علم حدیث، علم غریب الحدیث، اسماء الرجال، علم ناسخ و منسوخ، علم تلفیق حدیث، علم علل حدیث، علم تخریج حدیث، علوم تفسیر، علم قرات و تجوید، علم فقہ وغیرہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، علم حدیث میں اقوال کے پرکھنے کے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں، وہ انسانی فکر کی بلندی کو چھوتے ہیں، علم جرح و تعدیل علوم حدیث میں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے، اس میں شہادت کے جو اصول منضبط ہوئے ہیں وہ اتنے بلند ہیں کہ ان کا تصور نہیں ہو سکتا، کسی قدیم قوم یا کسی تہذیب میں اقوال کے صحیح و

غیر صحیح کے اصول پوری طرح وضع نہیں ہوئے ہیں، دور جدید میں جو اصول وضع ہوئے ہیں ان میں ہم عصر شہادتوں کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے لیکن ان شہادتوں کی اصل حقیقت عدالت سے متعلقہ کارکنوں پر سب سے زیادہ واضح طور پر منکشف ہوتی ہے، کسی معاملے کا ایک گواہ حلفیہ بیان واقعہ کی صداقت پر پیش کرتا ہے تو دوسرا اسی وقت اسی کی تردید کرتا ہے لیکن اسلام نے شہادت کے جو معیار قائم کئے ہیں ان میں ہم عصر شہادت کو چند اور شرائط سے مشروط کیا ہے، ان کی وجہ سے حق اور باطل میں امتیاز آسان ہو جاتا ہے، علم اسماء الرجال کا وجود اسلام کا رہین منت ہے، آج سے ہزار سال پہلے کے سیکڑوں راویوں کے احوال و واقعات بڑے مستند ذرائع سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں، یہ بذات خود نہایت وقیع کارنامہ اور علم تاریخ میں زبردست اضافہ ہے، پوری تاریخ انسانیت میں انگشت شمار شخصیات ملیں گی جن کی زندگی ایسے مستند ماخذ سے مرتب ہوئی ہے، اکثر اہم شخصیات کی حیثیت جب بلند تحقیق کسوٹی پر کسی جاتی ہے تو وہ ظن و تخمین کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی، شاید اسی حقیقت کی طرف اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا ۔۔۔ بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

چونکہ میری گفتگو کا موضوع وہ علوم و فنون ہیں جو قرآن کی نسبت سے مدون ہوئے، لہذا ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ علوم قرآن پر مسلمانوں نے خاصی توجہ کی ہے، ان میں ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کی کتاب فنون الافنان فی عجائب القرآن، علامہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی مشہور کتاب البرہان فی علوم القرآن، امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی تصنیف کتاب الاتقان فی علوم القرآن عام طور پر معروف و متداول ہیں، دور حاضر کے فاضل ڈاکٹر صبحی الصالح نے اسی موضوع پر ایک کتاب بعنوان مباحث فی القرآن شائع کر چکے ہیں، اس کتاب کے مباحث

یہ ہیں۔

باب اوّل، قرآن و وحی، باب دوم، تاریخ القرآن، باب سوم، علوم القرآن اس میں حسب ذیل مباحث شامل ہیں،

علم اسباب النزول، علم مکی و مدنی، علم القرآت، علم ناسخ و منسوخ، علم رسم القرآن، علم محکم و متشابہ،

باب چہارم، تفسیر و اعجاز، یہ حسب ذیل چار فصلوں میں منقسم ہے، فصل اوّل، تفسیر، اس کے ذیل میں اکثر تفاسیر اور مفسرین کا ذکر ہے، فصل دوم، القرآن یفسر بعضہ بعضاً، فصل سوم، اعجاز القرآن، قرآن کے تشبیہات و استعارات، مجاز و کنایہ، فصل چہارم، اعجاز فی نظم القرآن،

قرآنی علوم کی تفصیل جس طرح مباحث علوم القرآن اور اس قبیل کی دوسری کتابوں میں بیان ہوئی ہے وہ فنی اعتبار سے درست ہے لیکن عام طور پر یہ سارے مباحث علم تفسیر ہی کے ہیں، تفسیر کا ایک جامع علوم ہونا قرآن کا مرہون منت ہے، تفسیر کے لئے انگریزی کا لفظ Exegesis ہے، جس کی اصل یونانی ہے اور جس کے لغوی معنی توضیح و تفسیر کے ہیں، یہ لفظ بائبل کی توضیح کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ لغت میں اس کے یہ معنی درج ہیں: "Explanation, critical ana-lysis or inter Pretation of a word, literary passage etc. specially of Bible"

اور اس فن کا جو ماہر ہوتا ہے وہ Exegete کہلاتا ہے اور اس فن کا نام Exegetics ہے

اس تفصیل سے واضح ہے کہ بائبل کی تفسیر لفظ اور جملے کی توضیح و تشریح تک محدود تھی لیکن قرآن کی تفسیر کے حدود بہت وسیع ہیں، چنانچہ اس سے کئی علوم متعلق ہیں، اور ہر علم اپنی جگہ دقیق مطا

کا متقاضی ہے، مختصر یہ کہ علوم تفسیر قرآن کی دین ہے اور یہ سارے علوم تاریخ انسانیت کے اہم ابواب ہیں؟
قرآن کی نسبت سے علم تجوید کا ذکر نہایت ضروری ہے، اس علم کا مقصد اس لہجے کی حفاظت ہے جس لہجے میں سب سے
ابتداءً قرآن کی تنزیل ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ اس طرح کا علم کسی زبان میں ممکن نہ تھا، حضور علیہ السلام کی محبت کا یہ نتیجہ تھا کہ
مسلمان اس لہجے کو عملاً برقرار رکھنا چاہتے تھے جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اس کی بنا پر اصول اور
قواعد و ضوابط منضبط ہوئے، اور اس میں اتنے دقیق مسائل شامل ہوئے کہ رفتہ رفتہ یہ ایک وسیع
اور اہم علم قرار پایا۔ یہ علم نظری اور عملی دونوں ہے، نظری لحاظ سے اس کی تحصیل آسان ہے،
لیکن عملی اعتبار سے اس کا حصول نہایت کٹھن ہے، ہر ملک کے رہنے والوں کا الگ الگ لہجہ
ہو جاتا ہے، ان کے مخارج حروف وغیرہ الگ ہوتے ہیں، غیر ملکی لہجے پر دسترس حاصل کرنے کے
لئے ایک استاد کی رہنمائی میں قواعد و اصول کی رعایت کرتے ہوئے مدتوں مشق کرنی پڑتی ہے،
لیکن اتنی دسترس بہم پہنچانے کے باوجود مثلاً ہندوستانی قاری کی آواز عربی یا مصری قاری کی
آواز سے مختلف ہوتی ہے، دراصل مصوت، صامت، انتشار، تکیہ وغیرہ میں جو دقیق فرق
ملکوں ملکوں میں پایا جاتا ہے ان کا عملی احاطہ بڑی حد تک ناممکن ہے۔ اس دشواری کے باوجود کروڑوں
مسلمان اہل علم نے اپنی ساری زندگی اصل لہجے کی حفاظت اور اسی لہجے میں قرآن کریم کی ترتیل میں
صرف کر دی، دنیا کی کسی زبان میں ایسی کسی کتاب کا تصور نہیں ہو سکتا جس کے ابتدائی
لہجۂ قرأت کو اس خوبی سے محفوظ کر لیا ہو کہ اس سے ایک جامع علم وجود میں آ گیا، قرآن کی
نسبت سے علم تجوید کی ایجاد علمی دنیا کا ایک بڑا وقیع کارنامہ ہے اور اسی لحاظ سے انسانیت
پر قرآن اور اسلام کا بڑا احسان ہے، اگرچہ علم تجوید کی کارفرمائی صرف قرآن مجید تک محدود رہی
لیکن دور حاضر کے مشہور علم صوتیات پر اس علم کا خاصہ عمل دخل ہے، اگرچہ صوتیات کے ارتقا
میں علم تجوید جو قرآن سے متفرع ہے زیادہ اثر انداز ہوا ہوگا، یہ بات کتنی اہم ہے کہ جب اہل اسلام

علم تجوید کو ایک بلند درجے تک پہنچا چکے تھے، اہل مغرب اس علم کی مبادیات سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے،
تاریخ انسانی اس حقیقت کو کیونکر فراموش کر سکتی ہے کہ ایسا وسیع علم مغربی فن کے نشوونما سے
سینکڑوں سال پہلے وجود میں آچکا تھا،

قرآن کی نسبت سے ایک اور خصوصیت جو نہایت قابل توجہ ہے وہ اس کے متن کا طریقہ تحفظ ہے،
قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے اپنے ذمہ لے لی ہے، چنانچہ جس حیرت انگیز طریقے سے اس کا
متن محفوظ کر دیا گیا ہے وہ دنیائے علم کا ایک اعجوبہ ہے، عربی فارسی رسم خط اس لحاظ سے بڑا ناقص
ہے کہ اس میں تحریف متن کی کافی گنجائش ہے، اس رسم خط کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نقطے اور شوشے
کے ذریعے ایک حرف دوسرے حرف سے ممتاز ہوتا ہے، پھر بعض حروف کبھی جدا اور کبھی پیوستہ لکھے
جاتے ہیں، پیوستگی کی حالت میں حرف اصل صورت سے مختلف ہو جاتا ہے، نقطوں اور شوشوں کا
باقاعدہ التزام نہ ہونے کی بنا پر ایک حرف کا امتیاز دوسرے حرف سے اکثر باطل ہو جانا عام
بات ہے، اس طرح سینکڑوں محرف الفاظ وجود میں آجاتے ہیں اور قاری اکثر دھوکے کا شکار
ہو جاتا ہے، بنی آدم کو نبی آدم پڑھنے والے دیکھے گئے ہیں، کبھی کبھی ایسے لوگ مل گئے ہیں جو مجوب
کو محبوب اور برجان کو رحجان پڑھتے ہیں، ان خصائص کا لازمی نتیجہ قدیم متن کی تخریب و تحریف
کی شکل میں برآمد ہوتا ہے، اور یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ کسی کتاب کے دو قلمی نسخے یکساں
نہیں ہو سکتے اس لئے کہ کاتب انسان اور انسانی جذبات سے مرکب ہے، جذبات و احساسات
جہاں عالم میں رنگا رنگی کے موجب ہیں، وہاں ان کی کارفرمائی سے ایک خطی نسخہ دوسرے نسخے
سے کسی نہ کسی لحاظ سے الگ ہو جاتا ہے، مشین کا عمل اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، یعنی ایک مشین پر چھپے ہوئے
سارے فرمے یکساں ہونگے، ان میں کسی قسم کا بنیادی فرق نہ ہوگا، ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ایک فرمے میں
تو ضل ہے تو دوسرے میں اس کی جگہ ذکر، لیکن قلمی نسخے کی یہ ناقابل انکار خصوصیت ہے کہ دو

نسخے خواہ وہ پہلے ہی نسخے سے مرتب ہوا ہو، کسی نہ کسی وجہ سے متفاوت ہوگا یہی اختلاف کی حد بندی تو تمام نسخوں میں ہزاروں سے تجاوز کرنا عام بات ہے، اس سے عجیب مزاحیہ نتیجہ یہ نکلا کہ جس کتاب کے جتنے زیادہ نسخے ملتے ہیں وہ کتاب اپنی اصل سے اتنی ہی زیادہ دور ہو جاتی ہے، دنیا کی مقبول ترین کتاب میں اصل مصنف کا حصہ بالکل اس طرح گھٹ جاتا ہے جیسا ہومیوپیتھک کی تیز دواؤں میں مادی اجزاء، اگر یہ تمام نسخے مصنف کے روبرو پیش ہوں تو وہ اپنے خاص نسخے کی تلاش میں ناکام رہے گا، سعدی کی گلستاں فارسی کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، اگر اس کے تمام نسخوں کے تمام اختلاف کو اکٹھا کر لیا جائے تو وہ لاکھوں کے حدود میں ہوں گے، گویا ایک لاکھ نسخوں میں صرف ایک نسخہ اصل ہوگا اور ننانوے ہزار نو سو ننانوے نسخے مختلف ہوں گے، اگر سعدی زندہ ہوں اور ان کے سامنے یہ دانشگاہی معاملہ پیش کیا جائے تو وہ حیرت زدہ رہ جائیں اور دوسری گلستاں تالیف کرنا منظور کریں۔

ان امور کی روشنی میں قرآن پر غور کریں، قرآن کریم وہ کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی گئی ہے اور جس کے سب سے زیادہ نسخے ملتے ہیں، اکثر علما کے نزدیک قرآن لفظ القراۃ سے نکلا ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، اس لحاظ سے قرآن کا یہ نام اعجاز ہے اس لیے کہ قرآن کا زیادہ پڑھا جانا خود اس لفظ کے وجود کا جزء ہے، قرآن کے سب سے زیادہ پڑھے جانے کی دلیل یہ ہے کہ یہ کتاب حفظ کی جاتی ہے اور ابتدا سے اس وقت تک حفاظ کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی، ہر حافظ اپنی حیات میں قرآن کو ہزاروں سے زیادہ بار پڑھ چکا ہوگا، پھر قرأت میں تفسیر قرآن اور حدیث کے درس میں قرآن کی بار بار تکرار ہوتی ہے، قرآن کا پڑھنا عبادت ہے، ابتداء اسلام سے اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد کئی ارب سے متجاوز ہو چکی ہوگی، ان میں سے کچھ فیصد تو قرآن پڑھتے ہی ہوں گے، اس سے آپ قرآن کی کثرت تلاوت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

[illegible] رمضان کی ترویج اور قرآن خوانی کی مجالس نے قرآن کریم کا بہت [illegible] ایسے شواہد ہیں جن سے بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس خصوصیت کی حامل نہیں ، یہ رہی پڑھنے کی صورت ، اب ذرا اس کے لکھے جانے کی صورت کا قیاس کریں ، دنیا میں پھیلے ہزاروں کتاب خانے اور میوزیم میں شاید کم ایسے ہوں گے جو قرآن کے قلمی نسخوں سے عاری ہوں ، میرے علم کے مطابق ایران کے شہر مشہد کے کتاب خانہ آستانِ قدس میں ساڑھے چار ہزار سے زیادہ قلمی نسخے اب بھی موجود ہیں ، رامپور کے کتاب خانے اور مصر کے دار الکتب[1] میں سے ہر ایک میں دو سو سے زیادہ قلمی نسخے شامل ہیں ، اس سے ایک عمومی اندازہ کے مطابق اس وقت شاید ایک لاکھ نسخے اس عظیم کتاب کے موجود ہوں اور اتنی بڑی تعداد دنیا کی کسی زبان کی کسی ایک کتاب کا کیا ذکر متعدد کتابوں کی مل کر نہ ہوگی ، مقدس کتب کا تو ذکر ہی نہیں ، مجھے ذاتی طور پر معلوم نہیں کہ ہندو مذہب کی مقدس کتاب وید کے کتنے نسخے ملتے ہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کے خطی نسخے انگشت شمار ہوں گے ، اور توریت و انجیل کے ترجمے متداول ہیں ، اصل نسخے جو موجود ہوں گے ان کی تعداد مختصر ہی ہوگی ، زرتشتیوں کی مقدس کتاب اوستا ہے ۔ اس کا اصل نسخہ سکندر کے فتح استخر کے موقع پر نذر آتش ہو گیا تھا ، اس کے بعد کسی قلمی نسخے کا پتہ نہ تھا ، بعد میں یادداشت اور حافظے سے اوستا کے اجزاء مختلف ادوار میں مرتب ہوئے جن میں زبان کی یکسانی بھی نہیں ، اس کا آخری حصہ جو خردہ اوستا کہلاتا ہے وہ ساسانی دور میں زرتشت سے تقریباً ہزار سال بعد مرتب ہوا ، خردہ اوستا اور گاتھا جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے ، ان دونوں کی زبانوں میں بہت کافی فرق ہے ، بہر حال ، اب نہ اصل اوستا کا پتہ ہے اور نہ اس کے اصلی رسم خط کا ،

---

[1] تبریز میں ربع رشیدی ایک محلہ تھا جس میں رشید الدین فضل اللہ نے ایک کتاب خانہ ترتیب دیا تھا جس میں قرآن کے ایک ہزار نسخے تھے ۔

موجودہ اوستا ایک ایسے خط میں تحریر کیا گیا جو ساسانی دور کے پہلوی خط سے مقتبس ہے،

اس تفصیل سے واضح ہے کہ قرآن کریم دنیا میں سب سے زیادہ لکھی گئی کتاب ہے، اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ دنیا کی کسی کتاب پر اتنی فنی مہارت صرف نہیں ہوئی جتنی اس کے قلمی نسخوں کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی، اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ہمارے رسم خط کی بعض خصوصیات کی بنا پر نسخے کی کثرت متن کی صحت کی ضمانت کے برخلاف ہے، کسی کتاب کے جتنے زیادہ نسخے ہوں گے اتنی ہی وہ اپنی اصل سے دور ہوگی تو قرآن کے اتنی کثرت سے لکھے جانے کا صریحی نتیجہ اس کے متن میں غیر معمولی تحریف و تصرف کے شکل میں ظاہر ہونا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا، اور حیرا نگیز بات یہ کہ قرآن کے لاکھوں نسخوں کے درمیان ایک نقطے شوشے یا اعراب کا فرق نہیں ملتا، قرآن کے قدیم ترین نسخے سے ایک جدید نسخے کا مقابلہ کرنے پر جو حیرت انگیز یکسانیت ملتی ہے وہ دنیائے علم کا بہت زبردست اعجوبہ ہے اس سے بڑھ کر بات کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن کے سارے نسخے نظر انداز کر دیئے جائیں، اور ایک حافظ قرآن کی مدد سے مثلاً شام میں ایک نسخہ تیار کرایا جائے اور دوسری طرف مشرق بعید میں دوسرے حافظ کے ذریعہ ایک دوسرا نسخہ مرتب کرایا جائے اور پھر خواہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر لیا جائے یا ان میں سے ہر ایک کا کسی اور قدیم یا جدید نسخے سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں کسی ایک مقام پر سرمو فرق نہ ملے گا، یہ قرآن کا جیتا جاگتا معجزہ ہے، تاریخ انسانی میں ایسے محقق متن کی کوئی مثال کہاں ملے گی، شاید ایک سطر تحریر بھی موجود نہ ملے گی جو ایسی محقق اور معتبر ہو جیسی کہ قرآن کی تحریر، حفظ قرآن کی روایت اوائل دور اسلام سے قائم چلی جا رہی ہے اور جب تک دنیا قائم ہے انشاء اللہ باقی رہیگی، ایک حافظ اپنے سینے میں محفوظ امانت دوسرے کے سینے میں بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے منتقل کرتا رہتا ہے اور قیامت تک کرتا رہیگا، ایسی حفظ و نماسکی مثال دنیا کی تہذیبوں میں کہاں ملیگی، محفوظ صفات جس ستائش کے مستحق ہیں وہ ہم لوگوں کا حصہ ہوگا، قرآن کے ان سب سے بڑے محافظوں پاسبانوں پر اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرے آمین (باقی)

علاوہ بریں مختلف تقریبوں، رمضان کی تراویح اور قرآن خوانی کی مجالس میں قرآن کریم کا بار بار پڑھا جانا ایسا معمول ہے جس سے با آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس خصوصیت کی حامل نہیں، یہ تو رہی پڑھنے کی صورت، اب ذرا اس کے لکھے جانے کی صورت کا قیاس کریں، دنیا میں ہزاروں کتاب خانے اور میوزیم میں شاید کم ایسے ہوں گے جو قرآن کے قلمی نسخوں سے خالی ہوں، میرے علم کے مطابق ایران کے شہر مشہد کے کتاب خانہ آستانِ قدس میں[1] ساڑھے چار ہزار سے زیادہ قلمی نسخے اب بھی موجود ہیں، رامپور کے کتاب خانے اور مصر کے دار الکتب میں سے ہر ایک میں دو سو سے زیادہ قلمی نسخے شامل ہیں، اس سے ایک عمومی اندازہ کے مطابق اس وقت شاید ایک لاکھ نسخے اس عظیم کتاب کے موجود ہوں اور اتنی بڑی تعداد دنیا کی کسی زبان کی کسی ایک کتاب کا کیا ذکر متعدد کتابوں کی مل کر نہ ہوگی، مقدس کتب کا تو ذکر ہی نہیں، مجھے ذاتی طور پر معلوم نہیں کہ ہندو مذہب کی مقدس کتاب وید کے کتنے نسخے ملتے ہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کے خطی نسخے انگشت شمار ہوں گے، اور توریت و انجیل کے ترجمے متداول ہیں، اصل نسخے جو موجود ہوں گے ان کی تعداد مختصر ہی ہوگی، زرتشتیوں کی مقدس کتاب اوستا ہے۔ اس کا اصل نسخہ سکندر کے فتح استخر کے موقع پر نذرِ آتش ہو گیا تھا، اس کے بعد کسی قلمی نسخے کا پتہ نہ تھا، بعد میں یادداشت اور حافظے سے اوستا کے اجزاء مختلف ادوار میں مرتب ہوئے جن میں زبان کی یکسانی بھی نہیں، اس کا آخری حصہ جو خردہ اوستا کہلاتا ہے وہ ساسانی دور میں زرتشت سے تقریباً ہزار سال بعد مرتب ہوا، خردہ اوستا اور گاتھا جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے، ان دونوں کی زبانوں میں بہت کافی فرق ہے، بہر حال، اب نہ اصل اوستا کا پتہ ہے اور نہ اس کے اصلی رسم خط کا،

---

[1] تبریز میں ربع رشیدی ایک محلہ تھا جس میں رشید الدین فضل اللہ نے ایک کتاب خانہ ترتیب دیا تھا جس میں قرآن کے ایک ہزار نسخے تھے۔

موجودہ اور تا ایک ایسے خط میں تحریر کیا گیا جو ساسانی دور کے پہلوی خط سے مقتبس ہے،

اس تفصیل سے واضح ہے کہ قرآن کریم دنیا میں سب سے زیادہ لکھی گئی کتاب ہے اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ دنیا کی کسی کتاب پر اتنی فنی مہارت صرف نہیں ہوئی جتنی اس کے قلمی نسخوں کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ہمارے رسم خط کی بعض خصوصیات کی بنا پر نسخے کی کثرت متن کی صحت کی ضمانت کے برخلاف ہے، کسی کتاب کے جتنے زیادہ نسخے ہوں گے اتنی ہی وہ اپنی اصل سے دور ہوگی تو قرآن کے اتنی کثرت سے لکھے جانے کا صریحی نتیجہ اس کے متن میں غیر معمولی تحریف و تصرف کے شکل میں ظاہر ہونا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا، اور محیر العقول بات یہ کہ قرآن کے لاکھوں نسخوں کے درمیان ایک نقطے شوشے یا اعراب کا فرق نہیں ملتا، قرآن کے قدیم ترین نسخے سے ایک جدید نسخے کا مقابلہ کرنے پر جو حیرت انگیز یکسانی ملتی ہے وہ دنیا کے علم کا بہت زبردست اعجوبہ ہے اس سے بڑھ کر بات کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن کے سارے نسخے نظر انداز کر دیئے جائیں اور ایک حافظ قرآن کی مدد سے مثلاً شام میں ایک نسخہ تیار کرا لیا جائے اور دوسری طرف مشرق بعید ایشیا میں دوسرے حافظ کے ذریعہ ایک دوسرا نسخہ مرتب کرا لیا جائے اور پھر خواہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر لیا جائے یا ان میں سے ہر ایک کا کسی اور قدیم یا جدید نسخے سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں کسی ایک مقام پر سرمو فرق نہ ملے گا، یہ قرآن کا جیتا جاگتا معجزہ ہے، تاریخ انسانی میں ایسے محقق متن کی کوئی مثال کہاں ملے گی، شاید ایک سطر تحریر بھی موجود نہ ملے گی جو اتنی محقق اور معتبر ہو جیسی کہ قرآن کی تحریر، حفظ قرآن کی روایت اوائل دور اسلام سے قائم چلی جا رہی ہے اور جب تک دنیا قائم ہے انشاء اللہ باقی رہے گی، ایک حافظ اپنے سینے میں محفوظات دوسرے کے سینے میں بغیر کسی تغیر و تبدیل کے منتقل کرتا رہتا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ ایسی حفاظت کی مثال دنیا کی تہذیبوں میں کہاں ملے گی، مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے جس ستائش کے مستحق میں وہ کم لوگوں کا حصہ ہوگا، قرآن کے ان سب سے بڑے محافظوں یا پاسبانوں پر اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرے آمین (باقی)

کشمیر میں اسلام کی اشاعت

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ کالج (کشمیر)

(۳)

صوفیائے کرام :۔ کشمیر میں اشاعتِ اسلام کا سہرا حضرات صوفیائے کرام کے سر ہے، انھوں نے یہاں وہ کام کیا جو حملہ آوروں سے نہ ہو سکا، ان ہی بزرگوں نے یہاں مستقل اقامت کرنے کی ہمت کی، اور پھر اسی غریب الوطنی کی حالت میں یہاں سیاسی اور مذہبی انقلاب بپا کئے، ان کی زندگی کی غرض و غایت صرف تبلیغ و اشاعتِ دین تھی، اس مقصد کو بروئے کار لانے میں وہ جان و مال کی بھی پروا نہ کرتے تھے، بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی "حالات کی ناسازگاری اور ناموافقت کا جو بھی قدم قدم پر دامن پکڑ کر کھینچتی تھی، لیکن شوق کی بے پایانی پکار پکار کر کہتی تھی ہ

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے[1]

برصغیر میں عموماً اور کشمیر میں خصوصاً ان ہی بزرگوں نے اسلام پھیلایا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں "کشمیر میں حملہ آوروں نے نہیں بلکہ مسلمان عالموں اور درویشوں

---

[1] تاریخِ مشائخِ چشت، پروفیسر نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی : ص ۱۴۳ ۔

کی تاثیروں نے مسلمانوں کے دلوں کو فتح کیا۔[1]

افسوس ہے کہ ناسازگار ماحول اور ناموافق زبان و تہذیب کی وجہ سے ہماری تاریخوں میں ان بزرگوں کے نام محفوظ نہیں رہے ہیں، جو قدیم زمانوں میں کشمیر تشریف لائے تھے، تاہم اب یہ یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ریشیان کشمیر وہ غیر ملکی بزرگانِ دین تھے، جو سید شرف الدین (بلبل شاہ) سے سالہا سال قبل کشمیر آئے تھے، اور ان میں بہت سے مقامی لوگ بھی مسلمان بن کر شامل ہوئے تھے، انھوں نے مل کر یہاں خاموش طریقے پر اسلام پھیلایا، تیرہویں صدی کے اختتام پر مارکوپولو کشمیر آیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق یہاں اس زمانے میں مسلمان موجود تھے، وہ لکھتا ہے کہ یہاں کے لوگ جانوروں کو نہیں مارتے، البتہ اگر وہ کبھی گوشت کھانا چاہتے ہیں تو مسلمانوں سے ذبح کراتے ہیں جو ان ہی میں رہتے بستے ہیں۔

سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت

سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بیان کیا ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین (متوفی ۷۸۵ھ) نے جتنے سفر کئے ہیں اتنے کسی بزرگ نے نہیں کئے ہیں[2]، مگر قدیم تاریخوں اور مستند تذکروں میں ان کے ورود کشمیر کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے، البتہ صدیاں گذرنے کے بعد ان کے بعض اخلاف کشمیر آئے، اور یہیں مستقل اقامت اختیار کی[3]، مگر تعجب یہ ہے کہ کشمیر کے چند مورخین حضرت شیخ کی کشمیر تشریف آوری کے قائل نظر آتے ہیں، اور ا ھنیں نہایت قدر

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۰۳۔

[2] لطائفِ اشرفی جلد ۲ بحوالہ بزم صوفیہ: جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن: ص ۳۷۰

[3] تذکرہ حضرت سید جلال الدین: جناب سخاوت مرزا صاحب حیدرآباد ۱۹۶۲ء ص ۲۵۲، ۲۵۳۔

منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں ہمعصر دور کے چند نامور کشمیری علماء نے بھی حضرت شیخ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے[1]، البتہ وہ ان کے کشمیر آنے کا کوئی ذکر نہیں کرتے، پروفیسر سری کنٹھ کول لکھتے ہیں کہ میر سید محمد ہمدانی (فرزند میر سید علی ہمدانی رح) اس وقت کشمیر آچکے تھے، جب سادات کی ایک نئی جماعت سید جلال الدین بخاری کی پیشوائی میں کشمیر وارد ہوئی[2] گریہ اسی نام کے دوسرے بزرگ ہیں، ان سے حضرت مخدوم جہانیاں مراد لینا صحیح نہیں ہے؛ اگر ان سے حضرت مخدوم مراد لیا جائے تو وہ از روئے تاریخ غلط ہوگا، کیونکہ حضرت میر ہمدانی کے بارے میں تذکرہ نگار، لکھتے ہیں کہ وہ ۷۹۶ھ میں کشمیر آئے، جبکہ اس سے نو سال قبل ۷۸۵ھ میں مخدوم شیخ بخاری کا انتقال ہوچکا تھا۔

---

[1] حضرت علامہ داؤد خاکی کشمیری فرماتے ہیں:۔

آں بخاری نسبتہ سید جلال الدین لقب	قطب عالم بودن مخدومیش اشہر شدست
کے بیاں کردن مقاماتش مجال می بود	خود زبان لال و عبارت زیں بیاں اقصر شدست
چشم فیض از لطف او دارم کہ فیض عام او	تا دم محشر پئے اتباع مستنشر شدست
اوست یک صاحبقراں یک قرن او مشہور لیک	زیں مشائخ ہر یکے ارشاد را محور شدست

وردالمریدین: مطبوعہ دہلی ص ۱۴،۱۶

ایک اور کشمیری عالم اور محدث ان کا تذکرہ ان اشعار سے شروع کرتے ہیں:۔

آنکہ از چشم نبوت زبدہ چوں انسان عین	در علو پایہ از نگاہ او فزودہ زیب زین
از بواطن صیقل فیضش زدودہ زنگ و رین	قطب عالم حضرت سید جلال الدین حسین

اسرار الابرار قلمی شیخ داؤد مشکوتی

[2] تمہید راج ترنگنی ص ۹۵ ۔

حضرت سید محمد گیسو دراز | حضرت گیسو دراز نے اگرچہ زیادہ سیاحت نہیں کی ہے تاہم اقبال الدین احمد کے مطابق شیخ گیسو دراز ملتان سے اٹک تک کے کنارے ایبٹ آباد پہونچے، پھر یہاں سے سیدھے سرینگر کشمیر وارد ہوئے تو حضرت سید علی ہمدانی آپ کا استقبال کرنے کے لئے نکلے، اور اپنی خانقاہ میں پہونچایا، یہاں کے فقراء سے ملاقات کی، پھر شیخ محمد گیسو دراز نے جامع مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر بہت دیر تک دعا کی، اور فاتحہ پڑھنے کے بعد کہا "یہاں اکثر بزرگ موجود ہیں"، اور دریائے جہلم سے مخاطب ہو کر کہا: "اے دریا کے اندر رہنے والے بزرگ اللہ کی رحمتیں آپ پر ہوں"، اس کے بعد شیخ محمد گیسو دراز سیالکوٹ کے ارادہ سے نکلے[1]۔

شیخ علاء الدین بن شیخ بدر الدین بن شیخ سلیمان بن شیخ فرید الدین گنج شکر | شیخ علاء الدین صرف سولہ سال کی عمر میں اپنے والد شیخ بدر الدین سلیمان کے سجادۂ رشد و ہدایت پر بیٹھے اور چھپن سال تک اپنے نانا شیخ فرید الدین گنج شکر (م ۵ محرم ۶۶۴ھ) کا فیض عام کیا، ان کے مریدوں میں کشمیر کے گرد و نواح کے لوگ بھی تھے، جنھیں ان کے ساتھ اتنی وابستگی تھی کہ اپنی جگہوں پر ان کی یادگار میں "روضے" تعمیر کئے جن سے وہ تبرک حاصل کرتے تھے، سید محمد بن مبارک کرمانی (امیر خورد) لکھتے ہیں:

صیت عظمت و کرامت او ہم در	ان کی زندگی ہی میں ان کی عظمت و
حیات عزیز او میان عالم منتشر شد	وکرامت کی شہرت دنیا میں پھیل گئی
و اسم مبارک او میان سامی ولیا	اور اولیاء اللہ کے ہاں ان کا نام
مذکور و مشہور گشت، چنانکہ در	مشہور ہوا، چنانچہ اجودھن دیپال پور
دیار اجودھن دیپال پور و جائے کہ	اور کشمیر کی جانب ایک پہاڑ کے

[1] تذکرہ خواجہ گیسو دراز: اقبال الدین احمد: ص ۴۵، اقبال پبلشرز حیدرآباد کالونی کراچی۔

ست کثیر است خلق آن دیار را از ارادت	لوگوں نے زبردست محبت اور اعتقاد
محبت و اعتقاد مقامہا ساختہ اند و قبر او	کے زیر اثر ان کے نام پر مقامات مقدسہ
بنام روضۂ متبرکۂ او چمن و تبرک می گیرند	تعمیر کیے، جن سے وہ تبرک حاصل کرتے
و در آں موضع صدقات و ختمات می کنند[1]	ہیں اس کے علاوہ ان جگہوں پر ختمات
	پڑھتے اور صدقات دیتے ہیں۔

سید شرف الدین عبد الرحمن بلبل شاہ کشمیر میں اپنے اصلی نام سے زیادہ عرف ہی سے مشہور و معروف ہیں، کشمیر کی سیاست میں سب سے پہلے ان ہی کی مساعی جمیلہ سے اسلام داخل ہوا، اسی وجہ سے ان کا نام ہماری تاریخوں میں محفوظ رہا ہے، مگر بدقسمتی سے ان کے ورود کشمیر اور خدمت اسلام کو کرامات کے چکر میں الجھا دیا گیا ہے، جس سے بہت سے تاریخی واقعات پردۂ بے خبری چڑھ گئی ہے، یہاں تک کہ بعض حضرات ان کو کشمیر وارد ہونے والا پہلا مسلمان قرار دیتے ہیں، جو از روئے تاریخ صحیح نہیں ہے۔

وہ حضرت شاہ نعمت اللہ فارسی کے مرید تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ جب کشمیر کا حکمران رینچن تخت نشین ہوا تو اس کو اپنے موروثی مذہب اور کشمیر میں دوسرے مذاہب سے بے اطمینانی ہوئی، وہ ایسے مذہب کی تلاش میں لگا جو اسے روحانی سکون اور قلبی اطمینان دے سکتا تھا، اس مقصد کے لیے اس نے کشمیر میں مختلف مذاہب کے نمایندوں کو بلایا، اور ان کے ساتھ بحث کی، وہ کسی بھی مذہب سے مطمئن نہ ہوا، اس نے فیصلہ کیا کہ صبح سویرے جس شخص پر بھی اس کی پہلی نظر پڑے تو وہ اسی کا مذہب قبول کریگا، صبح سویرا اس کی

---

[1] سیر الاولیاء مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ: ص ۱۹۳۔

سید شرف الدین پر پڑی جو دریائے جہلم کے کنارے نماز ادا کرتے رہے تھے رینچن نے ان کو بلایا، اور ان کے مذہب اور نماز کے بارے میں پوچھا، اسی وقت مسلمان ہوا، اور صدرالدین اسلامی نام اختیار کیا، حضرت شیخ نے جہلم کے کنارے ایک خانقاہ تعمیر کی، اور اس کے ساتھ ایک لنگر بھی کیا، بعد میں یہ جگہ بلبل لنگر یا بلبل لنکر کے نام سے مشہور ہوئی، حضرت شیخ نے یہیں انتقال کیا، اور یہیں مدفون بھی ہیں[1]، اس طرح سلطان صدرالدین (رنبچن) رینچن کشمیر کا پہلا مسلمان ہوا، اور سیاسی اعتبار سے اسی وقت ہندو دورِ حکومت کا اختتام عمل میں آیا،

سید شرف الدین کے بعد کشمیر میں اشاعتِ اسلام جیسے اہم کام میں شیخ شرف الدین نے غیر معمولی خدمت انجام دی، مگر شاید زیادہ وقت نہ ملنے کی وجہ سے وہ کوئی انقلاب نہ لا سکے چنانچہ حضرت شیخ شرف الدین کے انتقال کے فوراً بعد کشمیر میں اسلام کے نوزائیدہ نقوش و اثرات مٹنے شروع ہوئے، اور یہاں جو مسلمان موجود تھے وہ دین سے غافل محض ہو کر صرف نام کے مسلمان رہے، زندگی کے آداب و رسوم میں وہ ہندو مذہب کی تقلید کرنے لگے، یہاں تک کہ بہت جلد بنیادی عبادات و عقائد سے بھی بے خبر ہوئی، مگر قدرت کا منشاء یہی تھا کہ کشمیر میں غیر اسلامی تہذیب و معاشرت اپنی آخری گردش مکمل کرے اور اس کی جگہ اسلام ہی پھیلے، اور اسے استحکام ملے، اس لئے کچھ ہی مدت کے بعد ایران و عراق کے شیوخ اور اکابر کی جماعت کشمیر وارد ہوئی، انھوں نے کشمیر کے چپے چپے پر مساجد، خانقاہیں اور تربیت گاہیں قائم کیں، جس کے نتیجے میں مختصر مدت کے بعد ہی یہاں عظیم [illegible] اور تہذیبی انقلاب رونما ہوا، اس جماعت کی راہنمائی اور سربراہی امیر سید علی بن شہاب الہمدانی کی (شیخ ہمدانی) نے کی، کشمیر میں جو گرانقدر تبلیغی اور روحانی خدمات انجام دیئے اس کا اندازہ اسی سے لگا

[1] یہ معلومات ہم نے تاریخ حسن ج ۲ و ۳، تاریخ اعظمی اور اسرار الابرار سے لئے ہیں۔

جا سکتا ہے کہ وہ کشمیر میں بانیٔ اسلام کے لقب سے مشہور ہیں، بلکہ ایک یورپی مقالہ نگار نے اسی مناسبت سے انھیں پیغمبرِ کشمیر کے نام سے یاد کیا ہے۔

اسلامی دنیا میر سید علی ہمدانی کے عہد میں: شیخ ہمدانی کا زمانہ عالم اسلام کے لئے امید و اضطراب کا زمانہ تھا، ایک طرف تاتاریوں کے حملوں سے ہر طرف کھنڈرات دکھائی دیتے تھے، اور دوسری طرف انہی کھنڈرات سے اذانیں بھی سنائی دے رہی تھیں،

شیخ ہمدانی نے ۱۲ رجب ۷۱۴ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۳۱۴ء میں ولادت پائی اور ان کا انتقال ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں ہوا، اس طرح ان کا زمانہ لگ بھگ آٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی عیسوی پر پھیلا ہوا ہے، شیخ ہمدانی کی ولادت سے ایک صدی قبل چنگیز خاں اور اس کی درندہ صفت قوم کی خون آشام تلوار اور بے لگام بربریت سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے گہوارے تودۂ خاک ہو گئے تھے، میر سید علی ہمدانیؒ کا وطن بھی اسی آگ کی لپیٹ میں تھا،

مگر ابھی کچھ دہائیاں بھی نہ گزرنے پائی تھیں کہ کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ خاک اور راکھ کے ان ڈھیروں میں اسلام کی چنگاریاں سلگتی نظر آئیں اور ٹوٹے ہوئے در و دیوار اور بکھرے ہوئے کھنڈرات میں نعرہائے تکبیر سنائی دئے،

میر سید علی ہمدانی کے زمانے میں یہی منگول جو عام مذاہب کو بالعموم اور اسلام اور مسلمانوں کو بالخصوص فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے میدان میں آئے تھے، اب جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے اور پورے عزم و شوق کے ساتھ اسلام کی احیائے نو میں مصروف ہوئے، سب سے پہلے برکہ خاں، مدت حکومت ۱۲۵۶ء تا ۱۲۶۵ء، جو چنگیز کے بیٹے جوجی خاں کی اولاد میں سے تھا دائرۂ اسلام میں داخل ہوا، اس نے مصر کے بادشاہ رکن الدین سے مصالحت کی، ہلاکو خان نے

بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، مگر اس کا بیٹا تکودار خاں نہ صرف خود مسلمان ہوا بلکہ دوسرے
تاتاریوں کو بھی دائرۂ اسلام میں لانے میں کوشاں رہا، ۱۲۸۴ء میں تکودار ایک سازش کا شکار ہو کر
قتل کیا گیا، یہ سازش ارغون خاں کی تھی، جو تکودار کو قتل کرنے کے بعد خود مالک تاج و تخت بنا،
اس کے زمانے میں مسلمانوں کو کچھ وقت کے لئے دوبارہ سخت آزمائشوں کا شکار ہونا پڑا، مگر ۱۲۹۵ء
میں غازان خاں تخت نشین ہوا، اس نے نہ صرف خود اسلام قبول کیا، بلکہ اسلام کو ایران کا شاہی
مذہب بھی قرار دیا غازان خاں نے ۱۳۰۴ء تک ایران میں اسلام کی اشاعت کی ہر ممکن کوشش کی،
اس کے بعد اس کا بھائی سلطان محمد خدابندہ تخت نشین ہوا، اس کا دینی رجحان ابتدا میں عیسائیت
کی طرف تھا، کیونکہ اس کی ماں عیسائی تھی، مگر وہ اپنی ماں کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی مسلمان بیوی
کی ہدایت و نصیحت پر مسلمان ہوا، اس کے مسلمان ہونے سے بہت سے [illegible] کے دل بھی بدل گئے اور
انھوں نے بھی اسلام قبول کیا، اسی زمانے میں جناب میر سید علی ہمدانی کی ولادت ہوئی، مغلوں کی
ایک شاخ بلاد متوسط پر قابض تھی، اس میں جو سب سے پہلا خان مسلمان ہوا وہ براق خان تھا،
اس نے اپنا نام غیاث الدین رکھا، اگرچہ اس کے بعد مغلوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، مگر کچھ
[illegible] کے بعد اس خاندان کے ایک اور بادشاہ ترمشرین خان (۱۳۲۲ء تا ۱۳۳۳ء) نے اسلام
قبول کیا، اس کے اثر سے تاتاری کثیر تعداد میں مسلمان ہوئے، اس وقت میر سید علی ہمدانی کی عمر لگ
بھگ پندرہ سال کی تھی، اسی زمانے میں کاشغر کا مشہور اور صاحب سطوت حکمراں امیر تیمور شیخ جمال الدین
کی راہنمائی سے مسلمان ہوا، اگرچہ امیر تیمور بڑا سفاک تاتاری تھا، مگر اس نے اسلام کی نشر و اشاعت
اور اسلامی رسوم و قواعد کے استحکام کی طرف بھی توجہ کی[1]،

اسی عہد میں اسلام اور اہل اسلام کے لئے ایک اور خوش آیند چیز یہ تھی کہ عثمانی ترک پوری

---

[1] اس کے لئے ظفر نامہ یزدی ملاحظہ کی جا سکتی ہے،

قوت و طوت کے ساتھ ابھرنے لگے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے پوری ہمت کے ساتھ میدان میں آئے، شیخ ہمدانی کی زندگی کے آخری دور میں سلطان مراد اول کو دھوکے سے قتل کیا گیا اور بایزید اول نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اپنا قدم جمانے اور ملک میں امن و اطمینان قائم کرنے کے بعد اس نے فرنگیوں کی طرف رخ کیا، جو مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے اور اقتدار سے ہر طرف محروم رکھنے کے لیے صدیوں سے کوشاں تھے، بایزید نے ۱۳۹۳ء (یعنی شیخ ہمدانی کے انتقال کے صرف پانچ سال بعد) بلغاریہ اور سربیا کو اپنے قبضے میں لے لیا، پھر ۱۳۹۶ء میں فرانس، انگلستان اسکاٹ لینڈ، لمبارڈی، جرمنی اور آسٹریا کے ۱۲ لاکھ اشخاص پر مشتمل فرنگی فوج کو شکست فاش دی، بدقسمتی سے بایزید اور امیر تیمور میں جنگ چھڑ گئی، دونوں قوت و قاہری میں ہم پلہ تھے، اس لئے دونوں طرف سے گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں بالآخر امیر تیمور ہی کامیاب رہا، اس نے بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) میں شکست دی اور اسے گرفتار کیا، یہ دونوں اس عہد میں ایسے دبدبے کے حکمراں تھے کہ اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تو یہ ضرور مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کو اسلامی جھنڈے کے نیچے لا سکتے تھے۔

جس زمانے میں ایران، عراق، ترکستان اور شام وغیرہ ممالک تاتاریوں کی قہرمانیوں کے نذر ہوئے، اس زمانے میں دو ایک اسلامی سلطنتیں محفوظ رہیں، ہماری مراد وسیع و عریض ہندوستانی مملکت اور مصر سے ہے، ہندوستان ان عرب اور وسط ایشیائی مہاجر علماء اور صوفیہ کا ملجا و ماوی بن گیا، جو مغلوں کے جبر و قہر سے بچ کر ہندوستان وارد ہونے میں کامیاب ہوئے تھے، انھوں نے ہندوستان میں مستقل طور پر اقامت اختیار کی اور پھر بہت جلد اپنے علم و فضل، فن و ہنر اور زہد و تقویٰ سے اس ملک کو اسلام کی فکری، روحانی، تہذیبی اور علمی یگانگت کا مرکز بنایا، اسی طرح جب تاتاری خوارزم، نیشاپور، ہمدان، سمرقند، بخارا، رے، بخان، مرو

اور بغداد کو زیر و زبر کر کے مصر کی طرف بڑھنے لگے تھے تو مصر کے حکمران سیف الدین قطز کے ہاتھوں ان کو شکستِ فاش ہوئی، اس طرح یہ ملک بھی مصئون و محفوظ رہا،

اسی زمانے میں اسلامی دنیا میں بالعموم اور مصر و شام میں بالخصوص نامور مجدد اسلام اور نادرۂ روزگار فاضل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حرانیؒ کا غلغلۂ علم اور نعرۂ اصلاح و تجدیدِ دین بلند ہوا، ان کے انتقال کے وقت میر سید علی ہمدانی کی عمر چوده سال کی تھی، ابن تیمیہ نے اس زمانے میں سیاست علم، دین اور زندگی کے تمام گوشوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کے لیے سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کیا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں انھوں نے مسلمانوں میں اپنی تصنیفات کے ذریعہ سے ان کے علمی جمود پر کاری ضرب لگا دی، اس کے علاوہ اپنے باکمال شاگردوں کی ایک جماعت بھی تیار کی، جن میں علامہ ابن قیم، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رجب وغیرہ جیسے اکابر امت شامل ہیں، اور یہ سب شیخ ہمدانی کے معاصر تھے۔

اس عہد میں مسلمان سلطنتوں کے حکمرانوں میں دین کا گہرا جذبہ پایا جاتا تھا اس وقت کے ہندوستانی حکمران زہد و تقویٰ میں کسی بڑے سے بڑے عابد شب زندہ دار سے کم نہیں تھے، اسی طرح تاتاری نو مسلم حکمران بھی بغیر کسی جبر و اکراہ یا مصلحت "سیاست" کے اسلام کے شیدائی بن گئے تھے، اور ان میں اسلام کو جاننے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا، حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اپنی فاضلانہ تصنیف ذخیرۃ الملوک کے پیش لفظ میں اسی تاریخی حقیقت کی غمازی کرتے ہیں۔

یقول العبد الفقیر علی بن	فقیر بندہ علی بن شہاب ہمدانی
شہاب الہمدانی کہ مدتی بود کہ	عرض کرتا ہے کہ کافی وقت سے

جمعی از ملوک و حکام اہلِ اسلام	کہ مسلمان سلاطین، حکام، امراء
و اماجد و اشراف نوعِ انام	اور اکابر امت کی ایک جماعت جو دینی
کہ در استصلاحِ امورِ دین اہتمام	امور کی اصلاح میں کوشاں ہے
می نمودند و آئینۂ دل را از غبار	اور دلوں سے گناہوں کی گندگی
ادناسِ آثام می زدودند، کثّر	دور کرتی ہے (خدا دنیا میں ان
فی الدنیا امثالہم و حسّن فی	کی تعداد میں اور اضافہ کرے
الدنیا امثالہم و حسّن فی العقبیٰ	اور عقبیٰ میں ان کا انجام اچھا
اٰمالہم و مناٰلہم.	کرے)

اس زمانے میں ان بزرگوں نے قلم و قرطاس اور شمشیر و سنان کو ثانوی حیثیت دی اور نہایت سکون کے ساتھ اسلام کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلایا، انھوں نے اپنے آرام کو تج دے کر عمر بھر سیاحت کی، اور دشت وجبل میں اذانیں دیں، اور ویرانوں اور بیابانوں میں خانقاہیں تعمیر کیں، اور اشاعتِ اسلام کے ایسے کارنامے انجام دیئے جو بڑے سے بڑے سلاطینِ اسلام کے تصوّر میں بھی نہ آئے ہوں گے، انہی بوریہ نشیں دینی خادموں میں امیر سیّد علی ہمدانی بھی ایک تھے، جو اپنے وقت کے صحیح معنوں میں سفیر کبیر اور جوال آفاق تھے،

اسلام داخل ہونے سے قبل کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات

ان حالات کو مدنظر رکھ کر جب ہم اس زمانے کے کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہندو تہذیب و سیاست کے خاتمہ کی علت بھی سمجھ میں آتی ہے، اور میر سید علی ہمدانی کی حیران کن کامیابی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے، صاف نظر آتا ہے کہ کشمیر کا معاشرہ

کسی دوسرے مذہب اور کسی دوسری تہذیب کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا، اور ٹھیک جس طرح ازمنۂ اولیٰ میں اسلام کے لیے دنیا ساز گار ہوئی تھی، اور نہایت سرعت کے ساتھ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا، اسی طرح کشمیر بھی کسی تازہ پیغام کا منتظر تھا، آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں کشمیر میں ہندو تہذیب، حکومت اور ثقافت دم توڑ رہے تھے، ہر طرف زوال وانحطاط کے بادل منڈلا رہے تھے، لوگ طویل العمر مذہب سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، سماج طبقات میں منقسم تھا، نچلی ذات کے طبقے مقہور و مظلوم تھے، مذہبی پیشوا چند رسوم میں مقید ہو گئے تھے، انھوں نے عوام الناس کو اوہام فاسدہ میں مبتلا کر رکھا تھا، علم و ادب کا بازار بے رونق ہو گیا تھا، جو کسی زمانے میں غیر ملکی اہلِ علم کے لیے بھی باعثِ جذب و کشش تھا، اس زمانے کی کشمیری شاعرہ للّہ عارفہ کے ذریعہ سے وقت کے سماجی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ اپنے زمانہ کی عظیم ترین کشمیری شاعرہ سمجھی جاتی ہیں، اور بلاشبہ اس کے اشعار اس کے ذہنی افق کی بے پناہ وسعت اور حساس طبیعت کے شاہد ہیں، ڈاکٹر پارمو للّہ کی شاعری کے حوالہ سے لکھتے ہیں:-

"للّہ کے کلام اور اس کی زندگی کے احوال وواقعات کا مطالعہ کرکے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کشمیر کی ہندو سوسائٹی مکمل طور پر بگڑی ہوئی تھی، مرد بدچلن اور بدکردار تھے، جبکہ عورتیں بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھیں، ہندو مذہب زیادہ تر شیو ازم کے اصول و قواعد کے گرد گھومتا تھا، لوگ عموماً نیز نجات، سحر، غیر ذی روح اشیاء نیز چشموں اور دریاؤں پر ایمان و یقین رکھتے تھے، اور ان کی پوجا و پرستش

بھی قدیم طریقے پر ہوتی تھی، للہ کی قسمت کے لیے کشمیر کے برہمنی مذہب میں
اصلاح کرنا لکھا تھا، للہ کی اصلاح کو بھی اس صدی کی اس مشہور اور مقبول
اصلاحی تحریک کا ایک حصہ بننا تھا، جس تحریک کے سربرآوردہ اور روح
رواں رامانند، کبیر اور نانک جیسے لوگ تھے، للہ اس وقت تک اپنے برہمنی
مذہب پر اسی طرح عمل کرتی تھی، جس طرح مذہبی پیشوا (گرو) تبلیغ کرتے
تھے للہ نے بھی حسبِ دستور ریاضت اور نفس کشی پر عمل کیا، مگر یہ سب رسمی طریقے
فضول اور بےکار ثابت ہوئے، اس نے اب مذہب کے ظاہری رسوم کے
خلاف آواز بلند کی، اور درختوں، دریاؤں اور مندروں کے پتھروں اور بتوں کے
خلاف علم بغاوت بلند کیا، اس کے نزدیک مندر کے پتھر چکی کے پاٹ سے زیادہ
بہتر نہیں ہیں، بت اس کے بقول تراشا ہوا پتھر ہے اور مندر ان ہی پتھروں
کا گھر ہے، بتوں کی پرستش بےثمر اور غیر معقول ہے، حق کا عرفان صرف اسی
صورت میں ہوگا جب اخلاص، پاکیزگی اور مساوات کی فضا پیدا کی جائے،
اور پھر اسی فضا میں ذات سے نجات حاصل کرنے کی جد و جہد کی جائے، للہ نے
شیوازم کی بھی مخالفت کی، جس پر اس زمانے کے پیشوایانِ مذہب عمل
کرتے تھے، ان مذہبی پیشواؤں کے بارے میں للہ عارفہ کہتی ہے کہ یہ لوگ شعبدہ
بازوں کے استاذ ہیں، للہ تسلیم کرتی ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں کی شعبدہ
بازی طاقتور ہے، یہ لوگ بہتی ہوئی ندی کو روک بھی سکتے ہیں، بھڑکتی
ہوئی آگ بجھا سکتے ہیں، اور مصنوعی گائے سے دودھ حاصل کر سکتے ہیں،
مگر یہ سارے کمالات جیسا کہ للہ نہایت نفرت اور حقارت کے ساتھ کہتی ہے،

مداری کے کھیل ہیں، اس قسم کی عبادت کے خلاف للہ نے آواز بلند کی، اس
اس نے ریاکاری و مکاری پر مبنی عبادت، نفاق، تقشف اور خود ساختہ
رسوم و لوازم کی علانیہ مذمت کی، للہ نے یوگا کا پرچار کیا۔[1]"

ایک مورخ ڈاکٹر ترشی نے درج ذیل الفاظ میں داخلۂ اسلام سے قبل کشمیر کے
سیاسی اور سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔

"کشمیر میں اسلام داخل ہونے سے تین سو سال قبل کی تاریخ بالخصوص
سیاسی حالات افسوسناک اور نفرت انگیز ہیں، اصل میں تنزل عام
نے یہاں اسی وقت سر نکالنا شروع کیا، جب سنگرام راجہ ۱۰۰۳ء میں
لوہار خاندان کے بانی کی حیثیت سے منظر پر آیا، زندگی کے ہر شعبہ میں
چاہے وہ سماجی ہو یا اقتصادی، تنزل و انحطاط شروع ہو کر پھیلنے لگا
ہر چند، اکالا، جے سمہا اور جگدیو جیسے مدبر حکمرانوں نے اصلاح و تنظیم
کی جانب توجہ کی، مگر ان کی کامیابی بھی وقتی تھی، اور ۱۳۲۰ء میں
عام بے چینی اور خلفشار کی کیفیت میں ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔"

معاصر تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے باشندے چاہے وہ
جوان ہوں یا عمر رسیدہ زندگی کی خوبیوں کو پس پشت ڈال کر سازشوں اور
غداریوں میں ڈوب گئے تھے، جس سے مہذب سوسائٹی کا حلیہ ہی
بگڑ گیا تھا، اخلاقی بے راہ روی تمام لوگوں کی طبیعتوں میں رچ
بس گئی تھی کشمیر کا ایک راجہ کلاسا ۱۰۶۳ء تا ۱۰۸۹ء ایسی بے لگام شہوت اور

---

[1] A History of Muslim Rule in Kashmir P. 11-111.

دوسری کا عادی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی عصمت لوٹنے کی حد پہنچا ہو تھا ۔ یہ
کا تابع حکمراں ہرشا دت۱۰۸۹تا ۱۱۰۱ء) اخلاقی لحاظ سے اتنا گرا ہوا تھا کہ
اس نے محرمات یعنی اپنی بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ بھی شادی
رچائی ، اس عہد کے دوسرے حکمراں بھی سست نااہل اور احمق
ثابت ہوا کرتے تھے ، ان خامیوں کی بنا پر وہ اپنے طاقتور وزیروں
اور بڑے جاگیرداروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے تھے ، یہ وزیر
اور جاگیردار بادشاہ گر کا اونچا مقام حاصل کر چکے تھے ، انتشار پسند
طاقتوں کے ابھرنے اور مملکت کی نزاعوں ، سازشوں بغاوتوں وہلاکت خیز
جنگوں نے کشمیر کو تباہ اور درہم برہم کر دیا تھا اس صورت حال میں کشمیر کا ملک
ایسی زمین بن گئی جس کی نہ کوئی پونجی تھی اور نہ سرمایہ اور جو وزیروں
اور جاگیرداروں نما ڈاکوؤں سے بھر گئی تھی ، ان حالات میں نظم و قانون
کو قابو میں لانا محال بن گیا تھا ، اور لوگوں کا جان و مال غیر محفوظ رہ گیا
تھا ، عام لوگ جابر و حریص وزیروں اور افسروں کے ہاتھوں غیر انسانی
مظالم اور اقتصادی استحصال کے ہدف بن گئے تھے ، مملکت کے اونچے
عہدے دار سرکاری ملکیت کو خورد برد کرتے ، مندروں کی دولت لوٹتے اور
دیہاتی باشندوں سے نقد و جنس چھینتے تھے ، لوگ بھاری ٹیکسوں اور دوسرے
غیر مساوی مطالبات کے نیچے دب کر کراہتے رہتے تھے ، داخلی بدنظمی نے اندرونی
تجارت کو درہم برہم کر دیا تھا ، اور بعض اوقات بیرونی تجارت بھی مکمل طور
پر معطل ہو گئی تھی ، مورخ کلہن تاجروں کے حرص و آز اور ان کی بد دیانتی

کی طرف بھی اپنی تاریخ میں اشارہ کرتا ہے۔ ؎

میر سید علی ہمدانی اور ورودِ کشمیر

یہ تھے وہ حالات جن میں کشمیر کی سرزمین مکمل طور پر الجھی ہوئی تھی، کشمیر سے ملحق بیرونی ممالک کے سلاطین کشمیر کے سارے حالات سے باخبر تھے، سیاح تاجر اور مبلغ دوسرے راستوں سے یہاں داخل ہوتے تھے، اور صوفیائے کرام بھی آئے دن یہاں وارد ہوتے رہتے تھے، اسی لیے میر سید علی ہمدانی نے یہاں کی تبلیغی خدمات میں گہری دلچسپی لی، اور اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

پروفیسر آرنلڈ T. W. Arnold نے لکھا ہے کہ امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کشمیر وارد ہونے کا باعث امیر تیمور کے قہر و غضب سے بچاؤ حاصل کرنا تھا، مگر اس کی تائید کسی بھی قدیم ذریعہ سے نہیں ہوتی ہے، شیخ ہمدانی عمر بھر سیاست وقت سے کنارہ کش رہے، وہ دین کے خادم اور روحانی پیشوا تھے، ان کے لیے ہر ملک ملکِ خدا ہونے کی وجہ سے کسی بادشاہ کی اعانت یا کسی کی مخالفت کرنا غیر ضروری تھا، اور کسی حکمراں سے ٹکر لینے کا ان کے ہاں سوال بھی پیدا نہ ہوتا تھا، وہ حکمرانوں کے محتاج نہیں تھے بلکہ سلاطینِ وقت ہی ان کی معاونت کے طالب ہوئے، پھر تاریخی اعتبار سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی ہے، امیر تیمور ۷۳۶ھ میں تولد ہوا تھا، اس وقت شیخ ہمدانی کی عمر ۲۲ سال کی تھی، امیر تیمور کو سلطنت حاصل کرنے کے لیے ہی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ دوڑ دھوپ میں صرف کرنا پڑا، جب اس نے توسیعِ مملکت کی طرف توجہ کی تو اس وقت شیخ ہمدانی کا انتقال ہو چکا تھا، یعنی شیخ ہمدانی کا انتقال

؎ S. Zain ul Abidin of Kashmir Dr. N. K. Zutshi. P. 4. 5

۷۷۱ھ یا ۷۷۲ھ میں ہوا، اور امیر تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان کی جانب توجہ کی، اور وہ ۸۰۱ھ میں دہلی پر قابض ہوا، ۸۰۳ھ میں دمشق، حلب اور بغداد کو اپنے قبضہ میں لایا، اس کے بعد ایشیائے کوچک (Asia Minor) کی طرف متوجہ ہو کر بایزید اوّل (یلدرم) کو شکست دی، امیر تیمور نے ۸۰۷ھ مطابق ۱۴۰۵ء میں وفات پائی، غرض امیر تیمور کا شیخ ہمدانی جیسے بزرگ کو ستانا صحیح نہیں معلوم ہوتا، البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ تیمور ابتداء میں ایرانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اس میں سادات (چاہے وہ علوی ہوں یا فاطمی) اور غیر سادات کا کوئی امتیاز نہیں تھا،

پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ شیخ ہمدانی کے نہایت قدیم سوانح نگار مولانا حیدر بدخشی لکھتے ہیں:۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی رو بقبلہ	امیر کبیر سید علی ہمدانی قبلہ رو بیٹھے
نشستہ بودند کہ حضرت رسول اللہ ﷺ	ہوئے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما
حاضر شدند و گفتند یا ولدی	ہوئے، فرمایا: میرے بیٹے تو کشمیر
در کشمیر رو و مردم آنجا مسلمان	جا، اور وہاں کے لوگوں کو مسلمان
کن، اگرچہ بعضی بشرف اسلام	بناؤ، اگرچہ ان میں کچھ اسلام لا چکے
مشرف اند اما بد تر از کافر	ہیں، مگر عملی اعتبار سے غیر مسلموں
(منقبۃ الجواہر قلمی)	سے بھی بدتر ہیں۔

واللہ اعلم اس حقیقت میں کتنی صداقت ہے، البتہ شیخ ہمدانی کی کامیابی یقیناً غیبی تائید سے مؤید تھی۔

پہلی سیاحت | شیخ ہمدانی سب سے پہلے ۷۷۴ھ میں کشمیر تشریف لائے، یہ زمانہ سلطان

شہاب الدّین کا عہدِ حکومت تھا، اگرچہ اس سیاحت کا کوئی غیر معمولی واقعہ شیخ ہمدانی کی سوانح یا تواریخِ کشمیر میں نہیں ملتا ہے، مگر ہمیں سلطان شہاب الدّین کی زندگی اور حکمرانی میں ایک گونہ انقلاب نظر آتا ہے، شہاب الدّین اپنی عظمت و جلالت میں تمام سلاطینِ کشمیر میں ممتاز و منفرد تھا، اس نے بگڑی ہوئی سلطنت جس شان سے منظم کی اور مملکت کے حدود کو وسعت دینے میں جس شجاعت و صلاحیت کا ثبوت دیا، اس لحاظ سے وہ یقیناً کشمیر کے قدیم راجہ للتادیتہ کا ثانی تھا، سلطان نے فتح و تسخیر کی ابتدا ایکلی، سودگر، تبت، دوسری طرف کشتواڑ اور جموں، آگے پشاور ہوتے ہوئے کابل، بدخشاں، دامغان، غزنین، غور، قندھار میں اپنی فتح و نصرت کے خیمے نصب کیے، آگے کوہ ہندو کش تک پہونچا، واپسی پر پورے پنجاب کو اپنے قبضے میں لایا، اور دہلی پر دھاوا بولنے لگا، اسی زمانے میں جب سلطان اپنی شجاعت اور وسعت سلطنت میں بلند مقام پر فائز ہو رہا تھا حضرت میر علی ہمدانی تائیدِ غیبی کے علاوہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے موقع و محل کے بھی منتظر تھے، چنانچہ جس وقت دہلی کے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق اور کشمیر کے سلطان شہاب الدّین کے درمیان لڑائی شروع ہوئی، میر سید علی ہمدانی نے ان دونوں حکمرانوں کے درمیان مصالحت اور تعلقات قائم کرنے کے لئے دروازہ کھول دیا، اس کے علاوہ سلطان شہاب الدّین کی فوج میں بیہقی سادات بھی تھے، جن میں سید تاج الدّین بیہقی کے فرزند میر سید حسن بیہقی امیر لشکر تھے، یہ بیہقی سادات شیخ ہمدانی کے متعلقین اور اقارب تھے ممکن ہے کہ کشمیری حکمراں کے لشکر میں بیہقی سادات کے اس عمل دخل کے پیچھے میر سید علی ہمدانی کی سیاسی بصیرت بھی کارفرما رہی ہوگی، اسی طرح سلطان شہاب الدّین نے اپنی حکمرانی کے آخری دور میں اسلام کی اشاعت میں شدت اختیار کی تھی، جیسا کہ مورخ حسن نے لکھا ہے،

"آخر عمر در تخریب بت خانہا افتادہ، بت خانہ بیشور کردہ بجیادہ بسیار مرتفع بود شکستہ ودر نفس شہر ہر جا کہ بت خانہائے ہنود موجود بود ویران ساخت"[1]

اس تغیر حالات کے پیچھے بھی میر سید علی ہمدانی کی اصلاح اور تبلیغ کا اثر اور دخل تھا۔

پہلی سیاحت کے دوران شیخ ہمدانی نے تھوڑے ہی وقت کے لئے قیام کیا، اس دوران میں وہ منظر عام پر نہیں آئے، البتہ حالات کا گہرا جائزہ لیا، اور حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل کرنے کے لئے کامیاب کوشش کی،

دوسری سیاحت | تین یا چار سال بعد شیخ ہمدانی نے ۷۷۳ھ میں کشمیر کی جانب دوبارہ توجہ کی، اس مرتبہ وہ پورے عزم کے ساتھ یہاں تشریف لائے، انھوں نے اپنے ساتھ وسط ایشیا کے بلند رتبہ علما، مبلغین، روحانی پیشوا، ماہرین صنعت وحرفت، سرکردہ اور صالح فنکاروں کی ایک بڑی جماعت اپنی سربراہی میں یہاں لائے، اس وقت حکومت کشمیر کی باگ ڈور سلطان قطب الدین کے ہاتھ میں تھی، سلطان، شیخ ہمدانی سے پہلے ہی متعارف اور ان کے مرتبہ سے واقف تھا، جب اس نے شیخ ہمدانی کی تشریف آوری کی خبر سنی تو وہ آگے بڑھ کر ان کے استقبال کے لئے نکلا، شیخ ہمدانی نے بڑی آسانی کے ساتھ اپنے رفقا، کو کشمیر کے مختلف مقامات میں پھیلایا، اور انھیں مقامی لوگوں کی اصلاح وتربیت کا کام سونپا، ان لوگوں نے مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر کی جانب توجہ کی، اور لوگوں کو نئے دین اور نئی تہذیب سے روشناس کیا، خود شیخ ہمدانی نے بھی شہر کے مرکز میں دریا کے کنارے مصلیٰ بچھایا، اور ریاضت وعبادت کے ساتھ بڑے زور وشور سے لوگوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا، ان کی بے لوث دعوت حق اور للہیت کو دیکھ کر لوگوں نے جوق درجوق اسلام قبول کیا، یہ مقام بعد میں کشمیر کا

---

[1] تاریخ حسن ج ۲ -

عظیم الشان تبلیغی مرکز بن گیا، چند مورخین اور تذکرہ نگاروں نے میر سید علی ہمدانی کے بعض رفقاء کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ہم ان میں چند حضرات کا مختصر الفاظ میں تعارف پیش کرتے ہیں۔

میر سید حسین سامانی | شیخ داؤد مشکوتی ان کی شان میں کہتے ہیں:۔

آنکہ بر صلب رخا دست تصرف داشتہ ۔۔۔ در دل روشن در آں تخم محبت کاشتہ

از ہمہ کون و مکاں در حق نظر بگماشتہ ۔۔۔ حضرت سید حسین از دیں لوا افراشتہ

ایران کے رہنے والے تھے، ہرات سے تعلق رکھتے تھے، سلطان شہاب الدین کے عہد حکومت میں حضرت میر سید علی ہمدانی کے اشارے پر کشمیر تشریف لائے، ان کے ساتھ ان کے اہل خانہ بھی تھے، موضع کولہ گام (واقع ضلع اسلام آباد) میں دریا کے کنارے اقامت کی، یہاں اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں مرجع خلائق ہوئے، حضرت شیخ نور الدین ریشی کشمیری بھی ان سے استفادہ کرتے تھے، دونوں بزرگ روحانیت کے بلند مقام پر فائز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کی کئی کرامتیں نقل کی ہیں۔[1]

---

[1] اسرار الابرار قلمی، و تاریخ کشمیر اعظمی ص ۴۰، لاہور ۱۳۰۳ھ

مکاتیب شبلیؒ

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں موقع کے تمام ملی و قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس سالہ اجتماعی جدوجہد کی مسلسل تاریخ ہے، قیمت جلد اول ۔۔۔ قیمت جلد دوم ۔۔۔ روپیے

"منیجر"

دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس

از

ضیاء الدین اصلاحی

دارالعلوم دیوبند میں اس کا صد سالہ اجلاس ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳ ، مارچ ۱۹۸۰ء کو دھوم دھام سے ہوا ، یہ عظیم الشان اجلاس دارالعلوم کا چھٹا جلسۂ دستار بندی (کانووکیشن) بھی تھا ، اس کا پانچواں اجلاس ستر بہتر ۷۲ برس پہلے ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا ، اس کے بعد سے پھر کوئی اجلاس نہیں ہو سکا ، اس صد سالہ جشن کا غلغلہ گذشتہ کئی برسوں سے بپا تھا مگر یہ برابر ملتوی ہوتا رہا ، اب دارالعلوم کے قیام کو سو ۱۰۰ برس سے زیادہ ہو چکا ہے اور چودھویں صدی ہجری ختم اور پندرھویں شروع ہونے والی ہے ، اسلئے اجلاس میں اب مزید تاخیر مناسب نہیں سمجھی گئی

دارالعلوم دیوبند ایک عالمی درسگاہ ہے ، اس کی شہرت اس برصغیر کے علاوہ بیرونی ممالک تک پہنچ چکی ہے اس لئے اس کے اجلاس میں بین الاقوامی رنگ پیدا ہوگیا تھا ، اس میں افغانستان کو چھوڑ کر تقریباً پوری اسلامی دنیا کے نمایندے شریک تھے ،

ہندوستان کے گوشے گوشے سے دارالعلوم کے قدر دان اس کی تقریبات میں شرکت کے لئے ٹوٹ پڑے تھے ،

محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان کے طول و عرض ، مغربی ایشیا ، افریقہ ، یورپ اور لاطینی

امریکہ کے تقریباً پانچ لاکھ مسلمان اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ غالباً مسلمانان ہند کا اس سے بڑا علمی، تعلیمی اور دینی اجتماع کبھی نہیں ہوا تھا،

شرکائے اجلاس میں سات ہزار فضلائے دارالعلوم بھی تھے جن کی دستار بندی ہوئی، ہندی، انگریزی اور اردو اخباروں کے نامہ نگار، آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ و دہلی اور پاکستان ریڈیو کے نمایندے بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔

دارالعلوم نے دس ہزار سے زیادہ افراد کے کھانے اور ناشتے کا خود انتظام کیا تھا، مدرسہ اصغریہ دیوبند اور مسلمانان دیوبند نے بھی ہزاروں مہمانوں کی ضیافت کی، اس کے علاوہ لگ بھگ ۱۵۰ سو ہوٹل بھی تھے،

تقریبات کے لئے دارالعلوم سے ملحق شمال و مغرب جانب موضع قاسم پور کی پانچ تا ۱۴ بیگھ آراضی کرایے پر حاصل کی گئی تھی، اس میں اکثر بڑے بڑے کیمپ خود دارالعلوم نے لگائے تھے اور دوسری رفاہی تنظیموں کی طرف سے بھی کیمپ نصب کئے گئے تھے۔ جن میں شرکائے اجلاس کو جلسہ گاہ کے قریب ضلع وار اور صوبہ وار ٹھہرایا گیا تھا، روشنی اور پانی وغیرہ کا مناسب بندوبست تھا، دارالعلوم کے زیر نگرانی ایک طبیہ کالج بھی عرصہ سے قائم ہے، اس کی عمارت میں طبی امداد کے لئے ایک اسپتال کا انتظام کیا گیا تھا، اجلاس ایک نہایت وسیع و عریض پنڈال میں ہوا، جس میں تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا مگر یہ ناکافی ثابت ہوا،

حکومت ہند نے شرکائے اجلاس کی سہولت کے پیش نظر کنسیشن فارم جاری کئے تھے اور بعض مرکزی اور اہم شہروں سے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئی تھیں، اسٹیشن سے مہمانوں کو لانے کے لئے بسوں، کاروں اور جیپوں کا بھی انتظام تھا

پورا قصبہ بلا امتیاز مذہب و ملت مہمانوں کے لئے فرش راہ بنا ہوا تھا مگر خود منتظمین کو اتنے

بڑے مجمع کی توقع نہ تھی اس لئے نظم و ضبط پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

۱۲ مارچ کو جمعہ تھا، مختلف کیمپوں اور مسجدوں میں بھی جمعہ کی نماز ہوئی، سب سے بڑی جماعت جلسہ گاہ کے پنڈال میں ہوئی، جہاں لاکھوں شرکاء نے مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔

پہلا اجلاس جمعہ کی نماز کے بعد سعودی عرب کے شیخ عبد اللہ المحسن ترکی کی صدارت میں ہوا، وہ ریاض یونیورسٹی کے چانسلر اور سعودی عرب کے فرماں روا شاہ خالد کے خاص نمائندے تھے، اس سے پہلے مصر کے قاری عبد الباسط عبد الصمد نے قرآن پاک کی تلاوت کی، جن کی سامعہ نواز اور دل نواز قرأت سے پورا مجمع متاثر تھا، ان کا شمار دنیا کے ممتاز قاریوں میں ہوتا ہے، ان کے بعد کویت کے وزیر اوقاف شیخ یوسف جی نے اجلاس کا رسمی افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ دارالعلوم کے بزرگوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، پھر مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔

خطبۂ استقبالیہ کے بعد صدر نے شاہ خالد اور ولی عہد شاہزادہ فہد کا تہنیتی پیغام پیش کیا، انھوں نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے سلسلہ میں دارالعلوم کی مفید خدمات اور اس کے اکابر کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ جو چیز ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ ہوگی وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے اذیت کا باعث ہوگی۔

شیخ عبد اللہ المحسن ترکی نے اپنی حکومت کی طرف سے دارالعلوم دیوبند کو بیس لاکھ روپے کی نذر پیش کی، اسی اجلاس میں عراق کے نمائندے نے بھی دارالعلوم کے لئے چار لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا، کویت کی حکومت کی طرف سے چھ لاکھ روپیے کا عطیہ دیا گیا، بعض اور حکومتوں نے بھی دارالعلوم کو رقمیں دیں۔

ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی اس اجلاس میں شریک تھیں، گو بعض حا

میں ان کی شرکت کو تعجب انگیز سمجھا گیا، مگر ان کی تقریر عام طور سے پسند کی گئی جو شستہ و شگفتہ اردو میں تھی، انھوں نے قومی بیداری اور ملک کی آزادی کی جد وجہد میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے گوناگوں کارناموں اور قابل فخر یادگاروں کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ مسلمانوں نے ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ہم کو بھی ان پر فخر ہے، ان سے ہندوستان کو طاقت ملی،

۲۲ر مارچ کو دو عام اجلاس ہوئے اور ۲۳ر مارچ کو پانچواں اور آخری عام اجلاس ہو کر دوپہر میں یہ سہ روزہ تقریبات ختم ہو گئیں، یہ سب اجلاس عرب ملکوں کے نمائندوں کی صدارت میں ہوئے اور مختلف ملکوں کے نمائندوں، دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے بعض ارکان و اساتذہ نے کارروائی میں حصہ لیا، روس کی نمائندگی وسطی ایشیا اور قزاقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے وائس چیرمین ڈاکٹر یوسف شاکروف نے کی، یہ بورڈ دنیا کی مسلم تنظیموں کے ساتھ دوستانہ [illegible] تعلقات کے لیے قائم ہوا ہے، ڈاکٹر یوسف نے تقریر شروع کی تو مجمع سے [illegible] اور روس افغانستان سے واپس جاؤ، کی آوازیں سنائی دیں، اس پر اسٹیج سکریٹری نے کہا کہ ہم حاضرین کی ترجمانی کرتے ہوئے روسی نمائندہ سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے جذبات اپنی حکومت تک پہنچا دیں اور اس کو بتا دیں کہ ہم افغانستان میں روسی مداخلت کو سخت ناپسند کرتے ہیں،

ہندوستان کے علماء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور پاکستانی علماء میں مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام اللہ خاں کی تقریریں عام طور سے پسند کی گئیں،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے جہاں گوناگوں کمالات اور خوبیوں سے نوازا ہے وہاں ان کو تقریر و خطابت کا بھی بڑا ملکہ عطا کیا ہے، ان کی ہر تقریر کی طرح یہ تقریر بھی نہایت موثر ولولہ انگیز اور از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھی، انھوں نے بے مثال مجمع اور حاضرین کی غیر معمولی

قدر متاثر ہو کر اپنی تقریر قرآن مجید کی اس آیت سے شروع کی۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ	اور یاد کرو اس وقت کو جب تم زمین میں
فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ	قلیل اور ضعیف سمجھے جاتے تھے اور
النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ	ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک
رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ	نہ لیں تو اللہ نے تم کو جگہ دی اور اپنی
تَشْكُرُوْنَ ۝	مدد سے تم کو قوت بخشی اور پاکیزہ چیزیں
(انفال : ۲۶)	کھانے کو دیں تاکہ اس کا شکر کرو۔

اور فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے یہ آیت اس وقت الہام کر دی گئی ہے، انھوں نے مسلمانوں کا اصلی اثاثہ اور مابہ الامتیاز سرمایہ دین کو بتاتے ہوئے کہا کہ میں عربوں سے بھی یہ بات بارہا کہی ہے کہ آپ کو اسی دین کی بدولت اعزاز و اکرام حاصل ہوا تھا، آپ جب اس کی دعوت لے کر اٹھے تو ساری دنیا سے افضل و برتر سمجھے گئے اور آج اسی دین سے تعلق کم ہونے کی بنا پر ہم کو ناکامیوں اور محرومیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، دارالعلوم دیوبند کا قیام دین ہی کی حفاظت کے لئے عمل میں آیا تھا، اس کا یہ جشن اس عظیم جہاد کی یاد دلاتا ہے جو ایک صدی پہلے کفر و الحاد کے اندھیروں کے خلاف شروع کیا گیا تھا، مولانا علی میاں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے، انہوں نے اس ملک کو تہذیب، تمدن، زبان، خوبصورت اور پرشکوہ عمارتیں دے کر گل و گلزار بنا دیا، یہاں مختلف تہذیبیں آئیں مگر ان کا پتہ اور نشان تک باقی نہیں مگر اسلام باقی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب بھی باقی ہے، اس وقت یہ ملک اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے جس دلدل میں پھنس گیا ہے اور ملک کی اجتماعی زندگی میں جو گندگی بھر گئی ہے اس کی صفائی صرف مسلمان ہی کر سکتے ہیں، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے اور اپنے دینی امتیاز اور ملی تشخص

کو بھی برقرار رکھنا ہے، وہ کسی حال میں بھی نہ اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی یادگار کو چھوڑنا گوارا کریں گے اور نہ اپنے کو اس ملک کے قومی دھارے میں ضم ہونے دیں گے، مسلمان کسی سیاسی پارٹی کے رحم وکرم پر نہیں جی رہے ہیں بلکہ اُن کی حفاظت خدا کر رہا ہے، آج اگر اس ملک میں مسلمانوں کو رہنا اور باعزت زندگی بسر کرنا ہے تو پہلے اپنے خدا پر، پھر اپنے آپ پر اعتماد کرنا چاہیے، کسی سیاسی جماعت اور نظام کے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کو زندہ رکھے یا ختم کرے۔

آخر میں مولانا نے دارالعلوم دیوبند کی اِن چار امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا (۱) توحید خالص (۲) اتباعِ سنت (۳) تعلق باللہ (۴) اعلاء کلمۃ اللہ اور پھر ہر ایک کی نہایت موثر اور دل نشین تشریح کی۔

مولانا کی اس ایمان پرور تقریر سے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ان کو اپنی عظمت کا احساس ہوا، یہ تقریر بہت پسند کی گئی اور اس سہ روزہ اجلاس کا حاصل سمجھی گئی۔

اسی اجلاس سے مشہور پاکستانی عالم اور نامور سیاسی رہنما مولانا مفتی محمود نے بھی خطاب کیا، ان کی تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی تھی مگر ان کو ۳۵ سال کے بعد ہندوستان آنے اور اپنی مادر علمی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا مفتی صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ساڑھے تین سو مدارس کا ایک وفاق قائم ہے، انھوں نے تجویز پیش کی کہ جس طرح کا اجتماع اس وقت دیوبند میں ہو رہا ہے، اسی طرح کا اجتماع پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی کیا جانا چاہیے، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ توحید و اتباعِ سنت پر اصل زور دینا چاہئے اور نزاعی مسائل سے پرہیز کیا جانا چاہئے اور ان میں اعتدال پیدا کیا جانا چاہئے، ان کی تقریر بھی عام طور پر پسند کی گئی۔

اس اجتماع میں مختلف ملکوں کے صدور مملکت اور سربراہوں کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے جن میں پاکستان کے جنرل ضیاء الحق، مصر کے انوار السادات، اور ہندوستان کے صدر

قدر سے متاثر ہو کر اپنی تقریر قرآن مجید کی اس آیت سے شروع کی :-

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ	اور یاد کرو اس وقت کو جب تم زمین میں
فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ	قلیل اور ضعیف سمجھے جاتے تھے اور
النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَ	ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک
رَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ	نہ لیں تو اللہ نے تم کو جگہ دی اور اپنی
تَشْكُرُونَ ۝	مدد سے تم کو قوت بخشی اور پاکیزہ چیزیں
(انفال : ۲۶)	کھانے کو دیں تاکہ اس کا شکر کرو۔

اور فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے یہ آیت اس وقت الہام کر دی گئی ہے، انھوں نے مسلمانوں کا اصلی اثاثہ اور مابہ الامتیاز سرمایہ دین کو بتاتے ہوئے کہا کہ میں عربوں سے بھی یہ بات بار بار کہتا ہے کہ آپ کو اسی دین کی بدولت اعزاز و اکرام حاصل ہوا تھا، آپ جب اس کی دعوت لے کر اٹھے تو ساری دنیا سے افضل و برتر سمجھے گئے اور آج اسی دین سے تعلق کم ہونے کی بنا پر ہم کو ناکامیوں اور محرومیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، دارالعلوم دیوبند کا قیام دین ہی کی حفاظت کے لئے عمل میں آیا تھا، اس کا یہ جشن اس عظیم جہاد کی یاد دلاتا ہے جو ایک صدی پہلے کفر و الحاد کے اندھیروں کے خلاف شروع کیا گیا تھا، مولانا علی میاں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے، انہوں نے اس ملک کو تہذیب، تمدن، زبان، خوبصورت اور پر شکوہ عمارتیں دے کر گل و گلزار بنا دیا، یہاں مختلف تہذیبیں آئیں مگر ان کا پتہ اور نشان تک باقی نہیں مگر اسلام باقی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب بھی باقی ہے، اس وقت یہ ملک اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے جس دلدل میں پھنس گیا ہے اور ملک کی اجتماعی زندگی میں جو گندگی بھر گئی ہے اس کی صفائی صرف مسلمان ہی کر سکتے ہیں، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے اور اپنے دینی امتیاز اور ملی تشخص

کو بھی برقرار رکھنا ہے، وہ کسی حال میں بھی نہ اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی یادگار کو چھوڑنا گوارا کریں گے اور نہ اپنے کو اس ملک کے قومی دھارے میں ضم ہونے دیں گے، مسلمان کسی سیاسی پارٹی کے رحم و کرم پر نہیں جی رہے ہیں بلکہ اُن کی حفاظت خدا کر رہا ہے، آج اگر اس ملک میں مسلمانوں کو رہنا اور باعزت زندگی بسر کرنا ہے تو پہلے اپنے خدا پر پھر اپنے آپ پر اعتماد کرنا چاہیئے، کسی سیاسی جماعت اور نظام کے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کو زندہ رکھے یا ختم کرے،

آخر میں مولانا نے دارالعلوم دیوبند کی اِن چار امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا (۱) توحید خالص (۲) اتباعِ سنت (۳) تعلق باللہ (۴) اعلاءِ کلمۃ اللہ اور پھر ہر ایک کی نہایت موثر اور دل نشین تشریح کی،

مولانا کی اس ایمان پرور تقریر سے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ان کو اپنی عظمت کا احساس ہوا، یہ تقریر بہت پسند کی گئی اور اس سہ روزہ اجلاس کا حاصل سمجھی گئی،

اسی اجلاس سے مشہور پاکستانی عالم اور نامور سیاسی رہنما مولانا مفتی محمود نے بھی خطاب کیا، ان کی تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی تھی مگر ان کو ۳۵ سال کے بعد ہندوستان آنے اور اپنی مادرِ علمی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا مفتی صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ساڑھے تین سو مدارس کا ایک وفاق قائم ہے، انھوں نے تجویز پیش کی کہ جس طرح کا اجتماع اس وقت دیوبند میں ہو رہا ہے، اسی طرح کا اجتماع پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی کیا جانا چاہیئے، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ توحید و اتباعِ سنت پر اصل زور دینا چاہیئے اور نزاعی مسائل سے پرہیز کیا جانا چاہئے اور ان میں اعتدال پیدا کیا جانا چاہیئے، ان کی تقریر بھی عام طور پر پسند کی گئی،

اس اجتماع میں مختلف ملکوں کے صدور مملکت اور سربراہوں کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے، جن میں پاکستان کے جنرل ضیاء الحق، مصر کے انوار السادات، اور ہندوستان کے صدر

نیلم سنجیوا ریڈی کا پیغام بھی تھا، اجلاس سے بابو جگجیون رام اور راج نرائن نے بھی خطاب کیا، جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ عبد اللہ نے اپنے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کو اپنی نمائندگی کے لئے بھیجا تھا، انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو دو لاکھ کا عطیہ بھی دیا،

اجلاس کے موقع پر کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، دارالعلوم کا کتب خانہ بڑا ہے اور اس میں مخطوطات و نوادر کا بھی اچھا ذخیرہ ہے اس لئے یہ نمائش اہل علم اور اصحاب ذوق کی دلچسپی کا مرکز رہی سہ روزہ اجلاس کے درمیان ۲۲ر مارچ کو "دینی تعلیم اور عہد حاضر کے تقاضے" کے عنوان سے سیمنار کے دو اجلاس ہوئے، پہلا جلسہ دن میں ۳ بجے مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر برہان کی صدارت میں اور دوسرا رات کو ۹ بجے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین بعض موانع کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت نہیں فرما سکے تھے ان کو سیمنار میں بھی مدعو کیا گیا تھا، انھوں نے اپنا مقالہ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تاریخی مدارس" راقم کو دیدیا تھا جس کو راقم نے وہاں پڑھا، حاضرین نے بڑے غور سے سنا، اس میں مسلمان حکمرانوں کے دور کے بعض عظیم الشان مدرسوں کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا تھا کہ ان سے جو جید علماء فارغ ہوئے، ان میں بعض قاضی ابو یوسف، امام محمد، امام غزالی اور امام الحرمین وغیرہ کے ہم پایہ تھے، مگر اب یہ سب مدارس معدوم ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ان کے کھنڈر بھی باقی نہ رہے، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟ مقالہ نگار کے نزدیک اس کا یہ جواب تشفی بخش نہیں ہے کہ جب مسلم سلاطین کی حکومتیں ختم ہوئیں تو ان کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کی بنا پر یہ مدارس بھی ختم ہو گئے، انھوں نے مورخانہ اور ناقدانہ تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ ان مدرسوں کے باقی نہ رہنے کی ذمہ داری سے علمائے کرام بری قرار نہیں دیے جا سکتے۔

۲۲ر مارچ کو آخری اجلاس ہوا، اس میں مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے وہ تجویزیں پڑھ کر سنائیں جو اس اجلاس میں منظور کی گئیں۔

ایک اہم تجویز یہ تھی کہ اسلام کی دعوت و سربلندی نیز دنیا کو درپیش موجودہ نئے مسائل کے حل کے لیے ایسے علماء تیار کیے جائیں جو علوم نبوت سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ہی جدید علوم، سائنس، ٹیکنالوجی سے بھی واقف ہوں اور موجودہ دور کے حالات اور نزاکتوں سے بھی باخبر ہوں تاکہ وہ امت کی علمی، فکری، دینی اور اجتماعی رہنمائی کر سکیں،

اس کے ساتھ ہی یہ تجویز تھی کہ دارالعلوم موجودہ بدلے ہوئے حالات میں جدید مسائل کو اسلامی شریعت کے مطابق حل کرنے کے لئے فقہ اسلامی میں تخصص کا ایک شعبہ قائم کرے۔ جس میں فقہ، اصول فقہ، فلسفۂ قانون، قواعد کلیات دین اور مختلف ائمہ کے مناہج و استنباط کے تقابلی مطالعہ کا اہتمام ہو۔

فلسطین اور افغانستان کے مسلمانوں کی حمایت میں بھی تجویزیں منظور کی گئی تھیں۔

اگر اس بڑے اجتماع میں کچھ بے لطفی اور تلخی بھی پیدا ہوگئی ہو تو وہ ذکر کے لائق نہیں، اس اجتماع سے جہاں دارالعلوم کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ ہوا وہیں اس کی گوناگوں ذمہ داریوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کو اس اجتماع نے اور بڑھا دیا ہے، قوم و ملت نے جس شان اور گرم جوشی سے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے، یقین ہے کہ اسی شان اور گرم جوشی سے وہ اس کی قیادت اور رہنمائی بھی قبول کرے گی، دارالعلوم کو ملت کے اس استعداد کو ہر حال میں باقی رکھنا ہوگا۔ مسلمان اس وقت جن حالات سے [illegible] ان کی صحیح رہنمائی بہت ضروری ہے۔ اس کا حق سب سے زیادہ دارالعلوم ہی کو ہے جس کی گوناگوں قدیم اور اہم روایات ہیں،

علمی خطوط

(۱)

محترم و مکرم حضرت سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب

السلام علیکم   مزاج گرامی

جزاکم اللہ، حضرت مولانا علی میاں صاحب کے تعارف میں ان کی کتابوں پر خوب تبصرہ فرمایا۔ کاروان مدینہ پر جی چاہتا تھا کہ مزید آپ کے قلم سے کچھ ہوتا۔ حضرت رائپوریؒ ان کے شیخ تھے سوانح کے تعارف میں یہ بھی آجاتا۔ سوانح مولانا محمد الیاس صاحبؒ پر حضرت سید صاحبؒ کا مقدمہ عجیب و عظیم ہے، اس کا تذکرہ ضروری ہے، سپاس نامہ تو حیات میں دیکھا، معارف میں اگر آئے تو حضرت مولانا کا جواب جو انھوں نے بیان فرمایا تھا وہ بھی آنا چاہئے۔

سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتویں جلد کی زیارت سے تکیہ میں آنکھیں شاد ہوئیں آپ کے لئے خوب دل سے دعا نکلی۔ اس کی داستان آپ کو سنادوں، حضرت مخدوم سید صاحبؒ کے قیام بھوپال و کراچی میں بندہ بار بار حضرت سے عرض کرتا رہا کہ ساتویں جلد پوری فرمادیں، سید صاحبؒ بھی فرماتے رہے کہ وہ ضروری ہے، ذرا سکون لے تو اسے کردوں۔ وفات کے بعد حضرت شاہ معین الدین صاحبؒ سے کئی بار خطوں سے اور زبانی بھی عرض کرتا رہا کہ آپ حضرت سید صاحبؒ کے جانشین ہیں اس لئے ساتویں جلد پوری فرمائیں، کراچی جب بھی جاتا ہوا صاحبزادہ گرامی سید سلمان میاں سلمہٗ سے تقاضا کرتا رہا کہ جتنا حضرت نے تحریر فرمایا ہے وہ شائع ہوجانا چاہئے، مولانا غلام محمد صاحب کے ذریعہ والدہ صاحبہ کی خدمت میں بھی یہ گذارش

کرتا رہا، اب معارف میں اس کے شائع ہونے سے بڑی خوشی و مسرت ہوئی، یہ بھی اس میں لکھا تھا کہ کسی دوسرے نام سے طبع ہوگی یہ بات ہرگز مناسب نہ ہوتی، الحمدللہ کہ وہ ساتویں جلد کے نام سے ہی طبع ہوئی، حق تعالیٰ آپ کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، انشاء اللہ کل قیامت میں آپ حضرات سیرت نگارؒ کے سامنے سرخ رو ہونگے، خدا کرے اس کی تکمیل بھی آپکے ہاتھوں سے ہو جائے۔

سنہ ۱۹۴۹ء حضرت سید صاحبؒ کے آخری سفر حج میں مدینہ پاک میں سید صاحبؒ صفہ کے چبوترے کے نزدیک تشریف فرما تھے، بندہ حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ عجیب سعادت و خوشی ملی ہے، باب جبرئیل سے باہر نکلو تو جو عمارت سامنے نظر آتی ہے معلوم کیا کہ یہ کیا ہے مدرسہ علوم شرعیہ، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، آگے بڑھے تو دار الصنائع حیدرآباد نظر آیا کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، آگے بڑھے تو مدرسہ سلفیہ رشیدیہ نظر آیا، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، اس کے مقابل ایک عظیم عمارت نظر آئی، یہ کیا ہے؟ دار الایتام، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، اب باب السلام سے مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے تو کئی حلقے نظر آئے تبلیغ و دعوت کے، یہ کون کر رہے ہیں؟ ہندی غلام، فرمایا اللہ کی عجب شان ہے یہ تمام سعادتیں پسماندہ ہندیوں کو عطا فرمادیں، بندہ نے دل میں کہا اس دور میں سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہندی غلاموں ہی سے لکھائی گئی،

خادم:۔ افتخار فریدی ۔ مراد آباد ۔ ۱۳ر مارچ سنہ

(۲)

مکرم و محترم برادرم صباح الدین صاحب؛ السلام علیکم

ایران سوسائٹی کی عمر خیام تقریبات میں روز اوّل آپکا مقالہ سننے کا موقع نہیں مل سکا۔

افسوس تھا، لیکن سمپوزیم میں شکریہ ادا کرنے کے سلسلہ میں آپ کی مختصر تقریر سے مقالات کا
مفرکیا ہے سننے کے بعد یہ افسوس جاتا رہا اور معلوم ہوا کہ اس نحیف و نزار جسم میں بھی ایک آتش
فشاں نہاں ہے اور ان ناتواں رگوں میں ایک ایسی آتش سیال رواں دواں ہے جو عمر خیام اللہ
جیسے شہرت یافتہ " رباعی گو " کی فتنہ گری پر اس شدت کے ساتھ شعلہ بار ہو سکتی ہے اور یہ
بھی دیکھا کہ اس شیروانی میں ایک غیر زبان کا غیر معمولی زبان داں پنہاں ہے، جو شیکسپیرانہ انداز
کی انشا پردازی اور زبان و بیان سے بے شمار و بے اختیار خراج تحسین و آفریں سامعین سے وصول
کر لیتا ہے، شاعر مشاعرہ لوٹتا ہے اور آپ نے اپنی نثری شاعری سے سمپوزیم لوٹ لیا حقیقت یہ
ہے کہ آپ نے مختصر الفاظ میں جو کچھ کہا وہ جذبات و تاثرات سے لبریز اور حقیقت سے پُر تھا

سمپوزیم میں محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے صدارت کے فرائض کا حق بخوبی ادا کیا، انھوں نے
تقریباً سب کو پورا وقت اور پورا موقع دیا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے خود اپنا مقالہ مختصر کرنے
اور کم سے کم وقت لینے میں پیش قدمی کی۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی حضرت کو اختصار سے کام لینا
پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس یکایک کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کی وجہ سے تسلسل نہ رہا۔ سنانے والے
مطمئن نہیں ہوئے اور آخر میں یہ ایک خانہ پری سی ہو کر رہ گئی۔ مقالہ اگر صرف قارئین کے لئے ہو
ہو تو طوالت اور وقت کے تعین کا سوال ہی نہیں ہوتا لیکن اگر سامعین کے لئے ہو تو اختصار
اور وقت کے تعین کا لحاظ ضروری ہے، جیسے ریڈیو میں تقاریر کا وقت مقرر ہوتا ہے اور اسی وقت
کے اندر اندر اس کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو سنانے والوں کو بے اطمینانی اور سننے والوں
کو بے لطفی نہ ہوتی۔

سمپوزیم میں فاضل مقالہ نگاروں نے عمر خیام کو بہ حیثیت شاعر، فلسفہ داں، ریاضی داں،
سائنس داں اور رصد داں پیش کیا لیکن کسی نے اسے صرف بہ حیثیت انسان پیش نہیں کیا،

کسی عظیم ہستی کی فنی، علمی، تحقیقی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن زندگی کا یہ پہلو بھی بڑی اہمیت اور کشش رکھتا ہے
جو دلوں پر مثل برق اثر انداز ہوتا ہے، کوئی عالم اگر عالم باعمل ہو تو باعثِ فیوض و برکات ہے اور
اگر بے عمل ہو تو بھی باعثِ عبرت ہے کہ حیف سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہو سکا۔

کوئی انسان کتنا ہی بڑا ہو یا چھوٹا۔ انسانیت کی بلندی ہی اسے بناتی ہے اور ایک عظیم انسان
کا رتبہ عطا کرتی ہے اور اسے زندہ جاوید بناتی ہے، یہ بھی قادرِ مطلق کا ایک امتحان ہی ہے کہ دیکھیں کون
اپنی تنی ہوئی گردن اور سر پُر غرور لئے بے سایہ و بے ثمر سرو کی مانند اپنی انا میں بے فیض تنا کھڑا ہے
اور کون میوہ کی ڈالی کی طرح جھکا سرِ نیاز خم کئے اپنی شاخ ثمر سے دوسروں کو فیض پہنچاتا ہوا ہے کہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

لیکن اس لوٹ مار نوچ کھسوٹ کے دور میں انسان کا لفظ انسانیت کی باتیں فرسودہ سی لگتی ہیں
اور کانوں میں رس کے بجائے زہر گھولتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم عظیم انسانوں
کی عظیم داستانیں، ان کی انسانیت اور انسان دوستی کی یادیں اور ان کے علم و عمل کی باتیں دہرائیں
اور دہراتے رہیں،

سیمینار میں کسی پروفیسر صاحب نے ،، عمر خیام بحیثیت سائنس داں ،، پیش کیا تھا۔ غالباً انھوں
نے خیام کو کلنڈر اور ماہ و سال اور ایام کی تقسیم کا موجد بتایا تھا۔ ممکن ہے میرے سننے سمجھنے میں غلطی
ہوئی ہو۔ وقت کی کمی کی وجہ سے کئی مقالات بڑے عاجلانہ انداز میں پڑھے گئے تھے۔ بہرحال بعض مغربی
مورخین محققین نے نمرود کو جہاں اور بہت سی چیزوں کا موجد بتایا ہے وہاں اسے ماہ و سال ایام کی
تقسیم اور دن کو چوبیس ۲۴ گھنٹوں، منٹوں، ثانیوں میں تقسیم کا موجد بھی بتایا ہے۔ مندرجہ ذیل اسکی چند اختراعات
ایجادات کا ذکر 1 "The Golen Bough"
By Sir James George Frazer

اور 2. The Two Ba by Lons by Alexander [illegible]

میں ملتا ہے،

۱۔ دائرے کی ۳۶۰ درجے میں تقسیم، ایک درجہ کی ۶۰ دقیقوں میں تقسیم اور ایک دقیقہ کی ۶۰ ثانیوں میں تقسیم۔

۲۔ دن کی چوبیس گھنٹے میں تقسیم اور گھنٹے کی ۶۰ منٹ میں اور منٹ کی ۶۰ سکنڈ میں تقسیم، نئے دن کا آغاز غروب آفتاب کے بجائے رات کے بارہ بجے سے، کیونکہ سورج کے غروب کا وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

۳۔ شمسی سال کی بارہ مہینوں میں تقسیم بروج کے بارہ کہکشاں کے مطابق،

۴۔ بروج کے حساب سے زائچہ کا شمار۔

۵۔ فراست الید، نجمی اور پیشین گوئی۔

علاوہ ازیں خام اینٹوں کا پکانا، بڑی بڑی عمارتوں، پلوں، مندروں، محلوں اور نہر بنانے کا حساب یعنی علم مہندسی، مٹی کے ٹکڑوں پر تحریر کرنے کی دریافت اور اس کا معدنیات سے نکالنا، دو دھاتیں ملا کر کانسی بنانے کی ایجاد۔ جادو یعنی لوگوں پر نامعلوم طریقہ سے اثر ڈالنا جسے آجکل ہپنوٹزم بھی کہا جا سکتا ہے۔ وغیرہ

ممکن ہے پروفیسر صاحب نے خیام کو متذکرہ ایجاد کا نہیں اس میں کسی تبدیلی ترمیم یا اضافہ کا ذمہ دار ٹھہرایا ہو۔ تحقیق میں اختلاف رائے کا ہونا ضروری ہے، پروفیسر صاحب نے جو کچھ بھی کہا ہو گا وہ کسی حوالہ سے ہی کہا ہو گا، بہرحال میرا مقصد اس بحث سے نہیں ہے، حقیقت واقعہ جو کچھ بھی ہو، قابل ذکر صرف وہ بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ایک انسان کی انسانی بلندی ہی اس کی علمی برتری اس کے کام اور اس کے نام کو دوام بخشتی ہے،

جنوری کے "معارف" میں آپ کے شذرات دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلام میں فرقوں کی تاریخ آپ نے نہایت مختصر لیکن جامع طور پر بیان کر دی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے جسے ہر قاری جس کی نظر اس طرف پہنچی ہے سراہے گا کہ آپ نے اپنے دامن کو ہر طرح اور ہر پہلو سے کسی بحث میں الجھنے سے خوب بچایا ہے ورنہ عموماً ایسی تحریروں سے نادانستہ ہی کوئی نہ کوئی شوشہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس کی ذرا تفصیل دیدیتے اور اسے کتابی شکل میں شائع کر دیتے یہ بہت کار آمد، مفید اور پر از معلومات چیز ہوتی،

والسلام "آغا رشید مرزا"

کلکتہ ۲۲ مارچ سنہ ۸۰ء

بعض ادبی کتابیں

انتخاباتِ شبلی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر کے اقتباسات جن میں کلام کے حسن و قبح عیب ہنر، درشعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے، قیمت :- ۹ روپئے۔

کلیاتِ شبلی اردو

مولانا کی اردو میں اخلاقی، سیاسی، مذہبی، اور تاریخی نظمیں جو عالم اسلام کے مختلف حوادث کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں، قیمت :- ۵ روپیے،

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

رسالۃ الامعان فی اقسام القرآن از المعلم عبد الحمید الفراہی، متوسط سائز، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات: ۷۶

قیمت دس روپیے، پتہ :- (۱) دار القرآن الکریم شارع بلالی، صندوق البرید ۲۵۰۶۶ کویت (۲) دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ - یو - پی

یہ کتاب ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا دیباچہ ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا قسمیں کھائی ہیں، مولانا نے ان کے متعلق اس رسالہ میں اصولی مباحث علحدہ تحریر فرمائے ہیں تاکہ اصل تفسیر میں ان بحثوں کا اعادہ و تکرار نہ ہو، دار المصنفین نے ۱۳۴۹ھ میں اس کا پہلا اڈیشن مصر سے طبع کرایا تھا، پھر چند بار اس کے اردو ترجمے دائرہ حمیدیہ سے شائع ہوئے، اب یہ نیا عربی اڈیشن دار القرآن الکریم کویت نے شائع کیا ہے، اس میں قرآن مجید کی قسموں پر وارد ہونے والے شبہات و اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے، اس سلسلے میں پہلے امام رازیؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے جوابات نقل کرکے ان پر تبصرہ کیا ہے، اس کے بعد قسم کی ضرورت، اس کی مختصر تاریخ اور عربی زبان میں اس کے استعمال کے مختلف طریقوں وغیرہ کو بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن میں قسموں کی غرض شہادت و استدلال ہے اور دلیل کے لئے قسم کا پیرایہ اختیار کرنا مقتضائے بلاغت ہے، یہ رسالہ قسموں کے متعلق مفید اصولی و ضروری مباحث کے علاوہ گوناگوں قرآنی حقائق و معلومات پر بھی مشتمل ہے، شروع میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا وہ مقدمہ بھی شامل ہے جو انھوں نے اس کے پہلے اڈیشن کے لئے تحریر فرمایا تھا، اس میں مولانا فراہی کے سوانح حیات اور تصنیفات کا اجمالی ذکر ہے لیکن یہ مقدمہ

نصف صدی پہلے لکھا گیا تھا اس میں مولانا کی جن کتابوں کو اس وقت غیر مطبوعہ بتایا گیا ہے، ان میں سے بعض اب چھپ گئی ہیں، حواشی میں اسکی صراحت ضروری تھی۔

شعلۂ نیم سوز از جناب فضا ابن فیضی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۰۰ مجلد مع خوب صورت گرد پوش، قیمت للعکار پتہ (۱) فیضی پبلیکشنز، مئوناتھ بھنجن (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ

جناب فضا ابن فیضی ایک مشاق کہنہ مشق اور مشہور شاعر ہیں، ان کو نظم اور غزل دونوں کہنے پر پوری قدرت ہے، کئی برس پہلے ان صفحات میں ان کی غزلوں کے مجموعہ "سفینۂ زرگل" کا ذکر آچکا ہے، زیر نظر مجموعہ ان کی نظموں پر مشتمل ہے، فضا صاحب کی غزلوں اور نظموں کے طرز ادا اور طریقۂ اظہار میں یکسانی ہوتی ہے، اس لئے ان کی غزلیں نظم نما اور نظمیں غزل نما ہوتی ہیں، زندگی کے مختلف شعبوں کی موجودہ گراوٹ اور بے راہ روی اور معاشرہ کے ہر طبقہ کے افراد کی ضمیر فروشی حق سے اغماض، سطحیت پسندی اور ظاہرداری ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، انھوں نے ادب، شاعری، صحافت، سیاست مذہب اور اخلاق میں جو تصنع، شاعروں اور ادیبوں میں جو کھوکھلا پن، سیاستدانوں میں جو خود غرضی اور پارساؤں میں جو ریاکاری پیدا ہو چکی ہے ان کا ذکر بڑے دکھ بھرے انداز میں کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں باطل میں حق، اندھیرے میں اجالا، جھوٹ میں سچ اور ٹکوں میں چاندی کے ورقوں کی ملمع کاری ہے اس لیے رذیل، شریف، بوالہوس، اہل علم اور فرعون، موسیٰ کے لباس میں دکھائی دیتے ہیں، ہر طرف بے دانشی، کم آگہی، علم و ہنر اور عقل و خرد کی بے مائگی، تحسین ناشناسی اور اہل فن و اصحاب کمال کی ناقدری کا مظاہرہ ہو رہا ہے، فضا صاحب کی نظموں سے ان کی شدتِ احساس، قوتِ مشاہدہ، موجودہ حالات سے باخبری اور فکر و خیال کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، اس مجموعہ کی نظمیں چار

مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی گئی ہیں، بعض نظموں میں موجودہ قومی و ملی مسائل پر بے لاگ تبصرہ ہے، ایک نظم میں اردو زبان کے ساتھ جو سیاسی کھیل کھیلا جارہا ہے اس کا ذکر ہے، ایک نظم میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی گذشتہ تاریخ اس کی عظمت، خصوصیت، کردار اور ادبی خدمات وغیرہ کو بیان کرکے آخر میں اس کے خلاف اربابِ سیاست اور ملت کے جعفر و صادق کی موجودہ سازش کو بے نقاب کیا ہے، دارالمصنفین کے جشنِ طلائی پر بھی ایک اچھی نظم ہے، "خونِ صد ہزار انجم" کے عنوان سے ملک کے بہیمانہ فسادات کا المناک ذکر ہے، آخری حصہ میں چند مشاہیرِ ادب و سیاست کے مرثیے ہیں، فضا صاحب کی نظموں میں جدت و طرفگی کے باوجود روایت کی پاسداری بھی ہے، وہ طرزِ ادا اور طریقۂ تعبیر کو شاعری کا ضروری اور اہم عنصر قرار دیتے ہیں اور ترقی پسندی اور جدیدیت نے اردو شاعری کو جو لب ولہجہ دیا ہے اس کو وہ اردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ اور اس کی شعری روایت کے شایانِ شان نہیں سمجھتے ہیں، ان کا کلام موجودہ ماحول کی پستیوں اور بے اعتدالیوں پر مکمل تبصرہ ہونے کے باوجود نعرہ بازی سے خالی ہے، وہ عہدِ حاضر کے پُر آشوب حالات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں کہ نظموں کی روانی اور تازگی میں فرق نہیں آنے دیتے، اُردو کی کلاسیکل شاعری پر ان کی اچھی نظر ہے، فارسی و عربی میں بھی اُنکی استعداد اچھی ہے اس لئے وہ موضوع کے اعتبار سے مناسب الفاظ اور عمدہ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں، ان کے استعارے تشبیہیں اور ترکیبیں غریب اور نامانوس نہیں معلوم ہوتیں، کتاب کی طباعت و کتابت بھی عمدہ ہے اس لئے یہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے، ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہو چکی ہے، امید کہ اور بھی زیادہ ہوگی جس کی یہ مستحق ہے۔ " ض "

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

جون ۱۹۸۰ء

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

.....٭٭٭.....

جلد ۱۲۵ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ اپریل کے معارف کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ چودہ سو سال کے اندر مسلمانوں نے دنیا کو کیا کیا چیزیں دیں اس وقت اس کا جائزہ لینا ہے کہ مسلمان اس برصغیر میں آکر آباد ہوئے تو اسلام اور ان کے اثرات کا اظہار کس کس طرح ہوا،

ان اثرات کا ذکر پہلے ہم ہندو مورخوں ہی کی زبانی بیان کرنا پسند کریں گے، جناب ای۔ سی۔ وتنا انگریزوں کی حکومت کے عہد کے بہت مشہور آئی۔ سی۔ ایس تھے، انھوں نے اپنے ایک مضمون "ہندوستانی تہذیب و اسلام" میں لکھا تھا کہ اسلام تخییل کی کوئی جدت نہیں، بلکہ اس کے لئے باعث فخر یہ بات ہے کہ اس نے اپنے سے پہلے کے پیش کردہ خیالات کو لوگوں کے دلوں میں اتار کر ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا، توحید کا مسئلہ اہل ہند کے لئے نیا نہ تھا لیکن یہاں بت پرستی انتہا تک پہنچ گئی تھی، اسلام ہمیشہ بت پرستی، باطل توہمات، اور مذہب کی شکل میں چھپی ہوئی بربریت کو گوارا کرنے سے منکر رہا، اس نے ہندوستان میں کوئی نئی قوم لا کر آباد نہیں کیا، یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا جس نے اس وقت جب کہ پرانے تمدن انحطاط پذیر ہو رہے تھے، اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے، انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کر دیا،

ای۔ سی۔ وتنا نے یہ بھی لکھا کہ اگر پورا ہندوستان نئے دین کے دائرے میں داخل ہو جاتا تو یقینی ہے کہ اچھوتوں کا مسئلہ حل ہو جاتا، چھوت چھات جو سوامی دیویکانند کے قول کے بموجب ہندو مت کی مخصوص شان ہو مٹ گئی ہوتی، اسلام کا اصولی اعتقاد یہ ہے کہ معاشرتی اور مذہبی امور میں مسلمان بلا لحاظ قومیت و مرتبت کامل مساوات رکھتے ہیں، بنیادی اصول ہندو تمدن کے لئے بالکل نئی چیز تھی، اسلام کی فتح یہ تھی کہ پست اقوام نے اس میں بخوشی داخل ہونا شروع کیا جن کو اس مذہب کے قبول کرنے کو جیسا پہلے ایک نیا

مستقبل نظر آیا، اس سے سب سے زیادہ صدمہ کثیر التعداد معبودوں کی پرستش کو پہنچا، اسلام ہی کی وجہ سے نیچے طبقہ کے لوگوں میں یہ احساس ہوا کہ عمل صالح اور جذبہ صادق کی بدولت وہ بھی اعلیٰ سے اعلیٰ شرفاء کے ہمسر ہوسکتے ہیں، چنانچہ ان میں بھگتی مذہب اسلام ہی کے سبب مقبول ہوا، اسلام ہندو سماج کے وجود اور اس کی قدیم تنظیم کے لئے ایک چیلنج بن گیا، تو اس کو اپنے اندر تبدیلیاں کرنی پڑیں، آریہ سماج کی تحریک اسلام کی طبعی قوت کی رہین منت ہے، اسلام کی توحید کا اثر جین مذہب نے بھی قبول کیا، اور اس کے ماننے والوں نے اپنے عقائد کی تشکیل از سر نو کی،

کے۔ ام۔ پنیکر اپنے زمانہ کے بہت مشہور مورخ تھے، وہ اپنی کتاب اے سروے آف انڈیا میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام آیا تو اس نے مذہب پر فخر کرنا سکھایا، اور ایک ایسا قانونی نظام عطا کیا جو کئی لحاظ سے اس زمانہ کے قوانین سے ترقی یافتہ تھا، راجپوتانہ اور وجیا نگر کے ہندو راجا اسلام ہی کے اثر سے اپنے دھرم اور مذہب کے علم بردار بن گئے، قدیم زمانے میں شمال میں بھارشئو اور گپت اور جنوب میں پلو اور چول خاندانوں کے راجا پکے ہندو ضرور رہے لیکن مذہب کی حمایت اور مدافعت کا خیال اُن کے دلوں میں کبھی نہیں آیا، اسلام سے ان کا واسطہ پڑا تو وہ بھی اُن کے حامی بن گئے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوؤں میں خدا پرستی کا تصور اسلام کی بدولت پیدا ہوا، ہندو پیشواؤں نے اپنے دیوتاؤں کا نام جو بھی رکھا ہو، اسلام ہی کے اثر سے انھوں نے خدا پرستی کی تعلیم دینی شروع کی یعنی خدا ایک ہے، وہی عبادت کے لائق ہے، اسی کے ذریعہ نجات مل سکتی ہے،

ڈاکٹر تارا چند نے "اسلام کا اثر ہندوستان پر" کے عنوان سے ایک پوری کتاب ہی لکھ دی ہے، اس میں ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں کہ مسلمان ہندوستان آئے تو ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کئے، مہاراشٹر، گجرات، پنجاب، ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، مسلمانوں کے اثر سے نہ صرف

ہندوستان کی اقتصادی زندگی، بلکہ یہاں کی معاشرت اور سیاست میں بھی کافی انقلابات پیدا ہوئے، مسلمانوں میں خاندان ونسل کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے، اس سے ہندو بھی متاثر ہوئے، انھوں نے اپنی معاشرتی بندشوں کو توڑ کر معاشرتی مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے اثرات پڑے، یہ اثرات رسم ورواج گھریلو زندگی، موسیقی، پوشاک، لباس، کھانے پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کے مراسم، تہواروں، میلوں اور مرہٹہ راجپوت اور سکھ والیان ریاست کے درباروں کے آداب میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، بابر کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں اس طرح ملے جلے رہتے تھے کہ بابر مسلمانوں کے ہندوستانی طرز زندگی کو دیکھ کر متعجب ہوگیا تھا، اس کے جانشینوں نے اس طرز زندگی کو اس شاندار طریقہ پر آراستہ و پیراستہ کیا کہ انھوں نے اپنے بعد جو کچھ چھوڑا، اس پر ہندوستان بجا طور پر فخر وناز کرسکتا ہے،

جدوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے جب کشمیر سے اراکان اور غزنیں سے چاٹگام تک کے علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کیا، تو ہندوستان میں پہلی دفعہ جغرافیائی وحدت قائم ہوئی، جو اس سے پہلے اس کو کبھی بھی نہیں حاصل ہوئی تھی، جدوناتھ سرکار نے جب اپنا ایک مضمون "ہندوستان میں اسلام" کے عنوان سے لکھا تو اس میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عہد میں ہندستان کو حسب ذیل چیزیں دیں (۱) انھوں نے ہندستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے جس سے بحری جہازوں اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ دونوں چیزیں بالکل ختم ہوگئی تھیں۔ (۲) ہندوستان کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیاچل کے شمال میں اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا (۳) ایک قسم کے نظام حکومت سے....

پورے ملک کو یکسانیت حاصل ہوئی۔ (۴) مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات و اطوار اور لباس وغیرہ معاشرتی امور میں یکرنگی آئی (۵) ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ وجود میں آیا، جس میں ہندوؤں اور چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین اور ترصیع کاری اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں (۶) ایک مشترکہ زبان، ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندوؤں نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اس اسٹائل کو مرہٹوں نے اپنی زبان میں بھی رائج کیا (۷) دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی، تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی (۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی، اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا، کاغذ یہاں مسلمانوں ہی نے رائج کیا (۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، مصوری میں ایک خاص اسکول قائم ہوا، ہندوستان میں باغبانی کے ذوق کا رواج ہوا،

ڈاکٹر بینی پرشاد نے اپنی کتاب "ہسٹری آف جہانگیر" میں لکھا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں پہلی دفعہ اسٹیٹ پولیس اسٹیٹ سے کلچر اسٹیٹ میں تبدیل ہوئی، رام پرشاد کھوسلا نے اپنی کتاب مغل کنگ شپ اور نوبیلیٹی میں اعتراف کیا ہے کہ مغل بادشاہوں نے ایک پائدار نظام حکومت قائم کرکے پورے ملک کو ابتری اور بدحالی سے بچا لیا، ڈاکٹر پی سرن رقمطراز ہیں کہ مغلوں نے اپنے بعد ایک بہت ہی قیمتی سیاسی وراثت چھوڑی ہے، اور یہ تو تمام مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ اکبر کے زمانہ میں جو زمین کی پیمائش ہوئی اور اس کی جو تفصیلات آئین اکبری میں درج ہیں انہی کو بنیاد بنا کر انگریزوں نے ہندوستان کے اندر لینڈ رفارم کیا،

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اکبر آباد، فتح پور سیکری، [illegible] آباد، فتح پور،
فتح آباد، شکوہ آباد، فیروز آباد، علی گڑھ، شاہجہاں پور، مراد آباد، ابراہیم آباد، دولت آباد،
حیدر آباد، احمد آباد، احمد نگر، اورنگ آباد، عظیم آباد، بوگرا، برہان پور اور مصطفیٰ آباد وغیرہ
جیسے مشہور شہروں کو مسلمانوں ہی نے آباد کیا، ایسے قصبوں اور دیہاتوں کے تو ان گنت نام
جو ان کی وجہ سے آباد ہوئے۔

ملک میں وحدت قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کے زمانہ میں بے شمار سڑکوں کی بھی تعمیر ہوئی،
بنگال سے لاہور، لاہور سے پشاور، اٹک سے کابل، آگرہ سے قنوج، لکھنؤ سے اجودھیا، فیض آباد ہوکر
جونپور، لاہور سے شاہدرہ، تلونڈی، راجاری وغیرہ سے ہو کر کشمیر، سورت سے برہان پور، گوالیار
ہو کر آگرہ اور پھر سورت ہی سے بھروچ، بڑودہ، احمد آباد، اجمیر اور بیانہ ہو کر اکبر آباد تک کی
یہ ساری سڑکیں مسلمانوں کے زمانہ میں بنائی گئیں، جو اب تک ہیں، ان کے اوپر بڑے بڑے پل بھی
تعمیر ہوئے، سنگ میل بھی نصب کئے گئے، سایہ دار درخت بھی لگوائے گئے، جابجا سرائیں بھی قائم
کی گئیں، مغلوں نے شاہراہوں کی تعمیر میں جو دلچسپی لی، اس کی تعریف پنڈت جواہر لال نہرو نے
اپنی ڈسکوری آف انڈیا میں بھی کی ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر آج بھی بیرونی سیاحوں کی نگاہیں چکاچوند ہو جاتی ہیں، اور وہ ہندوستان
کی تہذیبی اور تمدنی عروج کے قائل ہوتے ہیں، تعمیرات میں ہشت پہلو، و ندانہ دار، پیالہ دار،
ذکردار محرابیں، محراب دار چھتیں، شلغم نما گنبد، مثمن برج، ابھرواں نقاشی، مینا کاری، استر کاری،
کاشی کاری، ٹائل، موزیک، جوڑائی کے مضبوط مسالے، سنگ مرمر پر اعلیٰ قسم کے کاری، بلند چبوترے
اور اس کے اوپر برجیاں، گنبد، اور پہرہ داروں کے سکونتی مکانات، لکڑی کے بڑے بڑے
دروازے، محل اور مکانات کے اندر بڑے بڑے صحن، شہ نشین، بارہ دری، چمن آرائی اور

[illegible]

ذرے وغیرہ مسلمانوں کی وجہ سے یہاں [illegible]

انتہا درجہ کی لطافت، نفاست اور تمکنت انہی کی وجہ سے [illegible]

ہندوستان میں پارچہ بافی کے سلسلہ میں ململ، اطلس، مشجر، دیبا، [illegible]

نفتی، تافتہ، مشروع، گلبدن، سنگی، خاصہ، ہزار، ململ، [illegible]

آبِ رواں، تنزیب، جامدانی، شال، اور پشمینہ وغیرہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے یہاں رواج پذیر ہوئے، کامدانی اور زردوزی کی صنعت کو ان کی وجہ سے بڑا فروغ ہوا،

پارچہ بافی اور دوسری چیزوں میں آبنوسی، آبی، آتشی، ارغوانی، اخضری، حنائی، خاکی، زنگاری، زعفرانی، زیتونی، زمردی، سیمابی، اسودی، شنگرفی، طاؤسی، طباشیری، عنبری، عنابی، کاکریزی، کبودی، کاسنی اور باقی رنگوں کا اضافہ ان ہی کی وجہ سے ہوا،

خوشبوئیات میں گلبنگ، روح افزا، زباد، مید، ملاگیرا ور اطفار الطیب وغیرہ مسلمان اپنے ساتھ لائے، پھولوں میں یہاں بنفشہ، یاسمین اور نسترن کا رواج ان ہی کی وجہ سے ہوا، انھوں نے خیابان بندی، طرح ادائی اور چمن آرائی کے ذریعہ فن باغبانی میں جس خوش مذاقی اور حسن سلیقگی کا ثبوت دیا، وہ انگریز بھی اپنی حکومت کے زمانہ میں نہ دیکھے، اسی لئے وہ اپنے لگائے ہوئے خوبصورت باغ کو مغل گارڈن کہہ کر تسکین دے لیا کرتے تھے، یہاں درختوں میں پیوند لگا کر اچھے درخت پیدا کرنے کا رواج مسلمانوں ہی نے دیا، قلمی آموں کی بے شمار قسمیں ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوئیں، انگور، انار، زرد آلو، شفتالو، آلوچہ، خربزہ، تربوز، بادام، اور پستہ مسلمان ہی ہندوستان لائے،

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اکبرآباد، فتح پور سیکری، شاہجہاں آباد، الہ آباد، فتح پور، فتح آباد، شکوہ آباد، فیروزآباد، علی گڑھ، شاہجہاں پور، مراد آباد، ابراہیم آباد، دولت آباد، حیدرآباد، احمد آباد، احمد نگر، اورنگ آباد، عظیم آباد، بوگرا، برہان پور اور مصطفیٰ آباد وغیرہ جیسے مشہور شہروں کو مسلمانوں ہی نے آباد کیا، ایسے قصبوں اور دیہاتوں کے تو ان گنت نام ہیں جو ان کی وجہ سے آباد ہوئے۔

ملک میں وحدت قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کے زمانہ میں بے شمار سڑکوں کی بھی تعمیر ہوئی، بنگال سے لاہور، لاہور سے پشاور، اٹک سے کابل، آگرہ سے قنوج، لکھنؤ سے اجودھیا، فیض آباد ہو کر جونپور، لاہور سے شاہدرہ، تلونڈی، راجاری وغیرہ سے ہو کر کشمیر، سورت سے برہان پور، گوالیار ہو کر آگرہ اور پھر سورت ہی سے بھروچ، بڑودہ، احمد آباد، اجمیر اور بیانہ ہو کر اکبرآباد تک کی یہ ساری سڑکیں مسلمانوں کے زمانہ میں بنائی گئیں، جو اب تک ہیں، ان کے اوپر بڑے بڑے پل بھی تعمیر ہوئے، سنگ میل بھی نصب کئے گئے، سایہ دار درخت بھی لگوائے گئے، جابجا سرائیں بھی قائم کی گئیں، مغلوں نے شاہراہوں کی تعمیر میں جو دلچسپی لی، اس کی تعریف پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی ڈسکوری آف انڈیا میں بھی کی ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر آج بھی بیرونی سیاحوں کی نگاہیں چکاچوند ہو جاتی ہیں، اور وہ ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی عروج کے قائل ہوتے ہیں، تعمیرات میں ہشت پہلو، و ندانہ دار، پیالہ دار، نوکدار محرابیں، محراب دار چھتیں، شلغم نما گنبد، مثمن برج، ابھرواں نقاشی، مینا کاری، استرکاری، کاشی کاری، ٹائلیں، موزیک، جوڑائی کے مضبوط مسالے، سنگ مرمر پر اعلیٰ قسم کی پچی کاری، بلند چبوترے اور اس کے اوپر برجیاں، گنبد، اور پہرہ داروں کے سکونتی مکانات، لکڑی کے بڑے بڑے دروازے، محل اور مکانات کے اندر بڑے بڑے صحن، شہ نشیں، بارہ دری، چمن آرائی اور

فوارے وغیرہ مسلمانوں کی وجہ سے یہاں رائج ہوئے، پھران میں شوکت، تناسب اور توازن کے ساتھ انتہا درجہ کی لطافت، نفاست اور نزاکت انہی کی وجہ سے پیدا ہوئی،

ہندوستان میں پارچہ بافی کے سلسلہ میں مخمل، اطلس، مشجر، دیبا، اطلس، خارا، نقلی، تافتہ، مشروع، گلبدن، تنگی، خاصہ، چوتار، ململ، سری صاف، ڈوریہ، مہرگل، آبِ رواں، تنزیب، جامدانی، شال اور پشمینے وغیرہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے یہاں رواج پذیر ہوئے، کامدانی اور زردوزی کی صنعت کو اُن کی وجہ سے بڑا فروغ ہوا،

پارچہ بافی اور دوسری چیزوں میں آبنوسی، آبی، آتشی، ارغوانی، اخضری، حنائی، خاکی، زنگاری، زعفرانی، زیتونی، زمردی، سیمابی، اسودی، شنگرفی، طاؤسی، طباشیری، عنبری، عنابی، کاکریزی، کبودی، کاسنی اور باقی رنگوں کا اضافہ ان ہی کی وجہ سے ہوا،

خوشبوئیات میں گلینگ، روح افزا، باد، مید، ملاگیرا ور اطفار الطیب وغیرہ مسلمان اپنے ساتھ لائے، پھولوں میں یہاں بنفشہ، یاسمین اور نسترن کا رواج ان ہی کی وجہ سے ہوا، مغلوں نے خیابان بندی، طرح ادائی اور چمن آرائی کے ذریعہ فن باغبانی میں جس خوش مذاقی اور حسن سلیقگی کا ثبوت دیا، وہ انگریز بھی اپنی حکومت کے زمانہ میں نہ دیکھے، اسی لئے وہ اپنے لگائے ہوئے خوبصورت باغ کو مغل گارڈن کہہ کر تسکین دے لیا کرتے تھے، یہاں درختوں میں پیوند لگا کر اچھے درخت پیدا کرنے کا رواج مسلمانوں ہی نے دیا، قلمی آموں کی بے شمار قسمیں ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوئیں، انگور، انار، زمرد آلو، شفتالو، آلوچہ، خربزہ، تربوز، بادام، اور پستہ مسلمان ہی ہندوستان لائے،

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے چاول کی پکی ہوئی قسموں میں صرف بھات، کھیر
اور کھچڑی تھیں، مگر ان کی وجہ سے چاول کے پکانے میں طرح طرح کی قسمیں تیار ہونے لگیں، مثلاً
قبولی، قیمہ پلاؤ، کوکو پلاؤ، موتی پلاؤ، نورتن پلاؤ، نرگسی پلاؤ، انگوری پلاؤ، فالسی پلاؤ، مچھلی
پلاؤ، متنجن، زردہ، اور مزعفر وغیرہ، روٹیوں میں باقرخانی، کلچہ، تافتان اور شیرمال، ان ہی
کے جدت ذہن کے نتائج ہیں، گوشت کی قسموں میں قورمہ، شامی کباب، گولہ کباب، نرگسی کباب،
سیخ کباب، کوفتے اور پسندے وغیرہ ان ہی کے دسترخوان کی یادگاریں ہیں، جلیبی، برفی،
قلاقند، گلاب جامن، بالوشاہی، گوجھی، پیاؤ بڑے، امجوبی، فیرنی، مربے، اور طرح طرح کے
حلوہ جات انہی کی ایجادات ہیں،

یہ تو ایک بہت ہی مختصر جائزہ ہے، اسی سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی کن کن نعمتوں کو
موجودہ ہندوستان جھٹلائے گا، انھوں نے ہندوستان کو جنت نشان بنایا، اور سارے جہاں سے
اچھا ہندوستان ہی کو قرار دیا، مگر اب اُن کی کیا حیثیت بنادی گئی ہے، ان کا نام اچھوتوں
کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور ترحم خسروانہ سے اعلان ہوتا رہتا ہے، کہ مسلمانوں، اچھوتوں اور پچھڑی
جاتیوں کے حقوق اور تحفظ کا پورا خیال رکھا جائے گا، گویا مسلمانوں کا شمار ہندوستان کے اچھوتوں
اور پچھڑی جاتیوں کے ساتھ ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار،

جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی رحلت کی خبر دارالمصنفین میں بہت ہی رنج والم کے ساتھ سنی گئی،
مرحوم قوم و ملت دونوں کے لئے بہت مخلصانہ جذبات رکھتے تھے، وہ ایک اچھے خدمت گذار ملت کے ساتھ ہی بڑے
سچے محب وطن بھی تھے، انھوں نے اپنی سرگرمیوں سے عملی نمونہ پیش کیا کہ ایک سچا مسلمان ہی سچا محب وطن ہو سکتا ہے،
قاضی صاحب نے اردو، علی گڑھ اور مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ مدت مدید تک یاد
رہیں گی، ان پر تفصیلی مضمون معارف کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا،

مقالات

صلیبی جنگ اور اُس کے اہم پہلو

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

سیاسی اثرات یورپ کی مغربی ریاستوں نے جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے آخر میں "صلاح الدین ٹیکس" کے نام سے ایک ٹیکس وصول کرنا شروع کیا تھا، جس سے ان کی دولت میں نہ صرف اضافہ ہوا، بلکہ ان کو نئے ٹیکس لگانے کا اختیار بھی حاصل ہو گیا، اب تک ان کو زمین کی پیداوار ہی پر ٹیکس لگانے کا حق تھا، اس حق سے فرانس نے زیادہ فائدہ اٹھایا، اور چونکہ فرانس نے ان لڑائیوں میں زیادہ حصہ لیا تھا، اس لئے اس کو ان سے فوائد بھی زیادہ پہونچے، شام میں اس کی نوآبادیاں زیادہ قائم ہوتی گئیں، اور یورپ میں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اس کے وقار میں زیادہ اضافہ ہوا (تفصیل کے لئے دیکھو مضمون کروسیڈ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۱، ص ۴۵، گیارہواں ایڈیشن)

ان لڑائیوں کی وجہ سے جرمنی کی سیاست بھی ایسی الجھی کہ اس کے سلجھنے میں بڑی دیر لگی، لیتھونیا کے دشمن کی شرکت کی وجہ سے پروشیا کی سیاست بھی ایسی بدلی کہ اس کے بعد جدید پروشیا کی بنیاد پڑی (دکروسیڈ اِیچر اینڈ گنگسفو، باب ۲۸)

ان لڑائیوں کا سب سے زیادہ اثر بازنطینی سلطنت پر پڑا، اس کی سرحد یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلی ہوئی تھی، قسطنطنیہ نہ صرف اس سلطنت بلکہ یورپ کا حصن حصین تھا، اس کو مسلمان فتح نہ کر سکے تھے، مگر جب چوتھی صلیبی جنگ کے سلسلہ میں صلیبیوں نے اس کو لوٹ کر برباد کر دیا اور وہاں فلانڈرس کا رئیس شہنشاہ بنا دیا گیا تو قدیم شہنشاہی کی طرح یہ شہنشاہی قوی ثابت نہیں ہوئی، یہ تباہ ہوئی تو یونانی شہنشاہی قائم ہوئی، مگر اس کو بھی سابق قوت کبھی حاصل نہیں ہوئی، اور وہ کمزور ہوتی گئی، (تاریخ یورپ از اے، جے گرانٹ ص ۳۶۲)

جب دولت عثمانیہ ابھری تو وہ اس بازنطینی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس سے برسرپیکار رہی، عثمان خاں اول نے تو اس کے اہم قلعے فتح کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ بحر اسود تک پہنچا دیا، پھر ایشیائے کوچک میں اس کے شہر بروصہ کو بھی حاصل کر لیا، عثمان خاں کے بیٹے اور خان نے گیلی پولی پر قبضہ کر کے مسیحی یورپ میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ویانا کی دیواروں تک پھیل گئی، بازنطینی حکومت کا قیصر کنٹا کوزین تو اتنا اس کے سامنے جھکا کہ اس نے اپنی بیٹی تھیوڈرا کو خان کے حبالۂ عقد میں دے دیا، اس وقت اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا، قسطنطنیہ کے علاوہ صرف تھریس، مقدونیہ اور موریا کے کچھ حصے اس کی سلطنت میں رہ گئے تھے، اور خان کے جانشین مراد اول کے زمانہ میں دولت عثمانیہ کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر مسیحی حکومتیں صلیبی جنگ کے زمانہ کی طرح اس کے خلاف صف آرا ہوئیں، مگر کسووا کی جنگ میں ہلال کو صلیب پر فتح ہوئی، اور جب مراد اول مرا تو یورپ میں بلغاریہ، سرویا اور بوسینا پر اس کا تسلط تھا،

مراد کے جانشین بایزید اول یلدرم کی طاقت اور بڑھی تو سرویا کے بادشاہ نے اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا کو اس کے نکاح میں دے دیا، اس نے اپنی بڑھتی ہوئی طاقت سے فائدہ اٹھا کر

قسطنطنیہ میں بہت سی رعایتیں حاصل کر کے اس کے آخری قلعہ فلاڈلفیا پر بھی قبضہ کرلیا، ولاچیا اور بلغاریہ بھی اس کے زیر نگیں ہو گئے اناطولیہ اور ایشیائے کوچک کے اکثر علاقے اس کی حکومت میں شامل ہو گئے اور جب یورپ میں اس نے نائکوپولس، ویدین اور سلسٹریا کو بھی فتح کر لیا تو پوپ نے اس کے خلاف ایک صلیبی جنگ کا اعلان کیا اور فرانس اور جرمنی، بویریا اور برگنڈی وغیرہ کو ابھار کر ایک صلیبی فوج اس لئے تیار کی گئی کہ بایزید یلدرم کو شکست دے کر یہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے، پھر یہ درۂ دانیال کو عبور کر کے شام میں داخل ہو، اور ارض مقدس پر قبضہ کر کے یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کر کے انتقام لے (ہسٹری آف دی اوٹومن ٹرکس از ای ایس کریسی ص ۵۲، ج ۱) پھر ایک بار یورپ میں صلیبی جنگ کی فضا قائم ہو گئی، بڑی خونریزی ہوئی، مگر ہلال صلیب پر غالب آیا، اس کے بعد بایزید نے یونان کو بھی فتح کر لیا، اور جب وہ قسطنطنیہ کی تسخیر کے لئے اس کے محاصرہ میں مشغول تھا تو تیمور اپنے جرار اور سفاک لشکر کے ساتھ اس کے قلمرو پر حملہ آور ہوا، اور اس کو شکست فاش دے کر اس کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، تیمور نے اس کو قید کر لیا، اور اسی قید میں اس کی موت ہوئی، اس کی اس شکست پر یورپ میں بڑی خوشی منائی گئی، اور بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، لیکن محمد اول نے دولت عثمانیہ میں از سر نو جان پیدا کی، اس کے جانشین مراد ثانی کے عہد میں اس کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے نہ صرف قسطنطنیہ سے ٹکر لی بلکہ سالونیکا اور سرویا پر بھی قبضہ کر لیا، مسیحی حکومتیں مل کر اس کے خلاف بیس برس تک جنگ کرتی رہیں، ان مختلف معرکہ آرائیوں میں صلیبی جنگ کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ان صلیبیوں کو وارنا کی جنگ میں شکست ہوئی، مراد ثانی کے جانشین محمد کے زمانہ میں ترکوں کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا، جس کے بعد بازنطینی امپائر کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد جس طرح قسطنطنیہ میں داخل ہوا ہے، اس کا ذکر لارڈ ایورسلے نے اپنی کتاب ٹرکش امپائر میں اس طرح کیا ہے، "اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے، اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتحِ قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا، جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں، جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہو پائی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی، اور وہ اس میں کامیاب رہا، (ص ۷۸ بحوالۂ دولت عثمانیہ ج ۱، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڈھ ص ۱۱۵) پروفیسر آرنلڈ نے بھی اپنی مشہور کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ قسطنطنیہ کے عیسائیوں نے اطاعت قبول کر لی تو وہاں کے کلیسا کے بطریق کو یہ رعایتیں دی گئیں کہ وہ شہر میں جلوس کے ساتھ نکل سکتے ہیں، وہ اپنی عدالت میں اپنے مقدمے خود فیصلے کر سکتے ہیں، اپنے مجرموں کو موت کی سزا بھی دے سکتے ہیں، وہ اپنی عیسوی فقہ پر عمل کر سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، لارڈ ایورسلے محمد کی اس رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ محمد کی عظیم الشان رواداری یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمان موروں کے ساتھ جنھوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں یعنی عیسائیوں کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کو ملک سے نکالتے وقت یہ نمونہ پیش نہیں کیا، یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، (ٹرکش امپائر لارڈ ایورسلے ص ۸۹)

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر آرچر اور کنگسفورڈ نے تبصرہ کرتے ہوئے اجمالی طور پر لکھا ہے کہ پہلی جنگ صلیبی کی وجہ سے رومن امپائر سلجوقیوں کے زیر نگیں ہونے سے بچ گیا تھا،

آخر بارھویں صدی میں اس امپائر کے بہت سے کھوئے ہوئے علاقے واپس مل گئے تھے، لیکن بعد میں صلیبی فوج جس منتشر طریقے سے جنگ کے لئے روانہ ہوئی اس سے اس امپائر کو بڑا نقصان پہونچا، اس کے زوال کو صلیبی جنگ سے منسوب کیا جاسکتا ہے، (ص ۴۴۴)

یہی مصنفین لکھتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی طاقت مشرقی یورپ میں یونانی امپائر کے زوال سے بڑھتی گئی، چودھویں صدی کے آخر میں بایزید نے بلغاریہ اور سردیہ کو زیر کیا، پھر ہنگری خطرہ میں پڑ گیا، جس سے مغربی یورپ کے سورما عیسائیت کے مشترکہ دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فرانس کے ناٹٹون کی ایک بڑی جماعت ترکوں سے برسرپیکار ہوئی، مگر شکست کھا گئی، اس وقت بایزید قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکا، لیکن اس میں عیسائیوں کے شجاعانہ کارناموں کا کوئی دخل نہیں، تیمور کا حملہ حائل ہوا، پھر بایزید کے لڑکوں میں خانہ جنگی بھی رہی، جس سے قسطنطنیہ کچھ دنوں اور محفوظ رہا، لیکن ۱۴۵۳ء میں جب محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو پوپ نے مغربی یورپ کو ایک صلیبی جنگ کے فرائض ادا کرنے پر پھر ابھارا، لیکن دو صدیوں تک ترک مشرقی یورپ پر طوفانی بادل کی طرح چھائے رہے، جب ۱۵۷۱ء میں لیپانٹو اور ۱۶۸۳ء میں ویانا میں ترکوں کو جو شکست ہوئی تو یہ یقیناً صلیب کی فتح تھی، مگر چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک ترکوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں مقدس جنگ کا رنگ نہیں رہا، (کریسیڈص ۴۲۱ - ۴۲۰)

ان لڑائیوں میں بیت المقدس کی صلیبی لڑائیوں کا مذہبی جنون نہ رہا ہو، مگر فرانسیسی مؤرخ موسیو لیبان نے اعتراف کیا ہے کہ جنگ صلیبی نے کئی صدیوں تک دنیا میں شدید مذہبی عداوت اور ناروا داری جاری رکھی، اور اس کو بے رحمی اور خونخواری کے درجہ تک پہنچا دیا، جس کی مثال مذہب یہود کے سوا کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی (تمدن عرب ص ۳۰۸)

یہ مذہبی عداوت، نارواداری، بے رحمی اور خونخواری صدیوں تک کس کے خلاف رہی، یقیناً مسلمانوں کے خلاف، عیسائی سسلی اور اسپین کے مسلمانوں کا خون چوسنے کے بعد مطمئن نہیں ہوئے، تو ٹرکش امپائر کے مسلمانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے برابر تحاکوشش کرتے رہے اور اس میں وہ کامیاب رہے، انھوں نے صدیوں کی کوششوں کے بعد پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹرکش امپائر کا تیا پانچہ کر دیا، کس طرح؟ اس کی ایک جھلک یورپ کے مشہور مورخ ٹوائن بی کی حسب ذیل تحریر میں دکھائی دے گی، سمرنا میں جب یونانی فوج داخل ہوئی تو ٹوائن بی لکھتا ہے، ۵، مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہوگیا، جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے کے بعد ایک روز دفعۃً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہوگیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے، عقبی خطہ کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں، ایک فوجی دیوار کھڑی ہوگئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کے بندرگاہوں کو اندرون ملک سے جدا کرکے تجارت کو تباہ کر دیا، لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے، اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لئے گئے یا جلا وطن کر دئے گئے، غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا، (بحوالہ دولت عثمانیہ ج ا، ص ۳۴۸، شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ)

کیا یہ سفاکی، خونریزی اور ہولناکی صلیبی جنگ کی یاد تازہ نہیں کر رہی تھی،

<u>کلیسا پر اثرات</u> | اب تک صلیبی لڑائیوں کے جو فوری اور دور رس سیاسی اثرات مرتب ہوئے، اس پر روشنی ڈالی جا چکی اب ذرا یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان لڑائیوں سے کلیسا کو کیا نتائج

کیا کیا فوائد اٹھائے، یہ لڑائیاں پوپ ہی کے اشتعال دلانے پر چھیڑی گئیں، اس کی ہر آواز پر یورپ آمنا وصدقنا کہتا رہا، صلیبی فوجیں اسی کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہوتی رہیں، صلیبیوں کی فوج اسی کی فوج سمجھی جاتی، اس سے پاپائی طاقت میں اتنا اضافہ ہوا کہ یورپ کے حکمراں اس سے خوفزدہ رہنے لگے، پوپ کی طاقت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ فرانس کا بادشاہ سینٹ لوئی اپنے ملک فرانس میں تو مقبول رہا، مگر پوپ اس سے پانچویں جنگ صلیبی میں خفا ہوا، تو اس کو اور اس کے قلمرو نیپلز کو کلیسا کے دائرۂ اثر سے خارج کر دیا، فریڈرک اور پوپ دونوں کے جانشینوں میں سخت اختلاف رہا، فریڈرک نے تو یہ آواز بلند کی کہ زمانہ کی ساری خرابیاں اہل کلیسا کے غرور اور دولت کی وجہ سے ہیں، اس کی اس رائے سے یورپ کے دوسرے حکمراں بھی متاثر ہوئے، (آوٹ لائن آف ہسٹری، از، ایچ، جی، ویلس ص ۶۶۰)

کلیساؤں کے غرور کی وجہ یہ بھی تھی کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں وہ یورپ کے ہر ملک کی سیاست میں بھی اثر انداز ہونے لگے تھے، مغربی یورپ کے ہر ملک کے کلیسائی نظام میں پوپ مقتدر اعلیٰ قرار دے دیا گیا تھا، اس کے احکام کو حکومت بھی تسلیم کرنے لگی، جس سے آگے چل کر حکومت اور کلیسا میں بڑی آویزش ہوتی گئی۔

صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں اہل کنیسا کا اثر اس لحاظ سے بھی بڑھا کہ جو لوگ صلیبی جنگ میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوتے تو وہ ان ہی کے حکم کے پابند رہتے، اور جو صلیبی جنگ میں جانے کا وعدہ کر کے اس میں شرکت کرنے سے گریز کرتے تو ان کے معتوب ہو جاتے۔

ان کلیساؤں کو ان لڑائیوں کے زمانہ میں متمول ہونے کا بھی موقع ملا، پوپ نے

تو "صلاح الدین ٹیکس" کی طرح عشر بھی عاید کر رکھا تھا، صلیبیوں کے پاس جنگ میں شریک ہونے کے لئے سرمایہ نہ ہوتا تو وہ اپنی زمین، جائداد اور اثاثہ فروخت کر دیتے، ان کو زیادہ تر کلیسا کی طرف سے خرید لیا جاتا یا خود پادری انفرادی طور پر خرید لیتے، جو لوگ بوڑھے، یا جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہوتے تو وہ شرکت سے بچنے کی خاطر اپنا اثاثہ کلیسا کے حوالے کر دیتے، اس طرح کلیسا اور پادریوں کے پاس بڑی دولت جمع ہوگئی، جس زمین اور جائداد پر ان کا قبضہ ہو جاتا وہ برابر ان ہی کے پاس رہتی، ان کی بڑھتی ہوئی دولت کا برا رد عمل بھی ہوا اور کلیسائی نظام میں ریفارمیشن کی جو تحریک چلی اس میں ان کلیساؤں کا متمول ہونا بھی تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہب کو ان لڑائیوں میں جس طرح استعمال کیا گیا، مفاد پرستوں کی وجہ سے ان میں جو ناکامیاں اور ہولناکیاں ہوئیں، اس سے بھی ایک طبقہ میں بڑا تکدر پیدا ہوا، جس سے بھی یورپ کے ریفارمیشن کی تحریک میں بڑی مدد ملی، (مزید تفصیل کے لئے دیکھو کریسیڈ، از آرچر اینڈ کنگسفورڈ ص ۴۳۲-۴۳۴ اور تمدن عرب از موسیو لیبان، ص ۳۰۸ - ۳۰۷)

تجارتی و اقتصادی اثرات پہلے ذکر آچکا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یورپ کے تاجروں کو مشرق میں ایک تجارتی منڈی مل جائے، جو ان لڑائیوں کی وجہ سے ان کو مل گئی، گرانٹ لکھتا ہے کہ شمالی اطالیہ کی تجارتی سلطنتوں نے صلیبی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا، اس سے انھوں نے بہت سے مالی فوائد حاصل کئے، مشرق کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں میں انھوں نے تجارتی حقوق پیدا کر لئے، اس طرح قسطنطنیہ کی تجارت وینس اور جنیوا کے بندرگاہوں میں منتقل ہوگئی تھی، دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وینس کو ان مذہبی لڑائیوں سے زیادہ نفع حاصل ہوا، (ص ۱۶۱ - ۳۰۶) وینس کے تاجروں نے تو اسکندریہ

کے مسلمانوں سے اپنی تجارت کی خاطر دوستانہ تعلقات بھی پیدا کر لئے تھے، اور جب یہ لڑائیاں ختم بھی ہو گئیں تو ان کی تجارت بدستور جاری رہی، جب ان کی تجارت خطرے میں پڑ جاتی تو اطالوی تجار صلیبی جنگ سے آزردہ اور بد دل رہتے، (کرسیڈ از آرچر اینڈ کنگسفورڈ ص، ۴۳۶ - ۴۳۳) پہلے ذکر آیا ہے کہ اطالوی تاجروں نے اپنے تجارتی مفاد کی خاطر صلیبیوں کا رخ زارا اور قسطنطنیہ کی طرف بھی موڑ دیا تھا، زاران کا تجارتی حریف ہو گیا تھا، اس کی تباہی کے بعد تجارت پر وینس کا پورا قبضہ ہو گیا، اس کی تفصیل لکھتے ہوئے "دی بازنطینی امپائر" کے مصنف سی ڈبلیو، سی اومان رقمطراز ہے، کہ چوتھی صلیبی جنگ میں صلیبی وینس میں مقیم تھے، وہ اس مہم پر روانہ ہوئے تھے کہ مصر کے سلطان العادل پر وہاں پہونچ کر ایک کاری ضرب لگائیں، وینس کے تاجروں نے ان کو بحری بیڑے دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر اس شرط پر کہ وہ مصر کے ساحل پر حملہ آور نہ ہوں، کیونکہ ان تاجروں کے تعلقات مصر کے سلطان سے بہت اچھے تھے، جس نے اسکندریہ میں ان کو اتنی تجارتی رعایتیں دی تھیں کہ ہندوستان تک کی تجارت ان کے ہاتھوں میں آ گئی تھی، اسلئے ان تاجروں نے ان صلیبیوں کا رخ موڑ دیا، صلیبیوں نے وینس کے تاجروں سے جہاز دینے کا جو کرایہ دینے کا معاہدہ کیا تھا وہ نہ دے سکے تو تاجروں کو ایک بہانہ مل گیا، زارا کے شہری ان دنوں وینس سے بغاوت کر کے ہنگری کے بادشاہ سے مل گئے تھے، وینس کے تاجروں نے صلیبیوں سے کہا کہ اگر وہ زارا پر حملہ کر کے وینس کے ماتحت کر دیں تو وہ ان کے سارے قرض معاف کر کے ان کو وہاں پہونچا دیں گے، جہاں جانا چاہتے ہیں، صلیبی مسلمانوں کے خلاف ایک مقدس جنگ کرنے چلے تھے، لیکن وہ اب عیسائیوں کے ایک قصبہ کی طرف بڑھے، ضمیر رکھنے والے اس کے لئے آمادہ نہ ہوتے، وہ تو مصر کی مہم کے لئے اصرار کرتے، لیکن صلیبیوں کے یہاں گذشتہ ایک سو سال سے ضمیر کمیاب ہوتا جا رہا تھا، ان میں حریص مہم باز فوجی سردار تھے، جو زارا پر

حملہ کرنے کے لئے راضی ہو گئے،۔

زاراکی تسخیر ہوگئی، تو وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے..... جہاں کے حکمراں کے بھتیجے الیکوس نے ان کو قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کی دعوت اور وعدہ کرکے دی کہ وہ ان کو روپیہ، رسد، جنگی بیڑے اور فوج بھی دے گا، پوپ زارا جیسے عیسائی شہر پر ان صلیبیوں کے حملہ سے آزردہ تھا، مگر وینس کے تاجر صلیبیوں کو مصر پر حملہ کرنے سے باز رکھنا چاہتے تھے، اس لئے وہ بھی ان کا رخ قسطنطنیہ کی طرف موڑ دینا چاہتے تھے،........ یہ صلیبی قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے........ اور جب اس کو فتح کیا تو تین دن زنا اور غارت گری کا جشن مناتے رہے، نائٹ اور سپاہی اپنی پسند کے گھر میں گھس جاتے، اور اندر جا کر ان کا جو جی چاہتا کرتے، گرجاؤں اور ننوں کی رہائش گاہوں کو بھی نہ چھوڑا، پوپ بھی چیخ اٹھا کہ اس قسم کی فتح سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، شراب پی کر بدمست سپاہیوں نے ایک طوائف کو سینٹ صوفیہ کے منبر پر بٹھا کر اس کی تاج پوشی کی، اور اس سے ناشائستہ گانے گوائے، اور ناروا رقص کرائے، صلیبیوں کے ساتھ بہت سے پادری بھی تھے، وہ اپنے ہموطنوں کو ان ناروا حرکتوں سے روکنے گئے، مگر وہ خود لوٹ میں مشغول ہوگئے، گرجاؤں میں جتنی مقدس چیزیں تھیں، اُن سب کو انھوں نے لوٹا، ایک یونانی مصنف نے اس غارت گری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس نے لکھا کہ کافر مسلمانوں نے ایسی ناروا حرکتیں نہیں کیں، جو ان صلیبیوں کے ذریعہ سے عمل میں آئیں، مسلمانوں نے جب کوئی شہر فتح کیا تو انھوں نے گرجاؤں اور عورتوں کا احترام کیا (باب ۲۲ ص ۲۹۰-۲۷۹)

وینس کے تاجروں کے ساتھ مارسیلز کے تاجروں نے بھی فلسطین میں اپنی تجارت کی منڈی قائم کر دی تھی، اس طرح انگلستان، جرمنی، ڈنمارک اور ناروے کے تجارتی بیڑے بھی

بحر قلزم میں پہنچنے لگے، جس سے ان ملکوں کی دولت میں اضافہ ہونے لگا، یروشیا کے تاجروں نے بھی اس سے فوائد اٹھائے، تجارت بڑھی تو بینک بھی قائم ہونے لگے، زر مبادلہ کی سرگرمیاں بھی بڑھیں، بحری قوانین کا نفاذ بھی صلیبی جنگ کے ہی زمانہ سے شروع ہوا، اس تجارت سے مرچوں، مسالہ، خوشبوئیات کا رواج یورپ میں ہونے لگا، صقلیہ میں ریشم کے کارخانے قائم ہوئے گنے کی پیداوار بھی وہاں ہونے لگی، روئی اور ریشم کی صنعتیں شام سے یورپ میں آنے لگیں، ایران سے خوشبوئیات، ہندوستان سے مسالہ اور جواہرات، اور چین سے چینی برتن آنے لگے (آر جے اینڈ کنگسفورڈ ص ۴۴۰۔ ۴۴۳) موسیو لیبان لکھتا ہے کہ وہ تجارتی ترقی جو صلیبی جنگوں کی وجہ سے پیدا ہوئی صلیبیوں کے ایشیا سے نکالے جانے پر بھی ختم نہیں ہوئی، کیونکہ اطالیہ کے اکثر خود مختار تجارتی بندروں نے سلاطینِ اسلام کے ساتھ معاہدے کر لئے تھے، اور یہی مشرقی تجارت ونیس کی سرسبزی اور قوت کا باعث ہوئی اور اس وقت تک عروج پر رہی، جب کہ نئے بحری راستوں کے قائم ہونے سے یہ تجارت دوسری قوموں کے ہاتھوں میں چلی گئی، (تمدن عرب ص ۳۱۰) یہی مورخ لکھتا ہے، صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے لکڑی اور فلزات کی دستکاریاں، چینی اور شیشے کے عمدہ کام کی واقفیت ایشیا سے یورپ کو ہوئی، صور کے شیشہ کے آلات وینس کے لئے نمونے بن گئے، ریشمی کپڑوں کا بننا اور ان کا عمدگی کے ساتھ رنگنا، جو مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ پر تھا، یورپ میں پھیل گیا، پھر صلیبی فوج کے ساتھ جو تجار اور صیقل گر شام سے گئے، انھوں نے اپنے پیشوں سے متعلق وہاں سے بہت کچھ سیکھا، (ایضاً ص ۳۱۰-۳۱۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں کروسیڈ کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ بہت سے نئے پودے نئے پھل، نئے رنگ، پوشاک میں نئے بنفشی، شکر، باجرا، لیموں، خوبانی، تربوزے، روئی، ململ، بوٹے دار ریشمی کپڑے، بنفشی ارغوانی اور آسمانی رنگ، پوڈر، آئینے اور تسبیح کے دانے وغیرہ

یورپ میں صلیبی لڑائیوں کے بعد ہی یورپ میں ... سے آنے لگے (مضمون کرپیڈ انسائیکلو
پیڈیا برٹانیکا، ج ۵، ص ۵۵۰ - ۵۴۹، گیارہواں ایڈیشن)

معاشرتی اثرات | لیبان لکھتا ہے کہ فنون اور صنعت میں مشرق کا اثر یورپ پر بہت کچھ
ہوا، ان پر تکلف اور خوبصورت اشیا کو دیکھ کر جو مشرق میں قسطنطنیہ سے لے کر مصر تک موجود
تھیں صلیبیوں کا مذاق درست ہو گیا، یورپ کا طرز عمارت بھی بالکل بدلنے لگا، ان کی
عمارتوں میں عرب کے تمدن کے اثرات پائے جانے لگے، (تمدن عرب ص ۳۱۱) آرچر اور کنگسفورڈ
نے لکھا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ میں تاجروں کے ذریعہ سے تعیشات کے سامان آنے
لگے، تو ان کے باشندوں کا معیار زندگی عیش پسندی کی حد تک بڑھ گیا (ص ۴۳۶) فلپ
ہٹی لکھتا ہے کہ عیسائی جب بیت المقدس پہونچے تو ان کا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں سے اپنے تمدن
میں برتر ہیں، وہ مسلمانوں کو بت پرست سمجھتے، ان کا عام خیال تھا کہ وہ محمدؐ کو خدا کی حیثیت
سے پرستش کرتے ہیں، لیکن ان کا میل ملاپ مسلمانوں سے بڑھا تو ان کی یہ غلط فہمی جاتی رہی
اور جب ان کا باہمی ملنا جلنا بڑھا تو دونوں کے خیالات میں نمایاں فرق ہونے لگا، دونوں
میں ہمسایہ کے دوستانہ تعلقات پیدا ہونے لگے، عیسائی اپنے یہاں مقامی کاریگروں اور
کاشتکاروں کو رکھنے لگے،

انھوں نے اپنی جاگیر میں فیوڈل نظام قائم کیا تھا، مگر مقامی نظام ہی کو اختیار کر لیا
وہ اپنے ساتھ گھوڑے، باز اور کتے بھی لے گئے تھے، انھوں نے یہ معاہدہ کر لیا کہ ان کے شکار
کی مہم میں ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا، دونوں طرف سے مسافر اور تاجر بحفاظت تمام
آنے جانے لگے، عیسائیوں نے اپنا یورپی لباس پہننا چھوڑ دیا، اور عربوں کا مناسب اور
آرام دہ لباس پہننے لگے، وہ ایسی غذائیں بھی کھانے لگے، جن میں مسالہ اور شکر زیادہ

ہوتی، وہ ایسے مشرقی طرز کے مکانات بھی پسند کرنے لگے، جن میں وسیع صحن اور فوارے ہوتے،
انھوں نے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنا شروع کیا، اور وہ مسلمانوں
حتی کہ یہودیوں کے متبرک مقامات کا احترام بھی کرنے لگے، اور جب وہ آپس ہی میں لڑ جاتے
تو ان کفار (یعنی مسلمانوں) سے مدد کے خواستگار بھی ہوتے، مسلمان بھی مسلمانوں کے خلاف
عیسائیوں سے مدد لیتے (ہسٹری آف دی عربس ۴۴۳-۴۴۴) انگلستان کے بادشاہ
ایڈورڈ اول نے تو یہ تجویز پیش کی تھی کہ یورپ کی شہزادیاں مسلمانوں کے حرم میں بلا تکلف
داخل کر دی جائیں، تاکہ وہ اپنے حسن سے اپنے مسلمان شوہروں کو اپنا مذہب بدلنے پر
آمادہ کریں (کروسیڈ ص ۴۲۹) یورپ کے مدبرین کی یہ پرانی چال رہی ہے کہ تیغ وسنان
سے کام لینے کے ساتھ حسین عورتوں کے مژگان سے بھی کام لیتے رہے ہیں، سلجوقی خاندان
اور دولت عثمانیہ کے فرمانرواؤں کے حرم میں یورپ کی بہت سی شہزادیاں داخل ہوئیں،

علمی اثرات | صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ کے جغرافیہ دانوں ایشیا کے جغرافیہ سے واقف
ہونے کی کوشش کی تو جغرافیہ پر اچھا لٹریچر فراہم ہوگیا، پھر مورخوں نے ان لڑائیوں
کی تاریخیں لکھیں، تو تاریخی لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا، ان پر اچھی اچھی نظمیں بھی لکھی گئیں،
فرانسیسی شاعری پر تو صلیبی لڑائیوں کا اچھا خاصا اثر پڑا، اسی کے بعد یورپ والوں کو
مشرق کی زبانوں کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ۱۳۱۱ء تک آتے آتے یورپ میں مشرقی
زبانوں کے چھ اسکول کھل گئے، اور مشرق کے بہت سے قصے یورپ میں لکھے جانے لگے، مغربی
یورپ کے ملکوں کی زبانوں میں عربی کے کچھ الفاظ بدلی ہوئی شکلوں میں استعمال ہونے لگے،
تجارت، جہاز رانی اور موسیقی کے بھی اصطلاحات عربی زبان سے لئے گئے (انسائیکلو پیڈیا آف
برٹانیکا ج ۶ ص ۵۵۰-۵۴۹ گیارہواں اڈیشن)

مسلمان سلاطین کے کردار اور شجاعت کا اثر	صلیبی بلکہ خود یورپ کے فرمانروا عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے کردار اور شجاعت سے مرعوب اور متاثر

رہے، جیسا کہ یورپ کے حسب ذیل مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوگا۔

گبن لکھتا ہے کہ عماد الدین زنگی نے افرنجیوں سے انطاکیہ میں لڑ کر اپنی سپہگری کی شہرت قائم کی، اس نے تیس معرکے اور سر کئے جس کے بعد اس کو موصل کا علاقہ دیا گیا تاکہ وہ اپنے پیغمبر کے مشن کا حق ادا کر سکے، اور اس نے اپنے عوام کی امیدوں کو پورا کیا، اس نے پچیس [25] دن کے محاصرہ کے بعد الرہا (اڈیسا) کی تسخیر کی، اور افرنجیوں نے فرات تک کے جو علاقے فتح کر لئے تھے، ان کو پھر سے حاصل کیا، اس نے کردستان کے جنگجو قبیلوں کو بھی سر کیا، اس کے سپاہی نے فوجی کیمپ ہی کو اپنا ملک سمجھتے، ان کو اپنے اس آقا کے فیاضانہ انعامات کے عطا کرنے پر پورا بھروسہ رہتا، اور وہ بھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے خاندانوں کی پوری نگہبانی کرتا، اس کے لڑکے نور الدین نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی قوت کو متحد کیا، حلب کی حکومت میں دمشق کا اضافہ کیا، شام کے عیسائیوں کے خلاف بڑی طویل لڑائی لڑتا رہا۔ اس نے اپنی سلطنت کی سرحد دجلہ سے نیل کے ساحل تک بڑھا دی، عباسیوں نے اس کو وہ سارے خطابات اور مراعات دیئے جو بادشاہت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، عیسائی خود اس کی ہوشمندی، شجاعت، انصاف پسندی اور سیرت کی طہارت کو تسلیم کرنے پر مجبور رہتے، اپنی حکومت کے زمانہ میں اس مقدس سپاہی نے اسلام کے پہلے چار خلفا کے جوش و خروش اور سادگی کا اعادہ کیا تھا، اس کے محل میں سونا اور ریشمی کپڑے نہیں دکھائی دیتے، اس کی مملکت میں شراب کا استعمال ممنوع تھا، بیت المال کی آمدنی عوام کی خدمت میں بھی صرف ہوتی، اس کی خانگی زندگی بہت ہی سادہ تھی، جس کے مصارف اس مال غنیمت سے پورے کیے جاتے جو اسکو ہاتھ [illegible] اسکی ملکہ نے [illegible] کچھ زیور مانگے

تو وہ کہتا کہ "مجھ پر خوفِ الٰہی طاری رہتا ہے، میں مسلمانوں کا صرف خزانچی ہوں، میں ان کے مال کا ناجائز مصرف نہیں لے سکتا، حمص میں میری ملکیت میں تین دکانیں ہیں، یہی تم لے سکتی ہو" اس کی عدالت میں بڑے سے بڑے لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی، اور یہ غرباء کی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی، اس کی وفات کے چند سال کے بعد ایک مظلوم دمشق کی سڑکوں پر چلا کر کہتا تھا، نورالدین! نورالدین! اب تم کہاں گئے، اٹھو! آؤ، اور ہم لوگوں پر رحم کھاؤ، اور ہم کو بچاؤ، اور جب کوئی انتشار پھیلتا، تو ایک ظالم کی گردن نورالدین کے نام سے جھک جاتی (فال اینڈ ڈکلائن آف دی رومن امپائر، ج ۷، ص ۸۸ ـ ۴۸۷)

گبن صلاح الدین ایوبی کے بارہ میں لکھتا ہے کہ وہ کھردرے قسم کا اونی لباس پہنتا، صرف پانی ہی اس کے مشروبات میں تھا، اپنی سیرت کی پاکیزگی میں اپنے رسولؐ سے بھی آگے چلا گیا تھا (؟) وہ اپنی زندگی اور عمل میں کٹر قسم کا مسلمان تھا، وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ اپنے مذہب کی مدافعانہ لڑائیوں کی خاطر حج کرنے کو نہیں جا سکتا ہے، وہ حج کے لئے جاتا رہا، پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، وہ روزے بھی برابر رکھتا رہا، اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بھی کلام پاک کی تلاوت کر لیا کرتا تھا، اور جب غنیم کی یورش ہوتی تو بھی اس کی تلاوت میں مشغول رہتا، یہ بظاہر نمائشی چیز معلوم ہوتی ہے، مگر اس سے اس کی پرہیزگاری اور ہمت دونوں ظاہر ہوتی ہے، وہ شافعی مسلک کا تھا، اس لئے اسی مسلک کے عقائد کا مطالعہ کرنے کی ترغیب کر دیتا، شعراء اس کی مذمت سے محفوظ رہے، لیکن اس کو غیر مذہبی علوم سے نفرت تھی، ایک فلسفی نے بہت سی نئی باتیں کہیں تو وہ اس کی سزا کا مستحق ہو گیا، اس کی عدالت کا دروازہ ادنیٰ آدمیوں کے لئے کھلا رہتا اور وہ اس کے اور اس کے وزراء کے خلاف مقدمے دائر کر سکتے تھے، سلطان صرف اپنی سلطنت کے مفاد میں ہی کبھی انصاف سے تجاوز کر جاتا، سلجوقیوں اور زنگیوں کے

جانشین اس کے رکاب میں ضرور رہتے، اس کی پوشاک کو جھاڑ اگر دیتے، مگر وہ اپنے ادنی سے ادنی ملازموں کے لئے نرم اور متحمل رہا، اس کی فیاضی کی کوئی انتہا نہ تھی عکہ کی تسخیر کے وقت اس نے بارہ ہزار گھوڑے تقسیم کئے، جب اس کی وفات ہوئی تو اس کے خزانے میں صرف ۴۷ نقرئی درہم اور ایک اشرفی تھی، لیکن اس کی فوجی حکومت میں متمول شہری کسی خوف اور خطرہ کے بغیر اپنی محنت کا صلہ پاتے رہتے، اس زمانہ میں مصر، شام اور عرب کو اسپتالوں، مدرسوں اور مسجدوں سے آراستہ کیا گیا، قاہرہ کو حصار سے محفوظ کیا گیا، سلطان اپنے کو کسی نہ کسی مفید کام میں مشغول رکھتا، وہ کسی باغ میں تفریح کے لئے نہیں جاتا اور نہ اپنے محل کے اندر کوئی تعیش کا سامان کرتا، یہ مذہبی جنون کا زمانہ تھا، لیکن صلاح الدین کی خوبیوں سے خود عیسائی متاثر ہو کر خراج عقیدت پیش کرتے رہے، جرمنی کے شہنشاہ کو اس کی دوستی پر فخر رہا، یونانی شہنشاہ اس سے اتحاد اور تعاون کا خواستگار ہوا، اور جب سلطان نے یروشلم کو فتح کیا تو اس کی شہرت کو چار چاند مشرق اور مغرب دونوں جگہوں میں لگے (ایضاً ص ۴۰۶-۴۰۴)

آرچر اور کنگسفورڈ عماد الدین زنگی کے بارہ میں رقمطراز ہیں کہ زنگی کی سیرت میں بہت سے شریفانہ اوصاف تھے، وہ ایک بہادر سپاہی، ایک لائق جنرل اور ایک ہوشمند مدبر تھا، اس کی سب سے بڑی کمزوری صرف یہ تھی کہ وہ فریب اور جھوٹ سے بھی کام لیا کرتا تھا، لیکن ایک حکمراں کی حیثیت سے وہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے کام پر نظر رکھتا تھا، اور اپنی انتھک سرگرمیوں کی بدولت وہ مستقبل کے واقعات سے بھی باخبر ہو جاتا، وہ اپنے ماتحتوں کے لئے ضابطے کی پابندی میں بہت سخت تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ ایک ملک میں ایک ہی ظالم کو ہونا چاہئے، اس کے خوف سے ہر شخص لرزہ براندام رہتا، ایک بار اس نے ایک ملاح کو اپنی ڈیوٹی کے وقت سوتا پایا، جب اس نے اس کو جگایا تو اس پر اتنا خوف طاری ہوا کہ اسی وقت گر کر مر گیا (کروسیڈ ص ۲۰۴)

یہی مصنفین نور الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی ہوشیار قسم کا سپاہی تھا، اپنے باپ ہی کی طرح اپنے ماتحت سپاہیوں کا بڑا خیال رکھتا، مگر ان کو لوٹ کی اجازت نہیں دیتا، پھر بھی اس کے سپاہی اس سے محبت کرتے اور لڑائی میں بڑی پامردی سے اس کا ساتھ دیتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ لڑائی میں مارے بھی گئے تو سلطان ان کے اہل وعیال کی پوری خبر گیری کرتا رہے گا، ایک بار اس نے درویشوں کے ساتھ بڑی فیاضی کی جس سے اس کے سپاہیوں کو کچھ ناگواری ہوئی لیکن اس نے ان کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ ان لوگوں کو حق ہے کہ ہماری فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، میں تو ان کا ممنون ہوں کہ وہ اسی پر قناعت کر لیتے ہیں جو اپنے حق کی بنا پر طلب کرتے ہیں، ایک بار ایک امیر نے خراسان کے ایک عالم کی تضحیک کی تو نور الدین نے اس سے کہا کہ اگر تم ان کی برائی بیان کروگے تو میں تم کو سخت سزا دوں گا، گو تم حق بات ہی کیوں نہ کہو، اس عالم میں ایسی خوبیاں ہیں کہ اس کی برائیاں دب کر رہ جاتی ہیں، مگر تم اور تمہارے جیسے لوگوں میں تمہاری برائیاں تمہاری خوبیوں سے بہت زیادہ ہیں،

نور الدین کو تعمیرات سے بھی بڑا شوق تھا، شام میں زلزلہ آیا، تو اس کے بڑے شہروں کی از سر نو حصار بندی کرائی، اس نے ہر جگہ مسجدیں بنوائیں، بہت سے شہروں میں اسپتال قائم کئے، ابن اثیر اپنے تنخواہ دار طبیب سے آزردہ ہو کر دمشق پہونچا، وہاں کے اسپتال والوں نے اس کی خدمت کی اور اس نے ان کو کچھ انعام دینا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہم تو نور الدین سے بھی انعام لینا پسند نہیں کرتے۔

اسلامی فقہ کے مطابق جن کھانوں، مشروبات اور پوشاکوں کی اجازت تھی وہ ہی نور الدین استعمال کرتا، اور اپنی رعایا سے بھی استعمال کراتا، اس کے دربار میں بڑے آداب برتے جاتے، کوئی اس کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا تھا، صرف صلاح الدین کے باپ ایوب کو بیٹھنے

کی اجازت ہوتی...... وہ چوگان کھیلا کرتا، یہی اس کی تفریح تھی، مگر وہ کہتا کہ وہ اس تفریح میں اس لئے مشغول رہتا ہے کہ اس سے اس کی سپہگری کا بیدار رہتی ہے، اور گھوڑوں کی بھی تربیت ہو جاتی ہے، ابن اثیر نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی تفریح میں بھی ریاضت پیدا کر لی تھی،

نورالدین کی سیرت میں اس کے مذہبی جذبات کو بڑا اثر تھا، ان ہی جذبات کی بنیاد پر وہ عیسائیوں سے برابر جنگ کرتا رہا، ایک بار اس سے کہا گیا کہ اس کے بھائی کی ایک آنکھ اس مقدس جنگ میں جاتی رہی تو اس نے نہ افسوس کیا اور نہ اپنے بھائی سے ہمدردی کا اظہار کیا، بلکہ یہ کہا کہ اگر میرا بھائی دیکھ سکتا کہ اس کے صلہ میں اس کو بہشت میں کیا ملے گا تو وہ اپنی دوسری آنکھ کو بھی قربان کرنے کو تیار ہو جاتا، وہ اپنی لڑائی میں اپنے تحفظ کی بھی فکر نہ کرتا، ایک بار اس کے ایک رفیق نے کہا کہ وہ اپنی جان کی فکر نہیں رکھتے، اگر ان کی جان جاتی رہی تو پھر اسلام کا کیا حشر ہوگا، نورالدین نے جواب دیا، نورالدین کون ہے، وہ کیا ہے، ہمارے ملک اور ہمارے مذہب کا محافظ مجھ سے بہتر موجود ہے اور وہ خدا ہے (ص ۱۴۱ - ۲۴۰)

یہی مصنفین صلاح الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ صلاح الدین کو خراج عقیدت عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں نے پیش کیا ہے، تاریخوں اور افسانوں میں اس کا نام اس کے حریف رچرڈ شیر دل کے ساتھ لیا جاتا ہے، ہربرٹ والٹیر کا بیان ہے کہ اگر دونوں کی خوبیاں ایک دوسرے میں جمع ہو جاتیں تو دنیا میں پھر ایسے ۲ شہزادے کبھی نہیں پیدا ہوتے، جب صلاح الدین مرنے لگا تو اس نے اپنے علم بردار کو بلا کر کہا کہ تم نے لڑائی میں میرے علم کو برابر ہاتھ میں رکھا، میری وفات کے بعد بھی میرے جنازہ کے علم کو اپنے ہاتھ میں رکھنا، ایک معمولی چیتھڑے کو ایک نیزہ پر رکھنا اور چلاتے رہنا، دیکھو مشرق کا شہنشاہ اپنے ساتھ دنیا سے صرف کپڑے کا یہ ٹکڑا لے جا رہا

اسٹینلی لین پول عماد الدین زنگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "اتابک زنگی بڑا مردم شناس تھا، اگر کوئی لائق ملازم یا امیر اس کے ہاں ہوتا تو اسے یقین رہتا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کا معتمد ہو جائے گا..... وہ اپنے لشکر میں کسی قسم کے جور و ظلم کو گوارا نہ کرتا تھا، عورتوں کی آبرو ریزی پر جیسی سخت سزا وہ دیتا تھا اُس زمانہ میں کہیں نہ دی جاتی.... جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا، دو رسیاں تان دی گئی ہیں، اور سپاہ ان کے درمیان سے گذر رہی ہے، کسی کو حکم نہ تھا کہ کسی کاشتکار سے وہ ایک تنکہ بغیر قیمت دیئے لے سکے..... تنگ دستوں کی شرح مقرر کرنے میں نرمی کرتا، مگر دولت مند شہروں سے مصارف جنگ کے لئے کثیر رقمیں وصول کرتا تھا، مگر جس قدر روپے وصول کرتا، اس سے زیادہ کام کر دیتا۔ اس کی سختی و سیاست کا نتیجہ تھا کہ تمام عمل داری میں امن و خوشحالی کو ترقی رہی۔ (صلاح، ص ۳۹-۳۸)

نور الدین کے متعلق رقمطراز ہے کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا، دانشمند اور یکا دیندار تھا، گو عیسائیوں پر وہ بہت سخت تھا، مگر عدل وہ صفت تھی جس کی قدر و قیمت اس کے دل میں خدا کے بعد تھی، اس کی رعایا میں سے اگر کوئی شخص قاضی کی عدالت میں طلب کرتا تو ضرور حاضر ہوتا..... بیت المال کے روپئے کو ہاتھ نہ لگاتا..... اس کی سنجیدہ اور متین آنکھوں کا پُر سکوت عالم، بارعب پیشانی اور گندمگوں میں ایک گھلاوٹ پیدا کرتا، چہرہ تقریباً بے ریش تھا، اس میں ایک شریف انسان کا انداز خود داری اور صدق و صفا پایا جاتا تھا، جہاں کہیں وہ ہوتا خاموشی اور سکوت طاری ہوتا رہتا۔ (ص ۱۱۶-۱۱۵)

لین پول نے تو صلاح الدین پر پوری ایک کتاب ہی لکھ دی، وہ اس کے ہر وصف کو جھوم جھوم کر لکھتا ہے اور بڑی بلند آہنگی سے ایک جگہ تحریر کرتا ہے کہ وہ نہ

شرف بخشتا ہے کا ملک تمام مسلمانوں کا سب سے بڑا والی جو صداقت، امداد، عدالت و شجاعت میں یکتا اور بے مثل تھا۔ صلاح الدین ص ۲۰۵)

فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ عماد الدین زنگی کی وجہ سے صلیبی جنگ کا رخ اسلام کی حمایت میں بدل گیا وہ ان ہیروؤں کا ہیرو تھا جن کی انتہا صلاح الدین کی ذات میں ہوئی۔ وہ اسلام کے کاز کا چیمپین تھا مگر اس کا بیٹا نور الدین اس سے زیادہ لائق ثابت ہوا۔ ۵۴۴ھ ۱۱۴۹ء صلاح الدین کا نام تو مسلمانوں کے محبوب حکمرانوں کی فہرست میں ہارون رشید اور بیبرس کے ساتھ ابتک سرفہرست ہے۔ یورپ میں تو گانے والوں اور ناول نگاروں کے لئے ایک موضوع بنا ہوا ہے، اور اب تک بہادری کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ (ص ۶۵۲)

صلیبی جنگ کا تجزیہ | اب تک گذشتہ اوراق میں صلیبی لڑائیوں اور ان سے متعلق اور تمام باتوں کا ذکر یورپ کے مصنفوں ہی کی روشنی میں کیا گیا ہے، ان کا تجزیہ ان سے الگ ہوکر بھی کرنے کی ضرورت ہے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں میں ان لڑائیوں میں بڑا مذہبی جوش پیدا ہوا، مگر سوال یہ ہے کہ کس کی مذہبیت میں ایمان کی طہارت اور کردار کی پاکیزگی زیادہ تھی، فریقین اور فریقین اپنے دعاوی میں پیش قدمی کر سکتے ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائی بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننا چاہتے تھے، مگر وہ چھین نہ سکے، مسلمانوں کا قبضہ اس پر بدستور سابق رہا، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی سپہگری اور ایمان کی ولولہ انگیزی میں عیسائیوں سے برتر رہے، مسلمانوں کی تاریخ میں صلیبی جنگ کا عہد بہت ہی نازک ترین دور تھا، پوری عیسائی دنیا ان کی اور ان کے مذہب کی بیخ کنی کے لئے امنڈ پڑی تھی، مگر انھوں نے جس پامردی اور نبرد آزمائی سے ان کا مقابلہ کرکے

ان کے ارادوں کو ملیامیٹ کیا، وہ ان کی تاریخ کا بہت ہی زریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔
عیسائی ان لڑائیوں کو صلیبی کہکر مذہبی قرار دیتے رہے، مگر یہ مذہبی اس لئے نہیں کہی جاسکتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی تو یہ تعلیم بتائی جاتی ہے کہ تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے دائیں گال پر تھپیڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو اپنا کرتا بھی دیدے، کیا عیسائیوں نے اس تعلیم پر عمل کیا اور اگر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا تو کیا ان کے راہبوں اور قسیسوں نے ان کو حضرت عیسیٰؑ کی یہ تعلیم بتائی تھی کہ مقدس جہاد کرو تو اپنا خون بہاؤ اور اتنا قتل عام کرو کہ فوجیوں کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں خون میں ڈوبے ہوئے ہوں، بچوں کی ٹانگیں پکڑکر ان کو دیواروں سے ٹکرادو اور ان کو جلکہ دے کر فصیل سے پھینک دو، لوگوں کو زندہ جلادو، عورتوں کے جسم کو ریزہ ریزہ کردو، ان کی لاشوں اور کٹے ہوئے اعضاء کے ڈھیر لگادو، (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ مضمون کریسیڈ گیارہواں اڈیشن)

یورپ کے مستشرقین جب مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ لکھتے ہیں تو اس کو قصائی کی دوکان بنادیتے ہیں، مگر کبھی جادو سر پر چڑھ کر بھی بولتا ہے، خود یورپی مصنفوں نے اس جنگ میں عیسائیوں کے جو غیر رواداران مظالم بیان کئے ہیں، ان کی تفصیل گذشتہ اوراق میں آچکی ہے، اس سے انسانیت کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے، لین پول کو لکھنا پڑا کہ صلیبیوں نے بیت المقدس میں داخل ہوکر جو قتل عام کیا اس سے مسیحی دنیا کی عزت میں بٹہ لگا ہے، (صلاح الدین ص ۴۴، ۲۰) اور آج بھی ان کی لڑائیوں سے مسیحی دنیا کی عزت میں بٹہ لگ رہا ہے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم، ہیروشما اور ویٹ نام میں انھوں نے جو ہولناکیاں کیں، ان سے چنگیز خاں اور ہلاکو کی سفاکیاں بھی ماند پڑگئیں، انھوں نے

ان لڑائیوں میں جو کچھ کیا، کیا وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے عین مطابق تھا،

اور اگر صلیبیوں نے یہ مقدس لڑائیاں اس لئے لڑیں کہ بیت المقدس ان ہی کی اصل عبادت گاہ ہے، وہ اس سے کسی حال میں دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، تو پھر اسی سرزمین میں ان کی لڑائیاں محدود ہوتیں، مگر ریجی نالڈ نے تو جزیرۃ العرب کی طرف بھی فوج کشی کی کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو منہدم کر دیا جائے، صرف اس واقعہ سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ صلیبی جنگ بیت المقدس کے لئے نہ تھی بلکہ اسلام کو اس روئے زمین سے مٹا دینے کی کوشش تھی، اس مذہبی جنون میں پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف دو سو سال تک مبتلا رہا اس سے بڑھ کر غیر رواداری، عداوت اور تعصب کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اور اگر یہ واقعی مقدس جہاد اس لئے تھا کہ حضرت عیسیٰؑ جہاں پیدا ہوئے اور جہاں سولی پر چڑھائے گئے، اس لئے اس پر قبضہ عیسائیوں ہی کا ہونا چاہئے تھا، تو آج بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا تسلط ہے، یورپ میں پوپ، قسیس اور راہب کیوں نہیں اس کا اعلان کرتے کہ یورپ کے تمام عیسائی سرخ کپڑے کی صلیب اپنے سینوں پر لگا کر اور اپنی ساری چیزیں لٹا کر بیت المقدس کی طرف کوچ کریں اور اس کو اسرائیلیوں کے ناپاک وجود سے آزاد کر کے پاک کریں، اربن، پیٹر دی ہرمٹ، ریجی نالڈ، فلپ، اگسٹس، فریڈرک، باربروسا، رچرڈ شیر دل اور سینٹ لوئی، جیسے فدائیانِ عیسائیت پیدا ہو کر کیوں نہیں آگے بڑھتے، آہن پوش جوان اور جنگی بیڑے اس کی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے کیوں نہیں بھیجے جاتے، اور موجودہ پوپ کی طرف سے یہ اعلان کیوں نہیں ہوتا کہ جو شخص بیت المقدس کی طرف کوچ کرنے میں صلیب نہیں اٹھائے گا، وہ میرا پیرو نہیں ہے، مگر اسرائیلیوں سے یہ مذہبی لڑائی لڑنے کے بجائے ان کی اسلام دشمنی یہ کام کر رہی ہے کہ تمام اسلامی ممالک

کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں ایسی پیچیدگی اور زبوں حالی پیدا کر دی جائے کہ وہ کسی طرح پنپنے نہ پائیں، جیسا کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں ان کی کوشش رہی۔

اب ذرا اس جنگ میں بعض مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں پر بھی تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے، اسلام مسلمانوں میں وصل نہ کہ فصل کی تعلیم دیتا ہے، قرآن مجید کی تعلیم ہے کہ مسلمان باہمی عصبیت کا شکار نہ ہوں (مائدہ ۲۔ نسا ۱۴۱) وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، (حجرات ۱۰) مگر کیا ان صلیبی لڑائیوں میں تمام مسلمانوں نے یہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا؟ یورپ کی سامراجیت کی جارحیت ان پر اس لئے ہوئی کہ وہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ کر مجموعی حیثیت سے کمزور تھے۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر صلیبی ان پر ٹوٹ پڑے، اس نازک موقع پر تمام مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیئے تھا۔ مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ جب متحدہ یورپ کا زبردست حملہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے ہو رہا تھا، تو شام اور اس کے آس پاس، ربیعہ، موصل حلب، بوذنتج، نصیبین، بخارا، حابور، دمشق، حماۃ، حمص اور حران وغیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی حکومتیں علٰحدہ رہ کر مسلمانوں کی قوت کو کمزور کر رہی تھیں، عماد الدین، نور الدین اور صلاح الدین نے ان کو ملا کر متحد کرنے کی کوشش کی، مگر اسلامی حمیت اور دینی غیرت کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے بعض حکومتیں اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کی بنیاد پر صلیبیوں سے مل جاتیں، معین الدین آنر، سیف الدین، اس کے جانشین عز الدین اس کے چچازاد بھائی عماد الدین اور دمشق کے امرا نے ان سرفروش اور جانباز سلاطین کے خلاف صلیبیوں سے مل کر اپنی خیر تو کچھ دن منالی، مگر اس طرح اسلام سے غداری کی۔

عماد الدین، نور الدین اور صلاح الدین کے کارناموں سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر مسلمان متحد ہوں، ان میں ایمان پروری، دینی حمیت اور ملی غیرت ہو، اور پھر ان کے

قائد میں سیرت کی پختگی، عزم کی بلندی ہو، سیاسی بصیرت ہو، جنگی تدبیر کی ہوشمندی ہو، تو وہ دنیا کی بڑی سی بڑی قوت سے ٹکرا کر فاتح، کامران اور سرخرو ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کے یہی اثرات اس وقت کے یورپ کے فرمانرواؤں پر مترتب ہوئے اور وہ ان سے مرعوب رہے۔

مگر دکھ کی بات تو یہ ہے کہ صلاح الدین نے مسلمانوں کی جو اجتماعی قوت پیدا کی وہ اس کے جانشین باقی نہ رکھ سکے، رفتہ رفتہ سلجوقی اور ایوبی خاندان ختم ہوئے، مگر اس کالے بادل کے پیچھے سیمیں لکیریں اس طرح نظر آتیں کہ ان ہی کے کھنڈروں پر دولت عثمانیہ قائم ہوئی، جس کے حکمرانوں نے سرویا، بوسینا، بلغاریہ، والاچیا، ہنگری، پولینڈ، فرانس اور روس سے ٹکرا کر ایک ٹرکش امپائر بنالیا، جس کے علاقے یورپ میں تھریس، مقدونیہ، بلغاریہ، سلونیکا، البانیہ، ہنگری، بلغراڈ، اور کریمیا اور پھر ایشیا میں مصر، شام، عراق اور حجاز تک پھیلے ہوئے تھے، سلطان محمد فاتح نے تو قسطنطنیہ فتح کر کے بازنطینی امپائر کی بنیاد ہلادی، سلطان سلیمان اعظم کے نام سے تو یورپ کی سلطنتیں لرزتی تھیں، سلطان سلیم ثالث نے تو فرانس کے نپولین اعظم سے بھی ٹکر لی، سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں عثمان پاشا نے روس سے ایسی بہادرانہ جنگ کی کہ وہ شیر پلونا کہلائے، ان کارناموں سے مسلمانوں کا سر پھر اونچا ہوا، لیکن ان کے اندر بھی اختلافات پیدا ہوتے رہے، سلاطین معزول اور قتل کئے گئے، نادرشاہ نے اس پر حملہ کر کے اس کو کمزور کیا، مصر کی ماتحت ریاست ذوالقدریہ نے اس سے سرکشی کی، ان مسلمانوں نے صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کے اپنے اختلافات کے برے اور ہولناک نتائج سے عبرت حاصل نہیں کی، اسی لئے یورپ کی عیسائی حکومتوں نے ان کے ساتھ وہی کیا جو صلیبی جنگ کے آغاز میں کیا تھا، انھوں نے مسلمانوں کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا، ان سے جنگ

کر کے انگریزوں نے قبرص پر قبضہ کر لیا، مصر کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا، سوڈان پر لارڈ کچنر کا قبضہ ہوگیا، طرابلس، اٹلی کے زیر نگیں ہوگیا، پھر یورپ کے سامراجیوں نے بلقان کی جنگ چھیڑ کر ترکوں کے یوروپی علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور جب ترکوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کا ساتھ دیا تو ان کی شکست کے بعد حجاز، عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے لے لیا، شام فرانس کے قبضہ میں آگیا، ایشیائے کوچک روس کو ملا، قسطنطنیہ اور آبنائے فاسفورس سب کی مشترکہ ملکیت میں آگئے، سلطان عبدالحمید کی خلافت ختم کر دی گئی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، ٹرکش ایمپائر سے عربوں کو جدا کر کے ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنائیں تاکہ ان کی قوتیں مجتمع نہ ہو سکیں، نجد، حجاز، یمن، عسیر، لحج، امارات نواحی لسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین و شام، مصر، مراکش اور سوڈان کی حکومتیں بنیں، مگر ان پر یورپ کی سامراجی قوتیں چھائی رہیں، ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو یہ یوروپین سامراجیت سے آزاد ضرور ہوئیں، مگر فرنگی میکاولیوں نے عراق کو اردن سے کاٹ دیا، یمن کے دو ٹکڑے کر دیئے لبنان کو عیسائیوں اور عربوں کے لئے وجہ تنازعہ بنا دیا، فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کرا دی، اور بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا قبضہ کرا دیا، صلیبی جنگ میں اپنی شکست کا بدلہ ۷۴۳ برس کے بعد لیا،

یہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صلیبی اور اس قسم کی لڑائیوں سے سبق حاصل کرنے کے بجائے عرب مشرق وسطیٰ میں اسرائیلیوں سے برسر پیکار تو ضرور ہیں، مگر وہ وہی تاریخ دہرا رہے ہیں جو صلیبی لڑائیوں کے موقع پر اس زمانہ کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی بیوفائی سے عمل میں آئی، جس طرح صلیبیوں نے مسلمانوں کے نفاق اور اختلاف سے فائدہ اٹھایا وہی فائدہ اسرائیلی اور یورپ کی سامراجی حکومتیں عربوں کے باہمی نفاق سے اٹھا رہی

ہیں، ۱۹۶۷ء میں عربوں کی شرمناک شکست کی بڑی وجہ ان کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں پر تیشہ زنی، فکری انارکی اور جھوٹے معیار کے سامنے سپراندازی کے ساتھ ان کی سیاسی ابن الوقتی، علاقائی مفاد پرستی، اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے حکمرانوں کی خودغرضی بھی تھی، انھوں نے صلیبی محاربات پر مسلمانوں کی کامرانی اور کامیابی پر پانی پھیر دیا،

عربوں اور مسلمانوں نے اپنے قبلۂ اول بیت المقدس کو ۳۴۰ برس کے بعد اس لئے کھویا کہ ان کو خدا ترسی، ایمان پروری، زبان، دل اور عمل کی سچائی، اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی، انسان دوستی، عبادت، ریاضت اور مودت کی جو تعلیم دی گئی تھی، ان سب سے دور ہو کر نسلی اور علاقائی امتیازات اور باہمی تعصبات کے رذائل میں مبتلا ہوئے تو گرے اور گرتے چلے گئے، صلاح الدین ایوبی نے یہ عملی نمونہ پیش کیا تھا، کہ وہ رات کو راہب اور دن کو شہسوار بن کر یورپ کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہے، اپنی سیرت کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، ایمان کی طہارت سے اس نے جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنے کا جو درس دیا تھا، اس کو مسلمان بھول گئے اور اس وقت یورپ کی سامراجی قوتوں کے سامنے راکھ کے ڈھیر بنے ہوئے ہیں، عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی کی روحیں ان کو پیام دے رہی ہیں کہ وہ اب بھی یورپ کی نگاہوں میں راز کن فکان، معمار جہاں، آخری نبوت کے ارمغان اور ایشیا کے پاسبان ہو سکتے ہیں، اگر وہ متحد ہو کر اسلامی اور ملی زندگی بسر کرنا سیکھیں۔۔

دولت عثمانیہ جلد اول و دوم

ترکوں کی نہایت مفصل سیاسی تاریخ، از ڈاکٹر محمد عزیر، سابق رفیق دار المصنفین، زیر طبع ا

قرآنِ کریم

اور

اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد و ترقی

از ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

قرآن کریم کی نسبت سے فن خطاطی کو بڑا عروج و نشوونما ملا، دراصل خطاطی و خوشنویسی کا فن ہمارے رسم خط کی تخصیص ہے، ورنہ دنیا کے تمام رسم خطوں کا مقصود محض کسی بات کا ضبط تحریر میں لے آنا ہے، یہ اور بات ہے کہ ہر شخص کی تحریر مختلف ہونے کی وجہ سے تحریر کے ہزاروں لاکھوں نمونے ہر زبان میں مل جائیں گے، لیکن ان میں بذاتِ خود کوئی ایسا ہنر نہ ہو جو دلکشی کا موجب ہو، اس کے برخلاف عربی، فارسی رسم خط کی بدولت خطاطی اور خوشنویسی کا فن وجود میں آیا اور اس میں وسعت پیدا ہوئی یہاں تک کہ یہ فن نہایت وقیع علم قرار پایا، ذیل میں اس کی کچھ تفصیل افغانی عالم عبدالحی حبیبی کی کتاب خطاطی کی مدد سے پیش کی جاتی ہے،

خط عربی ابتداءً سادہ نسخ تھا، چنانچہ یہی سادگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین میں موجود ہے، منجملہ ان کے حضورؐ کا نامۂ مبارک ہے جو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام ہے اس فرمان کا اسکاٹ لینڈ کے مستشرق ڈنلوپ نے انکشاف کیا تھا اور جنوری ۱۹۴۰ء کے ایشیاٹک سوسائٹی انگلینڈ کے مجلہ میں شائع کیا تھا، دوسرا نامۂ مبارک نبوتی قبط کے بادشاہ مقوقس کے نام ہے، جو مصر کے کلیسا میں ملا تھا اور پہلی بار مجلہ الہلال قاہرہ ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا، حضورؐ کا تیسرا

فرمان منذر بن ساوی کے نام ہے جو دمشق میں حاصل ہوا تھا اور جرمنی کے مجلہ Zdmg ج ۱۱ ، سال ۱۸۶۷ء میں پہلی بار چھپ چکا تھا، اسی خط میں دو کتبے مدینہ میں کوہ سلع کے جنوب میں برآمد ہوئے ہیں، یہ ابتدائی خط نسخ رفتہ رفتہ خط کوفی سے نزدیک تر ہو گیا، چنانچہ اس خط نسخ ممزوج بکوفی کا قدیم ترین نمونہ قاہرہ میوزیم میں محفوظ ہے جو ایک لوح سنگ مزار پر ہے، یہ ۳۱ھ میں مرتب ہوا تھا، دوسرا قدیم کتبہ ۳۲ھ کا ہے جو بیت المقدس میں پایا جاتا ہے، اسی طرح اموی دور کی بعض تحریرات اسی خط میں برآمد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تحریر ولید بن عبد الملک (۸۶ - ۹۶ھ) کے عہد کی درخت بردی کے پوست پر لکھی ہوئی ملی ہے جو بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمۂ توحید کو شامل ہے اور اس کا یونانی ترجمہ بھی موجود ہے،

یہ سادہ ابتدائی خط جو نسخ اور نسخ ممزوج بکوفی کے طرز میں ملتا ہے، رفتہ رفتہ تزئینی شکل اختیار کرتا ہے، اس رجحان کے پیدا کرنے میں دو عوامل خصوصیت سے قابل توجہ ہیں، اوّل یہ کہ انسان طبعی طور پر اچھی اور دلکش چیزوں کو پسند کرتا ہے، اس لئے خط میں حسن، ہنر اور تزئین پیدا کرنے کا رجحان طبعی تھا، دوم ایک تاریخی بات یہ ہوئی کہ دور عباسیہ میں جب حکومت کا حلقہ وسیع ہوا تو اہل عرب کو دوسری قوموں کے ہنر، زیبائش و مصوری کے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ ان سے کافی متاثر ہوئے، چنانچہ ابن ندیم، طبری اور مسعودی کی روایت کے بموجب بامیان، کابل، داور، بست وغیرہ کے معابد سے مرصع بتوں کو بغداد لے گئے، اور وہاں عرصے تک خلیفہ کے محل میں ان کی نمائش ہوتی رہی، لیکن چونکہ اسلام تصویر کشی کی اجازت نہیں دیتا،

لا تدخل الملائکۃ بیتاً	جس گھر میں کوئی کتا یا تصویر ہو
فیه کلب او صورۃ ،	اس میں فرشتے نہیں داخل ہوتے،

کے درآید فرشتہ تا نکنی سگ ز در دور و صورت از دیوار

اس لئے محلوں کی آرائش میں تصویروں سے بڑی حد تک احتراز ملتا ہے، ابوالفضل بیہقی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ شاہزادہ مسعود غزنوی نے ہرات کے باغ عدنانی میں ایک محل تیار کرایا تھا جس کی دیواریں تصویروں سے مزین تھیں، لیکن جب سلطان محمود کو خبر ہوئی تو اس نے سخت باز پرس کی، گویا عام طور سے دور اسلامی میں عمارتوں کی آرائش میں تصویروں کا حصہ نفی کے برابر تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نقاشوں، خطاطوں اور مصوروں کی توجہ خط اور نقش و نگار کی طرف زیادہ بڑھی اور اسی رجحان نے خطاطی میں تزئینی رنگ بھرا،

دور عباسی میں علم و ہنر نے ترقی کے بڑے منازل طے کئے، خطاطی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھی، خلیفہ مامون کو خطاطی سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے دربار میں خطاطوں کی بڑی قدر دانی ہوئی، اس کے دور کا سب سے بڑا خطاط احمد بن ابو خالد احول تھا جس نے خط عربی کے لئے قواعد منضبط کئے، اور جس کی وجہ سے خطاطی کے بہترین نمونے معرض وجود میں آئے، وزیر یحییٰ برمکی کو بھی خطاطی سے لگاؤ تھا، وہ احمد بن ابو خالد احول کو بہت عزیز رکھتا تھا، اسی دور کا ایک دوسرا وزیر فضل بن سہل سرخسی ذوالریاستین تھا، جس کی توجہ سے قلم الریاستی رواج پذیر ہوا اور یہی خط ثلث و محقق، رقاع، غبار کا مبدأ ثابت ہوا، احمد احول کے حسن خط کا اندازہ ابوبکر الصولی کی کتاب ادب الکتاب کی ایک تحریر سے ہو سکتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ احمد احول کی خطاطی کے نمونے مامون کی طرف سے قسطنطنیہ بھیجے گئے، وہاں وہ صومعہ کے دروازے پر آویزاں کئے گئے تاکہ لوگ ان کا نظارہ کر سکیں، اواخر تیسری صدی میں خلیفہ المعتمد نے بزنطین کے بادشاہ کے نام ایک خط بھیجا، یہ خط خطاطی کا

ایسا بہتر نمونہ تھا کہ بادشاہ نے جواب میں لکھا کہ عرب کی کسی چیز پر سوائے اس دلکش تحریر کے مجھے رشک نہیں آتا۔ تیسری صدی کے خط کی ایک بہترین یادگار ایک کلام مجید ہے جس کی کتابت ۲۷۲ ہجری کی ہے اور جو دمشق کے میوزیم میں محفوظ ہے، یہ قرآن کوفی خط میں ہے جس کو کوفی تزئینی کہنا چاہیئے، دمشق ہی میں ایک قرآن کا قدیم تر نسخہ ہے جو ۲۷۰ ہجری میں وقف کیا گیا ہے، اس کا خط بھی کوفی تزئینی ہے، مشہد کے آستانہ قدس میں ایک قرآن ہے جو ۳۲۷ ہجری میں لکھا گیا ہے اور ایران میں سب سے قدیم نسخہ ہے، اس کا خط کوفی مائل بہ نسخ ہے، اسی کتاب خانے میں سلطان محمود کے دبیر ابوالحسن عراقی کا وقف کردہ نسخہ خط نسخ مائل بہ ثلث میں ہے، چوتھی صدی میں ایک اور تزئینی خط وجود میں آیا جس کو ابن ندیم پیرآموز کے نام سے یاد کرتا ہے، اس خط میں قرآن لکھے جاتے تھے، چنانچہ آستانہ قدس کے مجموعہ میں قرآن کا ایک ورق موجود ہے، ایک دوسری کتاب اسی خط میں صفات الشیعہ تالیف شیخ صدوق (۳۸۱ھ) ہے جس کا کاتب نصر بن عبد اللہ قزوینی اور سال کتابت ۳۹۱ ہجری ہے، یہ کتاب تہران کے ایک شخصی کتب خانہ میں پائی جاتی ہے، لیکن اس سے خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اس دور میں کوئی سادہ آمیختہ یا نسخ کا رواج نہ تھا، آستانۂ قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں ایک قرآن ہے جس کو سلطان محمود کے وزیر ابو القاسم منصور بن محمد ہروی نے ۳۹۳ ہجری میں وقف کیا تھا، یہ قرآن خط کوفی آمیختہ بہ نسخ میں ہے اور اس میں نقطہ، تشدید اور حرکات وغیرہ کا باقاعدہ اہتمام ملتا ہے، اس التزام کے اور نسخے مل جاتے ہیں۔ مثلاً گنجینۂ قرآن مشہد کا نسخہ ۴۱۸ھ جس کو ۴۲۱ھ میں ابوالبرکات رازی نے وقف کیا تھا، یا قرآن کا وہ نسخہ جو عیسیٰ بن عبد اللہ بلخی کا مکتوبہ ہے اور میلان کے کتاب خانے میں محفوظ ہے (۴۲۷) ان نسخوں میں خط کی تزئین پر زیادہ توجہ نہ تھی۔ لیکن عثمان بن حسین وراق غزنوی کے خط میں جو قرآن ۴۶۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ اور

بود ہے، کوفی خط کی اعلی تزیینی شکل ہے، اس قرآن کا ترجمہ خط نسخ
نمونہ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ عثمان غزنوی کوفی اور نسخ دونوں طرز
عتا تھا، پانچویں صدی کے وسط کے بعد کے قرآن کے جو نسخے ملتے ہیں ان
ہ اعلی درجے کی تذہیب و تنقیش بھی موجود ہے، اس سلسلے کے چند نسخے

خط کوفی، کاتب محمد بن عثمان وراق غزنوی، تاریخ وقف ۴۹۷ھ (ص ۹۴
خط کوفی مایل بہ پیرآموز مذہب و منقش مجموعہ چیسٹر بیٹی۔
ط کوفی با تذہیب و تنقیش نفیس و اعلی، کتابخانہ ملی پیرس مکتوبہ ۵۰۵ھ
خط کوفی با تذہیب، کاتب ابوبکر بن احمد بن عبید اللہ غزنوی موزۂ
ابت ۵۶۶ھ

بری ہی میں خط نسخ میں ریحان) رقاع اور توقیع کی آمیزش کی بہترین
ں نسخے سے فراہم ہوتی ہے جو محمد بن عیسی بن علی فیشاپوری نے ۵۸۹ھ میں
ی محمد بن سام کے لیے تیار کیا تھا اور ایران باستان کے میوزیم میں موجود ہے،
لتابوں میں بھی ملتا ہے، یہاں تک کہ قدیم فارسی مخطوطوں میں بھی یہی اہتمام
یم ترین مخطوطہ کتاب (الابنیہ عن حقایق الادویہ بخط اسدی طوسی مکتوبہ
موجود ہے، اس کا خط کوفی ہے جس میں کسی قدر نسخ کی آمیزش بھی ہے، دوسلو
مکتوبہ ۳۰۷ ہجری کراچی میوزیم میں ہے، یہ خط متمایل بہ نسخ ہے، اسی خط میں
ے کا نسخہ ہے جس کی کتابت ۴۰۷ھ کی ہے اور نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے،
کا جو نسخہ ترکی میں ہے اور جو ۵۰۰ ہجری کا مکتوبہ ہے اس کا خط شبیہ بکوفی ہے،

اور کتاب الابنیہ سے ملتا جلتا ہے، ترجمان البلاغہ کا کاتب ... دیلم پیادہ اسدی طوسی یعنی کاتب کتاب الابنیہ کا دوست معلوم ہوتا ہے اگرچہ دونوں نسخوں کی کتابت میں ۱۱ سال کا فرق ہے، لیکن دونوں کا خط کافی ملتا جلتا ہے اور دونوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے کلمات بنام بخشایندہ بخشایش گر آئے ہیں اور ان کا خط اتنا مشابہ ہے کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہے،

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی کے اکثر فارسی کے نسخوں میں دو قسم کے خط نظر آتے ہیں، اوّل خط نسخ با آمیزش کوفی، اس سلسلے کی مثالیں یہ ہیں :۔ کتاب ترجمان البلاغہ ۵۰۷ھ، المختصر من کتاب الوقف تحریر عبداللہ بن علی (۵۰۱ھ کتاب خانہ مرحوم پروفیسر محمد شفیع لاہور اور وامق و عذرائے عنصری (حدود ۵۰۰ھ) کشودہ پروفیسر محمد شفیع۔ دوسری قسم کے مخطوطے نسخ میں ہیں، جن میں کوفی کی آمیزش نہیں ہے، اس کی مثالیں نسخۂ ہدایت المتعلمین فی الطب (۴۷۸ھ نسخہ برٹش میوزیم) اور تفسیر ابوبکر عتیق سورآبادی (۵۲۸ھ) (نسخہ انڈیا آفس)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خط کوفی تزیینی کا استعمال عمارتوں میں، اکثر قرآن اور دوسری کتابوں کے نسخوں میں تیرہویں صدی تک برابر ملتا ہے، لیکن اسی دور میں دوسرے خطوط بھی برابر استعمال میں آئے ہیں، چنانچہ رقاع، ریحان، ثلث و محقق کے نمونے بھی برابر ملتے ہیں، اور خط نسخ اس قدر پختہ ہو گیا کہ اس کا شمار بھی ہنر اور تزیین میں ہونے لگا، اس طرح کی بہترین مثال عبداللہ صیرفی کے قرآن کی ہے جو ۷۲۰ھ میں لکھا گیا اور گنجینۂ قرآن مشہد میں موجود ہے،

اسلامی دور کی خطاطی کی سات سو سالہ تاریخ بڑی توجہ کی حامل ہے، اس کے ابتدائی دور میں نسخ سادہ کا رواج تھا، پھر نسخ آمیختہ بکوفی، کوفی سادہ، کوفی آمیختہ بنسخ، کوفی تزیینی، نسخ تزیینی کا رواج ہوا، لیکن ان میں جو ذرا ذرا سا فرق تھا، اس کے اعتبار سے ان کے الگ الگ نام ہوئے جن کی تعداد پچاس تک پہونچتی ہے، لیکن اوائل تیموری دور میں صرف چھ

خط زیادہ متداول تھے جیسا کہ اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

نگارمن خط خوش می نویسد بغایت خوب و دلکش می نویسد

مناشیر محقق نسخ و ریحان رقاع و ثلث ہر شش می نویسد

اسی درمیان میں خط تعلیق کا مزید اضافہ ہوا چنانچہ جامی لکھتے ہیں :-

کاتباں را ہفت خط باشد بطرز مختلف ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقاع

بعد ازاں تعلیق آن خط است کش اہل عجم از خط توقیع استنباط کردند اختراع

چودھویں صدی کے نصف میں نسخ و تعلیق کی آمیزش سے مشرق کا سب سے متداول خط نستعلیق وجود میں آیا جس کی ایجاد کا سہرا امیر علی تبریزی (۸۰۹ھ) کے سر ہے جیسا کہ سلطان علی مشہدی لکھتا ہے:

نسخ تعلیق گر خفی و جلی است واضع الاصل خواجہ میر علی است

وضع فرمود او ز ذہن دقیق از خط نسخ وز خط تعلیق

آخر میں بعض کاتبوں نے شکستہ آمیز تحریر شروع کر دی جس نے بعد میں فنی شکل اختیار کی اور شفیعای ہروی کے نام پر اس کا نام خط شفیعہ پڑ گیا، یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ اگرچہ نستعلیق خط کاملاً فارسی خط ہے، لیکن اس خط میں بھی قرآن کے اعلیٰ نسخے موجود ہیں اور قرآن کی نسبت سے اس خط کی اپنی الگ اہمیت ہے، اسی طرح خط شکستہ میں بھی قرآن کے نسخے مل جاتے ہیں، اس لئے قرآن کے خط کے ضمن میں اس خط کا ذکر بے محل نہیں۔

ایک نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ بابر نے ایک عجیب و غریب خط ایجاد کیا، جو خط بابری کے نام سے مشہور ہے، تزک بابری اور اکبری دور کی اکثر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اس اختراعی خط میں قرآن لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا، اس نسخے کا پتہ نہیں کہ کہاں ہے، البتہ مشہد کے گنجینۂ قرآن میں بقول گلچین معانی کے وہ قرآن جو زیر شمارہ (۵۰) محفوظ ہے اور جو شاید سلطان

حسین صفوی کے وقف نامہ ۱۱۱۹ ہجری کے اعتبار سے شاید امام ہشتم کا خط ہے، اور کل خط بابری میں ہے، مگر یہ خیال شبہ سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس خط کے حروف بھی محمد طاہر بن قاسم کی تالیف مجامع الطبقات (۳۴۵) میں درج ہیں اور یہ حروف خط بابری سے مختلف ہیں۔

قبل عرض ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی آرایش و زیبایش پر جتنی توجہ ہوئی ہے وہ کسی زبان کی ایک کتاب کا کیا ذکر سارے ذخیرۂ کتب عالم پر شاید ہی ہوئی ہو، یہ خطاطی آرایش کے علاوہ ہے اور جیسا کہ سطور بالا سے واضح ہے کہ ہزاروں خطاطوں نے قرآن مجید پر اپنا کمال ہنر صرف کیا ہے، اس کے نتیجے میں خود قرآن کے ایسے ایسے نادر و کمیاب نمونے موجود ہیں کہ محض ان ہی کی روشنی میں خطاطی کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، خطاطی کے جملہ اقسام میں قرآن مجید کے نسخے موجود ہیں، چونکہ ہر خطاط کا خط دوسرے سے الگ ہوتا ہی ہے چاہے قسم خط کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہوں، اس لیے قرآن مجید کے قلمی نسخوں سے قسم خط کے علاوہ الگ الگ خطاطوں کے خط کی انفرادی خصوصیات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے،

خطاطوں کے علاوہ ہزاروں نقاش اور مہذب بھی قرآن کے قلمی نسخوں کی تہذیب و نقش کشی میں برابر کے حصہ دار تھے، ان میں سے بعض ہنرمندوں کا نام لیا گیا ہے، لیکن عام طور پر قرآن مجید پر کام کرنے والے اپنے نام و تاریخ کے ذکر سے گریز کرتے ہیں، اس لیے خطاطوں کے مقابلے میں نقاشوں اور مہذبوں کے نام نسبتہً کم معلوم ہیں،

قرآن مجید کے نسخوں کی انفرادیت کا بڑا مدار فن خطاطی اور نقاشی پر ہے، لیکن ان کے علاوہ بعض اور امور قرآن کے نسخوں کی زینت کا سبب بنتے ہیں، اور قرآن مجید کی ترتیب و تہذیب میں ان کا بجا طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے، اس سلسلے کی پہلی چیز سیاہی ہے، عام سیاہی کے علاوہ قرآن میں جواہرات اور قیمتی دھات سے مرکب سیاہی کا استعمال ہوا ہے۔ یشب، یاقوت،

مروارید، صدف، زر، سیم کی آمیزش سے عمدہ اور دیرپا سیاہیاں بنائی جاتی تھیں، اس میں ہر رنگ کی سیاہی تیار ہوتی تھی اور ہر رنگ اپنی الگ کشش رکھتا تھا، قرآن کے سینکڑوں نسخے مل جائیں گے جن میں عام سیاہی کا مطلق استعمال نہیں ہوا ہے، اور عام سیاہی بھی آجکل کی سیاہی سے کئی گنا زیادہ چمکنے اور دیرپا ہوتی تھی، ہزار سال پرانے نسخے دیکھیں، ان کی سیاہی ایسی روشن ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کا نسخہ ہے، اور موجودہ دور کی سیاہی کے اعتبار سے جس طرح غیر وقیع ہے، اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ تیس چالیس سال پہلے کی تحریریں پڑھنے کے قابل نہیں رہ گئی ہیں، بہرحال سیاہی کے اعتبار سے قرآن مجید کے نسخوں میں بڑا اہتمام ملتا ہے، پرانے دور میں سیاہی بنانا بہت اہم پیشہ سمجھا جاتا تھا، غرض کہ قرآن میں سیاہی کی جو اقسام استعمال ہوئی ہیں وہ خود تحقیق کا موضوع ہو سکتی ہیں،

قرآن کی تہذیب و تنقیش کے ساتھ بعض التزامی امور کی ایسی دقیق پابندی ملتی ہے کہ دیکھنے والا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، بعض قرآن ایسے خفی حروف میں لکھے گئے ہیں کہ معدودے چند صفحے میں پورا قرآن سمو دیا ہے، اور جب جلی حرف کے نسخے دیکھیں تو پورے صفحے میں چند سطریں ملیں گی اور قرآن کا حجم حیرت انگیز ہوگا، کبھی سارے قرآن میں یہ پابندی ملتی ہے کہ اس کی ساری سطریں ایک خاص حرف سے شروع ہوئی ہیں، اسی طرح کی اور بھی پابندیاں ہیں جن کا احاطہ قرآن کے نسخوں کے دقیق مطالعہ کا متقاضی ہے، قرآن کے حاشیے کی آرایش و زیبایش میں جو فن صرف ہوا ہے وہ الگ موضوع ہے، جس کی کماحقہ بحث بڑا وقت اور بڑی بصیرت چاہتی ہے، قرآن کی تہذیب میں ایسا تنوع ہے جو شاید ایک زبان کی ساری مقدس و مذہب کتابوں میں نہ ملتا ہوگا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"۔ "عنوان سورہ" اور آیات کا نقش و نگار بھی بہت دلکش اور زیبا ہوتا ہے، ان کے علاوہ سطر کشی بھی ایک الگ فن ہے، سطروں کے درمیان

کا جو فاصلہ ایک صفحے پر ہو گا وہی پورے کلام مجید میں برقرار رہیگا یہی حال سطروں کی موٹائی کا بھی ہے کہ پورے متن میں کسی قسم کا فرق نہ ہو گا۔

قرآن مجید کی کتابت میں خطاطوں اور خوشنویسوں کے علاوہ علما و فضلا و صوفیہ یہاں تک کہ بادشاہوں، امیروں اور دوسرے لوگوں نے کافی حصہ لیا تھا، بادشاہوں میں سلطان ابراہیم غزنوی (م: ۴۹۲ھ) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سال کلام مجید کے دو نسخے تیار کرتا ایک مکہ معظمہ کے لئے اور دوسرا مدینہ طیبہ کے لیے، معلوم نہیں کہ اس نے کتنے نسخے لکھے ہوں گے لیکن اب ان میں سے کسی کا پتہ نشان نہیں، سلطان ناصر الدین محمود (م: ۶۶۴ھ) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے ذاتی مصارف کا ذریعہ مصحف کریم کی کتابت تھی، (برنی) مؤلف طبقات اکبری کے بقول وہ سال میں دو نسخے تیار کرتا، اس کے ہاتھ کا کوئی نسخہ موجود نہیں، البتہ ابن بطوطہ نے اس کے ہاتھ کا ایک نسخہ اپنے قیام دہلی بعد ۷۳۵ ہجری دیکھا تھا، اس نے لکھا ہے کہ قاضی کمال الدین[1] نے قرآن کا ایک نسخہ جو سلطان ناصر الدین محمود کے خط میں تھا مجھے دکھایا اس کی کتابت محکم اور استادانہ تھی (رحلہ ج ۲ ص ۲۷) افسوس کہ اب سلطان ناصر الدین کے نسخوں میں کوئی نسخہ نہیں ملتا۔

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ نے اپنے ایجاد کئے ہوئے خط بابری میں ایک نسخہ مکہ معظمہ روانہ کیا تھا، آستانِ قدس مشہد میں ایک نسخہ کچھ مختلف خط میں ہے، چنانچہ آقائے گلچیں معانی اسے بابری کا نسخہ قرار دیتے ہیں، مگر استاد حبیبی کی رائے اس کے برعکس ہے۔

سلطان اورنگزیب نے بھی مصحف شریف کی کتابت کی ہے۔ ماثر عالمگیری کی روایت کے بموجب ایک نسخہ شہزادگی کے زمانے میں لکھا تھا اور اسے مکہ مکرمہ روانہ کیا تھا تخت نشینی کے بعد دوسرا نسخہ لکھا اور مدینہ منورہ بھیجا۔ اس نسخے کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت

---

[1] محمد شاہ تغلق کے دور کے قاضی دہلی۔

ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوئے، ہندوستان کے کتاب خانوں میں اورنگ زیب کی
منسوب قرآن کے نسخے ملتے ہیں، مگر خود اس نے لکھا ہے کہ میں نے ایک دو مصحف لکھے ہیں
نام نہیں لکھا، نہ تاریخ لکھی، صرف رضائے الٰہی کی غرض سے لکھا ہے۔ (رقعات عالمگیری)
قول کی روشنی میں عام نسخوں کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

دارا شکوہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے ایک نسخہ کا پتہ عزیز باغ لائبریری حیدرآباد
میں بتایا گیا ہے (ستارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر ص ۶۹۸) اس کے ہاتھ کا ایک پنج سورہ
وہ پند اور سطور کا نسخہ وکٹوریا میموریل ہال کلکتہ میں بتایا گیا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (م ۱۰۳۷ھ) نسخ اچھا لکھتا تھا، اس کے ہاتھ کا ایک نسخہ جو
الانعام اور سورہ مائدہ کو حاوی ہے، سالار جنگ کے کتاب خانے میں موجود ہے،
کی کتابت ۱۰۲۳ ہجری میں ہوئی تھی، راقم کے توسط سے اس کے ترقیمہ کا عکس ونمدر
میں چھپ گیا ہے،

ظاہر ہے کہ قرآن کے نسخوں میں متن کے اعتبار سے کوئی ندرت نہیں ہوتی، البتہ ایسے نسخے جو
بڑی شخصیت سے منسوب ہیں، یا قدیم ہیں، یا کسی اچھے خطاط کی یادگار ہیں، یا خطاطی کے
اچھے نمونے ہیں، یا جن کی تہذیب و تنقیش کافی دلکش ہے، وہ زیادہ اہم نسخے قرار دے جاتے ہیں
دنیا کے کتاب خانوں میں قرآن مجید کے کتنے اہم نسخے ہونگے ان کا احاطہ کرنا اور ان پر سیر حاصل
بحث کرنا میرے دائرہ عمل سے باہر ہے، میری رسائی چند کتاب خانوں تک ہے اور ان میں جو قابل توجہ
نسخے موجود ہیں ان کی بابت ایک مختصر یادداشت پیش کی جاتی ہے، اس یادداشت کا مقصد صرف
یہ ہے کہ قرآن مجید کے اہم نسخوں کی تلاش و جمع آوری اور ان کے خط وغیرہ کے دقیق مطالعہ کی ضرورت
کا احساس پیدا ہو، اس لئے کہ جیسا عرض ہو چکا ہے خطاطی کی تاریخ کے سب سے مستند ماخذ

بھی نسخے فراہم کرتے ہیں، اس سے مزید اندازہ ہو گا کہ اہل اسلام نے اس کتاب کی آرائش میں کتنا ہنر صرف کیا ہے،

قابل ذکر یہ ہے کہ جس طرح اور دوسری کتابیں دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں، قرآن کے نسخے بھی ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں تلف اور برباد ہو چکے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ قرآن انسانی ہنر کا شاہکار ہے اور اس پر ماہرین نے جتنی توجہ کی کسی اور چیز پر صرف نہیں کی، لیکن افسوس ہے کہ اس کے نسخوں کی حفاظت میں عام مسلمانوں کی وہ خصوصی توجہ نہیں رہی جس کا یہ صحیفہ مستحق تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے قدیم نسخے عام طور پر نہیں ملتے،

قرآن مجید کے اہم نسخے | قرآن کی تدوین اور اشاعت حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ۲۵ ہجری کے اواخر سے شروع ہوئی اور ۳۰ھ تک جاری رہی، قرآن کے یہ نسخے مصحف کہلاتے تھے، ان کی تعداد میں اختلاف ہے، ان میں ایک خود حضرت عثمانؓ کے پاس رہا باقی نسخے مدینہ، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، یمن اور بحرین بھیجے گئے، تاریخی روایات میں متعدد مصاحف کا تذکرہ ملتا ہے جن کی شہرت حضرت عثمانؓ کے شائع کردہ مصاحف کے اصل نسخوں کی حیثیت سے تھی، لیکن کسی قدیم مصحف کو اصل نسخۂ عثمانی کی حیثیت سے مشہور کر دینا بہت آسان ہے، مگر اس کی اصلیت کا ثابت کرنا نہایت دشوار امر ہے، بہرحال جن مصاحف کا ذکر تاریخی روایات میں ملتا ہے ان پر ایک عالمانہ مضمون ابو محفوظ الکریم معصومی نے مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا، اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے،

مصحف خاص یہ نسخہ وہ ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے سامنے تھا اس نسخے کے بارے میں سب سے قدیم اطلاع عمرۃ بنت قیس العدویہ کی ہے جو احمد بن محمد بن حنبل کے صاحبزادے عبد اللہ کی سند سے کتاب الزہد میں درج ہے، عمرۃ العدویہ شہادت

ص ۱۲۸ – ۱۲۷

کے بعد ہی مدینہ پہنچی تھیں اور انھیں مصحف خاص دیکھنے کا موقع ملا تھا، روایت اس طرح پر ہے:

قرأینا مصحف الذی ھو فی	ہم نے ایک کمرے میں وہ مصحف دیکھا
حجرۃ، فکانت اول قطرۃ قطرت	حضرت عثمانؓ کے خون کا پہلا قطرہ
من دمہ علی ھذہ الآیۃ:	اس آیت پر پڑا تھا، اللہ ان لوگوں
فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع	کے لئے کافی ہے اور وہ سننے، جاننے
العلیم، قالت عمرۃ فما مات	والا ہے، حضرت عمرۃؓ فرماتی ہیں کہ قاتلوں
منھم رجل سویا،	میں سے کوئی تندرست اور درست حال
	میں نہیں مرا،

بعض بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مصحف انہی ایام میں تلف ہو گیا تھا لیکن دوسری اور تیسری صدی کے ایک مشہور محقق ابو عبید القاسم بن سلام (۱۵۰ - ۲۲۳) نے کتاب القرأت میں بیان کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مصحف میں نے دیکھا ہے جو بعض امرا کے خزانے میں محفوظ تھا، یہ نسخہ شہادت کے موقع پر ان کے سامنے تھا اور اس پر خون کے دھبے تھے،[۵]

تیسری صدی کے اواخر میں ابن قتیبہ دینوری (م: ۲۷۶) نے اطلاع دی کہ قرآن کریم کا وہ نسخہ خالد بن عثمان کے پاس تھا، پھر اس کی اولاد کے پاس رہا، آخر میں شلیخ شاہ کے ذریعہ اطلاع ملی کہ اب وہ طرسوس میں ہے،

جامع عتیق مصر کا نسخہ مقریزی (م ۸۴۵) کی روایت کے بموجب ایک عراقی تاجر مسعود بن سعد بن سعید کے ذریعے یہ نسخہ عباسی خلیفہ المقتدر (م ۳۲۰) کے خزانے سے حاصل کیا گیا اور پھر یکم ذی قعدہ ۳۴۸ھ کو جامع عتیق کے نام وقف ہوا، یہ حضرت عثمانؓ کا مصحف

۵؎ خون کے دھبے کی جگہ سب سے زیادہ سورہ والنجم پر) ۱ جلد ۲

خاص تھا اور اس پر خون کے دھبے تھے، وقف نامہ علامہ مقریزی کے حوالے سے درج ہے، لیکن نسخہ کی خصوصیت نہیں بیان ہوئی، بعض لوگ اس کی صداقت کے منکر ہیں، لیکن آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصری مورخ محمد بن عبد الوہاب معروف بہ ابن المتوج (م ۷۳۰) کے نزدیک اس کی صداقت میں کچھ شبہ نہیں، مصر کے دار الکتب المصریہ کی فہرست میں زیر شمارہ ۲۹ جو قرآن مجید مذکور ہے، فہرست نگار کا خیال ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر مقریزی نے الخطط میں کیا ہے، اس خیال کی صحت میں اس کو مصاحف عثمانی میں شمار کیا جا سکتا ہے،

مدرسہ فاضلیہ مصر کا نسخہ۔ چھٹی صدی میں یہ نسخہ قاضی عبد الرحیم بیسانی (م : ۵۹۶) کو دستیاب ہوا، یہ مصحف عثمانی تھا، قاضی موصوف نے تیس پینتیس ہزار دینار میں اس کو حاصل کیا تھا اور مدرسہ فاضلیہ جس کو انھوں نے ۵۸۰ھ میں قائم کیا اس کے کتب خانے میں محفوظ کر دیا تھا، نویں صدی ہجری میں مقریزی کے عہد میں کتاب خانے میں نادر کتابیں تلف ہو چکی تھیں مگر یہ نسخہ باقی رہ گیا تھا،

اندلس کا نسخہ۔ قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک مصحف چھٹی صدی کے وسط تک موجود تھا، جس کے متعلق مشہور رہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دست مبارک کا نوشتہ ہے، ابن خلدون کی روایت کے بموجب یہ مصحف بنو امیۂ اندلس کے خزانے میں تھا، وہاں سے ملوک الطوائف کے پاس پہنچا، آخر میں موحدین کے خزانے میں آیا، ۶۴۶ ہجری میں السعید علی بن المامون جب تلمسان کے قریب قتل ہوا تو السعید کے خزانے سے یہ مصحف ابن زیان کے قبضہ میں آیا، یہ مصحف میں ابو الحسن المرینی کا قبضہ جب تلمسان پر ہوا تو ابن زیان کے خزانہ کے ساتھ یہ مصحف بھی المرینی کے قبضہ میں آیا، ابن مرزوق نے مزید اضافہ کیا ہے کہ ابو الحسن مرینی سے پرتگالیوں

کے پاس یہ مصحف پہنچ گیا لیکن آخر میں ایک تدبیر کی گئی اور یہ نسخہ مرینی کے پاس واپس آگیا،

مسجد قرطبہ میں مصحف کے چند ورق

ابن فضل اللہ العمری نے مسالک الابصار (م ۷۴۹ھ) میں مسجد قرطبہ کے ذکر میں ایک مصحف کا تذکرہ کیا ہے جس کے چار ورق حضرت عثمانؓ کے خود نوشت مصحف کے تھے، یہ اوراق خون آلود تھے،

جامع اموی دمشق کے نسخے

شام میں دو نسخوں کا پتہ چلتا ہے اور دونوں جامع بنی امیہ دمشق میں مختلف زمانوں میں تھے، ان میں قدیم تر نسخے کا ذکر ۵۰۷ ہجری سے ملتا ہے، امیر مودود فرمانروائے موصل اپنے قیام دمشق کے زمانے میں ہر جمعہ کو مصحف عثمانی کی زیارت کرتا تھا، زیارت کے موقع پر ایک باطنی کے ہاتھ قتل ہوگیا۔

ایک دوسرے نسخے کی اطلاع مشہور سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) کے ذریعہ ملتی ہے کہ مشرقی رکن کے محراب کے اندر ایک بڑا خزانہ ہے، اس میں وہ مصحف عثمان محفوظ ہے جو بلاد شام کو بھیجا گیا تھا، اسی مصحف کو ایک مغربی فاضل ابو القاسم تجیبی نے ۶۹۵ ہجری میں اسی جگہ محفوظ پایا تھا، ابن مرزوق نے ۷۲۵ ہجری میں اس کو دیکھا تھا، مشہور سیاح ابن بطوطہ (رحلۃ ص ۵۴)، نے بھی لکھا ہے کہ مقصورہ کے بڑے خزانے میں حضرت عثمانؓ کا مصحف شام موجود ہے اور ہر جمعہ کو بعد نماز خزانہ کھلتا ہے اور مصحف کی زیارت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ العمری اس کو حضرت عثمانؓ کے خط میں بتاتے ہیں، علامہ شبلی کا بیان ہے کہ ان کے سفر قسطنطنیہ کے زمانے تک دمشق میں موجود تھا، بعد میں جامع مسجد میں آگ لگ گئی اور وہ نسخہ نذر آتش ہوگیا، مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصحف عثمانی ۱۳۰۸ ہجری ہی میں جامع اموی میں آگ لگ جانے کے موقع پر تلف ہوگیا، ۱۳۱۰ ہجری کی

الگ یہ مصحف بصری جو کسی بصرے لا کر یہاں رکھ دیا گیا تھا، وہ جلا تھا، یہ مصحف بصری یا مصحف عثمان کہلاتا تھا، اس کے بارے میں ابن فضل اللہ العمری نے لکھا ہے کہ اس پر خون کے دھبے تھے،

مکۂ معظمہ کا نسخہ

مکۂ معظمہ کے مصحف عثمانی کا ایک نسخہ ابن جبیر کی روایت کے مطابق قبۂ زمزم کے قریب قبۃ الشریف قرآن کریم اور حرم شریف کی کتابوں کا مخزن تھا، اس میں مصحف مذکور محفوظ تھا جس کی کتابت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تھی اور سنہ کتابت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ۱۸ سال بعد (سنہ ۲۹ھ) تھی، قحط و گرانی کے موقع پر اس کو باہر نکالتے اور بیت اللہ کی چوکھٹ اور مقام ابراہیم کے درمیان رکھ کر دعا کرتے، ابن جبیر نے اہل مکہ کے ایک اجتماع کا ذکر کیا ہے جو ۲۲ شوال ۵۷۹ھ میں نماز استسقا کے لئے ہوا تھا، ابن جبیر کے پہلے بیان میں خلفائے اربعہ میں سے کسی کا بتایا تھا، لیکن دوسرے بیان میں اس کو مصحف عثمانی لکھا ہے،

ابوالقاسم تجیبی نے بھی ۶۹۶ھ ہجری میں اس کی زیارت کی، ۷۳۵ھ میں ابن مرزوق نے اس مصحف عزیز کو دیکھا تھا، اور مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے (ج ۱ ص ۸۴) جو ابن جبیر کے بیان سے بالکل ملتا جلتا ہے، مگر اس نے بھی اس کو مصحف عثمانی نہیں لکھا، گو سال کتابت ۱۸ سال بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کاتب کا نام زید بن ثابتؓ لکھا ہے جو حضرت عثمانؓ کا عہد ہے، علامہ سمہودی (م ۹۱۱ھ) کے بعد تک مکہ معظمہ میں اس نسخے کی موجودگی ثابت ہے۔

مسجد نبوی کا نسخہ

اندلسی سیاح ابن جبیر کی روایت کے بموجب ۵۸۰ ہجری میں مسجد نبویؐ میں حجرۂ مبارک اور مقام النبی کے درمیان مصحف عثمانی محفوظ تھا، یہ نسخہ اُن مصاحف میں سے ایک تھا جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مدینہ سے باہر بھیجے گئے تھے، مشہور مورخ ابن النجار (م ۶۴۳ھ) نے اس نسخہ

کا ذکر کیا ہے لیکن اس کو مصحفِ عثمانی نہیں قرار دیا ہے، خطیب ابن مرزوق نے ۷۲۵ھ میں اس کی زیارت کی تھی اور انھوں نے اس کو مصحف عثمانی قرار دیا ہے، ان کے ایک معاصر محمد بن احمد المطری (م ۷۴۱ھ) نے بھی اس کو مصحف عثمانی لکھا ہے اور دسویں صدی ہجری کے اوائل تک عام طور پر مشہور تھا کہ یہی نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصحف خاص ہے، اس کا ثبوت اسی قدر تھا کہ آیت فسیکفیکھم اللہ ،، پر خون کے نشانات تھے، علامہ سمہودی (م ۹۱۱ھ) کو اس سے اختلاف تھا، اس لئے کہ اس خصوصیت کے دو قدیم نسخے مکہ معظمہ اور قاہرہ میں ان کی نظر سے گذرے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ نسخوں میں سے ہو سکتے ہیں انکی رائے میں مصحف خاص سے مشابہت پیدا کرنے کی غرض سے ان نسخوں کے اندر آیت مذکورہ رنگ دیگئی ہوگی،

ان کے علاوہ بعض اور بیانات میں مصاحف کا تذکرہ ملتا ہے ۔

۱ ۔ ۶۵۳ہجری میں مدرسہ بشیریہ کی تکمیل پر خلیفہ مستعصم باللہ (م ۶۵۶ھ) کی طرف نادر و نایاب کتابوں کے ۲۶ صندوق مدرسے کے کتاب خانے کو بھیجے گئے تھے، ان میں قرآن کے ۲ بیش قیمت نسخے تھے، ان میں سے ایک حضرت عثمانؓ کے دست مبارک کا نوشتہ تھا،

۲ ۔ رمضان ۶۶۱ھ میں الملک الظاہر نے فرماں روائے قبچاق کو جو ہدایا بھیجے تھے، ان میں بقول ابن واصل ایک قرآن مجید بخط حضرت عثمانؓ بھی تھا، (سخاوی)

۳ ۔ آٹھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ (م ۷۷۹ھ) نے بصرہ کی مسجد امیر المومنین علی کا ذکر کیا ہے، اس کے خزانے میں حضرت عثمانؓ کا مصحف خاص تھا جس کا ایک ورق جس میں آیت فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم ،، تھی خون آلود تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

وھم یصلون الجمعۃ فی مسجد امیر المومنین علی رضی اللہ	وہ لوگ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اس میں

عنہ ... وفیہ المصحف الکریم	محفوظ تھا جس پر حضرت عثمان شہادت
الذی کان عثمان یقرأ فیہ لما	کے وقت تلاوت کر رہے تھے اور آپ کے
قتل واثر الدماء فیہ الی الان فی الورقۃ	خون کے نشانات اس صفحہ پر تھے جس میں
التی فیہ قولہ تعالی فسیکفیکہم	اللہ تعالی کا یہ قول درج ہے ۔ اللہ انکے
اللہ وھو السمیع العلیم (رحلۃ ۹۲)	لیے کافی ہے اور سننے جاننے والا ہے"

مصاحف عثمانی کے بارے میں تاریخوں میں مندرج اطلاعات کا خلاصہ اوپر پیش ہوا موجودہ
دور کے محققین نے ان کی تلاش میں بڑی کاوش کی ، استاد طاہر الکردی کو حجاز اور مصر کے کتب خانوں
میں کوئی نسخہ نہیں مل سکا ، ان کا خیال ہے کہ ۱۳۳۴ھ میں جب ترک حرمین سے بے دخل ہوئے
تو مصحف مدینہ استنبول منتقل ہو گیا ، کہتے ہیں جب استنبول اتحادیوں کے نرغے میں آ گیا تو طلعت پاشا
اس کو برلن لے گئے ، اور کسی طرح وہ قیصر ولیم کے پاس پہنچ گیا ، جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی صلح نامہ
ورسائلیس مرتب ہوا اس صلح نامہ کی ایک دفعہ میں صاف اور واضح الفاظ میں اس مصحف کا
ذکر ہے ۔ " اس موجودہ صلح نامہ کے عمل میں آنے کے چھ مہینے کے اندر جرمنی جلالۃ الملک شاہ حجاز کو حضرت
عثمان رضی اللہ عنہ کے اصلی مصحف کو واپس کرے گا ، یہ نسخہ مدینہ میں ترکوں سے حاصل کیا گیا تھا اور
سابق شہنشاہ ولیم دوم کو نذر کیا گیا تھا " ، (حصہ سوم سکشن ۲ آرٹیکل ۲۴۶ صلح نامہ ورسائیلس)

علامہ کردعلی جامع ایا صوفیا استنبول کے ایک مصحف کی بابت اپنے دوست شیخ مسعود الکواکبی کا
بیان نقل کیا ہے کہ اس کے سرورق پر " عثمان بن عفان " کے الفاظ مکتوب تھے اور
جس کی زیارت کا موقع ان کو کئی بار مل چکا ہے خطیب العمر زوقی نے ۳۲۵ ہجری میں مسجد
دمشق میں اس نسخے کو دیکھا تھا اور اس پر عہد عثمانی کے کاتبین کے نام ان الفاظ میں تھے ،

۱۔ یہ اطلاع ڈاکٹر عابد علی عابد کی یادداشت (مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۵) میں مجملاً درج ہے ۔

هذا ما اجمع علیہ جماعۃ من صحابۃ	یہ وہ نسخہ جس پر مندرجہ ذیل اصحاب
رسول اللہ منهم زید بن ثابتؓ	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتفاق جن میں زیدؓ
عبد اللہ بن الزبیر و سعید بن العاصؓ	بن ثابت، عبد اللہ بن زبیر اور سعید بن عاصؓ

اس کے علاوہ اس پر یہ تحریر بھی ثبت تھی،

"قال النحنی لعلہ الکوفی او البصری"	امام نحنی کا بیان ہے کہ غالباً یہ کوفی یا بصری"

بظاہر یہ تحریریں بعد کی معلوم ہوتی ہیں

ایک مصری فاضل شیخ عبد العظیم زرقانی نے لکھا ہے کہ مصر میں قرآن مجید کے کئی قدیم نسخے موجود ہیں، جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہیں لیکن یہ انتساب صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ نسخے نقش و نگار اور زرکشی کے کام سے آراستہ ہیں، جو عہد عثمانی کے نسخوں کی خصوصیت نہ تھی، البتہ مسجد حسینی کا نسخہ عہد عثمانی کے نسخے کی نقل[1] ہو سکتا ہے، دکتور صبحی الصالح نے نقش و نگار ہی کی بنا پر دار الکتب کے نسخوں کو عہد عثمانی کا ماننے سے انکار کیا ہے لیکن دار الکتب کا نسخہ زیر شمارہ ۱۳۹ ہر طرح کے نقش و نگار سے پاک ہے، بقول مرتب فہرست صدر اول کی خصوصیات کا حامل ہے، اس بنا پر بخوبی ممکن ہے کہ وہی نسخہ ہو جس کا ذکر مقریزی نے "خطط[2]" میں کیا ہے، اگرچہ مقریزی نے نسخہ کی کوئی خصوصیت نہیں درج کی ہے لیکن عراقی تاجر نے اس کو نسخۂ خاص کہا ہے اور نہ اس پر خون کے دھبے بتائے ہیں، مرتب فہرست نے کچھ نہیں لکھا کہ اس پر خون کے نشانات ہیں یا نہیں، اگر نشانات نہیں تو یہ مقریزی کا نہیں ہو سکتا، نیز مقریزی کی یادداشت سے نسخۂ مذکورہ آراستہ تھا، اگر نسخہ مذکور میں یادداشت شامل ہو تو وہی نسخہ ہوگا ورنہ نہیں معلوم نہیں مرتب فہرست نے اس اہم معاملہ کو تشنہ کیوں چھوڑ دیا۔

تاشقند کے میوزیم میں مصحفِ عثمانی اس وقت تک موجود ہے جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے

---

[1] مباحث فی علوم القرآن ص ۸۷ ، [2] خطط ۴ ، ۱۱ ، ۱۹

بیان مستطابر ہم، علی حمزہ جعفری کی شہادت ہے کہ انھوں نے ۲۰ر اپریل ۱۹۶۱ کو اس نسخے کی زیارت
کی تھی، یہ نسخہ ۵۵ × ۶۸ سینٹی میٹر کے ۳۵۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، نہایت نفیس اور جلی قلم سے خط
کوفی میں ہے، خون کے دھبے اب تک موجود ہیں، صفحات کا رنگ ایک طرف ہلکا زرد ہے، دوسری
طرف سے سفید ہے، تحریر کے لئے ہرن کی کھال استعمال ہوئی، میوزیم کی ڈائرکٹر نفیسہ صادق کا بیان
ہے کہ خون کے دھبوں کے کیمیکل امتحان سے اس کی قدامت کا اندازہ لگایا گیا ہے، رسالہ سوویت
دیس ۶:۲ بابت جنوری ۱۹۵۹ میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصحف
عثمانی تیمور کے کتاب خانے میں تھا جو ۱۳۹۳ء میں دار الامارۃ سمرقند میں قائم کیا گیا تھا، پھر سمرقند کی
مسجد خواجہ احرار میں آگیا اور صدیوں تک اس مسجد میں ایک مرمریں ستون سے زنجیروں سے معلق رہا،
۱۸۷۳ یا ۱۸۶۸ میں زار روس ترکستان پر قابض ہوا تو روسی گورنر وان کاف مان کی نظر
میں یہ نسخہ آیا، اس نے سو روبل میں اسے خرید کر سینٹ پیٹرس برگ کے شاہی کتاب خانے میں بھیج دیا،
۱۹۱۷ میں روسی انقلاب کے بعد انقلابی دستے کے مسلمان سپاہیوں نے اس کو اپنے قبضے میں لینا چاہا
لیکن کسی وجہ سے ان کو نہ مل سکا، بالآخر پیتروگراد صوبائی مسلم کانگریس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا
اور مجلس وزراء کے حکمنامہ مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۱۷ء کے مطابق یہ مصحف عظیم روسی پارلیمان کے مسلم نمائندوں
کے جلسے میں اوفا پہنچا، پھر اسے ازبکستانی جمہوریہ کے پایۂ تخت تاشقند پہنچا دیا گیا، جہاں اب تاریخی میوزیم
میں محفوظ ہے، رسالہ سوویت دیس میں خون کے نشان بتائے گئے ہیں اور اس بات کی صراحت ہے کہ بعض
مستشرقین نے اس کی قدامت تسلیم کرلی ہے، میوزیم کی ڈائرکٹر کے بیان سے بھی روسی نشریہ کے مندرجات
کی تائید ہوتی ہے، انھوں نے مزید یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ تیمور اس نسخہ کو قسطنطنیہ سے لایا تھا،

اس نسخہ شریفہ سے سورہ "یٰسین" کا ایک عکس ۱۹۰۵ء میں ایک روسی عالم عبداللہ الیاس بدعانی
القریمی نے شائع کیا تھا، بورغانی کو اصل نسخہ ۱۸۸۹ء میں پیٹرس برگ کے شاہی کتاب خانے میں دیکھنے

کا شرف حاصل ہوا تھا، یہ خط کوفی میں چمڑے پر لکھا ہوا ہے، اور اس کے صفحات کو کنارے کی طرف ٹیڑھا کر کے دیکھا جائے، تو حروف شیشے کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، کل ۷۰ صفحات ہیں، اور آیت شریفہ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ پر خون کے دھبے موجود ہیں، سورۂ یٰسین ۲۲ صفحات کو حاوی ہے، اس کے ایک صفحے کا عکس قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب مآثر و معارف (ص ۲۲) میں شائع کیا ہے، قاضی صاحب کا مضمون اس عنوان سے شائع ہوا مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا، (سورۂ یٰسین)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے، کہ مسجد نبویؐ کے نسخے کے بارے میں خون کے دھبے کا ذکر دسویں صدی تک کے مورخین کی تحریروں میں ملتا ہے، اور اسی بنا پر عام طور پر یہ نسخہ حضرت عثمانؓ کا نسخۂ خاص سمجھا جاتا تھا، گو علامہ سمہودی (م: ۹۱۱) کو اس سلسلے میں برابر شک رہا، بہرحال اگر استنبول والا نسخہ وہی ہے جو مسجد نبویؐ سے منتقل ہوا ہے، تو اس پر خون کے دھبے ہونا چاہئے، اس لئے کہ مورخین نے ذکر کیا ہے کہ آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ پر دھبے موجود ہیں، اگر یہ حقیقت ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ روسی نسخہ اس کی اصل ہے، یا ترکی۔ (باقی)

مقالات سلیمان جلد سوم

(مذہبی)

یہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ کے مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے، اس میں کلام مجید کے احکام و مصالح کی حقانیت و تشریح بھی ہے، اور غیر مسلموں کے اعتراضات کا رد بھی، موجودہ دور کے مجددین و منکرین کے جہادات کی تفہیم بھی ہے، اور بعض جدید نظریات کے بانیوں کی تطبیق بھی۔ قیمت: ۱۷ — ۰ — ۰

علمی خطوط

(۱)

دفتر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۲۰ رمئی ۱۹۸۱ء

مخدوم و محترم السلام علیکم

پرسوں پروفیسر محمد اسلم صاحب کے یہاں فروری کا معارف دیکھا۔ آپ کے بدیع الاسلوب قلم نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی خدمات کا تذکرہ جن خوبصورت الفاظ میں لکھا ہے وہ انشائے عالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہے، پروفیسر عبدالقیوم صاحب نے بھی آپ کے شذرات کو بہت پسند کیا ہے۔

کتاب الشفا پر جناب ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون بھی بہت خوب ہے، کتاب الشفا کی شروح میں ملا علی قاری کی شرح بھی قابل ذکر ہے جو آج سے تقریباً نونے برس پیشتر آستانہ (قسطنطینیہ) سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ کتاب الشفا کی تعریف و توصیف میں خطبات مدراس (مولانا سید سلیمان ندوی) کے بعض دلآویز فقرے بھی قابلِ توجہ ہیں،

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان (عربی ادب) پر فاضل تبصرہ نگار کا تبصرہ تقریباً صحیح ہے، انہوں نے جن کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے، وہ متعلقہ ادارے کے لئے محتاج توجہ ہیں، خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ نظرثانی اور پروف ریڈنگ کا کام ان اصحاب نے کیا ہے جو عربی زبان اور علوم اسلامیہ سے نابلد تھے، اشاریہ (انڈکس) کا بھی یہی حال ہے، دوسری خرابی کی وجہ کتابوں

کی عدم دستیابی ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں بھارت اور پاکستان کے درمیان سالہا سال تک خطوط اور اس کے بعد رسائل وکتب کی ترسیل بند رہی ہے، ہمارے یہاں کے اکثر شائقینِ علم اسلامی ہند کی مطبوعات سے بے خبر رہتے ہیں، اس کے علاوہ بھارت سے جو اصحاب علم وفضل آتے ہیں، وہ سیدھے کراچی کا رخ کرتے ہیں، لاہور میں ان کا قیام نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان سے استفادہ یا تبادلۂ خیالات نہیں ہو سکتا، تاریخ ادبیات (عربی) ۱۹۷۲ء میں مرتب ہوئی تھی، علی میاں کی "السیرۃ النبویہ" (سال اشاعت ۱۹۷۸ء) اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی ایڈٹ کردہ ان کتابوں کا ذکر اس میں کیسے ہو سکتا تھا جو کتاب کی ترتیب اور اشاعت کے بعد گذشتہ پانچ چھ برسوں میں شائع ہوئی ہیں بہرحال یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مولانا اعظمی کی علمی کاوش سے مجمع بحار الانوار شائع ہو چکی ہے۔ نول کشوری نسخہ تو بدخط اور غلط سلط ہے۔ فاضل تبصرہ نگار تاریخ ادبیات اور لٹریری ڈائرکٹری میں بھی فرق محسوس نہیں کر سکے، تاریخ ادبیات میں صرف چیدہ چیدہ معیاری کتابوں کا ذکر ہوتا ہے نہ کہ کتابچوں، رسالوں اور مضامین کا، ایک اور بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ تقریباً چوالیس برس سے دار المصنفین میں مقیم ہیں اور آپ کے اسلامی ہند کے بیشتر اکابر سے مخلصانہ اور نیازمندانہ تعلقات رہے ہیں، جن کے دیکھنے والے اب اٹھتے جا رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے سوانح مرتب کر لیں اور ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم کی "یادوں کی دنیا" کی طرح ان اکابر کے حالات اپنے سوانح کے آخر میں شامل کر دیں تاکہ نئی نسل ان سے روشنی اور ہدایت حاصل کر سکے۔ بزم صوفیہ بھی تکمیل کی منتظر ہے۔

سیرت شامی قاہرہ میں چھپ رہی ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور دوسرے رفقاء کی خدمت میں سلام عرض کر دیں، بہت سے اصحاب تذکرۃ المحدثین جلد سوم کا انتظار کر رہے ہیں۔ فقط والسلام مع الاکرام

نیاز مند (شیخ) نذیر حسین، مدیر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

(۲)

شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

۱۰ مئی ۱۹۸۰ء برادرِ محترم السلام علیکم

آپ مجھے بتائے بغیر دو بار پاکستان گئے، میں بھی دعا کرتا رہا کہ کبھی مجھے آپ سے آگے نکلنے کا موقع ملے، آخر اللہ تعالیٰ نے میری سن لی اور مجھے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے دس دن کے سفر کا دعوت نامہ موصول ہو گیا، میں بھی آپ کو بتائے بغیر ہی گیا اور اب واپس آ گیا ہوں۔

اب آئندہ سفر پاکستان کا کب ہوگا؟ دونوں اکٹھے چلیں تو لطف آ جائے۔ کبھی ملاقات ہو تو آپ کو بتاؤں کہ انسان اور انسان میں کس قدر پیار کا رشتہ موجود ہے، میرا یہ سفر آنسوؤں کی وادی کا سفر تھا۔ پاکستان کے اہلِ علم نے ایک بے علم شخص کی کس قدر پذیرائی کی، کاش یہ بتانے کے لئے میرے پاس الفاظ ہوتے۔ پاکستان نے اقبال پر میرے چھوٹے موٹے کام کی جو قدر کی ہے، وہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ ہیچ مدان اور کج مج بیان پر اللہ کا خاص کرم ہے ورنہ میں کیا اور اقبال پر میرا کام کیا۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور، کراچی یونیورسٹی کراچی، پشاور یونیورسٹی پشاور، اور علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد میں علامہ اقبال کے فکر و فن پر میرے چار لیکچر ہوئے۔

لاہور اور کراچی میں مجھے رائٹرز گلڈ کی طرف سے استقبالیے دئے گئے، پشاور میں ایشین آرٹس کونسل نے اور اسلام آباد میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے بھی استقبالیے سے نوازا گیا۔

اس سفر میں اپنے گاؤں عیسیٰ خیل بھی گیا اور میانوالی بھی دونوں جگہوں پر متعدد جلسے

منعقد کیے گئے، عیسیٰ خیل میں پاکستان کے مشہور ماہر موسیقی عطاء اللہ خاں نیازی نے ایک محفل موسیقی سجائی اور اپنے نغموں میں میرے والد جناب تلوک چند محروم صاحب کا ذکر کر کے مجھ کو اس انداز سے خطاب کیا کہ ساری محفل آبدیدہ ہو گئی۔

میانوالی سے جب میری گاڑی چلی تو دریائے سندھ کے پار عیسیٰ خیل تک ایک پائلٹ جیپ میری گاڑی کے آگے آگے چلتی رہی۔ میانوالی سے دس بارہ گاڑیوں میں میرے احباب اور معززین شہر میرے ساتھ عیسیٰ خیل تک گئے، عیسیٰ خیل کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا، سڑکوں پر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگائی گئی تھیں، میرے والد کے اور میرے اشعار سے شہر کے در و دیوار مزین تھے، عیسیٰ خیل اور میانوالی دونوں جگہوں پر متعدد استقبالیے دیئے گئے، جن میں میرے والد صاحب کو خصوصاً خراج تحسین ادا کیا گیا۔

اسلام آباد میں صدر پاکستان جناب محمد ضیاء الحق سے بھی ملاقات ہوئی اور بات چیت میں ان کے سامنے میں نے یہ تجویز رکھی کہ اب جب کہ پاکستان میں بھی ایک اکیڈمی آف لیٹرز قائم ہو گئی ہے تو ہندوستان اور پاکستان میں ان اکاڈمیوں کے ذریعے سے ادیبوں، شاعروں اور اصحاب علم و ادب کا تبادلہ ہونا ضروری ہے تا کہ ادیبوں اور اہل قلم کو ایک دوسرے کے ممالک کے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کا پتہ چل سکے۔ جناب صدر صاحب نے پوری توجہ کے ساتھ مری یہ بات سنی،

خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں

والسلام

جگن ناتھ آزاد

باب التقریظ والانتقاد

"زندہ رود"

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مذکورۂ بالا کتاب کے گرد پوش پر ایک رنگین تصویر میں علامہ محمد اقبال ایک بچہ کو گود میں لئے ہوئے انتہائی مسرور نظر آرہے ہیں، یہ وہ بچہ ہے جس کے نام پر انھوں نے اپنی ایک مشہور مثنوی کا نام رکھا، اور آگے چل کر اس کو مخاطب کرکے کہا:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی   خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

اور یہ بھی:

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو   ہے اُس کا مذاق عارفانہ

یہ بچہ — **ڈاکٹر جاوید اقبال** — اب جوان ہوکر لاہور ہائی کورٹ کا جج ہے، اپنے والد بزرگوار کے کلام کا صحیح ترجمان بھی بن گیا ہے، اور چند مہینے پیشتر اردو زبان وادب کے افق پر ان کے سوانح نگار کی حیثیت سے نمودار ہوا ہے۔

علامہ محمد اقبال کی **جاوید نامہ** میں جو مختلف کردار ہیں، اُن میں ایک **زندہ رود** بھی ہے جو خود علامہ ہیں، ان کے اس سوانح حیات کا یہ نام رکھ کر ان کے لائق فرزند نے ان ہی کی طرح اپنی جدت ذہن کا ثبوت دیا ہے، زندہ رود کے معنی مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی بتائے گئے ہیں، جس کی

خصوصیت یہ ہے کہ یہ اچکتی، اٹکتی، بچکتی، سرکتی، اچلتی، پھسلتی اور بڑے پیچ کھاکر پہاڑوں کو چیرتی ہوئی بہتی ہے۔ "زندہ رود" پڑھ کر یہ اثر قائم ہوا کہ اس کی تحریر اچکتی، اٹکتی، مچلتی، اچلتی، سنبھلتی اور بڑے پیچ کھاکر تاریخی، سیاسی اور معاشرتی واقعات کے تودوں کو چیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

ان کے والد بزرگوار کی سوانح عمریاں اب تک جتنی لکھی گئی ہیں، اُن سے وہ مطمئن نہ تھے، اس لئے وہ ان کی ایسی سوانح عمری لکھنا چاہتے تھے جس میں ان کے خیالات و افکار کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ان کے ماحول کا بھی جائزہ ہو، اس جائزہ میں یہ کتاب مصنف کے والد بزرگوار اور اُن کے اجداد کے دور کی ایک روحانی، سیاسی، عمرانی اور ادبی تاریخ بھی بن گئی ہے، جس کو پڑھنے میں اجمال اور تفصیل دونوں کا مزہ ملتا ہے لائق مصنف جج کے عہدے پر اس وقت فائز ہیں، اس لئے جو کچھ لکھتے ہیں اس میں جج کی جرح بھی ہے اور واقعات کی چھان بین بھی، اس کا اصلی وصف اس کا ایجاز ہے، اس میں کہیں اکتا دینے والی تفصیل نہیں، اور نہ کہیں ایسا اختصار ہے جس سے یہ خیال ہو کہ مصنف کو اور لکھنا چاہئے تھا جو نہ لکھ سکے، اس میں تمام باتوں کی اتنی ہی تفصیل ہے جتنی کہ خوش مذاق قارئین کو پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے مطالعہ سے قارئین کو غیر شعوری طور پر محسوس ہوگا کہ اس میں وہ بھی ہے جو ان کو معلوم نہ تھا، اور وہ سب کچھ ہے جو ان کو معلوم تھا، لیکن ان سب کو کچھ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوگا کہ ان کو جو کچھ پہلے سے معلوم تھا اُن میں از سرِ نو تازگی بلکہ جلا پیدا کرنے کی ضرورت تھی جو اس کتاب سے پوری ہوگئی۔

اس میں تاریخ، سیاست، شعر و ادب اور تصوف کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے مطالعہ میں کچھ رومانیت کی سی لذت پیدا ہونے لگتی ہے، اس کے مصنف اپنے اشہبِ قلم کو اپنی چابکدستی سے جب اور جس طرح چاہتے ہیں، موڑ دیتے ہیں، وہ اپنے والد بزرگوار اور ان کے اجداد کے حالات

کبھی کبھی وہ ایک اسی زمانے کے سیاسی اور تاریخی واقعات کی عکاسی کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب ان کے قارئین اس ماحول کی مرقع آرائی سے محظوظ ہونے لگتے ہیں تو پھر اچانک اپنے خاندان کے بزرگوں کو ان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتے ہیں، انھوں نے جو تاریخی اور سیاسی واقعات لکھے ہیں وہ کچھ پردۂ اختفار میں نہ تھے، بلکہ جانے بوجھے ہوئے ہیں، مگر موضوع کے پس منظر کو نمایاں کرنے کی خاطر وہ بڑی خوش سلیقگی سے سجائے گئے ہیں، جس کی بڑی کمی علامہ اقبال کے پہلے سوانح نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب اور ۱۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا باب "سلسلۂ اجداد" کے عنوان سے ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال کے اجداد کشمیری برہمنوں کی گوت سپرو سے تھے، سپرو کی اصلیت سے متعلق کئی روایتوں کے حوالے دئے گئے ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ اس کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاپور سے ہے، ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ یہ مصری النسل ہیں مگر ڈاکٹر جاوید اقبال ان روایتوں سے اتفاق نہیں کرتے، انھوں نے اپنے والد ماجد ہی کے ایک خط سے تصریح کی ہے کہ کشمیر میں جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کی حکومت کا اعتماد حاصل کیا وہ ہندوؤں میں از راہ تعریض و طنز سپرو کہلائے، اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے، اسی سپرو گوت سے علامہ اقبال کے جد اعلیٰ بابا لول حج تھے جو ان کی پیدائش سے ساڑھے چار سو سال پہلے پندرہویں صدی میں سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے زمانہ میں (۱۴۷۰ - ۱۴۲۰ء) مسلمان ہوئے، اس سلطان کے شہمیری خاندان کے اور سلاطین کا ذکر بھی مختصر طریقہ پر آگیا ہے، ان ہی میں سے سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں مسلمان رشیوں نے تبلیغ اسلام شروع کی، ان کا ذکر احترام سے کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ان ہی میں شیخ نصر الدین بابا لول حج کے مرشد تھے، جو نسلاً ذات کے کھشتری راجپوت تھے، ان کشمیری رشیوں کی تفصیل لکھنے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس برصغیر میں صوفیہ کے جو معروف سلسلے یا طریقے رائج ہوئے ان کے

بانی عموماً سید تھے، جو وسطی ایشیا یا مشرق وسطیٰ سے یہاں آئے اور وہیں وفات پا گئے، ان کے خلفاء یا جانشین بھی اکثر ان ہی کے خاندان میں سے ہوئے، لیکن سلسلۂ ریشیاں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بانی کشمیر کے ایک کھشتری راجپوت نو مسلم کے فرزند تھے۔ ان کے خلفاء اور مریدین بھی سب کے سب نو مسلم تھے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات ویدانتی اور وجودی فکر کے امتزاج پر مبنی تھیں (ص ۴)

ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کے مطابق بابا لول حج کی آنکھیں بھینگی تھیں اور پاؤں ٹیڑھے تھے، شادی کے بعد ان کی بیوی ان پر ہنسا کرتی تھیں، اس لئے وہ دل برداشتہ ہو کر تارک الدنیا ہو گئے، پہلے حرمین شریفین کا رخ کیا، پھر بارہ۱۲ سال تک سیاحت کرتے رہے، کشمیر واپس ہوئے تو بابا نصر الدین کے مرید ہو کر سلسلۂ ریشیاں سے وابستہ ہو گئے، اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال رقمطراز ہیں کہ بیوی کا رویہ باطنی حسن کی تلاش اور جستجو کے لئے مہمیز ثابت ہوا (ص ۵) بابا لول حج کی اولاد میں ایک بزرگ شیخ اکبر تھے، جو علامہ اقبال کے دادا یا پردادا تھے، ان کے مرشد ایک سید تھے جن کے انتقال کے بعد انھوں نے ان کے مریدوں کو سنبھالا، گویا ان کے خلیفہ ہوئے (ص ۹) علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد قادریہ سلسلہ کے بزرگ سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار آوان شریف کے مرید تھے، بچپن میں علامہ بھی اسی سلسلہ میں بیعت ہو گئے تھے (ص ۶۴) اسی مناسبت سے ان کو اپنے گھر کے عارفانہ ذوق پر فخر تھا، خود ڈاکٹر جاوید اقبال بھی رقمطراز ہیں کہ ان کے والد بزرگوار کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو فطری طور پر دنیوی یا مادی آسودگی سے کہیں زیادہ اخلاقی اور روحانی مسرتوں کی جستجو میں تھا، اور جو دنیا کے مقابلہ میں ہمیشہ دین کو ترجیح دیتا تھا (ص ۱۵)

یہ خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آیا، ہجرت کے اسباب کے سلسلہ میں کشمیر میں افغانوں کے زوال اور سکھوں کے تسلط کی تاریخ اجمالی طور سے موثر انداز میں پیش کی گئی ہے، یہاں سکھوں کی حکومت ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء یعنی ستائیس برس تک رہی، لیکن اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے جو

خون ریزی اور سفاکی کی، اس کی داستان بہت ہی دردناک انداز میں لکھی گئی ہے کوئی مسلمان گائے ذبح کرتا تو سری نگر کی گلیوں میں اس کو گھسیٹا جاتا اور پھر اس کو پھانسی دے دی جاتی، ٹیکسوں کا اتنا بوجھ تھا کہ تعصب نقیروں سے اٹے پڑے رہتے، اس زندگی سے عاجز آکر وہاں کے لوگ ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے لگے، ان ہی حالات میں علامہ کا خاندان پنجاب آگیا (ص ۱۵) اور سیالکوٹ میں آباد ہوا، جہاں شیخ نور محمد پیدا ہوئے، اس پہلے باب کا خاتمہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ لکھ کر ختم کیا ہے :

"ان کے (یعنی ان کے والد بزرگوار کے) اشعار میں برہمن نسبت کی طرف اشارے ہیں، مگر ان میں طنز کا پہلو نمایاں ہے، یعنی یہ کہ سیاست کے میدان میں مسلمان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں، لیکن قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اگر یہاں کوئی حقیقی معنوں میں اسلام کے اسرار و رموز یا اس کے روشن مستقبل سے آگاہ ہے تو برہمن زادہ تھا۔"

اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ

"ان کے بعض اشعار سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فلسفہ ایسے علوم پر ان کے عبور کا سبب ان کا برہمن نسب ہونا تھا، مگر انھوں نے خود ہی فلسفہ کو دینی رہبری کے لئے ناکافی پاکر مسترد کر دیا، ان کے تجربے میں تو عشق رسول ایسی نعمت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے تمام فکری مسائل کو حل کر سکتے تھے، اس لئے قرآنی تعلیمات سے ان کا شغف اسلام کے ساتھ ان کی محبت اور مسلمان ہونے پر ان کا فخر وہ فطری عناصر تھے جن سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔ (ص ۱۶)

یہ ایسا جامع اور پُر مغز تبصرہ ہے جس سے اس شاعر اسلام کے افکار کو صحیح طور پر سمجھنے میں پوری مدد ملے گی اور یہ ان کی ذات اور ان کے کلام کا ایک سعادت مند ہی لکھ سکتا تھا خوشی ہے کہ یہ معرفت خود جلیل القدر باپ کے قدر شناس فرزند کو حاصل ہوئی۔

کتاب کا دوسرا باب "خاندان سیالکوٹ میں" کے عنوان سے ہے، پہلے اس میں سیالکوٹ کی مختصر لیکن دردناک تاریخ ہے، پھر پورے ہندوستان کے اُن نامساعد اور ناموافق حالات پر مورخانہ تبصرہ ہے جن میں مسلمان صبر آزما مصائب میں مبتلا تھے، سلاطینِ دہلی کے عہد میں سیالکوٹ کے مسلمان امن سے زندگی بسر کرتے رہے لیکن چودھویں صدی میں جب دہلی کی سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی تو سیالکوٹ کا باجگذار حکمراں سنہ پال اس پر قابض ہو گیا، اس نے یہاں کے قلعہ کو ہمیشہ کے لئے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے جوتشیوں کے مشورہ سے ایک مسلمان کو بے دردی سے ذبح کر کے اس کے خون کو بنیاد میں استعمال کیا، سید امام علی لاحق نے سلطان فیروز شاہ کے لشکر کی مدد سے اس کے خلاف لڑ کر ہندو راج کو ختم کیا، گو معرکہ میں خود شہید ہوئے، مغلوں کے عہد میں یہ قصبہ پھلتا پھولتا رہا، صوفیہ اور مشایخ کے حسن عمل اور خلق محمدی سے متاثر ہو کر یہاں کے ہندو اسلام قبول کرنے لگے، مگر ۱۸۰۷ء میں اس پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا، تو یہاں کے مسلمان مصائب میں مبتلا ہو گئے، جس سے متاثر ہو کر حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے (۱۷۸۶ء ۱۸۳۱ء) دہلی، اتر پردیش، بنگال اور دکن کے سرفروشوں کی ایک جانباز جماعت تیار کی، اور سکھوں کے مظالم کے خلاف جہاد کیا، وہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۰ء تک سکھوں سے جنگ کرتے رہے، مگر جب چند افغان سرداروں نے سکھوں سے مل کر ان کے خلاف سازش کی تو وہ ۱۸۳۱ء میں شاہ محمد اسمٰعیلؒ کے ساتھ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے، لیکن ان کے حامیوں نے سکھوں کے خلاف جہاد جاری رکھا، یہ مجاہدین ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کے خلاف بھی برابر لڑتے رہے، مگر جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے سکھ فوجوں کے ساتھ مسلمانوں پر بڑے ہولناک مظالم کئے، جامع مسجد سکھوں کی بارک بن گئی، زینت المساجد کو گوروں نے اپنا مسکن بنا لیا، ستائیس ہزار مسلمانوں کو پھانسی دی گئی، سات دن تک ان کا قتل عام جاری رہا، پھر عیسائی مشنریوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رکیک حملے شروع کئے، سیالکوٹ کے اندر بھی مسلمانوں پر انگریزوں کے ظلم و ستم ہونے لگے،

۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کے کچھ لوگ بھی سولی پر چڑھے، ان کو توپ سے بھی اڑایا گیا اور ان پر پچاس ہزار روپے کا اجتماعی جرمانہ بھی ہوا، ان ہی حالات میں علامہ محمد اقبال کا خاندان سیالکوٹ میں زندگی بسر کر رہا تھا، اس نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں کے ظلم و استبداد کو دیکھا تو ان کے خلاف نفرت پیدا ہوئی، (ص ۲۷) اسی حوصلہ شکن ماحول کے ساتھ ماضی گذر رہا تھا، لیکن مستقبل کو ہنوز پیدا ہونا تھا، کہ علامہ محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

اس ماحول کا ذکر اس کتاب میں اس لئے کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خاندان والوں کی زبانی اس کی کہانی سنی ہوگی، آگے چل کر خود اس کی تفصیل پڑھی ہوگی، وہ ایک جلیل القدر شاعر ہونے کو تھے، اس لئے ان کا اس ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر تھا مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت ان سے چھن گئی، ان کی تہذیب کی غارت گری ہوئی، ان کے مذہب اور ان کے رسول پر حملے ہوئے، اور ان کے وجود کو ختم کرنے کی پوری کوشش رہی، اس کے بعد ایک شاعر اسلام کے پیدا ہونے کی ضرورت تھی جو علامہ محمد اقبال کی ذات گرامی سے پوری ہوئی، ان کے والد بزرگوار نے ان کی اس نشوونما میں اس لحاظ سے مدد کی کہ ان کو اپنے اس فرزند ارجمند کے ایمان کی سلامتی کی برابر فکر رہی، ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ربع آخر کے مسلم بزرگوں کا یہ مستقبل پر بہت بڑا احسان تھا کہ ان کی توجہ سے آنے والی نسل میں اسلامی عصبیت بیدار رہی (ص ۲۸)

تیسرے باب میں علامہ اقبال کے سنہ ولادت کی تعیین بڑی محنت سے کی گئی ہے، جتنے مختلف سنہ اب تک لکھے گئے تھے ان پر جرح ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک فاضل جج ہی کی طرح کی ہے، اور اپنا یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ان کی پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء میں ہوئی، حیرت ہے کہ اس فخر روزگار کی پیدائش کی صحیح تاریخ کہیں درج نہیں جس کی تعیین میں اس کتاب کے بیس صفحے صرف کرنے پڑے۔

چوتھا باب "بچپن اور لڑکپن" کے عنوان سے ہے، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ

علامہ اقبال بچپن میں اپنے والد بزرگوار کی صحبت اور اپنے استاد سید میر حسن کی تعلیم و تربیت سے متاثر ہوئے،
اس باب میں موثر انداز میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ نور محمد بہت دین دار تھے، وہ روزی کمانے کے دھندے
سے فراغت پاتے تو اپنا وقت علما اور فضلا کی صحبت میں گذارتے۔ ان کو تصوف سے بے حد شغف تھا،
محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا درس ان کے گھر پر ہوتا، علامہ اقبال اس درس میں
برابر شرکت کرتے اور اپنے والد بزرگوار کی صحبت سے بھی فیض اٹھاتے، چنانچہ ان کو کہنا پڑا کہ ہزار کتب خانہ
ایک طرف اور باپ کی نگاہ شفقت ایک طرف (ص ۵۳)

شیخ نور محمد نے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم بھی دلائی پھر اپنے ساتھ قادریہ سلسلہ میں بیعت بھی کرائی اور
یہ ہدایت دی کہ "جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہمکلام ہے (ص ۶۵)
اور ان سے اپنی تربیت کی محنت کا معاوضہ اس صورت میں مانگا کہ وہ اسلام کی خدمت کرتے رہیں
(ص ۶۵) علامہ اقبال کو یہ اعتراف رہا کہ جو چیز یورپ کی درسگاہوں میں نہیں ملی، وہ ان کو اپنے والد کی
صحبت میں ملی (ص ۵۳) انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ میں نے اپنا زاویۂ حیات فلسفیانہ جستجو سے
حاصل نہیں کیا، زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ورثہ میں مل گیا تھا، بعد میں عقل اور استدلال
کو اسی کے ثبوت میں صرف کیا (ص ۶۴) خود ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ

"اقبال کے گھر کا ماحول دیندارانہ اور درویشانہ تھا جس میں محبت و شفقت کے ساتھ
عزت و احترام کو بڑا دخل تھا، اقبال گو لطائف وجدانی کو تسلیم کرتے تھے، ان کے رموز کا
ذاتی تجربہ بھی کچھ حد تک رکھتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں تصوف کے بارے
میں علمی اعتبار سے ان کے ذہن میں کچھ الجھنیں پیدا ہوئیں اور ان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا" (ص ۶۸)

یہ بات بڑی اہم ہے، علامہ اقبال اور تصوف کا مسئلہ بڑا متنازعہ فیہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے
یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان الجھنوں کی ابتلا سے تصوف سے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ عارضی یا مستقل طور پر

بدلا ہا، اور ان کی یہ الجھنیں مجمی تصوف یا اسلامی تصوف سے پیدا ہوئیں؟۔

بچپن ہی میں نہیں بلکہ آگے چل کر بھی ان کے استاد سید میر حسن ان کے ذہن پر حاوی رہے جو سرسید کی تحریکات سے متاثر تھے، اس لئے اس باب میں سرسید کے تمام کارناموں کا بڑا اچھا جائزہ لیا گیا جو اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے، اس سے یہ بھی دکھانا مقصود ہے کہ علامہ اقبال سرسید سے بھی متاثر تھے، ان کی ادبی تحریک سے شاعروں نے ملت کی فلاح و بہبود کی خاطر بامقصد شاعری کی بنیاد رکھی، جس کو ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے شاعرانہ کارناموں سے منتہائے کمال تک پہونچا دیا، اس باب میں بعض قارئین کو یہ پڑھ کر شاید تعجب ہو کہ علامہ اقبال اپنے بچپن میں اکھاڑے میں بھی اترے، دنگل بھی لڑے اور کبوتریں بھی اڑایا کرتے، اس کو پڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں کس بل آیا اور ان کے تخیل میں غیر معمولی قوت پرواز بھی پیدا ہوئی۔

پانچواں باب "گورنمنٹ کالج لاہور" کے عنوان سے ہے، اس میں علامہ اقبال کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی تفصیل ہے، اس زمانہ میں وہ اپنے استاد ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ کے بھی گرویدہ رہے، اس باب کا اہم حصہ وہ ہے جس میں علامہ کے اس دور کی شاعری کا بہت عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے کہ اس زمانہ تک ان کے والد بزرگوار کی توجہ گرد و نواح کی طرف مبذول ہونے کے بجائے زیادہ تر اپنی ذات پر مرکوز تھی، فلسفہ کے مطالعہ سے ان کی غزلوں کے روایتی مضامین بعض اوقات حکمت کے موتی بکھیرتے نظر آتے ہیں، مگر اس زمانہ میں ان میں فکری الجھنیں بھی پیدا ہوگئی تھیں جس کے اسباب یہ تھے کہ انھوں نے ہیگل، گوئٹے، میرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سب سے کچھ نہ کچھ استفادہ کیا، ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہونچنے میں ان کی رہنمائی کی، بیدل اور غالب نے بھی انھیں بہت کچھ سکھایا، ان کا خود بیان ہے کہ ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانہ میں انھیں دہریت سے بچا لیا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ وہ اپنے ذہنی تجسس کی

وجہ سے خالصتہً ذاتی اور باطنی نوعیت کی کشمکش میں مبتلا تھے، کیونکہ وہ اس عہد میں کسی بات کی صحت
صداقت کو دوسروں کی سند کے حوالے سے تسلیم کرنا پسند نہ کرتے تھے، دہریت کی عارضی کیفیت غالباً
ہیگل کے مطالعہ سے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے خود ہی یہ سوال پیدا کیا ہے کہ جب
اقبال کی تعلیم و تربیت ابتدا ہی سے روایتی اسلامی نہج پر ہوئی تو ورڈزورتھ نے انھیں کیوں اتنا متاثر کیا؟
اس کا جواب وہ خود ہی یہ دیتے ہیں کہ اقبال کا ذاتی تجسس اس امر کا شاہد ہے کہ وہ خود اپنی روایت کی
تنگ اور محدود فضا سے بیزار تھے، یورپی فلسفہ کے مطالعہ سے انھیں ذہنی خلفشار پیدا ہوا جس میں انیسویں
اور انیسویں صدی کا یورپی فلسفہ بھی مبتلا تھا، اس لئے اگر ان کے متجسس ذہن اور شاعرانہ قلب نے
ورڈزورتھ کے مطالعہ سے عقلیت کے کھوکھلے پن کا ایک ناقابل فہم جواب پایا، تو کوئی تعجب کی بات
نہ تھی، بلکہ یہ تو ان کی سلامتی عقل کی دلیل تھی کہ وہ اپنے عہد کے مادہ پرستانہ نظریات سے اثر قبول کرنے
کے باوجود ان سے اپنے کو گمراہ نہ ہونے دیا۔ فلسفہ و تصوف کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ورڈزورتھ کے
خیالات ابن عربی کی وجودی تعلیمات سے کتنی مشابہت رکھتے ہیں، اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے
کہ ذہنی ارتقاء کے اس مرحلہ میں اقبال کو تصور وحدت الوجود ہی نے عالم تشکیک سے نکالا (ص ۸۴)

ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ تجزیہ علامہ کے ان حامیوں کو ضرور متوجہ کرے گا، جو یہ کسی طرح تسلیم
کرنے کے لئے تیار نہیں کہ وہ وحدت الوجود سے بھی متاثر ہوئے، بلکہ وہ اس تصور کو ان سے
منسوب کرنا ان پر ایک بڑا الزام سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اس دور کی شاعری کا مزید تجزیہ
کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> "اس مختصر دور کی شاعری میں اقبال کے ارتقائے فن کی رفتار بہت تیز تھی، بعض
> غزلوں میں فن کی پختگی کے ساتھ فکر کی گہرائی نمایاں ہے، غزلوں میں گو عشق
> مجازی کی آمیزش ہے، لیکن مضامین میں ہر قدم پر متصوفانہ یا حکیمانہ شاعری روایتی

تغزل کو پیچھے دھکیل رہی ہے، انداز بیان میں انتہائی شدت ہے، وجودی فلسفہ کے زیر اثر بعض اشعار تصوف کے روایتی نظریۂ فنا کی ترجمانی کرتے ہیں، گویا اقبال کے نزدیک نفس کی انفرادیت ایک فریب ہے، جو نمود حق کے بعد خود بخود مٹ جاتا ہے، اور پھر وہی ازلی حقیقت "خدا" رہ جاتی ہے، اس عہد میں اقبال نے وجودی فلسفہ کی روشنی میں اپنے سیاسی تصورات کی بنیاد رکھی اور بعد میں وطنی قومیت کی حمایت میں نظمیں تحریر کیں۔" (ص ۸۴)

اس تجزیہ سے خود تجزیہ نگار کی دقت نظر اور حسن فکر کا بھی اظہار ہوتا ہے اور کون ہے جو اس سے اختلاف کر سکتا ہے، یہ سب احاطہ کرنے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"اقبال کی طالب علمی کے دور کی شاعری کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ اس عہد میں وہ مجموعۂ اضداد تھے، زندگی ان کے لئے ابھی ایک معمہ تھی، وہ کسی پختہ یقین تک نہ پہونچے تھے، بلکہ ان کا ذہن مختلف افکار و نظریات اور جذبات کی پائداری یا ناپائیداری کو پرکھنے کے لئے ایک تجربہ گاہ تھا، اور یہ کیفیت خاصی مدت تک جاری رہی (ص ۸۵)

یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان کی طالب علمی کا دور ان کی شاعری کی تشکیل کا عبوری دور تھا، ان کے سامنے ان کی خاندانی روایات اور دینی تعلیم کا کعبہ بھی تھا، پھر انگریزی تعلیم کے جدید اثرات کا کلیسا بھی تھا، وہ شاعری اردو میں کرتے، مگر مطالعہ میں وہ تمام انگریزی شاعری رہتی، اسی کے ساتھ ان کا اپنا پر تخیل بھی تھا جس کے سہارے وہ پرواز نے کے بھی خواہاں تھے، مگر ان کے دور میں مسلمانوں کی مٹی ہوئی عظمت و شوکت کا ماتم بھی ہو رہا جس سے ان کا دل روندھا ہوا بھی تھا، ان کا انداز فکر فطری طور پر حکیمانہ تھا، تعلیم یورپ

فلسفہ کی ہوئی مگر کانوں میں گھر کے ماحول کی وجہ سے تصوف اور ابن عربی کی وحدت الوجود کی آواز گونج رہی تھی، اس لئے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ان کا مجموعۂ اضداد ہونا کوئی حیرت انگیز نہیں، آگے چل کر بھی ان پر مختلف قسم کے ماحول اور رجحانات کے اثرات مترتب ہوئے مگر ان اثرات کو قبول کرنے کے ساتھ ان کو جس طرح رد کیا ہے اور پھر اپنی اصلی منزل مقصود کی طرف جس طرح گامزن ہوئے ہیں، وہی ان کی شاعری کی اصلی جان ہے، اسی کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے حسن نظر اور حسن فکر سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی یہ سوانح نگاری بڑی جاندار ہو گئی ہے۔

چھٹا باب "تدریس و تحقیق" کی سرخی کے ساتھ ہے، اس میں اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ کی ملازمت، پھر اس زمانہ میں ان کی نثری تحریروں، ان کے خاص خاص احباب اور انجمن حمایت اسلام میں سوز و گداز سے بھرے ہوئے ترنم کے ساتھ ان کی اپنی نظمیں پڑھنے کی مقبولیت کے ذکر کے بعد ان کے اس دور کی شاعری پر اہم ناقدانہ تبصرہ ہے، جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انھوں نے اس دور میں روایتی غزل گوئی سے چھٹکارا حاصل کر لیا، جس کے بعد ان کے یہاں جہاں مناظر قدرت اور حسن و جمال وغیرہ پر نظمیں ملتی ہیں، وہاں ان کے یہاں وطنی قومیت کے موضوعات بھی ہیں، اس کا ایک سبب تو ڈاکٹر جاوید اقبال یہ بتاتے ہیں کہ ان کے مزاج میں اضطراب تھا، جو بات ان کی دلچسپی کا باعث ہوئی، اس پر شعر کہہ دیتے، وطنی قومیت پر نظمیں کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ اس وقت تعلیم یافتہ گروہ کے سامنے یہ حقیقت یہ تھی کہ انگریز اور یورپ کی دوسری قوموں نے وطنی قومیت کی وجہ سے ترقی کی، اس لئے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اس رو میں بہہ گیا، علامہ بھی نوجوان تھے، اس لئے ان کا بھی متاثر ہونا تعجب انگیز نہیں، ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ اس زمانہ میں وہ وسیع المشربی کے ہمہ اوست میں بھی غرق تھے، جس کی وجہ سے ان کے یہاں عشق مجازی، فطرت کی

مناظر کشی، حسن، نگارئہ کائنات اور وطنی قومیت کی گونج کے ساتھ روایتی تصوف اور اسلامیت کے بھی عناصر ہیں، پھر یہ سوال خود ہی ڈاکٹر جاوید اقبال کرتے ہیں کہ جب وہ وطنی قومیت کی نشے سے سرشار اور ہمہ اوست کی وسیع المشربی میں مستغرق تھے تو اپنی شاعری میں اسلامیت کا عنصر کیوں شامل کیا، اس کے جواب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے یورپی ممالک میں صنعتی انقلاب، کلیسا اور یورپی سیاست کی باہمی آویزش، علوم و سائنس کی ترقی، تجارت اور صنعت کے پھیلاؤ، یورپی قوموں کی ملک گیری اور استعمار پسندی کی ہوس، مسلمانوں کے اخلاقی، سیاسی اور معاشی زوال اور ترکی میں مدحت پاشا، وسط ایشیا میں مفتی عالم جان، مصر میں شیخ عبدہٗ، ہندوستان میں سرسید احمد کی اصلاحی تحریکوں، اتحاد اسلامی کے سلسلہ میں جمال الدین افغانی کے نظری اور فکری خیالات اور مولانا شبلی کے اسلامی جذبات کا جائزہ لے کر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس زمانہ میں جس طرح مسلم تعلیم یافتہ طبقہ میں وطنی قومیت کا جذبہ فروغ پا رہا تھا اسی طرح وہ قلبی اور ذہنی طور پر تحریک اتحاد اسلام سے بھی متاثر تھا، لیکن بظاہر ایسے اتحاد کے وجود میں آنے کے امکانات دکھائی نہ دیتے تھے بلکہ آئے دن کسی نہ کسی ملک پر مغربی استعمار کے ہاتھ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا جس کو دیکھ کر مسلمان ماتم کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے، ان کی نہ کوئی سیاسی تنظیم اور نہ قیادت تھی، اس لئے وہ بیک وقت وطنی قومیت اور عالمی اسلامی اخوت کے متضاد جذبات کے حامل بنے ہوئے تھے، اس دور میں اقبال کی شاعری مسلم معاشرہ میں اسی تضاد کی عکاسی کرتی ہے۔ (ص ۱۰۴)

اس تجزیہ میں کیسی جذباتی کسک اور مبصرانہ بصیرت ہے۔ اقبال شناسیں میں کون ہے جو اس سے اختلاف کرے گا، اور اگر کوئی اختلاف کرے گا بھی تو اقبال کے اس دور کی شاعری کو اس نقطۂ نظر سے بھی کچھ دیر تک سوچنا پڑے گا، ورنہ ان کی شاعری کا صحیح جائزہ نہ لے سکے گا۔ علامہ جب یورپ روانہ ہوئے ہیں تو اس کی تفصیل کتاب کے چھٹے باب میں آگئی ہے اور

جب وہ کیمبرج، ہائیڈل برگ اور میونخ وغیرہ میں قیام کرتے ہیں تو اس کی کہانی کتاب کے آخری یعنی ساتویں باب میں ہے، ان تمام تفصیلات کو لکھنے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا قلم ایک افسانہ نویس اور ناول نگار کے قلم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کو پڑھتے وقت وہی لطف ملتا ہے جو کسی اچھے ناول نگار کی تحریر میں ملا کرتا ہے، ان دونوں ابواب کی بہت سی باتیں اقبال کے اور سوانح نگاروں کی تحریروں میں نہیں ملیں گی، اور اگر ہونگی بھی تو ان کے پیش کرنے کا وہ رومانی اور کیف آگیں انداز نہیں جو اس کتاب میں ہے۔

یورپ کے قیام میں علامہ اقبال میں جو ذہنی انقلاب آیا اس کا تجزیہ بھی اس باب میں بہت اچھی طرح کیا گیا ہے، اس تجزیہ کا انداز بھی دوسرے تجزیہ نگاروں سے کچھ علیحدہ ہے۔ اس وقت یورپ میں استعمار کی دوڑ تھی، روس کی نظر مشرق بعید کی طرف تھی، برطانیہ اور فرانس ایشیا اور افریقہ کے استحصال میں لگے ہوئے تھے، اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی فکر تھی کہ اٹلی، جرمنی اور دوسری طاقتیں ان کے اس استحصال میں شریک نہ ہوں، اس استعمار پسندی، ملک گیری اور زراندوزی میں ان میں باہمی رقابت اور نفرت بھی تھی، مگر اسی کے ساتھ ان کی متحدہ کوشش یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کی قوت مجتمع نہ ہونے پائے، وہ سب کے سب دولتِ عثمانیہ کے استیصال کی فکر میں لگے ہوئے تھے، فرانس، مراکش کو دولت عثمانیہ سے علیحدہ کر کے اپنے زیر نگیں کرنا چاہتا تھا، ایران کے بھی دو حصے کر دیے گئے تھے، اس کے شمالی حصہ پر روس کی برتری تھی، جنوبی حصہ پر برطانیہ حاوی ہو گیا تھا، ان واقعات سے علامہ اقبال پر یہ اثر ہوا کہ یورپ اپنی اغراض کی خاطر دنیائے اسلام کو پارہ پارہ رکھنا چاہتا ہے، اور جو اسلامی ممالک ان کے دائرۂ اثر سے باہر تھے، ان میں وطنیت کے یورپی تصور کو پھیلا کر ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے میں سرگرداں رہے۔ ان مشاہدات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمانوں میں اگر وطنیت کا

تصور فروغ پاگیا تو وہ بھی مغربی ریاستوں کی طرح ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے یا آپس میں برسرپیکار رہ کر ایک دوسرے کے حقوق غصب کرنے لگیں گے، اس طرح وہ ختم ہوجائیں گے، اس لئے ان کو یہ خیال ہوا کہ مسلمانانِ عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشتراکِ ایمان کے اصول پر متحد ہو کر ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کو وجود میں لائیں۔ (ص ۱۳۶) اسی کا خواب وہ اپنی شاعری میں دیکھنے لگے۔

اسی کے ساتھ یورپ کے قیام میں انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یورپی علم و ہنر کا منتہائے نظر تن تک ہے، اس میں من کی گنجائش نہیں، اس سے دماغ کی تو تربیت ہو جاتی ہے لیکن دل تشنہ رہ جاتا ہے، یہ اپنی مادہ پرستی میں عشق سے محروم ہے جو روح کے اندر حقیقی معنوں میں احترامِ آدمیت اور انسان دوستی کا جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ اپنی مشرقی بصیرت سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ یورپ کی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی (ص ۱۳۴)

ان کے خیالات میں یہ تلاطم پیدا ہوا تو ان میں اسلامیت کا جذبہ ابھرا اور ان کی شاعری کا رنگ بھی بدل گیا، ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ پہلے انھوں نے یورپ کے فلسفۂ عقلیت کا رد وجودی تصوف سے کیا تھا، اب ان کی نظر میں فلسفہ اور وجودی تصوف کی اہمیت جاتی رہی، وہ مقامِ عقل سے گذر کر مقامِ شوق کی طرف رواں دواں ہوئے، فلسفہ ان کے نزدیک ایک بیکار ذہنی مشق نظر آیا اور وجودی تصوف کو وہ افیون کا نشہ سمجھنے لگے تھے۔ (ص ۱۳۵)۔

یہاں پر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس وجودی تصوف سے بیزار ہو گئے جس کی حکومت ملکوتی اور علم لاہوتی میں حرم کے درد کا درماں نہیں اور جس کی تعلیم میں ذکرِ نیم شبی، مراقبے، اور سرود ہیں مگر اس سے دل یا نگاہ مسلمان نہیں بنی یا اس وجودی تصوف سے بے رغبتی ظاہر کی جس سے اسلاف کا جذبِ دروں حاصل ہوتا ہو، یا جس سے زمرۂ لایحزنون میں تحریک

ہونے کی تڑپ پیدا ہوتی ہو، یا جس میں خودی کی گتھیاں سلجھا کر صاحب جنون ہونے کا جذبہ عطا ہوتا ہو، یا جس میں مے لاالٰہ الا ہو کی مے پی کر من و تو کی تفریق مٹ جاتی ہو' یا جس سے وہ فقر حاصل ہوتا ہے جس کے ہزاروں مقام میں روح قرآنی بے پردہ نظر آتی ہے' یہ وہ بحث ہے جو ممکن ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد میں پڑھنے کو ملے، اور امید ہے کہ یقیناً ملے گی۔

علامہ اقبال اپنے اس ذہنی انقلاب کے بعد ۱۹۰۸ء میں یورپ سے وطن واپس آرہے تھے تو ان کا جہاز اٹلی کے جزیرہ سسلی کے قریب سے گذرا، اس وقت وہ سسلی کو تہذیب حجازی کا مزار سمجھ کر رو دئے (ص ۱۳۷) اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کے یہی آنسو' آگے چل کر ان کی شاعری کا سیل رواں ہی بن گئے۔

اس قسم کا تجزیہ اقبال کے اور قدرشناسوں نے بھی کیا ہے، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے تجزیہ میں جو دلائل و براہین پیش کیے ہیں' یا علامہ کی شاعری کے تشکیلی دور کے جو ارتقائی مدارج اور منزلیں متعین کی ہیں وہ دراصل قابل غور ہیں اور اقبالیات کے لٹریچر میں قیمتی اضافے ہیں، اس باب کے ساتھ یہ کتاب ختم ہوجاتی ہے، جس کو ختم کرنے کے بعد یہ خیال آیا کہ بہت دنوں کے بعد اقبالیات پر ایک اچھی کتاب مطالعہ میں آئی تھی، اس کو یہیں پر ختم نہ ہونا چاہئے تھا، اسی میں اور ابواب ہوتے، جن کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی دوسری جلد کے مطالعہ کا شوق ابھی سے تیز ہوگیا ہے، علامہ محمد اقبال کے اس نئے سوانح حیات کو غور سے پڑھنے کے ساتھ ان کے پورے کلام کا بھی مطالعہ غور سے کیا گیا تو قارئین محسوس کریں گے کہ ان کے ذہن کے بہت سے نئے دریچے کھل گئے ہیں۔

ممکن ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے جو یا کو اس کتاب میں زبان کی کچھ خامیاں نظر آئیں اس کے مصنف کے والد بزرگوار کی شاعری میں ایسے لوگوں کو زبان کی کمزوریاں نظر آتی تھیں مگر انھوں نے یہ کہہ کر ان کی زبان بند کی تھی:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس کتاب کی زبان کے ناقدوں کو ڈاکٹر جاوید اقبال بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔

اس تقریظ کو پڑھتے وقت بعض قارئین کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس میں صرف مدح وستایش ہی کے ہار گوندھے گئے ہیں، تنقیص کی کہیں چنگاریاں نہیں ہیں، مگر یہ راقم اس کو کیا کرے کہ اس کو علامہ اقبال سے عشق ہے، جب ان کی کہانی ان کے لائق فرزند کی زبانی بیان ہوئی تو اس میں اس راقم کو وہی لذت ملی جو کسی رند بلا نوش کو شیشہ وساغر کی محفل میں مے دو آتشہ اور سہ آتشہ کے دور میں ملتی ہے۔

جو عشق جانگداز ہو تو عشق باز کیا کریں

مطبوعات جدیدہ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم : مرتبہ جناب مصباح الدین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸۰، قیمت حسب توفیق، پتہ :- مصنف سے ، ای بلاک ۴۱۰- سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی (پاکستان)

اردو میں رد قادنیت پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، مولانا ثناء اللہ امرتسری کا یہ خاص فن بھی تھا اور جناب ایس ایس برنی کی کتاب " قادیانی مذہب " تو اس موضوع پر حرف آخر ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی مفید کڑی ہے، اس کی ابتداء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اور بعد کے مختصر حالات اور آپ کی دعوت و پیغام وغیرہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جس سے ختم نبوت لازماً ثابت ہو جاتا ہے، مصنف نے قرآن کی وہ آیتیں اور حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں ختم نبوت کے اسلامی عقیدہ کی صراحت موجود ہے اور ان کے علاوہ ایسی آیتیں اور حدیثیں بھی تحریر کی ہیں جن میں بظاہر تو اس کی صراحت نہیں ہے لیکن ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کا جو منصب بنایا گیا ہے اس سے یہی ظاہر ہے کہ آپ کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں، مصنف کا یہ استدلال بھی ہے کہ گذشتہ آسمانی کتابوں اور قرآن میں ایک نبی کے بعد دوسرے نبی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر میں مبعوث کئے جانے کا ذکر ہے لیکن آنحضرت کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا ادنیٰ اشارہ کہیں نہیں کیا گیا ہے، اگر کوئی نبی ہونا ہوتا تو قرآن اس اہم اور بنیادی مسئلہ کے ذکر سے خالی نہ ہوتا، لائق مصنف نے مرزا صاحب کی زندگی کے عام حالات و واقعات بیان

کرکے دکھایا ہے کہ اس سیرت وکردار کا آدمی نبی اور رسول نہیں ہو سکتا، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قادیانیت اسلام کے خلاف ایک متوازی مذہب ہے، اور انگریزوں کی سازش سے مرزا غلام احمد مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے مامور تھے، انھوں نے پاکستان اور ملیشیا کی قومی اسمبلی اور قاضی القضاۃ ابوظہبی کا یہ فیصلہ بھی تحریر کیا ہے کہ قادیانی غیر مسلم ہیں، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے لیکن کہیں کہیں لہجہ سخت اور انداز بیان تیز ہے۔

تذکرہ خاندانِ عزیزی مرتبہ سید ظل الرحمٰن صاحب ریڈر شعبۂ علم الادویہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۰۲، قیمت: تیس روپئے
پتہ شفاء الملک میموریل کمیٹی، دودھ پور علی گڑھ،

مسلمانوں نے دوسرے علوم وفنون کی طرح فن طب کو بھی بہت ترقی دی اور اس کو چار چاند لگایا، ہندوستانی مسلمانوں کے کارنامے علم الادیان (دینی علوم) کی طرح علم الابدان (طب) میں کسی اسلامی ملک سے کم نہیں، طب جدید کی ترقی سے پہلے ہندوستان میں سب سے بہتر، مقبول، ارزاں اور سہل طریقۂ علاج یہی تھا، آخری دور میں دلّی اور لکھنؤ زبان وادب کی طرح طب وحکمت کے بھی مرکز سمجھے جاتے تھے، لکھنؤ میں بھی جھوائی ٹولے کا خاندان بہت ممتاز تھا، اس کی بدولت لکھنؤ کو ایک مستقل طبی اسکول کا درجہ ملا، دریہاں کے صاحب کمالات ومجتہد الفن اطبا کی حذاقت اور مسیحائی کے ڈنکے پورے ملک میں بجتے تھے، زیر نظر کتاب میں جھوائی ٹولہ کے چوالیس کامل الفن اور جید اطبا کے سوانح وحالات قلمبند کئے گئے ہیں، حکیم عبدالعزیز اس خاندان کے گل سرسبد، اور تکمیل الطب کالج کے بانی تھے، ان ہی کے نام نیک کی نسبت سے یہ خانوادہ "خاندان عزیزی" کے نام سے موسوم ہوا، مصنف نے یہ تذکرہ ان کے جدا مجد حکیم محمد یعقوب سے شروع کیا ہے، کیونکہ اس خاندان میں سب سے پہلے ان ہی سے اس فن کی ابتدا ہوئی ہے، مصنف نے تمام طبیبوں کے طبی امتیازات واجتہادات، فن طب میں

ان کی علمی تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں، علمی مسائل میں اہل دلی سے ان کا اختلاف اور دوسرے علمی و ادبی اشتغال کا بھی ذکر کیا ہے، اور ان کی حذاقت و مہارت فن دکھانے کے لئے ان کے مختلف نسخے بھی نقل کئے ہیں، درس و تدریس بھی خاندان عزیزی کا طرۂ امتیاز تھا، اس کی پوری تفصیل بھی دیجئے، اس اعتبار سے یہ کتاب پونے دو سو برس کی طبی تاریخ ہے، ہندوستان کی طبی تاریخ اور یہاں کے اطبا کے حالات میں کم کتابیں لکھی گئی ہیں، لائق مصنف کا یہ خاص موضوع ہے، اس سے پہلے بھی وہ اس موضوع پر کئی کتابیں مرتب کر چکے ہیں، جن میں سے چند چھپ گئی ہیں، مصنف کو جھوائی ٹولہ کی آخری علمی و طبی یادگار شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب سے استفادہ کرنے کا موقع بھی مل چکا ہے، اس لئے انھوں نے یہ تذکرہ بہت شوق و محنت سے لکھ کر اس ممتاز طبی خانوادہ کا نام نیک ضائع ہونے سے بچا لیا، وہ ندوی بھی ہیں، اس لئے ان کو تالیف و تصنیف کا اچھا سلیقہ ہے جس کا نمونہ یہ کتاب بھی ہے،

۱۔ ہندوستان میں عربی علوم و فنون کے ممتاز علماء اور انکی علمی خدمات
۲۔ تذکرہ حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی،
۳۔ تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ،

} مرتبہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی، تقطیع خورد،

کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۵۶ و ۱۴۴ و ۱۱۲ قیمت ۱۵ روپے و ۱۰ روپے و ۳ روپئے؛ پتہ: مکتبہ طیبہ سی ۲۸/۲۰۰ ٹیپ ٹینی آخایر، لکھنؤ

ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی مولانا محمد اویس نگرامی ندوی مرحوم کے ہونہار فرزند ہیں، ان کو علم و فن کا موروثی ذوق ہے، یہ تینوں کتابیں انھوں نے بڑے سلیقہ سے مرتب کی ہیں، پہلی کتاب پر ان کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے، اس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک کے ہندوستانی علماء و مصنفین نے عربی زبان کی جو خدمات

کی ہیں ان کا چار ابواب میں جائزہ لیا ہے، پہلے باب کی حیثیت تمہید کی ہے، اس میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے عربی علوم و فنون سے متعلق کاموں کا اجمالی ذکر ہے، آخری تین ابواب میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، طبقات، سیر، تذکرہ، منطق، فلسفہ، ادب اور شاعری سے متعلق ہندوستان کی عربی تصنیفات کا ذکر اور ان کے مصنفین کے مختصر حالات دئے گئے ہیں، اس قسم کے جائزوں میں امکانی کوشش کے بعد بھی بعض نام چھوٹ ہی جاتے ہیں مگر تعجب ہے کہ لائق مصنف نے علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی کو نظر انداز کر دیا ہے، مولانا محمد اسلم جیراجپوری کا ذکر بھی رہ گیا ہے حالانکہ ان کی کتاب "الوراثۃ فی الاسلام" پر ایک زمانہ میں بڑی رد و کد ہو چکی ہے، ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی پابندیوں کی وجہ سے مصنف کے لئے اس میں مزید تفصیل کی گنجائش نہ رہی ہوگی لیکن کتابی صورت دیتے وقت ان کو زیادہ پھیلا کر لکھنا چاہئے تھا، تاہم یہ جس صورت میں بھی شائع ہوئی ہے فائدہ سے خالی نہیں مگر غفلت یا عجلت کی وجہ سے اس میں کتابت و طباعت کی بیشمار غلطیاں رہ گئی ہیں،

دوسری کتاب مصنف کے والد بزرگوار مولانا محمد اویس ندوی مرحوم کا تذکرہ ہے، اس میں وہ سب مضامین اور تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جو مولانا کی وفات کے بعد ان کے دوستوں اور عزیزوں نے تحریر کئے تھے، یہ کئی حصوں پر مشتمل ہیں پہلے دونوں حصے خود لائق مرتب کے قلم سے ہیں، ابتدائی حصہ میں نگرام کے اس علمی و دینی خانوادہ کے متعلق معلومات درج ہیں جس سے مولانا اویس مرحوم کا تعلق تھا، دوسرے حصہ میں مولانا کے سوانح حیات اور علمی خدمات کا ذکر ہے، تیسرا حصہ ان تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے جو ان کے احباب و تلامذہ نے قلمبند کئے تھے، اس حصہ میں مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کا مختصر اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا طویل مضمون بہت مؤثر ہے، چوتھے حصہ میں اخباروں اور رسالوں کے شذرے اور آخری حصہ میں اہل تعلق کے تعزیتی خطوط دئے گئے ہیں، ان سے مولانا کی سیرت و شخصیت، ان کے علمی شغف، خوش طبعی اور نفاست وغیرہ مختلف پہلو سامنے آگئے ہیں تیسرا کتابچہ صلحاء و اخیار کے دلآویز حالات و واقعات کا سبق آموز مجموعہ ہے،

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۲ویں جلد

جنوری ۱۹۸۰ء تا جون ۱۹۸۰ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن   عبدالسلام قدوائی ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۵

ماہ جنوری ۱۹۸۰ء تا جون ۱۹۸۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۵

ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۰ء تا جون سنہ ۱۹۸۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	محمد منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین	۵۹-۱۴۲، ۳۱۵-۳۱۹	۱۵	ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)	۵-۹، ۱-۳۴۹
۱۴	مولانا محمد ناظم صاحب ندوی سابق پروفیسر مدینہ یونیورسٹی مدینہ	۴۴	۱۶	شیخ نذیر حسین مدیر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	۱۲

۔۔۔۔۔۔ختم۔۔۔۔۔۔